رجسٹرڈ نمبر [illegible]
۱۰ رجب [illegible] ۱۹۵۰ء

ماہنامہ

# ترجمان القرآن

علومِ قرآنی و حقائقِ فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

جلد

## سید ابوالاعلیٰ مودودی

چندہ سالانہ [illegible] قیمت فی پرچہ [illegible]

# الجہاد فی الاسلام

تالیف

## سید ابو الاعلیٰ مودودی

### مختصر فہرست مضامین حسب ذیل ہے۔

**اسلامی جہاد کی حقیقت** اس میں بتایا گیا ہے کہ قرآن کی تعلیم جہاد کن اہم حقائق پر مبنی ہے اور نظام تمدن میں روح جہاد کا کیا مرتبہ ہے۔

**مدافعانہ جنگ** وہ اغراض جن کے لیے قرآن نے دفاعی جنگ کا حکم دیا ہے۔

**مصلحانہ جنگ** اسلامی جنگ کے اصول و مقاصد کی تشریح اور ان اعتراضات کا مدلل جواب جو اس نوع کی جنگ پر کیے جاتے ہیں۔

**اشاعتِ اسلام اور تلوار** دعوت و تبلیغ کے متعلق اصل تعلیم اسلامی کی تشریح اور اس کی تحقیق کہ اشاعت اسلام میں تلوار کا کیا حصہ ہے۔

**قوانین جنگ** اسلام سے قبل کے وحشیانہ طریقہائے جنگ اور ان میں اسلام کی اصلاحات۔

**جنگ دوسرے مذاہب میں** جنگ کے متعلق ہندو مذہب، بودھ مت، یہودیت اور عیسائیت کی تعلیمات کی تشریح اور اسلام سے ان کا مقابلہ۔

**جنگ اور تہذیب جدید** بین الاقوامی قانون جنگ کی تفصیل اور اسلامی قانون جنگ سے اس کا مقابلہ۔

ضخامت ۵۰۰ صفحات مجلد ([illegible]) انگریزی ([illegible]) [illegible]

**دفتر ترجمان القرآن، حیدرآباد دکن**

# فہرست مضامین

## ماہ محرم الحرام ۱۳۵۶ھ جلد ۱۰ عدد ۱



**ضروری اطلاع:** (۱) سرکار آصفیہ کے سررشتۂ امور مذہبی کی جانب سے جن کتب خانوں، دارالمطالعوں اور دوسرے مشغلین کو یہ رسالہ بھیجا جاتا ہے ان کو اطلاع دی جاتی ہے کہ اس سال ان پرچوں میں ۲۵ کی تخفیف کر دی گئی ہے لہٰذا جن حضرات کو پرچہ نہ پہنچے وہ شکایت نہ فرمائیں۔

(۲) یکم اپریل سے کے لیے ڈاک کا محصول بڑھ گیا ہے لہٰذا آئندہ اہل برما سے پانچ روپیہ کی بجائے ساڑھے پانچ روپیہ چندہ لیا جایا کرے گا۔ منیجر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# اشارات

اس اشاعت کے ساتھ ترجمان القرآن کی زندگی کا پانچواں سال شروع ہو رہا ہے۔ سفر کی اس نئی منزل میں قدم رکھنے سے پہلے مجھ پر اللہ تعالیٰ کا شکر واجب ہے۔ پچھلے دور اس طرح گذرتے رہے ہیں کہ ہر سال کی ابتدا میں خوف ہوتا تھا کہ شاید اب یہ پرچہ پورا سال نہ چل سکے گا، اور ہر سال کے خاتمہ پر حیرت ہوتی تھی کہ اتنی مدت یہ زندہ کیسے رہا۔ مگر تیسرے دور کے ان مسلسل تجربات اور نصرت الٰہی کے پیہم مظاہرات نے اب دل میں اس امر کا اذعان سا پیدا کر دیا ہے کہ یہ خدمت بارگاہ الٰہی میں کسی حد تک مقبول ضرور ہے اور اسی قبولیت کی بنا پر اس کے ساتھ يَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ کا سا معاملہ ہو رہا ہے گو ظاہر حالات کے لحاظ سے خارج میں کوئی تغیر نہیں ہوا۔ اب بھی زمانہ کا وہی رنگ ہے جسے دیکھ دیکھ کر دل ٹوٹا جاتا تھا، ہمت بیٹھی جاتی تھی، حوصلے پست ہوئے جاتے تھے لیکن اب باطن کا وہ حال نہیں جو پہلے تھا۔ اب دل میں ایک اطمینان ہے، ذہن میں ایک سکون ہے۔ حوصلوں میں ایک نئی قوت پرواز اور عزائم میں ایک خاص طاقت ثبات محسوس ہوتی ہے۔ پہلے صبر اور توکل کے الفاظ ذہن میں تھے۔ روح میں ان کے معنی کا تحقق اب شروع ہوا ہے۔ پہلے صرف اعتقاداً یہ سمجھتے تھے کہ خدا پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ چار سال کی مشق و تمرین کے بعد اب کچھ سمجھ میں آنے لگا ہے کہ خدا پر بھروسہ کرنے کے معنی کیا ہیں، اور اس پر بھروسہ کرنے والوں کے ساتھ کیا معاملہ ہوتا ہے۔ یہی وہ نعمت ہے جو برسوں سے جس کی طلب تھی۔ اور اب کہ اس بخشش کا آغاز ہوا ہے، صمیم قلب کے ساتھ بخشنے والے کا شکر ادا کرتا ہوں۔ اور ادائے شکر کے ساتھ

یہ دعا بھی کرتا ہوں کہ اس نعمت کا اتمام فرمایا جائے کیونکہ اب جو مرحلہ درپیش ہے اس میں سب سے بڑھ کر جس چیز کی ضرورت ہے میں ایک مجاہد کے سے ایمان کا طالب ہوں۔ ایسا دل مانگتا ہوں جو سمندر کی طوفانی موجوں کے مقابلہ میں ٹوٹی ہوئی کشتی لے جانے پر بے جھجک آمادہ ہو جائے۔ ایسی روح مانگتا ہوں جو شکست کھانے اور سپر رکھ دینے کا تصور ہی نہ کر سکتی ہو۔ ایسی عزیمت مانگتا ہوں جو مادی سہاروں سے قطعاً مستغنی ہو اور تمام سہاروں کے چھوٹ جانے پر بھی نہ ٹوٹ سکے۔ ایسا ارادہ مانگتا ہوں جسے کوئی طاقت اپنے مقصد کے راستہ سے نہ ہٹا سکے۔

---

اس سے پہلے ہم کئی مرتبہ اشارۃً کہہ چکے ہیں کہ ہندوستان میں تیزی کے ساتھ ایک نیا انقلاب آرہا ہے جو بلحاظ اپنے اثرات اور اپنے نتائج کے ۱۸۵۷ء کے انقلاب سے بھی زیادہ شدید ہوگا۔ پھر اس سے بہت زیادہ بڑے پیمانہ پر ایک دوسرے انقلاب کا سامان تمام دنیا میں ہو رہا ہے۔ اور بہت ممکن ہے کہ یہ وسیع تر انقلاب ہندوستان پر اثر انداز ہو کر یہاں کے متوقع انقلاب کا رخ اچانک پھیر دے، اور اس کو ہماری توقعات سے بہت زیادہ پرخطر بنا کر چھوڑ دے۔

جو لوگ خس و خاشاک کی طرح ہر رو پر بہنے کے لیے تیار ہیں اور جن کو خدا نے اتنی سمجھ بوجھ ہی نہیں دی ہے کہ اپنے لیے زندگی کا کوئی راستہ معین کر سکیں، ان کا ذکر تو قطعاً فضول ہے۔ انھیں غفلت میں پڑا رہنے دیجیے، زمانہ کا سیلاب جس رخ پر بھی بہے گا وہ آپ سے آپ اسی رخ پر بہہ جائیں گے۔ اسی طرح اُن لوگوں سے بھی قطع نظر کیجیے جو آنے والی انقلابی قوتوں پر کچھ بوجھ کر ایمان لائے ہیں اور بالارادہ اسی رخ پر جانا چاہتے ہیں جس پر زمانہ کا طوفانی دریا بہہ رہا ہے۔ اب صرف وہ لوگ رہ جاتے ہیں جو مسلمان ہیں، مسلمان رہنا چاہتے ہیں، مسلمان مرنا چاہتے ہیں، اور یہ تمنا رکھتے ہیں کہ ہندوستان میں اسلامی تہذیب زندہ رہے، اور ہماری آئندہ نسلیں محمد عربی صلعم

کی بتائی ہوئی راہ راست پر قائم ہیں۔ ان لوگوں کے لیے یہ وقت رواداری سے گذار دینے کا نہیں، بلکہ انتہائی سوچنے اور غایت درجہ کے غور و فکر کا ہے۔ وہ اگر اس نازک وقت میں غفلت اور بے پروائی سے کام لیں گے تو ایک جرم عظیم کا ارتکاب کریں گے اور اس جرم کی سزا صرف آخرت ہی میں نہ ملے گی بلکہ اسی دنیاوی زندگی میں ان پر چھا جائے گی۔ زمانہ کا بے درد ہاتھ ان کی آنکھوں کے سامنے تہذیب اسلامی کے ایک ایک نشان کو مٹائے گا۔ اور وہ بے بسی کے ساتھ اس کو دیکھا کریں گے۔ زمانہ ان کے قومی وجود کو ملیا میٹ کرے گا، ایک ایک کر کے ان امتیازی حدود کو ڈھائے گا جن سے اسلام غیر اسلام سے متمیز ہوتا ہے اور اس خصوصیت کو فنا کر دے گا جس پر مسلمان دنیا میں فخر کرتا رہا ہے، وہ یہ سب کچھ دیکھیں گے اور کچھ نہ کر سکیں گے۔ ان کی آنکھیں خود اپنے گھروں میں اپنی نوخیز نسلوں کو خدا پرستی سے دور، اسلامی تہذیب سے بیگانہ اور اسلامی اخلاق سے عاری دیکھیں گی۔ اور آنسو تک نہ بہا سکیں گی۔ ان کی اپنی اولاد اُس فوج کی سپاہی بن کر اٹھے گی جسے اسلام اور اس کی تہذیب کے خلاف صف آرا کیا جائے گا۔ وہ اپنے ان جگر گوشوں کے ہاتھ سے تیر کھائیں گے اور جواب میں کوئی تیر نہ چلا سکیں گے۔

یہ انجام یقینی ہے اگر کام کے وقت کو غفلت میں کھو دیا گیا۔ انقلاب کا عمل شروع ہو چکا ہے۔ اس کے آثار نمایاں ہو چکے ہیں، اور اب فکر و عمل کے لیے بہت ہی تھوڑا وقت باقی ہے۔

---

اسلامی ہند کی تاریخ پر جو لوگ نظر رکھتے ہیں اُن سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ اس ملک میں اسلامی تہذیب کی بنیاد ابتدا ہی سے کمزور رہی ہے صدر اول میں اور اس سے متصل بعد کی قرنوں میں اسلامی سیلاب کی جو لہریں ہندوستان تک پہنچیں وہ زیادہ تر خس و خاشاک اور کثافتیں لے کر آئیں، اس لیے کہ اس زمانہ میں ہندوستان دار الاسلام کی آخری سرحدوں پر تھا اور وہ سب لوگ جو اسلام کے مرکزی اقتدار یا اصولی عقیدہ و مسلک کے خلاف بغاوت کرتے تھے عموماً بھاگ بھاگ کر اسی طرف آجاتے تھے۔

چنانچہ سندھ اور کاٹھیاواڑ اور گجرات وغیرہ ساحلی علاقوں میں جو گراصیاں آج تک پائی جاتی ہیں وہ اُسی زمانہ کی یادگار ہیں۔ اس کے بعد چھٹی صدی ہجری میں جب اصل دعوت نے ہندوستان کا رخ کیا تو وہ خود بھی نئی ثقافتوں سے بہت کچھ آلودہ ہو چکا تھا۔ امراء میں روح جہاد اور علماء میں روح اجتہاد سرد ہو چلی تھی۔ ہمارے حکمراں زیادہ تر وہ لوگ تھے جن کو خراج اور توسیع مملکت کی فکر تھی۔ ہمارے مذہبی پیشواؤں میں اکثریت ان حضرات کی تھی جن کی زندگی کا مقصد حکومت کے مناصب حاصل کرنا اور ہر قیمت پر اپنے مذہبی اقتدار کی حفاظت کرنا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں صحیح معنوں میں کبھی اسلامی حکومت قائم ہوئی نہ حکومت نے پوری طرح وہ فرائض انجام دیے جو شرعاً اس پر عائد ہوتے تھے۔ نہ اسلامی علوم کی تعلیم کا کوئی صحیح نظام قائم ہوا، نہ اشاعت اسلام کی کوئی خاص کوشش کی گئی، نہ اسلامی تہذیب کی ترویج اور اس کے حدود کی نگہداشت جیسی ہونی چاہیے ویسی ہوسکی۔ علماء اور صوفیہ کے ایک مختصر گروہ نے بلاشبہ نہایت زریں خدمات انجام دیں اور انہی کی برکت ہے کہ آج ہندوستان کے مسلمانوں میں کچھ علم دین اور کچھ اتباع شریعت پایا جاتا ہے لیکن ایک قلیل گروہ ایسی حالت میں کیا کرسکتا تھا جب کہ قوم کے عوام جاہل اور ان کے سردار اپنے فرائض سے غافل ہوں۔

اسلام کی عام کشش سے متاثر ہوکر ہندوستان کے کروڑوں آدمی مسلمان ہوئے مگر اسلامی اصول پر ان کی تعلیم و تربیت کا کوئی انتظام نہ کیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس ملک کی اسلامی آبادی کا سواد اعظم ان تمام مشرکانہ اور جاہلانہ رسوم و عقائد میں گرفتار رہا جو اسلام قبول کرنے سے پہلے ان میں رائج تھے۔

جو مسلمان باہر سے آئے تھے ان کی حالت بھی ہندوستانی نومسلموں سے کچھ زیادہ بہتر نہ تھی۔ ان پر عجمیت پہلے ہی غالب ہو چکی تھی۔ نفس پرستی اور عیش پسندی کا گہرا رنگ ان پر چڑھ چکا تھا۔ اسلامی تعلیم و تربیت سے وہ خود پوری طرح بہرہ ور نہ تھے۔ زیادہ تر دنیا اُن کی مطلوب تھی۔ خالص دینی جذبہ ان

میں سے بہت کم، بہت ہی کم لوگوں میں تھا، وہ یہاں آکر بہت جلدی عام باشندوں میں گھل مل گئے
کچھ ان کو متاثر کیا اور کچھ ان سے متاثر ہوئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں مسلمانوں کا تمدن اسلامیت و عجمیت اور
ہندیت کی ایک معجون مرکب بن کر رہ گیا۔

عام طور پر جو طرز تعلیم یہاں رائج ہوا وہ اسی ڈھنگ کا تھا جسے انگریزوں نے بعد میں اختیار کیا
اس کا بنیادی مقصد حکومت کی خدمات کے لیے لوگوں کو تیار کرنا تھا۔ قرآن اور حدیث کے علوم جن پر
اسلامی تہذیب کی بنیاد قائم ہے۔ یہاں کے نظام تعلیمی میں بہت ہی کم بار پا سکے۔

طرز حکومت بھی قریب قریب اسی ڈھنگ کا رہا جس کی تقلید بعد میں انگریزوں نے کی، بلکہ اپنی
قومی تہذیب کی حفاظت اور ترویج اور اس کے حدود کی نگہداشت کا جتنا خیال انگریزوں نے رکھا
ہے، اتنا بھی مسلمان حکمرانوں نے نہ رکھا خصوصیت کے ساتھ مغل فرمانرواؤں نے اس باب میں جس سہل انگاری
سے کام لیا ہے اس کی مثال تو شاید دنیا کی کسی حکمراں قوم میں نہ مل سکے گی۔

ظاہر ہے کہ جس قوم کی تعلیم اور سیاست دونوں اپنی قومی تہذیب کی حفاظت سے دستکش ہو جائیں
اس کو زوال سے کوئی قوت نہیں بچا سکتی۔

---

گیارہویں صدی ہجری میں انحطاط اپنی آخری حدوں پر پہنچ چکا تھا، مگر عالمگیر کی طاقتور شخصیت
اس کو روکے ہوئے تھی۔ بارہویں صدی کی ابتدا میں جب قصر اسلامی کا یہ آخری محافظ دنیا سے رخصت
ہوا تو وہ تمام کمزوریاں یکایک نمودار ہوگئیں جو اندر ہی اندر صدیوں سے پرورش پا رہی تھیں تعلیم و
تربیت کی خرابی اور قومی اخلاق کے اضمحلال اور نظام اجتماعی کے اختلال کا پہلا نتیجہ سیاسی زوال
کی صورت میں ظاہر ہوا۔ مسلمانوں کی سیاسی جمعیت کا شیرازہ دفعتہً درہم برہم ہو گیا۔ قومی اور اجتماعی
مفاد کا تصور ان کے دماغوں سے نکل گیا۔ انفرادیت اور خود غرضی پوری طرح ان پر مسلط ہو گئی۔ الخ

میں ہزاروں ہزار خائن اور غدار پیدا ہوئے جن کا ایمان کسی نہ کسی قیمت پر خریدا جا سکتا تھا، اور جو اپنے ذاتی فائدہ کے لئے بڑے سے بڑے قومی مفاد کو بے تکلف بیچ سکتے تھے۔ ان میں لاکھوں بندگانِ شکم پیدا ہوگئے جن سے ہر دشمنِ اسلام تھوڑی سی رشوت یا حقیر سی تنخواہ دے کر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہر قسم کی بدتر سے بدتر خدمت لے سکتا تھا۔ ان کے سوادِ اعظم سے قومی غیرت اور خودداری اس طرح مٹ گئی کہ دلوں میں اس کا نام و نشان تک باقی نہ رہا۔ وہ دشمنوں کی غلامی پر فخر کرنے لگے۔ غیروں کے بخشے ہوئے خطابات اور مناصب میں ان کو عزت محسوس ہونے لگی۔ دین و ملت کے نام پر جب کبھی ان سے اپیل کی گئی وہ پتھروں سے ٹکرا کر واپس آئی اور جب کوئی حامیِ دین و ملت اقتدارِ قومی کے گرتے ہوئے قصر کو سنبھالنے اٹھا، اس کا سر خود اس کی اپنی قوم کے بہادروں نے کاٹ کر دشمنوں کے سامنے پیش کر دیا۔

اس طرح ڈیڑھ صدی کے اندر اسلام کا سیاسی اقتدار ہندوستان کی سرزمین میں بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینک دیا گیا، اور سیاسی اقتدار مٹتے ہی یہ قوم، افلاس، غلامی، جہالت اور بداخلاقی میں مبتلا ہوگئی۔

---

۱۸۵۷ء کا ہنگامہ دراصل سیاسی انقلاب کی تکمیل اور ایک دوسرے انقلاب کی تمہید تھا۔ جن کمزوریوں نے مسلمانوں سے سیاسی اقتدار چھینا تھا وہ سب علیٰ حالہ قائم تھیں۔ اور ان پر مزید کمزوریوں کا اضافہ ہو گیا تھا۔ ان کے اندر اسلامی تہذیب کی بنیاد پہلے سے کمزور تھی۔ اس کمزوری نے جب حکومت کے منصب سے ان کو ہٹا دیا، اور افلاس و غلامی کی دوہری مصیبت میں وہ گرفتار ہوئے تو دوسری اور کمزوریاں رونما ہوگئیں۔

دین، اخلاق اور تہذیب اور تمدن یہ سب چیزیں بلند تر انسانیت سے تعلق رکھتی ہیں، اور ان کی قدر و عزت وہی لوگ کر سکتے ہیں جو حیوانیت سے بالاتر ہوں۔ پیٹ اور روٹی اور کپڑا اور آسائشِ بدن اور لذاتِ نفس وہ چیزیں ہیں جو انسان کی حیوانی ضروریات سے تعلق رکھتی ہیں

اور جب انسان مقامِ حیوانی سے قریب تر ہوتا ہے تو اس کی نگاہ میں یہی چیزیں زیادہ اہم ہوتی ہیں حتیٰ کہ وہ ان کی خاطر بلند تر انسانیت کی ہر متاعِ گراں مایہ کو نہ صرف قربان کر دیتا ہے بلکہ حیوانی پستی کی آخری حدوں پر پہنچ کر اس میں یہ احساس بھی باقی نہیں رہتا کہ میرے لیے کوئی چیز ان چیزوں سے اعلیٰ و ارفع بھی ہو سکتی ہے۔ ہندوستان کا مسلمان جب اپنا سیاسی اقتدار کھو رہا تھا اس زمانہ میں اس کی انسانیت پر حیوانیت غالب آ چکی تھی، مگر انسانیت بالکل فنا نہیں ہوئی تھی، اس لیے وہ پیٹ اور بدن پر انسانیت کی گراں قدر متاعوں کو قربان تو کر رہا تھا، مگر اس کو یہ احساس ضرور تھا کہ یہ متاعیں گراں قدر ہیں اور کسی نہ کسی طرح ان کی بھی حفاظت کرنی چاہیے۔ لیکن جب وہ سیاسی اقتدار کھو چکا تو افلاس نے پیٹ اور بدن کے سوال کو ہزار گنا زیادہ اہم بنا دیا، اور غلامی نے غیرت اور خودداری کے تمام احساسات کو مٹانا شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی انسانیت روز بروز پست ہوتی چلی گئی اور حیوانیت کا اثر بڑھتا اور چڑھتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ ابھی ایک صدی بھی پوری نہیں گزری ہے۔ اور حال یہ ہو گیا ہے کہ مسلمانوں کی ہر نسل پہلی نسل سے زیادہ نفس پرست، اور بندۂ شکم اور آسائشِ بدن کی غلام بن کر اٹھ رہی ہے۔ ستر برس پہلے وہ مغربی تعلیم کی طرف یہ کہہ کر گئے تھے کہ ہم صرف اپنی حیوانی ضروریات پوری کرنے کے لیے ادھر جا رہے ہیں، اپنے دین و اخلاق اور اپنی قومی تہذیب و تمدن کو ہم کھونا نہیں چاہتے۔ اور واقعہ بھی یہ تھا کہ اس وقت تک یہ چیزیں ان کی نگاہ میں کافی اہمیت رکھتی تھیں، لیکن جیسا کہ ہم نے اوپر عرض کیا، وہ بنیادی کمزوریاں جنہوں نے ان کو حکومت کے منصب سے ہٹایا، ان میں پہلے سے موجود تھیں، اور وہ نئی کمزوریاں جو غلامی و افلاس کی حالت میں فطرۃً پیدا ہوتی ہیں، ان کے اندر تیزی سے پیدا ہو رہی تھیں۔ ان دونوں قسم کی کمزوریوں کی بدولت ایک طرف دین و اخلاق کی اہمیت اور قومی تہذیب و تمدن کی قدر و عزت روز بروز ان میں کم ہوتی چلی گئی۔ دوسری طرف خود غرضی اور نفسانیت کے روز افزوں غلبہ نے اُن کو ہر اس شخص کی غلامی پر

آمادہ کر دیا جو ان کو کچھ مال اور جاہ اور اپنے ہم جنسوں میں کچھ سربلندی عطا کر سکتا ہو خواہ ان چیزوں کے بدلے میں وہ انسانیت کے جس گوہر بیش بہا کو چاہے خرید لے۔ تیسری طرف انفرادیت اور خود پرستی جو ڈھائی سو برس سے ان کی قومیت کو گھن کی طرح لگی ہوئی ہے انتہائی حد کو پہنچ گئی ہے یہانتک کہ اجتماعی عمل کی کوئی صلاحیت ان میں باقی نہیں رہی اور وہ تمام صفات ان سے نکل گئیں جن کی بدولت ایک قوم کے افراد اپنے قومی مفاد کی حفاظت اور اپنے قومی وجود کی حمایت کے لیے مجتمع ہو سکتے اور مشترک جد و جہد کر سکتے ہیں

---

یہاں اتنا موقع نہیں کہ اس دوسرے انقلاب کے تمام پہلوؤں کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا جا سکے تاہم مختصراً اس کے چند نمایاں پہلوؤں کی طرف ہم اشارہ کریں گے تاکہ ہندوستان میں اسلام کی موجودہ پوزیشن واضح طور پر سامنے آجائے اور یہ اندازہ کیا جا سکے کہ اب جو تیسرا انقلاب سامنے آرہا ہے، وہ ان حالات میں مسلمانوں پر کس طرح اثر انداز ہوگا۔

---

جس روز سے برٹش امپیریلزم نے ہندوستان میں قدم رکھا ہے، اُسی روز سے اس کی یہ مستقل پالیسی رہی ہے کہ مسلمانوں کا زور توڑا جائے۔ اسی غرض کے لیے اسلامی ریاستوں کو مٹایا گیا اور اس نظام عدل و قانون کو بدلا گیا جو صدیوں سے یہاں قائم تھا۔ اسی غرض کے لیے انتظام مملکت کے قریب قریب ہر شعبے میں ایسی تدبیریں اختیار کی گئیں جن کا مآل یہ تھا کہ مسلمانوں کو معاشی حیثیت سے تباہ و برباد کر دیا جائے اور ان پر رزق کے دروازے بند کر دیے جائیں، چنانچہ گذشتہ ڈیڑھ دو سو سال کے اندر اس پالیسی کے جو نتائج ظاہر ہوئے ہیں وہ یہ ہیں کہ جو قوم کبھی اس ملک کے خزانوں کی مالک تھی، وہ اب روٹیوں کی محتاج ہو چکی ہے۔ اس کو معیشت کے ذرائع سے ایک ایک کر کے محروم کر دیا گیا ہے، اور اب اس کی ۹۰ فیصدی آبادی غیر مسلم سرمایہ دار کی معاشی غلامی میں مبتلا ہے۔ ساہوکار سے برٹش امپیریلزم کا مستقل اتحاد ہے اور برطانوی نظام

عدالت اس کے لیے وہی خدمت انجام دے رہا ہے جو سود خوار پٹھان کے لیے اس کا ڈنڈا انجام دیتا ہے۔

---

سیاسی اقتدار سے محروم ہونے کے بعد مسلمانوں میں جاہ اور عزت کی بھوک پیدا ہوئی اور معاشی وسائل سے محروم ہونے کے بعد روٹی کی بھوک۔ ان دونوں چیزوں کے حصول کا دروازہ صرف ایک ہی رکھا گیا اور وہ مغربی تعلیم کا دروازہ تھا۔ روٹی اور عزت کے بھوکے لاکھوں کی تعداد میں ادھر لپکے۔ وہاں ہاتف غیب نے پکار کر کہا کہ آج روٹی اور عزت مسلمان کے لیے نہیں ہے۔ یہ چیزیں اگر چاہتے ہو تو نامسلمان بن کر آؤ۔ اپنے دل کو، اپنے دماغ کو، اپنے دین اور اخلاق کو، اپنی تہذیب اور آداب کو، اپنے اصول حیات اور طرز معاشرت کو، اپنی غیرت اور خودداری کو قربان کرو، تب روٹی کے چند ٹکڑے اور عزت کے چند کھلونے تم کو دیے جائیں گے۔ انہوں نے خیال کیا کہ بہت ہی سستے داموں بہت ہی قیمتی چیز مل رہی ہے۔ بیچو اس پرانے کباڑخانے کو۔ یہ چیزیں جو روٹی اور خطاب و منصب جیسی بیش بہا چیزوں کے معاوضے میں مانگی جا رہی ہیں، آخر ہیں کس کام کی۔ انہیں تو رہن رکھ کر دھیلے کے چار پیسے بھی نہیں مل سکتے۔

مسلمان جب مغربی تعلیم کی طرف گئے تو یہی کچھ سمجھ کر گئے۔ زبانوں نے گو ایسا نہیں کہا۔ مگر جذبات اور تخیلات تو ایسے ہی کچھ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ کم و بیش ۹۰ فی صدی لوگوں پر اس تعلیم کے وہی اثرات ہوئے جو ہم نے اوپر بیان کیے ہیں۔ اسلامی تعلیم میں وہ قطعی کورے ہیں۔ ان میں بیشتر ایسے ہیں جو قرآن کو ناظرہ بھی نہیں پڑھ سکتے۔ اسلامی لٹریچر کی کوئی چیز ان کی نظروں سے نہیں گزرتی۔ وہ کچھ نہیں جانتے کہ اسلام کیا ہے اور مسلمان کس کو کہتے ہیں اور اسلام اور غیر اسلام میں کیا چیز مابہ الامتیاز ہے۔ خواہشات نفس کو انہوں نے اپنا معبود بنا لیا ہے۔ اور یہ معبود انہیں اس مغربی تہذیب کی طرف لیے جا رہا ہے جس نے نفس کی ہر خواہش اور لذت نفس کی ہر طلب کو پورا کرنے کا ذمہ لے رکھا ہے۔ وہ مسلمان ہونے پر نہیں بلکہ ماڈرن ہونے پر فخر کرتے ہیں۔ وہ اہل فرنگ کی ایک ایک ادا پر جان نثار کرتے ہیں۔ لباس میں، معاشرت میں، کھانے اور پینے میں،

میل جول اور بات چیت ہی نہیں بلکہ اپنے ناموں تک میں وہ ان کا ہو بہو چربہ بن جانا چاہتے ہیں۔ انھیں ہر اس طریقہ سے نفرت ہے جس کا حکم مذہب نے ان کو دیا ہے، اور ہر اس کام سے رغبت ہے جس کی طرف مغربی تہذیب انھیں بلاتی ہے۔ نماز پڑھنا ان کے ہاں معیوب ہے۔ اتنا معیوب کہ جو شخص نماز پڑھتا ہے، ان کی سوسائٹی میں بنایا جاتا ہے اور اگر بنانے کی جرأت نہیں ہوتی تو کم از کم حقارت آمیز حیرت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے کہ آخر یہ کونسی مخلوق ہے جو اب تک خدا کا نام لیے جا رہی ہے۔ بخلاف اس کے سنیما جانا ان کے نزدیک نہ صرف جائز ہے بلکہ ایک مہذب انسان کے لوازم حیات میں سے ہے اور جو شخص اس سے اجتناب کرتا ہے اس پر حیرت کی جاتی ہے کہ یہ کس قسم کا تاریک خیال ملا ہے جو بیسویں صدی کی اس برکت عظمیٰ سے محروم رہنا چاہتا ہے۔ ان میں اب وہ طبقہ سرعت سے بڑھ رہا ہے جو مذہب اور مذہبیات سے اپنی بیزاری کو چھپانے کی بھی ضرورت نہیں سمجھتا، اور صاف کہنے لگا ہے کہ ہمیں اسلام سے کوئی تعلق نہیں

یہ بیزاری اب تک ہمارے مردوں میں تھی مگر اب عورتوں میں بھی پہنچ رہی ہے۔ جو طبقے ہماری سوسائٹی کے سرخرو اور تعلیم یافتہ ہیں وہ اپنی عورتوں کو کھینچ کر باہر لا رہے ہیں۔ ان کو بھی اسلام اور اس کی تہذیب سے بیگانہ اور مغربی تہذیب اور اس کے طور طریقوں اور اس کے تخیلات سے آراستہ کیا جا رہا ہے۔ عورت میں انفعال اور تاثر فطری طور پر مردوں سے زیادہ ہے۔ جو راستہ مردوں نے ستر برس میں طے کیا ہے، عورتیں اس کو ان سے بہت جلد طے کر لیں گی اور ان کی گودوں میں جو نسلیں پرورش پا کر اٹھیں گی ان میں شاید اسلام کا نام بھی باقی نہ رہیگا

خود غرضی انفرادیت اور نفس پرستی کے غلبہ کا فطری نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں سے قومیت کا احساس مٹتا جا رہا ہے ان کی اجتماعی طاقت فنا ہو رہی ہے پندرہ سال سے اُن کے اندر سخت انتشار برپا ہے۔ ان کی کوئی قومی پالیسی نہیں، کوئی اجتماعی ہیئت نہیں۔ کوئی ایک شخص نہیں جو ان کا لیڈر ہو۔ کوئی ایک جماعت نہیں جو ان کی نمائندہ ہو کسی بڑی سے بڑی قومی مصیبت پر بھی وہ جمع نہیں ہو سکتے۔ ایک بن سری فوج ہے جو راس کماری سے پشاور تک پھیلی ہوئی ہے ایک ریوڑ ہے جس میں کوئی نظم نہیں۔ ایک بھیڑ ہے جس میں کوئی رابطہ نہیں۔ ہر فرد آپ ہی اپنا لیڈر اور آپ ہی اپنا پیرو

انجمنیں و جمعیتیں ہزاروں ہیں، مگر حال یہ ہے کہ ایک ہی انجمن کے ارکان باہم برسرپیکار ہو جاتے ہیں اور علانیہ ایک دوسرے کے مقابلے پڑتے ہیں۔ اول اول ان کو اپنی اُس طاقت کا گھمنڈ تھا جو کبھی ان میں پائی جاتی تھی اگر منتشر قوموں۔ پھر دس سال کے اندر ان کو بتا دیا کہ طاقت کس چیز کا نام ہے یہ آپس میں لڑتے رہے اور وہ منظم ہو گئیں انہوں نے خود اپنے سرداروں میں سے ایک ایک کو کھینچ کر زمین پر گرا دیا، او اُنہوں نے ایک سردار کی اطاعت کر کے اسے تمام ملک میں بے تاج کا بادشاہ بنا دیا یہ اپنی قوتوں کو خود اپنی تخریب میں ضائع کرتے رہے اور وہ حکومت سے پیہم مقابلے کر کے اپنا زور بڑھاتے رہے انہوں نے ملک کے تازہ انتخابات میں شخصی اغراض کو سامنے رکھا اور بیسیوں پارٹیاں بن کر اسمبلیوں میں پہنچے۔ اُنہوں نے اجتماعی اغراض کو مقدم رکھ کر تمام ملک میں منضبط جد وجہد کی اور ایک مستحکم جمعیت کی شکل میں حکومت کے ایوانوں پر قبضہ کر لیا۔ ان نتائج کو دیکھ کر ہندوستان کے مسلمانوں پر اب وہی اثر ہو رہا ہے جو ایک باقاعدہ فوج کو دیکھ کر منتشر انبوہ پر ہوا کرتا ہے۔ ایک منظم جماعت کی کامیابی سے وہ مرعوب ہو گئے ہیں۔ وہ دیکھ رہے ہیں کہ حکومت کا اقتدار اب بہت جلدی انگریز کے ہاتھ سے منتقل ہو کر اس نئی جماعت کے ہاتھ میں آنے والا ہے۔ لہٰذا اب وہ سمت قبلہ بدلنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ ان کے سجدوں کا رخ وائسریگل لاج سے ہٹ کر آنند بھون کی طرف پھرنے لگا ہے اور آج نہیں تو کل پھر کر رہے گا۔

یہ ہے مسلمانوں کی موجودہ پوزیشن۔ اب دیکھیے کہ جو انقلاب آ رہا ہے وہ کس نوعیت کا ہے۔

اب تک ہندوستان کی حکومت ایک ایسی قوم کے ہاتھ میں رہی ہے۔ جو اس ملک کی آبادی میں آٹے میں نمک کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے اثرات تو وہ تھے جو اوپر آپ نے دیکھ لیے۔ اب جو جماعت برسر اقتدار آ رہی ہے وہ ملک کی آبادی کا سواد اعظم ہے۔ گذشتہ ڈھائی سو برس میں مسلمانوں نے جو زنانہ خصوصیات اپنے اندر پیدا کی ہیں ان کو پیش نظر رکھ کر اندازہ کیجیے کہ اس قوم کو جدید ہندی قومیت میں جذب ہوتے کتنی دیر لگیگی۔

جدید ہندی قومیت کا لیڈر وہ شخص ہے جو مذہب کا علانیہ مخالف ہے ہر اس قومیت کا دشمن ہے جس کی بنا کسی مذہب پر ہو، اس نے اپنی دہریت کو کبھی نہیں چھپایا، یہ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں کہ وہ کمیونزم پر ایمان رکھتا ہے

اس امر کا بھی وہ خود اعتراف کر چکا ہے کہ میں دل اور دماغ کے اعتبار سے مکمل فرنگی ہوں۔ یہ شخص ہندوستان کی نوجوان نسل کا رہنما ہے اور اس کے اثر سے وہ جماعت نہ صرف غیر مسلم قوموں میں بلکہ خود مسلمانوں کی نوخیز نسلوں میں بھی روز افزوں تعداد میں پیدا ہو رہی ہے جو سیاسی حیثیت سے ہندوستانی وطن پرست، اور اعتقادی حیثیت سے کمیونسٹ اور کلچرل حیثیت سے مکمل فرنگی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس ڈھنگ پر جو قومیت تیار ہو رہی ہے اس سے مغلوب اور متاثر ہو کر ہندوستان کے مسلمان کتنی مدت تک اپنی قومی تہذیب کے باقی ماندہ آثار کو زندہ رکھ سکیں گے؟

مسلمانوں کے انتشار اور بدنظمی کو دیکھ کر اب ان کے مستقل قومی وجود کو تسلیم کرنے سے صاف انکار کیا جا رہا ہے جن لوگوں کی عمریں عوام کی رہنمائی اور اقوام کی نبض شناسی میں گذری ہیں ان سے یہ راز چھپا نہیں رہ سکتا کہ اس قوم کا شیرازۂ قومیت بڑی حد تک بکھر چکا ہے، وہ خصوصیات اس سے فنا ہو رہی ہیں جو کسی جماعت کو ایک قوم بناتی ہیں۔ اب اس کے افراد کسی دوسری قومیت میں جذب ہونے کے لیے کافی حد تک مستعد ہو چکے ہیں۔ یہی چیز ہے جس کی بنا پر اب یہ سکیم بنائی جا رہی ہے کہ مسلمانوں کی جماعتوں کو خطاب کرنے کے بجائے ان کے افراد کو خطاب کیا جائے اور ان کو جدا جدا اکائیوں کی شکل میں رفتہ رفتہ اپنی طرف کھینچا جائے۔ یہ کس چیز کی تمہید ہے؟ جس شخص کو اللہ نے تھوڑی سی بصیرت بھی عطا کی ہے وہ اس کو سمجھنے میں غلطی نہیں کر سکتا۔ مسلمان انگریزی اقتدار کے زمانہ میں جس کیرکٹر کا اظہار کرتے رہے ہیں اس کو سامنے رکھ کر غور کیجیے، کیا اسمبلیوں کی نشستوں اور آیندہ معاشی اور سیاسی فائدوں کا لالچ ان کے افراد کو فوج در فوج اس طرف کھینچ کر نہ لے جائیگا جس طرف انھیں کھینچا جا رہا ہے؟ اور کیا یہ وہی سب کچھ نہ کریں گے جو انگریزی اقتدار کی غلامی میں کر چکے ہیں؟

مسلمانوں کی اصلی کمزوری کو تاڑ لیا گیا ہے۔ آپ نے سنا کہ انھیں کھینچنے کے لیے جو صدا بلند کی جا رہی ہے وہ کونسی صدا ہے؟ وہی پیٹ اور روٹی کی ذلیل صدا جو ہمیشہ خود غرض اور شکم پرست حیوانات کو اپنی طرف کھینچتی رہی ہے۔ ان سے کہا جا رہا ہے کہ تہذیب کیا بلا ہے؟ اور تمہاری تہذیب کی خصوصیت بجز پاجامے اور ڈاڑھی کے اور ہے ہی کیا؟ ہمیں آخر کونسی اہمیت ہے؟ اصلی سوال تو پیٹ کا سوال ہے! اسی سوال کو حل کرنے کے لیے ہم اٹھے ہیں۔ اب اگر دہریت اور

کمیونزم کا زہر بھی تھوڑا تھوڑا ہر نوالے کے ساتھ پیٹ میں اتر جائے تو اس سے گھبرانے کی کوئی وجہ نہیں۔ جو قوم اس سے پہلے انہی نوالوں کے ساتھ الحاد و فرنگیت کا زہر بھی اتار چکی ہے اس کے حلق میں ویسی ہی چند اور چنیاں یوں کھسنے لگیں۔

---

اس نوعیت کا ہے وہ انقلاب جو آ رہا ہے۔ مسلمانوں میں سے جو لوگ اس انقلاب کے دامن سے وابستہ ہیں ان کی زندگیاں ہمارے سامنے ہیں۔ ان کی صورتیں، ان کے لباس، ان کی بات چیت، ان کی چال ڈھال، ان کے آداب و اطوار، ان کے خیالات سب کچھ ہمارے سامنے اس مسلمان کا نمونہ پیش کر رہے ہیں جو اس آنے والے انقلاب میں پیدا ہوگا۔ ہم ابھی سے دیکھ رہے ہیں کہ اس دور میں مسجدوں کے بجائے مباشے اور رسوں کے بجائے شرابیاں ہمارے ہاں پیدا ہوں گی، گنہ مار زنگ کی جگہ نمستے لے گا، ہیٹ کی جگہ گاندھی کیپ ہو گی۔ پیشانیوں پر تلک اور بندیاں نظر آئیں گی۔ دماغ اور دل اور جسم سب اپنا رنگ بدلیں گے، اور کونواقردہ خاسئین کی لعنت جو ان پر ستر سال پہلے نازل ہوئی تھی، ایک دوسری شکل میں ظاہر ہو کر رہے گی۔

---

دنیا میں انقلاب کی رفتار بہت تیز ہے اور روز بروز تیز ہوتی چلی جا رہی ہے، پہلے جو تغیرات صدیوں میں ہوتے تھے۔ اب وہ برسوں میں ہو رہے ہیں۔ پہلے انقلاب بیل گاڑیوں اور ٹٹوؤں پر سفر کیا کرتا تھا، اب ریل اور تار اور اخبار اور ریڈیو پر حرکت کر رہا ہے۔ آج وہ حالت ہے کہ

یک لحظہ غافل بودہ ام صد سالہ راہم دور شد

اگر ہندوستان کے باہر کوئی اچانک واقعہ نہ بھی پیش آیا تب بھی اس متوقع انقلاب کے رونما ہونے میں کچھ زیادہ دیر نہ لگے گی۔ اور اگر کوئی عالمگیر جنگ چھڑ گئی جو قضائے مبرم کی طرح دنیا کے سر پر لٹک رہی ہے تو غالباً فیصلہ کا وقت اور بھی زیادہ قریب آ جائے گا۔

---

# مقالات

# نکاح کتابیہ

از جناب مولوی صدر الدین صاحب مدرسۃ الاصلاح سرائے میر ضلع اعظم گڈھ

یورپ کی تہذیب مشرقی ممالک پر جس حیرت انگیز سرعت کے ساتھ قابض ہوتی چلی جارہی ہے ارباب نظر سے پوشیدہ نہیں اور اس کے جو مضر اثرات پیدا ہوئے ہیں وہ بھی محتاج بیان نہیں۔ مشرق کا مذہب اور اس کا تمدن دونوں مساوی طور پر اس سے متاثر ہو رہے ہیں۔ اسلام اور مسلمانوں کی انتہائی بدقسمتی کا یہ کس قدر افسوسناک مظاہرہ ہے کہ ہم دوسروں کو اپنے رنگ میں رنگنے کے بجائے خود اپنے ہی کو غیروں کے رنگ میں رنگتے جارہے ہیں۔ اور اسلامی تہذیب و معاشرت کو چھوڑ کر نہ صرف اپنی سیزدہ صد سالہ روایات کو محو کر رہے ہیں بلکہ اس کے ساتھ ہی ایمان اور اسلام کی بھی بیخ کنی کرنا چاہتے ہیں۔ ایک طرف ہماری تہذیب اور ہمارا مذہب ہے جس کے بند میں شگاف پر شگاف پڑتے جارہے ہیں۔ دوسری طرف تہذیب مغربی کا سیلاب ہے جو ان شگافوں میں سے روز افزوں تیزی کے ساتھ بڑھتا چلا آرہا ہے۔ مغربی فتنہ اپنی گوناگوں زینتوں کے ساتھ مختلف شکلوں میں نمودار ہوتا ہے اور دیکھتے دیکھتے اسلامی ماحول میں ایک وبا کی طرح پھیل جاتا ہے۔

ان فتنوں میں سب سے زیادہ خطرناک اور روح اسلام کو پیام ہلاکت دینے والا فتنہ "مغربی حسن" ہے۔ ہر سال ہزاروں کی تعداد میں مغربی ساحرات اپنی ایمان سوز ادائیں لے کر ساحل ہند پر اترتی ہیں اور ملک کا "تعلیم یافتہ" اور "مہذب طبقہ" اپنی متاع جان و ایمان لے کر ان کے سامنے حاضر ہو جاتا ہے۔ یہ بے پناہ طوفان یورپین فتوحات کا ایک زبردست حربہ ہے جس کی طرف اگر ہمارے ارباب حل وعقد اور ملی رہنماؤں نے پوری توجہ نہ کی تو انھیں یقین رکھنا چاہیے کہ اسلامی تاریخ کے آئندہ صفحات میں وہ ایک افسوسناک باب کا اضافہ کریں گے۔

مگر افسوس تو یہ ہے کہ اس فتنہ کو مذہبی عدالتوں سے مدافعت کے بجائے سند جواز حاصل ہو رہی ہے آج کی صحبت میں چاہتا ہوں کہ کتاب وسنت کی روشنی میں وقت کے اس اہم ترین مسئلہ کی حقیقت دریافت کروں اور ساتھ ہی سیاسی اور تمدنی نقطۂ نظر سے بھی ازدواج بالاجانب کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالوں۔

قرآن میں ایک جگہ ہے:۔

| | |
|---|---|
| وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ (مائدہ : ۱) | اور تمہارے لئے جائز ہے ان لوگوں کی عفیفہ عورتوں سے نکاح جن کو تم سے قبل کتاب دی گئی۔ |

اس آیت کے عموم اور ظاہری الفاظ سے متبادر ہوتا ہے کہ جو لوگ بھی اہل کتاب ہیں ان کی عورتوں سے نکاح جائز ہے خواہ ان کا عقیدہ اصل تعلیمات سے کتنا ہی بعید کیوں نہ ہو کیونکہ یہاں صرف اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ کی قید ہے اور قرآن نے بلا امتیاز اعمال وعقائد ہر فرقہ اور ہر عقیدے کے یہود ونصاری کو لفظ اہل کتاب سے تعبیر کیا ہے۔

یہی ایک آیت ہے جس کی آڑ میں اتنا عظیم الشان فتنہ اسلامی ممالک میں بویا جا رہا ہے اور لوگوں کے لئے اباحت کے دروازے کھل گئے ہیں لیکن میرے خیال میں آیۂ مذکورہ کا یہ مفہوم کسی طرح سے بھی روح اسلام کی ہم نوائی اور دیگر نصوص کی مطابقت نہیں کرتا، اور نہ اسلامی تعلیمات کا فلسفہ کبھی اس کی اجازت دے سکتا ہے بیشک اس آیت میں نکاح کتابیات کی حلت کا صریحی بیان موجود ہے لیکن اگر دوسرے نصوص سے آنکھیں بند نہ کر لی جائیں تو ماننا پڑتا ہے کہ یہ حکم اہل کتاب کے ایک خاص فرقہ سے متعلق تھا جو اپنی گوناگون خوبیوں کی وجہ سے دیگر فرق ضالہ سے ممتاز تھا۔

اس اجمال کی تفصیل معلوم کرنے کے لیے اہل کتاب کے مختلف فرقوں کے متعلق خدا کے آخری مقدس اور مہیمن کلام پر ایک تفصیلی نظر کرنے کی ضرورت ہے اور ساتھ ہی نکاح کے جواز وعدم جواز کے متعلق جو آیات ہیں ان کا تتبع بھی لابدی ہے۔

کافرہ اور مشرکہ کی حرمت کے بارے میں تو شاید کسی بحث و تمحیص کی مطلق ضرورت نہیں قرآن کا کھلا ہوا ارشاد موجود ہے۔

لَا تَنكِحُوا الْمُشْرِكَاتِ حَتَّىٰ يُؤْمِنَّ — مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو جب تک کہ وہ ایمان نہ لائیں

اسی طرح کافرہ کے بارے میں بھی حکم ناطق موجود ہے۔

لَا تُمْسِكُوا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ — کافر عورتوں کی عصمتوں پر قبضہ نہ رکھو۔

ظاہر ہے کہ ان آیات میں ازدواج کی علت سوائے شرک اور کفر کے دوسری کوئی شے نہیں ہو سکتی چنانچہ پہلی آیت میں تو حَتَّىٰ يُؤْمِنَّ کہکر اس حقیقت کی طرف انگلی اٹھا کر اشارہ بھی کر دیا، اب دیکھنا یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ کے متعلق قرآن کیا کہتا ہے۔

یہ تو مسلم ہے کہ ان کے مختلف فرقے تھے جن کے عقائد ایک دوسرے سے جدا گانہ تھے چنانچہ قرآن نے ایک ہی مقام پر نصاریٰ کے دو فرقوں کا ذکر کرکے ان کی اساسی گمراہیوں کو بیان کیا ہے اور کھلے لفظوں میں ان کو کافر کہا ہے پہلے فرقہ کی تکفیر جس کا نام مفسرین کرام نے فرقہ یعقوبیہ تبلایا ہے قرآن نے ان الفاظ میں کی ہے۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ (مائدہ) — ان لوگوں نے کفر کیا جنہوں نے کہا کہ اللہ تو وہی مسیح ابن مریم ہے۔

اسی طرح دوسرے فرقہ کے متعلق آپ کا ارشاد ہے۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ ثَالِثُ ثَلَاثَةٍ — وہ کافر ہیں جنہوں نے کہا کہ خدا تین میں کا تیسرا ہے

اب اسی آیت حق نما میں یہودیت کا بھی عکس دیکھ لیجیے کہ ان کا ایمان کفر اور شرک کے داغ دھبوں سے کہاں تک محفوظ تھا۔

لُعِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن بَنِي إِسْرَائِيلَ عَلَىٰ لِسَانِ دَاوُودَ وَعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ (مائدہ) — ان اسرائیلیوں پر جنہوں نے کفر کیا تھا داؤد اور عیسیٰ (علیہما السلام) کی زبان سے لعنت کی گئی۔

کہ جگہ جگہ قرآن ایسی ہی لعنت کا ذکر کرتا ہے۔

وَلٰکِنْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِکُفْرِهِمْ۔ لیکن خدا نے ان کے کفر کی وجہ سے ان پر لعنت کی۔

علاوہ بریں توراۃ میں سے بعض فرقوں کے شرک میں مبتلا ہو جانے کی تفصیلات مذکور ہیں۔

لیکن قرآن کی ان آیات سے جن میں ان مغضوب اور گمراہ اقوام کی روحانی نجاستوں اور اعتقادی بدعتوں کا بیان کیا گیا ہے یہ لازم نہیں آتا کہ ساری کی ساری امت اسی نحوست اور ملعونیت کا شکار تھی۔ بےشک اکثریت تو انھیں کور بختوں کی تھی جن کی متاع ایمان کفر اور شرک کے ہاتھوں لٹ چکی تھی مگر ایک گروہ ایسے حق پسندوں کا موجود تھا جن کے قلب میں ایمان کا حقیقی نور جگمگا رہا تھا اور جن کے اعتقادات اور اعمال و افکار کے سانچے میں نہیں ڈھالے گئے تھے، چنانچہ قرآن نے جہاں بھی ان کی بداعمالیوں اور بداعتقادیوں پر نکتہ چینی کی ہے وہاں پوری قوم کو سامنے نہیں رکھا ہے۔ آیۂ لَمْ يَكُنِ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ میں من تبعیضیہ استعمال کر کے اہل کتاب کو دو گروہوں میں بانٹ دیا ہے یعنی اہل کفر اور اہل حق۔ ایک دوسرے مقام پر عام اہل کتاب اور اس فرقۂ خاص کو بالکل صریح الفاظ میں الگ الگ کر دیا ہے۔

وَإِنَّ فَرِيقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُونَ الْحَقَّ۔ اور بےشک ان میں سے ایک گروہ حق کو چھپاتا ہے۔

اسی طرح جگہ جگہ اس حق آگاہ اور حق پرست جماعت کو عام بدبختوں اور گمراہوں سے الگ کر کے قرآن اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے چنانچہ یہود کی شرارتوں اور ان کی علمی و عملی خیانتوں کا جہاں ذکر کیا ہے وہاں بھی فرمایا ہے۔

وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلَىٰ خَائِنَةٍ مِّنْهُمْ إِلَّا قَلِيلًا مِّنْهُمْ۔ اور تو برابر ان کی خیانتوں پر مطلع ہوتا رہے گا انھیں چند لوگوں کے سوا۔

یعنی ان میں چند ارباب حق بھی موجود ہیں جو تحریف اور خیانت جیسے قبیح جرموں سے مجتنب اور اپنی

سعادتوں کی بنا پر ابتک حق کا سر رشتہ تھامے ہوئے ہیں ایک جگہ سورہ اعراف میں تو صاف صاف کہدیا گیا ہے

وَمِنْ قَوْمِ مُوْسیٰٓ اُمَّةٌ یَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ یَعْدِلُوْنَ۔ — اور موسیٰ کی قوم میں ایک گروہ ہے جو حق کی راہ بتلاتا اور اسی کے مطابق فیصلہ کرتا ہے۔

اور بالآخر یہی لوگ قبول حق کی فطری صلاحیتوں کی بنا پر رفتہ رفتہ حلقہ بگوش اسلام ہوتے گئے جیسا خود قرآن ہی کا ارشاد ہے۔

لٰکِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَالْمُؤْمِنُوْنَ یُؤْمِنُوْنَ۔ الاٰیۃ — لیکن ان (یہود) میں سے جو راسخین فی العلم ہیں وہ اور مومنین ایمان رکھتے ہیں۔ الخ۔

یہود کی طرح نصاریٰ میں بھی ایک گروہ موجود تھا جو آسمانی بادشاہت کے ظل عاطفت سے ابھی باہر نہیں نکلا تھا نہ دوسرے فرقوں کی طرح اپنی متاع ایمان برباد کرچکا تھا اور نہ اس کے اعتقادات کا چشمہ صافی شرک کی کدورتوں اور نجاستوں سے ملوث ہوا تھا، قرآن ان کی میانہ روی کو یوں سراہتا ہے۔

وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِیْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ وَكَثِیْرٌ مِّنْهُمْ سَآءَ مَا یَعْمَلُوْنَ۔ — اگر وہ قائم رکھتے توریت اور انجیل کو اور اس چیز کو جو ان کے رب کی جانب سے ان پر نازل ہوئی تو کھاتے اوپر سے اور اپنے پیروں تلے سے (ہاں) ان میں کچھ لوک راہ راست پر قائم رہے ہیں لیکن اکثر بدعمل ہیں

بلکہ یہودیوں کی نسبت نصاریٰ میں حق پرستی کا مادہ زیادہ پایا جاتا تھا۔ اور ان کے اندر ایک اچھا خاصہ گروہ اسی راہ اعتقاد کا راہرو تھا جس کی سلامت روی اور حق نوازی کا اعتراف قرآن ان مدحیہ الفاظ میں کرتا ہے۔

وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى — جب وہ رسول پر اترے ہوئے کلام کو سنتے ہیں تو تم دیکھتے

اَعۡیُنَهُمۡ تَفِیۡضُ مِنَ الدَّمۡعِ مِمَّا عَرَفُوۡا مِنَ الۡحَقِّ مائدہ۔ ہو ان کی آنکھوں کو کہ بے اختیار اُبلی پڑتی ہیں بوجہ حق کے پہچاننے کے۔

چنانچہ نجاشی شہنشاہ حبش اس حق پرست گروہ کے باطنی کمالات کا ٹھیک آئینہ ہے، اس کے روبرو حضرت جعفر نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق جب قرآنی نقطہ نظر پیش کر کے کہا کہ حضرت عیسیٰ خدا کے ایک برگزیدہ پیغمبر اور کلمۃ اللہ ہیں تو اس کی زبان سے بے ساختہ نکلا کہ خدا کی قسم عیسیٰ اس کے علاوہ ایک تنکے کے برابر بھی زیادہ نہیں۔

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہوا کہ اہل کتاب خواہ وہ عیسائی ہوں یا یہودی علمی اور عملی دونوں حیثیتوں سے مختلف جماعتوں اور فرقوں میں بٹے ہوئے تھے اکثر تو اپنے نور فطرت کے فیضان کو کھو کر اپنی اہوا و امانی کو دین اور شریعت بنا بیٹھے تھے لیکن کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو خدا کی دی ہوئی شریعت کے سچے پیرو تھے۔

اب شروع سے آخر تک کی تفصیل کو نگاہ کے سامنے رکھیے۔ وَالۡمُحۡصَنٰتُ مِنَ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ کی اباحت۔ لَا تُمۡسِکُوۡا بِعِصَمِ الۡکَوَافِرِ وَلَا تَنۡکِحُوا الۡمُشۡرِکٰتِ حَتّٰی یُؤۡمِنَّ۔ کی تحریم نیز اہل کتاب کے ان مختلف الاعتقاد فرقوں کے متعلق قرآنی احکام اور تصریحات سب کو ملا کر غور کرنے سے عقدہ خود بخود حل ہو جاتا ہے کہ جب کفر اور شرک حرمت نکاح کی علت ٹھیری تو آیت جواز کے حکم میں عام اہل کتاب جن کے کفر اور شرک کا اعلان قرآن بار بار کرتا ہے نہیں داخل ہو سکتے بلکہ وہی لوگ اس کے تحت میں آئیں گے جو خدا کی بتائی ہوئی راہ پر ابھی تک قائم ہیں اور جو لوگ کہ بتدریج اسلامی بادۂ حقیقت کے ذوق آشناؤں میں داخل ہوتے گئے، جلد یا بدیر۔

چنانچہ فقہائے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بعض مخفی اشارات اور اقوال سے بھی اسی حقیقت کی طرف رہنمائی ہوتی ہے امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے اس آیت کے عموم سے نصاریٰ بنی تغلب کو مستثنیٰ کرتے ہوئے فرمایا لیسوا علی النصرانیة ولم یاخذوا منها

شرب الخمر یعنی نصرانیت کو ان سے کوئی تعلق نہیں انہوں نے مے نوشی کے سوا اس سے کچھ بھی نہ لیا۔ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر تفقہ فی الدین کی نعمت کتنوں کو ملی ہے صاف فرماتے ہیں۔

خدا نے جب مشرک کے نکاح سے منع فرمایا ہے تو الوہیت عیسیٰ کے اعتقاد سے بڑھ کر شرک عظیم اور کیا ہو سکتا ہے۔ پھر نکاح دائمی محبت اور تعلق کا ایک زبردست عہد و پیمان ہوتا ہے اور قرآن معاندین حق اور اعدائے اسلام سے اس قسم کے گہرے تعلقات کی شدت سے مخالفت کرتا ہے۔

لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّیْ وَعَدُوَّکُمْ اَوْلِیَآءَ اپنے اور میرے دشمنوں (کفار و مشرکین) کو دوست نہ بناؤ

ازدواجی تعلقات سے بڑھ کر دوستی اور کیا ہو سکتی ہے۔ اسلامی تعلیمات کا فلسفہ تو بالکل صاف ہے کہ جن راستوں میں ایمان کے دامن کو کفر کی خارزاریں الجھنے کا ذرا بھی اندیشہ ہوتا ہے ان پر قدم رکھنے کی ہرگز اجازت نہیں دیتا اور نفسیات کے واقف کاروں سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ ازدواجی محبت کس حد تک انقلابی اثر رکھتی ہے۔

ان تصریحات کی روشنی میں آج کل کے اہل کتاب کے متعلق غور فرمائیے کہ ان میں سے کتنے ہیں جو توریت و انجیل کے سچے پیرو ہیں، کون فرقہ ہے جس کو منهم امة مقتصدة کا خطاب دیا جا سکتا ہے، کتنے یهدون بالحق وبه یعدلون کے معیار پر پورے اتر سکتے ہیں اور کتنوں کی آنکھیں معرفت حق کے ساتھ ابل پڑتی ہیں؟ اہل کتاب کے اندر یہ اوصاف اگر آج عنقا ہیں اور یقیناً ہیں تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ آج نکاح کتابیات کی اباحت کا دروازہ کھولا جائے۔

**سیاسی نقطۂ نظر** یہ تو دین و مذہب کا فیصلہ تھا جسے بغیر قیاس و حجت کی آمیزش کے پیش کر دیا گیا لیکن سیاسی اور قومی مصالح بھی کسی طرح اس موالاۃ اور اختلاط کی اجازت نہیں دیتے بالخصوص اس زمانہ کے لیے جبکہ ایمان کی بنیادیں دن بدن کھوکھلی ہوتی جا رہی ہیں اور مسلمانوں کا دین و اسلام حوادث روزگار کے بے پناہ سیلاب میں حباب کی طرح بہتا چلا جا رہا ہے اور مغرب کی مطلق العنان تہذیب کی ہر صدا پر

أَعْيُنَهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوا مِنَ الْحَقِّ الاٰیۃ۔ سو ان کی آنکھوں کو کہ بے اختیار ابلی پڑتی ہیں بوجہ حق کے پہچاننے کے۔

چنانچہ نجاشی شہنشاہ حبش اس حق پرست گروہ کے باطنی کمالات کا ٹھیک آئینہ ہے۔ اس کے پوچھنے پر حضرت جعفر نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق جب قرآنی نقطہ نظر پیش کرکے کہا کہ حضرت عیسیٰ خدا کے ایک برگزیدہ پیغمبر اور کلمۃ اللہ ہیں تو اس کی زبان سے بے ساختہ نکلا کہ خدا کی قسم عیسیٰ اس کے علاوہ ایک تنکے کے برابر بھی زیادہ نہیں۔

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہوا کہ اہل کتاب خواہ وہ عیسائی ہوں یا یہودی علمی اور عملی دونوں حیثیتوں سے مختلف جماعتوں اور فرقوں میں بٹے ہوئے تھے اکثر تو اپنے نور فطرت کے فیضان کو کھو کر اپنی اہوا اور امانی کو دین اور شریعت بنا بیٹھے تھے لیکن کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو خدا کی دی ہوئی شریعت کے سچے پیرو تھے۔

اب شروع سے آخر تک کی تفصیل کو نگاہ کے سامنے رکھیے۔ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ کی اباحت۔ لَا تُمْسِكُوْا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ اور لَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ۔ کی تحریم نیز اہل کتاب کے ان مختلف الاعتقاد فرقوں کے متعلق قرآنی احکام اور تصریحات سب کو ملا کر غور کرنے سے عقدہ خود بخود حل ہو جاتا ہے کہ جب کفر اور شرک حرمت نکاح کی علت ٹھیری تو آیت جواز کے حکم میں عام اہل کتاب جن کے کفر اور شرک کا اعلان قرآن بار بار کرتا ہے نہیں داخل ہو سکتے بلکہ وہی لوگ اس کے تحت میں آئیں گے جو خدا کی بتائی ہوئی راہ پر ابھی تک قائم ہیں اور جو لوگ کہ بتدریج اسلامی بادۂ حقیقت کے ذوق آشناؤں میں داخل ہوتے گئے۔ جلد یا بدیر۔

چنانچہ فقہائے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بعض مخفی اشارات اور اقوال سے بھی اسی حقیقت کی طرف رہنمائی ہوتی ہے امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے اس آیت کے عموم سے نصاریٰ بنی تغلب کو مستثنیٰ کرتے ہوئے فرمایا یسوا علی النصرانیۃ ولم یاخذوا منھا

الا شرب الخمر یعنی نصرانیت کو ان سے کوئی تعلق نہیں انہوں نے مے نوشی کے سوا اس سے کچھ بھی نہ لیا۔

سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر تفقہ فی الدین کی نعمت کتنوں کو ملی ہے صاف فرماتے ہیں۔ خدا نے جب مشرک کے نکاح سے منع فرمایا ہے تو الوہیت عیسیٰ کے اعتقاد سے بڑھ کر شرک عظیم اور کیا ہو سکتا ہے

پھر نکاح دائمی محبت اور تعلق کا ایک زبردست عہد و پیمان ہوتا ہے اور قرآن معاندین حق اور اعدائے اسلام سے اس قسم کے گہرے تعلقات کی شدت سے مخالفت کرتا ہے۔

لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ لیث اور میرے دشمنوں (کفار و مشرکین) کو دوست نہ بناؤ

ازدواجی تعلقات سے بڑھ کر دوستی اور کیا ہو سکتی ہے۔ اسلامی تعلیمات کا فلسفہ تو بالکل صاف ہے کہ جن راستوں میں ایمان کے دامن کو کفر کی خارزار میں الجھنے کا ذرا بھی اندیشہ ہوتا ہے اُن پر قدم رکھنے کی ہرگز اجازت نہیں دیتا اور نفسیات کے واقف کاروں سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ ازدواجی محبت کس حد تک انقلابی اثر رکھتی ہے۔

ان تصریحات کی روشنی میں آج کل کے اہل کتاب کے متعلق غور فرمائیے کہ ان میں سے کتنے ہیں جو توریت وانجیل کے سچے پیرو ہیں، کون فرقہ ہے جس کو منھم امۃ مقتصدۃ کا خطاب دیا جا سکتا ہے، کتنے یھدون بالحق وبہ یعدلون کے معیار پر پورے اتر سکتے ہیں اور کتنوں کی آنکھیں معرفت حق کے ساتھ ابل پڑتی ہیں؟ اہل کتاب کے اندر یہ اوصاف اگر آج عنقا ہیں اور یقیناً ہیں تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ آج نکاح کتابیات کی اباحت کا دروازہ کھولا جائے۔

سیاسی نقطۂ نظر | یہ تو دین و مذہب کا فیصلہ تھا جسے بغیر قیاس و حجت کی آمیزش کے پیش کر دیا گیا لیکن سیاسی اور قومی مصالح بھی کسی طرح اس موالاۃ اور اختلاط کی اجازت نہیں دیتے بالخصوص اس زمانہ کے لیے جبکہ ایمان کی بنیاد دن بدن کھوکھلی ہوتی جا رہی ہیں اور مسلمانوں کا دین و اسلام حوادث روزگار کے بے پناہ سیلاب میں حباب کی طرح بہتا چلا جا رہا ہے اور مغرب کی مطلق العنان تہذیب کی ہر صدا پر

اسلام کی روح قربان کی جا رہی ہے۔ اس خطرناک فتنہ کو دیکھ کر دردمند مسلمانوں کو کبھی بھی خاموش نہ بیٹھنا چاہیئے یہ نرے الفاظ نہیں بلکہ حقیقت اور تجربہ ہے کہ اس کے ذریعے ہزارہا نوجوان اور ان کے واسطے سے ان کے خاندان اسلام سے اور اسلامی تعلیمات سے دور ہوتے جا رہے ہیں اور یہ غارتگران دین و ایمان نہایت خاموشی کے ساتھ اپنی سحر آفرینیوں کے ذریعے مشن کو کامیاب بنا رہی ہیں۔

علاوہ ازیں اس کے ذریعہ مغربی تہذیب کی کیسی زبردست تبلیغ اسلامی ماحول میں ہو رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس نئے تمدن کو ہر جگہ تفوق اور ہمہ گیری حاصل ہوتی جا رہی ہے اس لیے جو نسلیں ان عورتوں سے پیدا ہوں گی وہ بجائے اسلامی تہذیب اور اصول معاشرت کو اختیار کر سکتی ہیں نتیجہ یہ ہوگا کہ مغربی تہذیب اور معاشرت کا ایک ایک عنصر اسلامی تعلیمات کی جگہ لے لے گا اور ملی مفاد اور دینی غیرت تو درکنار قومی احساسات بھی سرد پڑتے جائیں گے۔

پھر مسلمانوں کی اقتصادی کمزوریاں تو کبھی بھی اس کی اجازت نہیں دے سکتیں کہ وہ یورپین تہذیب کا بار اٹھا سکیں، ہمارا تجربہ خود شاہد ہے کہ کتنے اسی شوق کے پیچھے ننگ و ناموس کھو بیٹھے اور کتنے معاشی حیثیت سے تباہ و برباد ہو گئے۔

ملی و اجتماعی نقطۂ نظر اب آخر میں میں علمی اور اجتماعی حیثیت سے اس مسئلہ کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں اقوام عالم کے باہمی اختلاط اور نوجوانان عالم کی آزادروی نے اس کو ایک مستقل اور بین الاقوامی مسئلہ بنا دیا ہے۔ جس نے دنیا کے سنجیدہ اور متفکر دماغوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ بالآخر ارباب غور و فکر اپنے مصالح قومی کے لیے مضرت رسان دیکھ کر اس کے خلاف سخت احتجاج کر رہے ہیں ان کے خیالات کسی قدر حذف و اضافہ کے ساتھ اپنے الفاظ میں پیش کرتا ہوں۔

آج کل ہمارے ترقی پسند اور آزاد خیال نوجوان یورپین عورت کو اس بنا پر ترجیح دے رہے ہیں کہ وہ رفتار زمانہ کا ساتھ دینے کے لیے اپنے اندر کافی صلاحیت رکھتی ہے۔ تہذیب و تمدن کے میدان میں مردوں کے

دوش بدوش چل رہی ہے اسے مشرقی عورتوں کی طرح تعلیم و تادیب کی ضرورت نہیں۔ دوسرے ازدواج کا یہ آزاد طریقہ زندگی کو خوشگوار بنانے کے لیے نہایت موزوں اور ضروری ہے زن و شوہر ایک دوسرے کے عادات و خصائل اور اصول زندگی سے کافی حد تک پہلے ہی واقف ہو چکتے ہیں لہذا ان کے ذاتی تجربات کے بعد جو سلسلۂ ازدواج قائم کیا جائیگا وہ حقیقی محبت اور پرخلوص تعلقات پر مبنی ہوگا۔ اور اختلاف طبائع کے زندگی تلخ کر دینے والے مصائب سے محفوظ رہ کر زندگی میں وہ اطمینان حاصل ہوگا جو اس تعلق کی جان ہے۔ ان وجوہ کی بنا پر سمجھا جاتا ہے کہ یورپین عورتوں سے شادیاں کرنا گویا حقیقی مسرت اور سعادت حاصل کرنا ہے۔

مگر کیا یہ سعادت اور مسرت واقعی سعادت اور مسرت ہے یا محض خوش فہمی کا ایک کرشمہ؟

یہ تو ایک مسلم حقیقت ہے کہ نکاح ایک دائمی تعلق اور زن و شوہر کی باہمی معاشرت کا نام ہے جس کے اندر ایک زبردست اور اہم ترین مصلحت حیات پوشیدہ ہے یعنی اولاد اور نسل کی مصلحت کبریٰ جو زوجین کو مجبور کرتی ہے کہ دونوں اپنے مزاجی تباین اور طبیعت کے مختلف رجحانات اور غیر متوازن احساسات کو ایک سطح پر لا کھڑا کریں۔ گویا وہ اصولاً ایک دوسرے کی طرف جھکنے اور ایک دوسرے کے اطوار و خصائل کو بنظر استحسان دیکھنے یا کم از کم مداہنت سے کام لینے پر مجبور ہوتے ہیں اور یہی چیز سعادت اور کامرانی حیات کی بنیاد ہے لیکن یہ جھکاؤ یا باہمی رعایت محض مصالح اولاد ہی کا کرشمہ نہیں ہے بلکہ ماحول اور سوسائٹی کا اخلاقی قانون یا طرز معاشرت ہر شخص کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اس کے احکام کے دائرہ سے باہر قدم نہ رکھے انسان اس کے مطابق چل کر طبیعت میں سکون اور اس کی خلاف ورزی کر کے ایک اضطراب، خوف اور حیا محسوس کرتا ہے لیکن جب ایک شخص اپنے ماحول اور اپنی سوسائٹی سے باہر ہوتا ہے اس وقت اس کا دماغ سوسائٹی کے اخلاقی قیود سے بالکل آزاد ہو جاتا ہے پھر وہ اپنے اغراض و مقاصد کے دوران تحصیل میں ان تمام زنجیروں کو بڑی آسانی کے ساتھ توڑ دیتا ہے جن میں وہ اپنے وطن اور سوسائٹی کے اندر جکڑا ہوا تھا کیوں کہ اس اجنبی ماحول کے اندر اپنی خاص سوسائٹی کے آئین معاشرت کا اسے تصور تک نہیں آتا جس کی مخالفت

کرنے میں اس کو خوف یا حیا دامن گیر ہو۔

یہ نفسیات کا نہایت واضح مسئلہ ہے۔ عورتیں بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں۔ جب ایک اجنبی عورت اپنے ملک کو چھوڑ کر اپنے شوہر کے ہمراہ نئے ملک اور نئی معاشرت میں آتی ہے تو وہاں کی ہر چیز، ہر شکل، ہر طرز، ہر روش اس کی نظروں میں انوکھی اور اوپری معلوم ہوتی ہے جس سے اس کی طبیعت کو اخلاقی یا طبعی کوئی انس نہیں ہوتا۔ دوسری طرف چونکہ وہ اپنے پرانے ماحول اور اس کی تقییدات سے بھی آزاد ہو چکی ہوتی ہے، اس لیے خود اپنی قومی تہذیب کے خلاف عمل کرنے میں بھی اسے کسی بات کا خطرہ نہیں ہوتا اور وہ اپنے ہم قوموں سے جدا ہو کر انتہا درجہ کی بے قید اور بے حیا ہو جاتی ہے ازدواجی زندگی کے تمدنی فرائض کو بھی انجام دینے کی صلاحیت اس میں بہت ہی کم رہ جاتی ہے تا آنکہ اس کے دل پر شوہر کی محبت کا سکہ بیٹھا ہوا ہے لیکن یہ محبت یقیناً سعادت حیات کی پوری طرح کفیل نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اس کے لیے اس نسلی اور وطنی وفاق کا ہونا ضروری ہے جس کا فلسفہ ابھی ہم اختصار کے ساتھ بیان کر چکے ہیں۔ لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ دو اجنبی زوجین کے درمیان ازدواجی تعلق اتنا پختہ، مضبوط اور حیات آفریں نہیں ہو سکتا جتنا دو ہم قوم زن و شوہر کے اندر ہوتا ہے۔

**ایسے تعلق کا اولاد پر اثر** تناسلی لحاظ سے انسان اور حیوان میں کوئی فرق نہیں اور جس طرح ایک جنس کے حیوان کے اندر جوہر منویہ کے لحاظ سے بہت سی نوعیں ہوتی ہیں بعینہٖ یہی حال انسان کا ہے ساتھ ہی یہ بات بھی تجربوں کے حدود میں آ چکی ہے کہ ہر نوع دوسری نوع سے بہت سی خصوصیات میں جدا ہوتی ہے مثال کے طور پر ایک تیز گھوڑے کو لیجیے جو چھکڑے کھینچتا ہے، اس کے مقابل میں ایک ایسی گھوڑی لیجیے، جو سواری کے لیے مخصوص ہے دونوں کے خصائص بالکل جدا جدا ہوں گے اب اگر ان دونوں سے بچہ پیدا ہو گا تو اس کے اندر ایک خاص نقص اور بودا پن پایا جائے گا کیونکہ اس کا مزاج ماں اور باپ دونوں کے متضاد مزاجوں سے متاثر ہو گا نتیجہ یہ ہو گا کہ نہ تو اس کے اندر چھکڑا کھینچنے والے گھوڑوں جیسی قوت اور مضبوطی ہو گی نہ سواری کے گھوڑوں

جیسی پھرتی اور تیز رفتاری بلکہ دونوں کے بین بین وہ ایک نکمی اور کمزور مخلوق بن کر رہ جائے گا۔

بعینہ یہی حال مختلف نسل و قوم کے انسانوں کا ہے ہر ایک نوع کے مختلف خواص اور مقتضیات ہیں، مصری اقوام کا مزاج الگ ہوتا ہے چینی کا الگ۔ جب ایک مصری مرد مصری عورت سے رابطۂ زوجیت جوڑتا ہے تو اس کی نسل صحیح معنوں میں مصری خصوصیات کی وارث ہوتی ہے لیکن جب اولاد مخلوط ہوگی تو اس کے اخلاق و عادات کے اندر وہ جوہر صافی نہیں پایا جا سکتا بلکہ اس کے احساسات اور جذبات کی اگر تحلیل کی جائے تو ان کے اندر یقیناً متباین حقائق اور غیر متوافق رجحانات کی آمیزش نظر آئے گی۔

ممکن ہے کہ یہ تباین اور اختلاف فطانت اور ذکاوت کا جوہر اولاد میں پیدا کردے، لیکن وہ اخلاق کی روح کو تو یقیناً بری طرح صدمہ پہنچائے گا۔ اس کی مزید تشریح کی اگر ضرورت ہو تو مثال کے طور پر دو جانوروں کو لیجیے فرض کیجیے کہ ایک کتا ہے جو کسی یورش کے موقع پر راہ فرار اختیار کرتا اور اپنی پناہ ڈھونڈھنے لگتا ہے اس کے مقابل میں ایک مادۂ سگ ہے جو ایسے مواقع پر بھاگنے کے بجائے جان پر کھیل کر چڑھ دوڑتی ہے اب اگر ان دونوں کے اختلاط سے کوئی بچہ پیدا ہو تو یقیناً وہ دو متضاد مؤثروں کا نتیجہ یعنی بزدلی اور چالاکی کا جامع ہوگا، در در اصل یہ جبن یعنی ضعف خلق ہی اس کی ذکاوت کا سبب ہوگا کیونکہ وہ ہر ایسے مقام پر متردد اور متفکر ہوگا۔ اس کے باپ کی خصوصیات کا جو اثر اس کے مزاج پر ہے وہ فرار ہونے کی رغبت دلائے گا لیکن جہاں تک ماں کے مزاج کو دخل ہے وہ ثبات و استقلال کا داعی ہوگا۔ پس وہ اس وقت عجیب کشمکش یا تذبذب میں متلا اور متضاد کیفیات سے دو چار ہوگا۔ یہ تردد اور تذبذب جس کے اندر بزدلی اور کمزوری اخلاق کا پہلو بالکل نمایاں ہے، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ آگے بڑھنے کے بجائے موقع کی نزاکت اور اس کے نشیب و فراز پر غور کرنا شروع کرے گا۔ اور یہ غور و فکر کا مادہ یا ذکاوت طبع اسی پدری خون کا اثر ہے جو اس کے خمیر میں موجود ہے۔

ان تمثیلات کو سامنے رکھیے حقیقت بالکل بے نقاب ہو کر نگاہوں کے سامنے آجائے گی کہ اس قسم کی

شادیاں قوم ونسل کے اندر اخلاقی امراض کے مہلک جراثیم کس طرح پیدا کرتی ہیں۔ ضرور ہے کہ ایسی نسل جرائم پیشہ ہو کیونکہ وہ کسی بات پر ہرگز نہیں جم سکتی، وہ ہر کام کی ابتدا شک اور تردد سے کرے گی، عزم وثبات سے جو نجاح وکامرانی کی اولین شرط ہے اس کا دل بالکل خالی ہوگا۔ تردد اور تذبذب اس کی فطرت ثانیہ بن جائے گی۔ اس کے اندر باپ کے قومی خصائص اور مزایا موجود ہوں گے نہ ماں کے، گو ان دونوں سے زیادہ ذکی اور فطین ہو لیکن کامرانی حیات انفرادی یا جماعتی ہر حیثیت سے ذکاوت طبع سے زیادہ اخلاق کی محتاج ہے بلکہ صرف اخلاق ہی کی اسے احتیاج ہے۔

تاریخی حقائق سے بڑھ کر قابل اعتبار اور اطمینان آفرین کوئی شہادت اور کوئی حجت نہیں، روم اور یونان کی تاریخ ہمارے سامنے ہے۔ اس کا فلسفۂ زوال اگر دریافت کیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ ازدواج بالاجانب کی نامحمود رسم نے ان کی آبائی شجاعتوں کا کس طرح ستیاناس کر کے ذلت وپستی کے غار میں انھیں دھکیل دیا۔ اور اگر ان تمام سے بھی بڑھ کر واضح ثبوت اور قابل عبرت مثال دیکھنا ہو تو پرتگال کی حالت کو دیکھیے جو اس وقت تمام دول غربیہ میں سب سے زیادہ کمزور اور زوال پذیر ملک ہے اور اس کی وجہ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ یہاں قوم کی رگوں میں کوئی خالص خون موجود نہیں ہے بلکہ زنگیوں اور فرنگیوں کا باہمی اختلاط قومی اور ملکی زندگی پیدا ہی نہیں ہونے دیتا۔ خلاصۂ بحث یہ ہے کہ اس طرح کے ازدواجی تعلقات دونوں حیثیتوں سے ملک وملت کے لیے مضر اور اس کی تباہی کا سامان ہیں ایک طرف تو ان کو اصلی زندگی اور اس کی مسرتیں نہیں میسر آسکتیں دوسری طرف نسل نہایت ضعیف الاخلاق اور ناکارہ پیدا ہوتی ہے۔

آخری گذارش انکاح کتابیہ اس ساری بحث کا موضوع ہے، کتابیات یعنی یہود ونصاریٰ کی عورتیں ہم سے مذہب، وطن نسل، تہذیب، اخلاق وعادات ہر ایک چیز میں جدا ہیں لیکن اسلامی جماعت سے ان کا اختلاط جس حیرت انگیز اور خطرناک طریقہ سے روبہ ترقی ہے، اہل نظر سے پوشیدہ نہیں، ملک وقوم کے لیے یہ

اختلاط جائز ہے یا ناجائز؟ مفید ہے یا مضر؟ اوپر کی سطروں میں انہیں امور سے بحث کی گئی ہے اور اجمالاً اس حقیقت کو الفاظ کے پردہ پر دکھلانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اسلام کی شریعت، اس کی موجودہ سیاسی حالت اور اسکی اقتصادی کمزوری اس امر کی ہرگز اجازت نہیں دیتی کہ اہل اسلام اس خطرناک فتنہ سے غفلت برتیں، آخر میں علمی اور اجتماعی نقطۂ نظر سے بھی اس کے مضر اثرات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

کیا مشرق، بالخصوص ہندی مسلمانوں کو وقت کے اس نہایت اہم سیاسی اور مذہبی فتنہ کا سدباب نہیں کرنا چاہیے؟ اور کیا ضرورت نہیں ہے کہ سمجھ بوجھ رکھنے والے اور قومی درد رکھنے والے قوم کی اس مہلک آفت پر فوری توجہ کریں۔

---

# استدراک

خوش قسمتی سے یہ مضمون ایسے وقت آیا جب کہ خود ہم کو اس مسئلہ پر اظہار رائے کی ضرورت درپیش تھی۔ ہمارے ایک دوست کا تقاضا تھا کہ "فرنگیات" کی درآمد کا فتنہ بڑھتا جا رہا ہے، اور نکاح کتابیہ کی اجازت کا شرعی مسئلہ اس کے لیے بہانہ بن گیا ہے لہٰذا اس کے متعلق شرعی احکام کی صحیح تشریح ہونی چاہیے انہوں نے اس پر ایک مفصل استفسار بھی لکھ کر بھیجدیا تھا، مگر اب اس کو شائع کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہی، کیونکہ جن امور کی طرف انہوں نے اپنے استفسار میں توجہ دلائی تھی ان سب کو مولوی صدر الدین صاحب نے اپنے مضمون میں بیان کر دیا ہے۔

اس میں کسی شک و شبہہ کی گنجائش نہیں کہ یہ ایک بڑا فتنہ ہے ہندوستان اور مصر و شام وغیرہ ممالک میں تو اس کا اثر صرف اسی حد تک رہا کہ اسلامی نظام، معاشرت میں گھس کر اس نے تہذیب اسلامی کی بیخ کنی شروع کر دی لیکن ٹرکی میں اس کے سیاسی نتائج بھی نہایت خطرناک ثابت ہوئے ہیں، اور اس کی بدولت

ایک عظیم الشان اسلامی سلطنت تباہ ہو چکی ہے۔ اس بنا پر اگر درمند مسلمانوں کو اس کے سدباب کی ضرورت کا احساس ہو تو یہ بالکل جائز ہے لیکن ہمارے نزدیک مصالح کے کسی ایک پہلو پر ضرورت سے زیادہ زور دے کر کسی شرعی مسئلہ میں ترمیم کرنا درست نہیں۔ قرآن مجید جس نے نازل کیا ہے وہ حکیم مطلق ہے اور اس کی نظر تمام مصالح وضروریات پر غایت درجہ توازن وتناسب کے ساتھ پڑتی ہے۔ اس کے احکام کو سمجھنے اور حالات پر ان کو ٹھیک ٹھیک منطبق کرنے کے لیے ضروری ہے کہ حتی الامکان نظر کو زیادہ سے زیادہ وسعت دے کر تمام چھوٹی اور بڑی مصالح کا جائزہ لیا جائے اور ہر ایک کو رعایت کا وہی درجہ دیا جائے جو خود شارع نے دیا ہے۔

قرآن مجید کی جس آیت میں اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح کی اجازت دی گئی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:۔

| | |
|---|---|
| اَلْیَوْمَ اُحِلَّ لَکُمُ الطَّیِّبٰتُ وَطَعَامُ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ حِلٌّ لَّکُمْ وَطَعَامُکُمْ حِلٌّ لَّھُمْ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلِکُمْ اِذَآ اٰتَیْتُمُوْھُنَّ اُجُوْرَھُنَّ مُحْصِنِیْنَ غَیْرَ مُسٰفِحِیْنَ وَلَا مُتَّخِذِیْٓ اَخْدَانٍ (المائدہ: ۱) | آج تمہارے لیے پاک چیزیں حلال کر دی گئی ہیں اور ان لوگوں کا کھانا جن کو کتاب دی گئی ہے تمہارے لیے حلال ہے اور تمہارا کھانا ان کے لیے حلال ہے اور مومن عورتوں میں سے پاک دامن عورتیں اور ان لوگوں کی بھی پاک دامن عورتیں جن کو تم سے پہلے کتاب دی جا چکی ہے (تمہارے لیے حلال ہیں) بشرطیکہ تم ان کو ان کے مہر ادا کر کے قید نکاح میں لاؤ نہ یہ کہ کھلم کھلا بدکاری کرنے والے یا چوری چھپے تعلقات رکھنے والے بنو۔ |

**اختلافات سلف** اس آیت کی تفسیر میں سلف کے درمیان بھی بہت کچھ اختلافات ہوئے ہیں اور بعض اختلافات کا منشا، وہی شبہات ہیں جو لائق مضمون نگار پیش کر رہے ہیں، لیکن جمہور علماء نے

ہر زمانہ میں اس کے حکم کو ظاہر الفاظ اور عموم اطلاق ہی پر باقی رکھا ہے، اس لئے کہ کسی حکم قرآنی کو ظاہر سے پھیرنے اور عام کو خاص کرنے کے لیے دلیل کی ضرورت ہے، اور یہاں سرے سے کوئی دلیل ہے ہی نہیں۔ منزل قرآن سے بڑھ کر صاحب حکمت متقن تو کوئی نہیں ہو سکتا۔ وہ خود اپنے حکم میں کسی استثنا یا تخصیص کی ضرورت سمجھتا تو وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ کے ساتھ کوئی قید ضرور بڑھاتا۔ اس کی شان تشریع سے یہ امر بہت بعید ہے کہ وہ قانونی احکام کے بیان میں اتنی پست زبان بھی استعمال نہ کر سکے جتنی دنیا کے واضعین قانون استعمال کر لیتے ہیں۔ کس طرح ممکن ہے کہ اس کا مقصد تو اہل کتاب کے کسی خاص گروہ کی عورتوں کو حلال کرنا ہو، اور وہ بیان حکم کے لیے الفاظ ایسے منتخب کرے جو تمام اہل کتاب کے لیے عام ہوں اور جن میں استثنا اور تخصیص کے لیے قطعاً کوئی اشارہ تک نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ صحابۂ کرام اور تابعین اور ائمۂ سلف نے عموماً اس آیت کو اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح کی عام اجازت پر محمول کیا ہے، اور صرف محمول ہی نہیں کیا۔ بلکہ اس کے مطابق عمل بھی کیا ہے، چنانچہ حضرت عثمان بن عفان نے نائلہ بنت فرافصۂ کلبیہ سے نکاح کیا جو نصرانیہ تھی، اور طلحہ بن عبید اللہ نے ایک شامی یہودیہ سے نکاح کیا، اور حذیفہ بن الیمان اور کعب بن مالک اور مغیرہ بن شعبہ وغیرہم نے بھی کتابیات سے نکاح کیے یا ان کو نکاح کے پیغام دیے۔

ابن عمر کا مسلک اصحاب میں سے صرف ایک ابن عمر رضی اللہ عنہ ہیں جنھوں نے اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح کو مطلقاً ناجائز قرار دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "اللہ تعالیٰ نے مشرک عورتوں کو حرام کیا ہے۔ وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ (مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو جب تک کہ وہ ایمان نہ لائیں) اور میں نہیں جانتا کہ اس سے بڑھ کر بھی کوئی شرک ہو سکتا ہے کہ عیسیٰ بن مریم یا کسی بندۂ خدا کو خدا قرار دیا جائے"۔ اس بنا پر وہ تمام اُن اہل کتاب کی عورتوں کو حرام قرار دیتے ہیں جن کے اعتقاد میں کفر و شرک پایا جاتا ہو

اور وَالْمُحْصَنٰتُ کی تفسیر وَالْمُسْلِمَاتُ سے کرتے ہیں۔ یعنی ان کی رائے میں آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اہل کتاب میں سے جو عورتیں مسلمان ہو جائیں ان کے ساتھ بھی نکاح کرنا تمہارے لیے حلال ہے۔

لیکن اس مسئلہ میں ابن عمر کی رائے درست نہیں ہے جس کے وجوہ مختصراً ہم بیان کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں خود ہی اہل کتاب کے وہ تمام عقائد بیان فرمائے ہیں جو صریح شرک پر مبنی ہیں، مثلاً ان کا یہ اعتقاد کہ اِنَّ اللّٰہَ ھُوَ الْمَسِیْحُ ابْنُ مَرْیَمَ اور یہ کہ اِنَّ اللّٰہَ ثَالِثُ ثَلٰثَۃٍ اور، قَالَتِ الْیَہُوْدُ عُزَیْرُ ابْنُ اللّٰہِ وَقَالَتِ النَّصٰرَی الْمَسِیْحُ ابْنُ اللّٰہِ۔ یہی نہیں بلکہ اس نے لفظ شرک اور کفر کو بھی ان کی طرف منسوب کیا ہے۔ مگر اس کے باوجود اس نے کسی جگہ بھی ان کے لیے "مُشرک" کا لفظ استعمال نہیں کیا بلکہ تمام قرآن میں جہاں کہیں بھی ان کا ذکر کیا ہے، اہل کتاب یا اس کے ہم معنی دوسرے الفاظ کے ساتھ کیا ہے۔ قرآن کو اول سے لے کر آخر تک دیکھ جائیے تین گروہ بالکل الگ الگ نظر آئیں گے۔ ایک مشرکین وکفار یعنی وہ لوگ جن کے پاس کوئی آسمانی ہدایت محرف یا غیر محرف موجود ہی نہیں ہے۔ دوسرے اہل کتاب جو اپنی تمام اعتقادی و عملی گمراہیوں کے باوجود کسی نبی اور کسی آسمانی کتاب پر ایمان رکھتے ہیں۔ تیسرے مومنین جن سے مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیرو ہیں عام اس سے کہ وہ اسلام میں پیدا ہوئے ہوں یا اہل کتاب کے گروہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سے اسلام میں آئے ہوں یا مشرکین وکفار کے گروہ سے نکل کر مسلمان ہو گئے ہوں۔ قرآن ان تینوں گروہوں کے درمیان واضح امتیاز برتتا ہے اور کہیں ان کو خلط ملط نہیں کرتا کہ مطلقاً اہل کتاب بول کر مشرک مراد لے، یا مطلقاً مشرک بول کر اہل کتاب مراد لے، یا الذین اوتوا الکتاب بول کر مسلمان مراد لے۔ پس جب اللہ تعالیٰ نے ایک جگہ وَلَا تَنْکِحُوا الْمُشْرِکَاتِ فرمایا اور دوسری جگہ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ، تو لامحالہ یہ ماننا پڑے گا کہ پہلی آیت میں المشرکات سے اہل کتاب کی عورتیں مراد نہیں ہیں بلکہ بت پرستوں اور دوسری غیر کتابی قوموں کی عورتیں مراد ہیں

اگر یہ معنی نہ لیے جائیں تو قرآن کی دو آیتوں میں صریح تعارض لازم آتا ہے جس کو یہ کہکر دفع نہیں کیا جا سکتا کہ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ سے مراد وہ عورتیں ہیں جو یہودیت و نصرانیت چھوڑ کر مسلمان ہو گئی تھیں، یا ان کتابی فرقوں کی عورتیں ہیں جو شرک و کفر سے پاک تھے۔ اس لیے کہ

اول تو اللہ تعالیٰ نے والمحصنٰت من الذین اوتوا الکتاب سے پہلے والمحصنٰت من المومنٰت فرمایا ہے اور مومنات سے صرف وہی عورتیں مراد نہیں ہیں جو اسلام میں پیدا ہوئی ہوں بلکہ وہ سب عورتیں بھی مراد ہیں جو اپنے سابق مذہب چھوڑ کر اسلام میں آئی ہوں۔ پس جب مومنات سے نکاح کو عموماً حلال کر دیا تھا اور ان میں وہ عورتیں بھی آپ سے آپ داخل تھیں جو اسلام سے پہلے نصرانی یا یہودی تھیں تو پھر خاص طور پر والمسلمات من الذین اوتوا الکتاب کے ذکر کی کونسی ضرورت تھی۔ اس طرح تو یہ فقرہ بالکل بے معنی اور عبث ہو جاتا ہے

ثانیاً اس آیت سے پہلے یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ ان لوگوں کا کھانا تمہارے لیے حلال ہے جن کو کتاب دی گئی ہے کیا وہاں بھی اہل کتاب سے مراد وہ مسلمان ہیں جو نصرانیت اور یہودیت چھوڑ کر مسلمان ہوئے ہوں؟ اگر نہیں تو کس بنا پر جائز ہوا کہ ایک ہی آیت کے ایک ٹکڑے میں لفظ اہل کتاب کے ایک معنی لیے جائیں اور دوسرے ٹکڑے میں دوسرے معنی؟

ثالثاً نصاریٰ اور یہود کا کونسا فرقہ ایسا ہے جو شرک یا کفر سے پاک ہو؟ خدا کے بارے میں صحیح اعتقاد ان میں باقی ہی کہاں تھا اور کہاں سے آسکتا تھا؟ موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کی اصل تعلیمات سے تو وہ محروم ہو چکے تھے پھر صحت اعتقاد کا راستہ ہی کیسے تھا کہ ان میں کوئی فرقہ راہ راست پر ہوتا؟ پس یہ خیال قطعاً صحیح نہیں کہ والمحصنٰت من الذین اوتوا الکتاب سے یہود یا نصاریٰ کا کوئی صحیح العقیدہ گروہ مراد ہے۔ قرآن کی جن آیات سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ ان میں کچھ صحیح العقیدہ فرقے بھی تھے، ان کا اشارہ در اصل ایسے اہل کتاب کی طرف ہے جو نیک دل اور سلیم الفطرت ہونے کی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی

ہدایت کو قبول کر چکے تھے یا عنقریب قبول کرنے والے تھے۔

رابعاً اور بالفرض اگر یہ یہود و نصاریٰ کا کوئی خاص گروہ ایسا ہو بھی تو اللہ تعالیٰ نے الذین اوتوا الکتاب من قبلکم کے ساتھ کوئی قید ایسی نہیں بڑھائی ہے جس سے یہ مستفاد ہوتا ہو کہ یہ حکم صرف اسی گروہ کے ساتھ مخصوص ہے اور دوسرے اہل کتاب اس سے خارج ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ہم خواہ مخواہ اہل کتاب کے اعتقادات کی چھان بین میں لگ جائیں اور اپنے قیاس سے ان کی بعض عورتوں کو حلال اور بعض کو حرام قرار دیں؟

جن لوگوں نے حضرت ابن عمر کے قول کی تائید کی ہے وہ آیت وَلَا تُمْسِكُوا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ سے بھی استدلال کرتے ہیں لیکن یہ آیت خاص طور پر ان مردوں اور عورتوں کے حق میں نازل ہوئی ہے جو دارالحرب سے دارالاسلام کی طرف مسلمان ہو کر ہجرت کر آئے ہوں اور جن کے شوہر یا بیویاں دارالحرب میں بحالت کفر رہ گئی ہوں۔ آیت کا منشا یہ ہے کہ ان کے دارالاسلام میں آتے ہی جاہلیت کا نکاح ٹوٹ جاتا ہے اور مہاجر مرد و عورت دونوں نکاح کے لیے آزاد ہو جاتے ہیں۔ یہ معنی تو شان نزول کے لحاظ سے متحقق ہوتے ہیں لیکن اگر کوئی شخص نفس الفاظ ہی پر حصر کرے تو ہم کہیں گے کہ ایک جگہ لَا تُمْسِكُوا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ فرما کے ایک عام حکم بیان کیا گیا تھا۔ پھر دوسری جگہ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوتُوا الْكِتٰبَ کہہ کر یہ بتا دیا گیا کہ کفار میں سے ایک خاص جماعت یعنی اہل کتاب اس لاتمسکوا کی ممانعت عام سے مستثنیٰ ہے۔ اگر آپ یہ نہیں مانتے کہ پہلے حکم عام کو دوسرا حکم خاص کر رہا ہے تو آپ کو ماننا پڑے گا کہ اللہ تعالیٰ متضاد باتیں کرتا ہے ایک جگہ ایک چیز کی اجازت دیتا ہے اور دوسری جگہ اسی کی ممانعت کر دیتا ہے۔ معاذ اللہ۔

**ابن عباس کا مسلک** | ابن عمر کے بعد دوسرے صحابی جنہوں نے نکاح کتابیات کی اجازت کو محدود کرنے کی کوشش کی ہے، ابن عباس ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ حکم صرف ذمی عورتوں کے ساتھ مخصوص ہے۔ نصاریٰ در

اقتباسات

یہود میں جو لوگ سلطنت اسلامی کی رعایا ہوں صرف انہی کی عورتوں سے نکاح کیا جا سکتا ہے۔ خواہ ان کے ... کیسا ہی فساد ہو۔ رہے اہل حرب (یعنی وہ لوگ جو حدود دار الاسلام سے باہر رہتے ہوں) تو ان کی عورتوں سے نکاح جائز نہیں۔ دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کے اس گروہ سے جنگ کا حکم دیا ہے: قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ وَلَا يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ (التوبۃ) نیز یہ بھی فرمایا ہے کہ جو لوگ خدا اور رسول کے دشمن ہوں ان سے محبت رکھنا اہل ایمان کا کام نہیں ہے: لَا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ (المجادلۃ) دوسری طرف اللہ تعالیٰ نے ازدواجی تعلق کی بنیاد جس چیز پر رکھی ہے وہ مودّت اور رحمت کے سوا اور ... خَلَقَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً (الروم) پس جب نکاح کا تعلق محبت و اخلاص کا مقتضی ہے۔ اور حربی مشرکین و اہل کتاب سے محبت رکھنا حرام، اور جنگ کرنا مامور بہ ہے، تو لازم آیا کہ ان کی عورتوں سے نکاح کرنا جائز نہ ہو۔ یہ ابن عباس کا استدلال ہے مگر ابن عمر کی طرح ان کی رائے کو بھی جمہور صحابہ و تابعین و ائمہ مجتہدین نے تسلیم نہیں کیا اگرچہ حربیہ سے نکاح کو بالاتفاق سب مکروہ قرار دیتے ہیں، لیکن اس کی حرمت کا کوئی بھی قائل نہ ہوا کیونکہ والمحصنٰت من الذین اوتوا الکتاب کی اجازت حربی اور غیر حربی سب کو شامل ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ نے کوئی قید نہیں رکھی ہے۔ پس جہاں تک قانونی جواز کا تعلق ہے اس کو ٹھیک اسی عموم پر باقی رکھنا چاہیے جو آیت قرآنی میں پایا جاتا ہے۔ رہا قومی مصالح یا شخصی حالات کے لحاظ سے نکاح کا مناسب نہ ہونا اور اس سے پرہیز کرنا، تو یہ بالکل ایک دوسری چیز ہے۔ ہم جائز کو ناجائز نہیں کر سکتے البتہ یہ حق ہم کو حاصل ہے کہ جو فعل جائز کسی خاص حالت میں یا کسی خاص وجہ سے ہمارے لیے مناسب نہ ہو اس سے ہم پرہیز کریں، کیونکہ جواز کے معنی امر اور لزوم کے نہیں ہیں۔

**جمہور کا مسلک اور ان کے اختلافات** ابن عباس اور ابن عمر رضی اللہ عنہما کی رائے کو رد کر دینے کے بعد جو لوگ آیت زیر بحث کے حکم کو عام قرار دیتے ہیں، ان کے درمیان تمام تر اختلاف صرف دو لفظوں کی تفسیر میں ہے، ایک اَلْمُحْصَنَات دوسرے الذین اوتوا الکتاب۔ محصنہ کے معنی ایک گروہ کے نزدیک "پاک دامن عورت" کے ہیں۔ اور دوسرا گروہ کہتا ہے کہ محصنہ وہ عورت ہے جو آزاد ہو، لونڈی نہ ہو۔ پہلے گروہ کے نزدیک اہل کتاب کی صرف ان عورتوں سے نکاح جائز ہے جو عفیفہ ہوں۔ بدکار اور آبرو باختہ اور بے حیا عورتیں اس حکم سے خارج ہیں۔ دوسرے گروہ کی رائے میں کتابیہ لونڈی سے نکاح جائز نہیں خواہ وہ عفیفہ ہی کیوں نہ ہو، اور آزاد کتابیہ سے جائز ہے خواہ وہ بدکار ہی کیوں نہ ہو۔ اہل کتاب کے متعلق اختلاف اس امر میں ہے کہ کون کون سے گروہ ان میں شامل ہیں۔ امام شافعی کہتے ہیں کہ اہل کتاب [illegible] صرف وہ یہودی اور نصرانی ہیں جو بنی اسرائیل سے ہوں۔ رہیں دوسری قومیں جنہوں نے یہودیت یا نصرانیت قبول کرلی ہے تو وہ اہل کتاب نہیں ہیں کیونکہ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ صرف بنی اسرائیل کی طرف بھیجے گئے تھے۔ دوسری قومیں ان کی دعوت کی مخاطب ہی نہ تھیں۔ حنفیہ اور جمہور فقہاء کہتے ہیں کہ ہر وہ قوم جو کسی نبی کو مانتی ہو اور کسی کتاب الٰہی پر ایمان رکھتی ہو، اہل کتاب میں شمار کی جائے گی۔ اس میں یہود و نصاریٰ کی بھی کوئی قید نہیں۔ اگر کوئی گروہ صحف ابراہیم کا ماننے والا یا زبور داؤد پر ایمان رکھنے والا ہوتا تو وہ بھی کتابی گروہ ہوتا۔ سلف میں ایک قلیل جماعت اس طرف بھی گئی ہے کہ جن قوموں کے پاس کوئی ایسی کتاب ہے جس پر آسمانی ہونے کا شبہ کیا جا سکتا ہے وہ بھی اہل کتاب میں سے ہیں مثلاً مجوسی۔ موجودہ زمانہ کے بعض مجتہدین نے اسی خیال کو وسعت دے کر یہ اجتہاد فرمایا ہے کہ ہندو اور چینی اور بودھ مت والے بھی اہل کتاب ہیں اور ان کی عورتوں سے بھی نکاح جائز ہے، کیونکہ بہرحال ان کے ہاں بھی کوئی نہ کوئی نبی آیا ہوگا۔ اور کوئی نہ کوئی کتاب ان کو دی گئی ہوگی۔

**اصح المسالک** ان تمام اختلافات میں جو مسلک سب سے زیادہ صحیح ہے وہ یہ ہے کہ اہل کتاب سے مراد

صرف یہود و نصاریٰ ہیں۔ عام اس سے کہ وہ اسرائیلی ہوں یا غیر اسرائیلی۔ قرآن مجید میں اہل کتاب لفظ انہی دونوں گروہوں کے لیے آیا ہے اور ایک جگہ تو تصریح کر دی گئی ہے کہ یہی دو گروہ اہل کتاب ہیں وَهٰذَا كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ مُبَارَكٌ فَاتَّبِعُوهُ وَاتَّقُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ۔ أَنْ تَقُولُوا إِنَّمَا أُنْزِلَ الْكِتَابُ عَلَىٰ طَائِفَتَيْنِ مِنْ قَبْلِنَا (الانعام : ۶) ان دو گروہوں کے علاوہ جن دوسری قوموں کے پاس کتابیں بھیجی گئی تھیں انہوں نے چونکہ اپنی کتابوں کو بالکل ضائع کر دیا اور ان کے اعتقاد و عمل میں کوئی چیز بھی تعلیمات نبویہ پر باقی نہیں رہی اس لیے ان پر لفظ اہل کتاب کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجوسیوں کو اہل کتاب قرار نہیں دیا، حالانکہ وہ زردشت کو مانتے ہیں جن پر نبی ہونے کا شبہہ کیا جاتا ہے۔ ہجر کے مجوسیوں سے جب معاملہ پیش آیا تو حضور نے فرمایا کہ سنوا بھم سنة اهل الکتاب (ان کے ساتھ اہل کتاب کا سا معاملہ کرو) یہ نہیں فرمایا کہ وہ اہل کتاب ہیں۔ پھر جو نامۂ مبارک آپ نے مجوس ہجر کو لکھا تھا اس میں صراحت کے ساتھ یہ تحریر فرما دیا تھا کہ۔

فان اسلمتم فلکم مالنا و علیکم ما علینا ومن ابی فعلیه الجزیة غیر اکل ذبائحهم ولا نکاح نساءهم۔

اگر تم اسلام قبول کرو گے تو تمہارے لیے وہی حقوق ہوں گے جو ہمارے ہیں اور تم پر وہی واجبات ہوں گے جو ہم پر ہیں اور جو انکار کریں گے۔ ان پر جزیہ عائد کیا جائے گا۔ مگر ان کا ذبیحہ نہ کھایا جائے گا نہ ان کی عورتوں سے نکاح کیا جائیگا۔

اس تصریح کے بعد یہ شبہہ کرنے کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہتی کہ غیر یہود و نصاریٰ کو بھی اکل ذبائح اور نکاح محصنات کی اغراض کے لیے اہل کتاب میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

رہی اسرائیلیت کی قید، جو امام شافعی نے لگائی ہے تو وہ بھی درست نہیں۔ بلا شبہہ دعوت موسوی و عیسوی کے مخاطب صرف بنی اسرائیل تھے، مگر جن غیر اسرائیلی قوموں نے نصرانیت کو قبول

کیا انہیں بھی تو خدا اور رسول نے اہل کتاب ہی میں شمار کیا ہے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو نامۂ مبارک قیصر روم کے نام لکھا تھا اس میں یہ آیت نقل فرمائی تھی کہ یَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ۔

پھر جن لوگوں نے محصنات کا ترجمہ عفیفہ یا حرہ کیا ہے اور عفت یا حریت کو نکاح کتابیہ کے لیے شرط قرار دیا ہے ان کا مسلک بھی درست نہیں معلوم ہوتا۔ اسمیں شک نہیں کہ احصان کے مفہوم میں عفت اور شرافت دونوں داخل ہیں اور محصنہ سے مراد ایسی ہی عورت ہے جو پاک دامن بھی ہو اور شریف و معزز بھی لیکن شارع کا مقصود ان دونوں چیزوں کو نکاح کے لیے شرط قرار دینا نہیں ہے بلکہ محض فضیلت و اولویت کا اظہار مقصود ہے اور شارع دراصل یہ بتانا چاہتا ہے کہ تم نکاح کرنے کو تو ہر مومن اور کتابی عورت سے کر سکتے ہو مگر اولیٰ اور افضل یہ ہے کہ وہ عورت محصنہ یعنی شریف اور پاک دامن ہو۔ قرآنی احکام میں اس قسم کی قیود بکثرت لگائی گئی ہیں جو ثبوت حکم کے لیے شرط کی حیثیت نہیں رکھتیں بلکہ کسی فعل جائز کے افضل پہلو یا کسی فعل ناجائز کے ارذل پہلو کو ظاہر کرنے کے لیے بطور ایک قید زائد کے رکھ دی گئی ہیں تاکہ اہل ایمان افضل کے اختیار اور ارذل سے اجتناب کا اہتمام کریں۔ بعینہٖ یہی مسلک ہے جو اس باب میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اختیار فرمایا ہے۔ حضرت حذیفہ بن الیمان نے ایک یہودیہ سے نکاح کیا۔ حضرت عمر کو اطلاع پہنچی تو آپ نے لکھا کہ اسے چھوڑ دو۔ انہوں نے دریافت کیا کہ یہ حکم کس بنا پر ہے؟ کیا کتابیہ سے نکاح کرنا حرام ہے؟ آپ نے جواب دیا کہ حرام نہیں ہے مگر مجھے خوف ہے کہ کہیں تم لوگ اہل کتاب کی آبرو باختہ عورتوں میں نہ پھنس جاؤ۔

پس تمام مسالک میں جو مسلک ہمارے نزدیک اصح ہے وہ یہ ہے کہ اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح کرنے کے شرعی جواز کو عام قرار دیا جائے خواہ وہ حربیہ ہوں یا ذمیہ، عفیفہ ہوں یا نہ ہوں، لونڈیاں ہوں یا آزاد۔

**مصالح و حِکَم** | یہاں تک تو صرف قانون شریعت کا بیان تھا۔ اب ہم اس کے حکمی پہلو کی طرف توجہ کرتے ہیں۔

**نکاح کے متعلق اسلامی نقطۂ نظر** شریعت اسلامیہ میں نکاح کی حیثیت محض ایک عمرانی معاہدہ ( Social Contract ) ہی کی نہیں ہے، جیسا کہ بعض لوگ آج کل تعبیر کر رہے ہیں، بلکہ اس میں ایک مذہبی تقدس کی شان بھی ہے۔ یہ تقدس ہندوؤں اور عیسائیوں کے نکاح کی طرح ( Sacrament ) کی حد تک تو نہیں پہنچا، مگر عبادت کی حد تک ضرور پہنچ جاتا ہے۔ شارع اس سے نہ صرف تمدنی و عمرانی فوائد حاصل کرنا چاہتا ہے بلکہ دینی و روحانی فوائد بھی چاہتا ہے۔ اس سے اخلاق کی اصلاح مقصود ہے۔ سوسائٹی کی پاکیزگی مقصود ہے۔ ایک خالص اسلامی نظام معاشرت کا بقا و دوام اور نشو و ارتقا مقصود ہے۔ دنیا میں خدا کا نام لینے والی اور کلمۃ اللہ کو بلند کرنے والی نسلیں پیدا کرنا مقصود ہے اور ان مقاصد میں مددگار ہونے ہی کی وجہ سے اس کو عبادات کے قریب جگہ دی گئی ہے بعض فقہائے اسلام نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ بعض حیثیات سے نکاح کو جہاد پر بھی فضیلت ہے کیونکہ نکاح اور جہاد دونوں وجود مسلم اور وجود اسلام کے اسباب ہیں، مگر جو کچھ افرادِ مسلمین کی مناکحت سے حاصل ہوتا ہے وہ اس سے بدرجہا زیادہ ہے جو جہاد سے حاصل ہوتا ہے۔ جہاد میں تو زیادہ تر امکان اس کا ہے کہ کفار قتل ہوں گے یا ذمی بن کر حالت کفر ہی میں رہیں گے بخلاف اس کے مناکحاتِ اہل اسلام کا خاص نتیجہ یہ ہے کہ اس سے مسلمانوں کی ایک نسل کے اخلاق محفوظ ہوں گے اور دوسری نسل متبعین اسلام کی وجود میں آئے گی۔

اس باب میں اسلام کے نقطۂ نظر کو پوری طرح سمجھنے کے لیے ان احادیث پر ایک نگاہ ڈالنی چاہیے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح کے متعلق مروی ہیں۔ ابو یعلیٰ نے اپنی مسند میں نقل کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ عکاف بن وداعۃ الھلالی سے پوچھا کیا تو بیوی رکھتا ہے؟ انہوں نے کہا، نہیں۔ آپ نے پوچھا لونڈی بھی نہیں۔ انہوں نے کہا نہیں۔ آپ نے دریافت فرمایا تو صحیح الجسم اور خوشحال ہے؟ انہوں نے عرض کیا، ہاں۔ آپ نے فرمایا تب تو تو شیطان کے بھائیوں میں سے ہے یا رہبان نصاریٰ [illegible] اگر تو ہماری جماعت میں شامل ہونا چاہتا ہے تو ہم [illegible] ہیں۔ اور ہمارے طریق [illegible]

میں سے ایک نکاح بھی ہے۔ تم میں بدترین لوگ وہ ہیں جو مجرد رہتے ہیں اور تمہارے مرنے والوں میں بدترین وہ ہیں جو مجرد مرتے ہیں۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ تناکحوا تناسلوا تکثروا فانی مکاثر بکم الامم یوم القیمۃ نکاح کرو نسلیں بڑھاؤ اپنی تعداد میں اضافہ کرو کیونکہ میں قیامت کے روز تمام امتوں کے مقابلہ میں تمہاری تعداد زیادہ دیکھنا چاہتا ہوں۔

ایک موقع پر فرمایا اربع من اعطیھن فقد اعطی خیر الدنیا والاخرۃ قلباً شاکراً ولساناً ذاکراً وبدناً علی البلاء صابراً وزوجۃ لا تبغیہ حوباً فی نفسھا ومالہ۔ (رواہ الطبرانی فی الکبیر والاوسط) چار چیزیں ہیں کہ جس کو وہ دی گئیں اسے دنیا اور آخرت کی ساری بھلائی دے دی گئی۔ ایک وہ دل کہ خدا جو کچھ دے اس پر وہ شکر ادا کرے۔ دوسرے وہ زبان جو خدا کا ذکر کرنے والی ہو۔ تیسرے وہ بدن جو مصیبتوں کے مقابلہ میں ٹھیرنے کی قوت رکھتا ہو۔ چوتھے وہ بیوی جو شوہر کے مال اور اپنی عصمت میں کسی خیانت کی طرف مائل نہ ہو۔

ایک اور موقع پر ارشاد ہوا من اراد ان یلقی اللہ طاھراً مطھراً فلیتزوج الحرائر (ابن ماجہ) جو کوئی اللہ سے پاک صاف ملنا چاہتا ہو اسے شریف عورتوں سے شادی کرنا چاہیے۔

ایک دوسری حدیث میں ہے لا تتزوجوا النساء لحسنھن فعسیٰ حسنھن ان یردیھن ولا تتزوجوھن لاموالھن فعسیٰ اموالھن ان تطغیھن ولکن تزوجوھن علی الدین فلامۃ خرقاء سوداء ذات دین افضل (ابن ماجہ) عورتوں سے ان کے حسن کی خاطر شادیاں نہ کرو۔ ممکن ہے کہ ان کا حسن ان کو بگاڑ دے۔ اور تم ان کے مال و دولت کی خاطر بھی شادیاں نہ کرو۔ ہوسکتا ہے کہ ان کے اموال ان کو سرکش بنا دیں۔ تم کو ان میں جو چیز دیکھنی چاہیے وہ دین ہے۔ اگر ایک سیاہ رو اور نادان لونڈی بھی دیندار ہو تو وہ دوسری عورتوں سے افضل ہے۔

اسی قسم کی بہت سی احادیث ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں نکاح کی اہمیت صرف ایک تمدنی ضرورت کو پورا کرنے ہی کے لیے نہیں ہے، بلکہ سب سے بڑا مقصد تحصین نفس اور طہارت اخلاق، اور تہذیب اسلامی کا فروغ، اور خالص مسلمان نسلیں پیدا کرنا ہے اور ان اغراض کے لیے صرف یہی کافی نہیں ہے کہ مسلمان نکاح کریں بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ ان کے نکاح ایسی عورتوں سے ہوں جو مسلمان ہوں، دین دار ہوں، شریف اور باعصمت ہوں، کیونکہ ایک صالح اسلامی سوسائٹی ایسے ہی مردوں اور عورتوں کے ازدواج سے وجود میں آسکتی ہے، اور ایک صالح مسلمان نسل ایسی ہی ماؤں کے پیٹ سے پیدا ہوسکتی ہے۔

مخلوط شادیوں کی مضرت: دینی نقطۂ نظر سے ہٹ کر خالص عمرانی نقطۂ نظر سے بھی دیکھا جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ مخلوط شادیوں (Mixed marriages) سے بڑھ کر کوئی چیز نظام معاشرت اور حیات عائلی کو فاسد کرنے والی نہیں ہوسکتی۔ وہ ایسے زوجین جن کے خیالات میں بعد المشرقین ہو، جنہوں نے بالکل مختلف ماحولوں میں مختلف روایات اور مختلف معاشرتوں کے زیر اثر پرورش پائی ہو، اپنے باہمی اختلافات کے ساتھ نہ خود اپنی زندگی میں سکون و راحت حاصل کرسکتے ہیں، نہ اپنے گھر کو کسی نظام معاشرت کا صالح رکن بنا سکتے ہیں۔ اور نہ کوئی ایسی نسل پیدا کرسکتے ہیں جو کسی نظام تمدن میں ٹھیک ٹھیک نصب ہوسکتی ہو۔ یہ ممکن ہے کہ ان کے درمیان محبت ہو اور آخر تک رہے، مگر ان کی محبت اور رفاقت زیادہ سے زیادہ صرف انہی کی ذات کیلئے لطف ولذت کی موجب ہوسکتی ہے اس سے بڑھ کر اس کا کوئی تمدنی فائدہ نہیں ہے اختلاف مذہب یا اختلاف قومیت تو خیر بڑی چیز ہے حیات عائلی کی کامیابی اور نظام تمدن کی بہتری کے لیے تو ایسی شادیاں بھی مفید نہیں ہوتیں جن کے دونوں فریق ایک ہی سوسائٹی کے دو مختلف طبقات سے تعلق رکھتے ہوں۔ اختلاف کا لازمی نتیجہ فساد ہے، اور صلاح کے لیے ضروری ہے کہ زوجین کے درمیان زیادہ سے زیادہ امور میں اتحاد ہو۔ صرف یہی کافی نہیں ہے کہ ان کا دین ایک ہو، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ ان کا طرز معاشرت ایک ہو، ان کے خیالات اور اصول حیات میں یکسانی ہو، ان کے

معاشی اور معاشرتی مرتبہ میں ہموار ی ہو، اور انہوں نے ایسی خاندانی روایات کے زیر اثر تربیت پائی ہو جو ایک دوسرے سے بہت زیادہ مختلف نہ ہوں۔ یہی چیز ہے جس کو اصطلاح شریعت میں "کفاءت" کہتے ہیں شارع نے مناکحت میں کفو کو جو اہمیت دی ہے وہ اسی لیے ہے کہ زوجین میں زیادہ سے زیادہ مماثلت ہو کیونکہ مماثلت صرف زوجین ہی کے لیے مودت ورحمت کی موجب نہیں ہے بلکہ پوری سوسائٹی کے لیے مفید ہے اور آئندہ نسلوں کی بہتری بھی اسی پر موقوف ہے۔ جن زوجین میں مماثلت نہیں ہوتی ان کی مواصلت محض ایک جسمانی مواصلت ہے جو تمدن وتہذیب کے نقطۂ نظر سے قطعی بانجھ یا قریب قریب بانجھ ہوتی ہے۔

**اختلاف مذہب کے نقصانات** عدم کفاءت کے نقصانات تو صرف اسی قدر ہیں کہ اس سے زوجین میں مودت ورحمت کم اور نتیجہ خیز اشتراک عمل کم تر ہوتا ہے۔ مگر اختلاف مذہب وقومیت کے نقصانات اس سے بدرجہا زیادہ ہیں۔ اس میں سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ ایک غیر مسلم ماں کی آغوش میں جو اولاد تربیت پاکر اٹھیگی وہ دین واخلاق کے اعتبار سے اسلامی سوسائٹی کے کسی کام کی نہ ہوگی۔ اس کے علاوہ یہ بھی خطرہ ہے کہ وہ ایک مسلمان گھر میں غیر اسلامی طریقے رائج کرے گی اور جن جن گھروں سے اس کے روابط ہوں گے وہ سب کم وبیش اس عضو فاسد کے شر سے متأثر ہوں گے۔ پھر خود شوہر بھی اس کے اثرات سے محفوظ نہ رہے گا۔ اگر وہ اس کی محبت میں زیادہ گرفتار رہا تو ممکن ہے کہ اپنے دین وایمان کو بھی ہاتھ سے کھو بیٹھے، اور اگر یہ فساد اس حد تک نہ بھی پہونچا تو اس کا کم سے کم یہ اثر ضرور ہوگا کہ وہ اپنے گھر میں اسلامی اخلاق اور اسلامی تہذیب کے بہت سے ارکان کی بربادی اپنی آنکھوں سے ہوتے دیکھیگا اور اس کو گوارا کرے گا۔ سیاسی حیثیت سے بھی اس قسم کی شادیاں خالی از مضرت نہیں۔ سازش اور جاسوسی اور سلطنت اسلامی کی بیخ کنی کے لیے مسلمان گھر کی کافر ملکہ بہت آسانی کے ساتھ استعمال کیجا سکتی ہے، اور اگر وہ زیادہ ہوشیار ہو تو اپنے شوہر کو بھی ان اغراض کے لیے آلہ کار بنا سکتی ہے۔ یہ سب وہ

مضرتیں ہیں جو پہلے بھی ظاہر ہو چکی ہیں اور آج بھی ظاہر ہو رہی ہیں۔ ہندوستان میں ہمارے نظام معاشرت کو مشرکانہ رسوم اور جاہلانہ عادتوں سے کس نے آلودہ کیا؟ انہی عورتوں نے جو تہذیب شرک پر قائم رہ کر یا برائے نام مسلمان ہو کر مسلمان خاندانوں میں داخل ہوئیں۔ مسلمانوں کی نسلوں کو دین و اخلاق کے اعتبار سے کس نے تباہ کیا؟ انہی ماؤں نے جن کے سینوں سے مسلمانوں کے بچے شرک و جاہلیت کا دودھ پی پی کر بڑے ہوئے۔ اسلامی حکومتوں کو کس چیز نے غارت کیا؟ زیادہ تر ان کافر عورتوں کی محبت نے جو مسلمان امرا کے دلوں پر متصرف ہو گئی تھیں۔ آج اسلامی نظام معاشرت کی بنیادوں کو کونسی چیز کھوکھلا کر رہی ہے؟ ایک بڑی حد تک ان مغربی عورتوں کی حکومت جو ہماری سوسائٹی کے خوشحال اور با اثر طبقوں پر مسلط ہو گئی ہیں۔

**اسلامی قانون ازدواج کی شان اعتدال**

جب حال یہ ہے تو ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ غیر مسلم عورتوں سے نکاح کرنا بالکلیہ ممنوع ہونا چاہیے تھا۔ آخر کیا وجہ ہے کہ شارع نے اس چیز کو جائز رکھا؟ اس کا صحیح جواب معلوم کرنے کے لیے ہم کو اس مسئلہ کے دوسرے پہلو پر نگاہ ڈالنی چاہیے کہ یہی وہ مقام ہے جہاں شارع کا کمال حکمت اور اس کے طریق تشریع کا انتہائی اعتدال و توازن نظر آتا ہے۔

انسان جب کوئی قانون بناتا ہے تو عموماً وہ کسی ایک پہلو کی طرف اس قدر جھک جاتا ہے کہ دوسرے پہلو اس کی رعایت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ کبھی وہ اجتماعی مصالح پر زیادہ زور دیتا ہے اور شخصی مصالح نظر انداز کر دیتا ہے۔ اور کبھی شخصی مصالح کی اتنی رعایت کرتا ہے کہ اجتماعی مصالح باطل ہو جاتے ہیں۔ مگر شارع اسلام کی حکیمانہ شان ایسی ہے کہ وہ ہر مصلحت پر نظر رکھتا ہے اور ہر ایک کی اتنی ہی رعایت کرتا ہے جس کی وہ مستحق ہوتی ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا، اجتماعی مصالح اور ایک بڑی حد تک شخصی مصالح کا اقتضاء یہ تھا کہ مسلمانوں کی شادیاں مسلمان عورتوں ہی سے ہوں اور پھر ان میں بھی مماثلت اور اتحاد کو ملحوظ رکھا جائے، چنانچہ اس کے لیے کفاءت کا ضابطہ مقرر کیا گیا:

تخیروا لنطفکم وانکحوا الاکفاء۔     اپنے نطفوں کے لیے اچھی قرارگاہیں تلاش کرو اور اپنے

روی ذلک من حدیث عائشہ وانس وعن اغفرو کفو والوں میں شادیاں کرو۔

طرق عدیدہ)

اور صاف طور پر بتا دیا گیا کہ کفاءت میں سب سے پہلی اور سب سے اہم چیز دین ہے:۔

| | |
|---|---|
| وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ (التوبۃ) | مومنین اور مومنات ایک دوسرے کے ولی ہیں۔ (اس لیے کہ) وہ نیکی کا حکم دیتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور خدا ورسول کی اطاعت کرتے ہیں۔ |
| يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا قُوْا أَنْفُسَكُمْ وَأَهْلِيْكُمْ نَارًا (التحریم) | اے اہل ایمان اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو آگ سے بچاؤ۔ |
| وَمَنْ لَمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا أَنْ يَنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ مِنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ وَاللّٰهُ أَعْلَمُ بِإِيْمَانِكُمْ بَعْضُكُمْ مِنْ بَعْضٍ (النساء: ۴) | اور تم میں سے جو کوئی پاک دامن مومن عورتوں سے نکاح کرنے کی استطاعت نہ رکھتا ہو، وہ ان مومن لڑکیوں میں سے اپنے لیے جوڑا منتخب کرے جو تمہاری مملوک ہیں۔ اللہ تمہارے ایمان کو خوب جانتا ہے اور تم سب ایک دوسرے کے ہو۔ |
| تزوجوهن على الدين فلامة خرقاء سوداء ذات دين افضل (الحدیث) | تم ان سے دین کی بنا پر شادیاں کرو کیونکہ ایک بیوقوف سیاہ لونڈی بھی جو دین دار ہو دوسری عورتوں سے افضل ہے۔ |

دوسری طرف بعض شخصی مصالح اس کی بھی مقتضی تھیں کہ غیر قوموں میں نکاح کرنے کا دروازہ قطعی طور پر بند نہ کر دیا جاتا۔ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص کسی غیر مسلم عورت کے عشق میں مبتلا ہو جائے اور حصول مقصود کا

دروازہ بالکل بند پاکر حرام کی طرف جھک پڑے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک شخص کسی ایسی جگہ رہتا ہو جہاں مسلمان عورت بہم نہ پہنچ سکتی ہو، اور مجرد رہنے کی وجہ سے اس کے اخلاق بگڑنے اور اس کی خانگی زندگی خراب ہونے کا اندیشہ ہو۔ ایسے مخصوص حالات کے لیے کسی حد تک رخصت کا دروازہ کھول دینا ضروری تھا۔ چنانچہ شارع نے یہ دروازہ کھولا مگر اس فتح باب میں شخصی مصالح کی رعایت کے ساتھ یہ بات ملحوظ رکھی کہ اجتماعی مصالح کو کم سے کم نقصان پہنچے۔

مسلمہ اور غیر مسلم کے نکاح کی حرمت اب سے پہلے تو یہ بات طے کر دی گئی کہ غیر مسلموں کے ساتھ شادی کرنے کی رخصت صرف مردوں کو دی جا سکتی ہے، عورتوں کے لیے یہ دروازہ قطعاً مسدود ہے۔

لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّونَ لَهُنَّ ۔ نہ مسلمان عورتیں کافر مردوں کے لیے حلال ہیں اور نہ کافر مرد مسلمان عورتوں کے لیے حلال۔ (الممتحنہ ۲۰)

یہ اس لیے کہ عورت کی فطرت ایک انفعالی فطرت ہے۔ اس میں ڈھال لینے سے زیادہ ڈھل جانے کی صلاحیت ہوتی ہے، وہ مرد کے اثرات اپنے ماحول کے اثرات کو زیادہ شدت کے ساتھ قبول کرتی ہے۔ اور عائلی زندگی میں شوہر سے عموماً مغلوب ہی ہو کر رہتی ہے۔ ایک غیر مسلم مرد سے اس کی شادی ہونے میں کم از کم ۹۰ فی صدی خطرہ اسی بات کا ہے کہ وہ ہمیشہ کے لیے اسلام اور اس کی تہذیب سے کٹ جائے گی، اور یہ خطرہ تو سو فی صدی ہے کہ اس کے پیٹ سے جو اولاد پیدا ہوگی وہ ملت کفر پر رہے گی۔ پس تمام مصالح و حکم اس بات کے مقتضی تھے کہ مسلمان عورتوں کے لیے غیر مسلموں کی زوجیت قطعی طور پر حرام کر دی جائے۔ اور رخصت کا دروازہ اگر کھولا بھی جائے تو وہ صرف مردوں کے لیے ہو۔

مسلم اور غیر مسلمہ کے نکاح کے قیود پھر مردوں کے لیے بھی یہ رخصت عام نہیں ہے۔ غیر مسلموں کو ازدواجی اغراض کے لیے دو طبقوں پر تقسیم کیا گیا ہے: ایک وہ طبقہ جو اسلام اور اس کی تہذیب سے بُون بعید رکھتا ہے۔ جس کے عقائد اور اصول حیات اور قوانین اخلاق و معاشرت کسی جہت میں بھی مسلمانوں سے نہیں ملتے

دوسرا وہ طبقہ جو تمام غیر مسلموں میں اسلام سے اقرب ہے، نبوت اور وحی کو کسی نہ کسی حد تک مانتا ہے، خدا اور یوم آخر کے اعتقاد میں بھی کسی حد تک اسلام سے قریب ہے' اصول اخلاق اور قوانین معاشرت میں بھی بہت سی ایسی چیزیں ابھی تک اس کے پاس محفوظ ہیں جو منبع نبوت سے نکلی ہوئی ہیں۔ ان دونوں طبقوں میں سے پہلے طبقہ کے ساتھ تو شادی بیاہ کرنا مسلمانوں کے لیے قطعی ممنوع کر دیا گیا۔

| | |
|---|---|
| وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكَاتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ (البقرہ، ۲) | اور مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو جب تک کہ وہ ایمان نہ لائیں۔ ایک مومن لونڈی ایک مشرکہ سے بہتر ہے خواہ وہ تم کو کتنی ہی پسند ہو اور تم اپنی عورتوں کی شادیاں بھی مشرک مردوں سے نہ کرو جب تک کہ وہ ایمان نہ لائیں۔ ایک مومن غلام ایک مشرک سے بہتر ہے خواہ وہ تمہیں کتنا ہی پسند ہو۔ وہ آگ کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ اور خدا اپنے اذن سے جنت اور مغفرت کی طرف بلاتا ہے۔ |

**نکاح کتابیہ کی اجازت** رہا دوسرا طبقہ تو اس کی عورتوں سے شادیاں کرنے کی اجازت دے دی گئی' مگر اس طرف بھی اشارہ کر دیا گیا کہ یہ محض ایک رخصت ہے اور اس لیے عطا کی گئی ہے کہ تم حرامکاری میں مبتلا نہ ہو۔

| | |
|---|---|
| وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ وَلَا مُتَّخِذِيْٓ اَخْدَانٍ (المائدہ : ۱) | اور حلال ہیں تمہارے لیے ان لوگوں کی عورتیں جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی ہے، بشرطیکہ تم ان کے مہر ادا کر کے قید نکاح میں لاؤ اور علانیہ یا چوری چھپے زنا کاری نہ کرو۔ |

**نکاح کتابیہ کی کراہیت** جو لوگ شریعت اسلام کی روح سے اچھی طرح واقف تھے انہوں نے اس اجازت کو ہمیشہ رخصت ہی کے قبیل سے سمجھا اور اس کو پسند نہ کیا کہ مسلمانوں میں کتابیات سے شادی کرنے کا عام رواج ہو۔ شریعت کے سب سے بڑے راز داں اپنے عہد میں حضرت عمرؓ تھے۔ انہوں نے حضرت حذیفہؓ کو جو کچھ لکھا تھا وہ شریعت کی اسپرٹ پر خوب روشنی ڈالتا ہے۔ زمانہ اسلام کے غلبہ کا تھا۔ مسلمان ارض شام میں فاتح اور حکمراں کی حیثیت سے تھے۔ معاملہ ایک ایسے جلیل القدر مسلمان کا تھا جس نے براہ راست شمع نبوت سے نور ایمان کا اکتساب کیا تھا۔ اسلامی اخلاق اور اسلامی تہذیب میں اس سے بڑھ کر اور کون پختہ ہو سکتا تھا۔ مگر باوجود اس کے حضرت عمرؓ نے حضرت حذیفہؓ کو ایک کتابیہ کے ساتھ ازدواجی تعلق رکھنے سے منع کیا۔ پھر یہ نہیں فرمایا کہ کتابیہ سے شادی کرنا حرام ہے۔ بلکہ یہ فرمایا کہ اس سے مسلمان گھروں میں اہل کتاب کی بد اخلاق عورتوں کے گھس آنے کا اندیشہ ہے، لہٰذا اس اجازت سے فائدہ نہ اٹھانا ہی بہتر ہے۔

غور کیجیے کہ جب غلبہ کی حالت میں نکاح کتابیہ کے متعلق اسلام کا یہ طرز عمل ہے تو ایسی حالت میں کیا طرز عمل ہونا چاہیے جبکہ ایک مسلمان کفار سے مغلوب ہو اور ان کی سوسائٹی میں گھرا ہوا ہو۔ اس وقت تو نکاح کتابیہ کی کراہت اور زیادہ بڑھ جانی چاہیے، کیونکہ دارالکفر میں اس کی مضرتیں کئی گنی زیادہ ہو جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ائمہ اسلام نے عموماً نکاح کتابیہ کو مکروہ، اور خصوصاً دارالکفر میں نہایت مکروہ قرار دیا ہے۔ شمس الائمہ سرخسی اپنی کتاب المبسوط میں لکھتے ہیں:۔

| | |
|---|---|
| یجوز للمسلم ان یتزوج کتابیۃ فی دار الحرب | مسلمان کے لیے دارالحرب میں کتابیہ سے شادی کرنا جائز |
| ولکنہ یکرہ لانہ اذا تزوجھا ثمہ | تو ہے مگر مکروہ ہے کیونکہ اگر وہ وہاں شادی کرے گا تو |
| ربما یختار المقام فیھم۔۔ واذا ولدت | ممکن ہے کہ کفار ہی کے ملک میں رہ پڑے ۔۔۔۔۔ اور |
| تخلق الولد باخلاق الکفار و فیہ تعرض | جب کتابیہ کے پیٹ سے اولاد پیدا ہو تو وہ کفار کے اخلاق |
| الفتنۃ فیکرہ لھذا ۔۔۔۔۔۔ و مثل | پر اٹھے۔ اس میں اور بھی فتنے ہیں اس لیے یہ مکروہ ہے |

| | |
|---|---|
| علی رضی اللہ عنہ عن مناکحۃ اھل الحرب من اھل الکتب فکرہ ذالک (ج ۵ ص ۹) | …. حضرت علی رضی اللہ عنہ سے حربی عورتوں کے ساتھ نکاح کے بارہ میں پوچھا گیا تو آپ نے اس کو مکروہ فرمایا |

امام ابن جریر طبری اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں۔

"ذمیہ اور حربیہ دونوں سے نکاح جائز ہے بشرطیکہ نکاح کرنیوالا ایسی جگہ نہ ہو جہاں اس کی اولاد کے کفر پر مجبور ہونے کا خوف ہو۔ (جز وساد س ۔ ص ۶۱)

ہدایہ میں ہے :-

| | |
|---|---|
| ویجوز تزویج الکتابیات والاولیٰ ان لا یفعل ولا یاکل ذبیحتھم الا للضرورۃ وتکرہ الکتابیۃ الحربیۃ اجماعا لانفتاح باب الفتنۃ من امکان التعلق المستدعی للمقام معھا فی دار الحرب وتعریض الولد علی التخلق باخلاق اھل الکفر (کتاب النکاح)۔ | کتابیات سے نکاح کرنا جائز ہے مگر بہتر یہ ہے کہ نہ کیا جائے اور نہ ان کا ذبیحہ کھایا جائے الا یہ کہ ضرورت آپڑے۔ اور حربی کتابیہ سے نکاح کرنا بالاجماع مکروہ ہے۔ کیونکہ اس سے فتنہ کا دروازہ کھلتا ہے، مثلاً یہ کہ عورت سے ایسا گہرا تعلق ہو جائے کہ مسلمان شوہر اسی کے ساتھ کافروں کے ملک میں رہ پڑے۔ اور یہ کہ اس کی اولاد اہل کفر کے اخلاق سے متخلق ہو جائے۔ |

اس بحث سے یہ بات واضح ہوگئی کہ نکاح کتابیہ کو ناجائز اور باطل ٹھیرانا درست نہیں ہے۔ البتہ قانون اسلامی کی اسپرٹ اور ائمۂ اسلام کے اجماع سے اس کا مکروہ ہونا اور خصوصاً دار الکفر میں اور غلبۂ کفار کی حالت میں نہایت درجہ کروہ و مبغوض ہونا ثابت ہے۔ اس کے ساتھ حضرت عمرؓ کے فعل سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ نہ صرف نکاح کتابیہ کے معاملہ میں بلکہ شریعت کی تمام رخصتوں کے معاملہ میں جن سے ناجائز فائدہ اٹھانیکا میلان پایا جاتا ہو مسلمانوں کے اولی الامر کو امتناعی احکام جاری کرنے کا حق ہے اور اس قسم کے امتناعی احکام جائز کو ناجائز اور حلال کو حرام کیے بغیر نافذ کیے جاسکتے ہیں مگر ایسے احکام جاری کرنیوالوں میں اتنا تفقہ ہونا چاہیے کہ وہ قانون شریعت کی شان اعتدال کو ضائع نہ

# شخصیت پرستی

از جناب چوہدری غلام احمد صاحب پرویز

اسلام کا نصب العین یہ تھا کہ وہ انسان اور خدا کے درمیان براہ راست تعلق پیدا کر دے، ایسا تعلق کہ عبد و معبود کے درمیان کوئی دوسرا واسطہ نہ رہے۔ ان کے درمیان کوئی دوسری قوت حائل نہ ہو۔ نبی اکرم تشریف لائے اور اپنی عدیم النظیر تعلیم اور فقید المثال عمل سے بتا دیا کہ اس بلند ترین تخیل اور اس نصب العین کو کس طرح عمل میں لایا جا سکتا ہے چنانچہ حضور کا مشن ان شاندار الفاظ میں بتایا گیا

قُلْ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰى اِلَيَّ اَنَّمَا اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاسْتَقِيْمُوْا اِلَيْهِ وَاسْتَغْفِرُوْهُ ۔ وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِيْنَ ۔

کہو کہ میں تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہوں۔ مجھ پر وحی نازل ہوتی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی ہے پس اسی کی طرف سیدھی راہ اختیار کرو۔ اس سے مغفرت مانگو اور مشرکین کے لیے بڑی ہی خرابی ہے۔

اور اسی کی تفسیر تھی جو پیکر اسلام جناب عمرؓ نے وادی ضجنان میں گذرتے وقت فرمایا اللہ اکبر یہ وہ وادی ہے جس میں ابن خطاب اونٹ چرایا کرتا تھا اور باپ کی سخت گیری برداشت کیا کرتا تھا اور آج اس رب العزت کا اتنا فضل ہے کہ عمر اور اس کے خدا کے درمیان کوئی دوسری طاقت حائل نہیں۔ اس سے مراد محض جسمانی اور روحانی طاقت ہی نہ تھی بلکہ ہر وہ طاقت جو انسان کے قلب و دماغ پر مستولی ہو کر اسکے اور اس کے خدا کے درمیان حاجب و دربان بن جاتی ہے۔

لیکن ہر دقیق نظریہ کی طرح یہ نظریہ تھا بڑا لطیف اور ہر حقیقت عظمیٰ کے مانند یہ حقیقت تھی بڑی غیر محسوس

محسوسات کا خوگر انسان، کہ جس کے سجدہ ہائے جبین نیاز بسیط سے بسیط حقیقت مجردہ کو بھی لباس مجاز میں دیکھنے کے لیے رقصاں وجنباں رہتے ہیں، اس غیر محسوس تعلق سے زیادہ عرصہ تک کیف اندوز نہ ہوسکا اور اس نے وہ تمام پردے ایک ایک کرکے پھر سے گرا لیے جو اس کے اور اس کے خدا کے درمیان حائل تھے اور جنہیں نبی عربی نے ایک ایک کرکے اٹھا دیا تھا۔ قرآن کریم نے بڑی شرح وبسط سے ان تمام مقامات کو ایک ایک کرکے گنا دیا تھا، جہاں سے یہ پردے قلب ودماغ اور سمع وبصر پر گرا کرتے ہیں۔ لہذا جب تک قرآن آنکھوں کے سامنے رہا کسی کی مجال نہ ہوئی کہ ان پردوں کو پھر سامنے لا سکے۔ کہ چراغ کا روشن ہونا ہی اس بات کے لیے کافی ہے کہ اندھیرا وہاں نہ آسکے۔ لیکن جب قرآن مہجور ہوگیا، جب بنی اسرائیل کی طرح اس نور مبین کو پس پشت ڈال دیا گیا۔ تو وہی کچھ ہوا جو ہوتا چلا آتا تھا۔ کہ فطرت کے قوانین اٹل اور اس کا دستور غیر متبدل ہے۔ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا۔ آئیے ان مختلف پردوں۔ اور ان کے حسین وحسیں نقش ونگار کی سیر کریں جو عقیدت وارادت کے رنگوں سے مزین اور اطاعت ومتابعت کے جواہر سے مرصع ہیں۔

---

**رسول پرستی** خدا کے بعد ماننے والوں کے نزدیک ہمیشہ رسول کی ہستی اشرف ترین مخلوق ہوتی ہے۔ لہذا اگر انسانوں میں سے کسی کو خدا کی جگہ دئے جانے کا احتمال ہوسکتا ہے تو سب سے پہلے وہ رسول ہی کی ہستی ہوسکتی ہے۔ امم سابقہ کی روشن مثالیں جو کچھ رہی ہوں ان پر قرآن تفصیلی روشنی ڈالتا ہے۔ وہ فطرت انسانی کے اس کمزور پہلو سے واقف تھا۔ اسے معلوم تھا کہ کس طرح حضرات انبیاء کرام خدا بنائے گئے۔ اس کے بیٹے قرار دیئے گئے۔ الوہیت وابنیت کی مقدس چادر اڑھا کر انہیں کس طرح ما فوق البشر منوایا گیا۔ قرآن کریم اس خطرناک چور دروازہ کو سیسہ پلائی ہوئی دیواروں سے بند کرنا چاہتا تھا۔ آپ کسی سورۃ کو دیکھیے۔ بلفظاً معناً۔ مجملاً تفصیلاً۔ اس غلط عقیدہ کے ہر گوشہ کی تردید اسمیں موجود ہوگی۔ یعنی قرآن کریم میں جس وجہ خدا کو

توحید پر مختلف عنوانات سے زور دیا گیا ہے۔ اسی و. جہ رسولوں کی بشریت بھی متنوع اعتبارات سے بے نقاب کی گئی ہے۔ انھیں بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ کہا گیا۔ (۲ : ۱۸) انہیں خدا کا عبد کہا گیا۔ وہ ہدایت بھی کرتے تھے تو اپنے مالک حقیقی کے حکم سے ہی کرتے تھے۔

وَجَعَلْنَاهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا وَأَوْحَيْنَا إِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرَاتِ وَإِقَامَ الصَّلَاةِ وَإِيتَاءَ الزَّكَاةِ ۖ وَكَانُوا لَنَا عَابِدِينَ۔ (۲۱:۷۳)

اور ہم نے ان کو امام و پیشوا بنایا جو لوگوں کو ہمارے حکم سے ہدایت کرتے تھے اور ہم نے ان کو نیکی کرنے، نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ دینے کی وحی کی۔ اور وہ سب ہماری بندگی کرتے تھے

وہ خود خدا کے دروازے کے بھکاری ہوتے تھے۔

فَقَالَ رَبِّ إِنِّي لِمَا أَنزَلْتَ إِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيرٌ۔ (۲۸:۲۴)

اور (موسیٰ) نے کہا کہ پروردگار! آپ جو کچھ بھی بہتری میرے لیے بھیجیں میں اس کا محتاج ہوں۔

انھیں اپنی ذات تک کے لیے نفع و نقصان کا اختیار نہ ہوتا تھا۔

"تم کہہ دو کہ میں اپنی ذات کے لیے بھی کسی نفع یا نقصان کا اختیار نہیں رکھتا۔ مگر جو اللہ چاہے۔ اگر میں غیب کے امور سے واقف ہوتا تو میں بہت سے منافع حاصل کر لیا کرتا۔ اور کوئی مضرت مجھ پر واقع نہ ہوتی۔ میں تو صرف ایمان والوں کے لیے نذیر و بشیر ہوں۔ ۱۸۸

جو وحی ان پر نازل ہوتی تھی وہ خود اس پر ایمان لاتے تھے وَأُمِرْتُ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْمُسْلِمِينَ وَأَنْ أَتْلُوَ الْقُرْآنَ۔ اور اس کی اتباع کرنے پر اسی طرح مامور تھے جس طرح اور ماننے والے۔ (إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ (۱۰:۱۵) ہر چند اللہ تعالیٰ نے اپنے حفظ امن میں لے کر ان کو ایسا بنایا تھا کہ ان سے معصیت کا سرزد ہونا ممکن ہی نہ تھا۔ لیکن ان کی بشریت و عبودیت کو بختہ ترین طریق پر واضح کرنے کے لیے یہاں تک بھی فرما دیا کہ بفرض محال اگر یہ بھی شرک و معصیت کریں تو ان پر بھی اسی طرح عذاب ہو جس طرح دوسرے انسانوں پر (۱۲ : ۲۶ (۱۵ : ۱۰) نہیں۔ بلکہ ان کو عام لوگوں سے

دگنا عذاب ہو۔

"اگر (بفرض محال) ہم تمہیں ثابت قدم نہ رکھتے تو تم ان کی طرف کچھ نہ کچھ جھک پڑتے اور اس صورت میں ہم تمہیں اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی دگنا عذاب دیتے اور کوئی ہمارے خلاف تمہارا مددگار نہ ہوتا۔ (۱۷ : ۷۴)

کفار اعتراض پر اعتراض کرتے کہ رسُول بھی ہمارے ہی جیسے انسان کیوں ہوں لیکن قرآن بار بار اس بات پر زور دیے جاتا کہ ہاں وہ انسان ہی ہیں اور انہیں انسان ہی ہونا چاہیے تھا۔ وہ عام انسانوں کی طرح کھاتے پیتے تھے اور بازاروں میں چلتے پھرتے تھے۔

"اور کہتے ہیں کہ اس رسول کو کیا ہوا ہے کہ یہ کھانا بھی کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا بھی ہے۔۔۔ (۲۵ : ۷)

جواب ملتا ہے کہ:۔

"ہم نے تم سے پہلے بھی جس قدر رسول بھیجے وہ سب کھانا بھی کھاتے تھے اور بازاروں میں چلتے پھرتے بھی تھے"۔۔۔ (۲۵ : ۲۰)

اور پھر عام انسانوں کی طرح۔ اپنے وقت پر۔ مدت حیات ختم کرکے اس دنیا کو چھوڑ جاتے تھے وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّن قَبْلِكَ الْخُلْدَ ۖ أَفَإِن مِّتَّ فَهُمُ الْخَالِدُونَ (۲۱ : ۳۴) اور ہم نے تم سے پہلے کسی بشر کے لیے ہمیشہ رہنا تجویز نہیں کیا۔ پھر اگر تم انتقال کر جاؤ گے تو کیا یہ ہمیشہ رہیں گے۔

البتہ ان کی علمی بصیرت۔ حقائق و معارف کے اس افق اعلیٰ پر ہوتی ہے جہاں عام انسانوں کی نگاہ نہیں پہنچ سکتی۔ ان کے مزکّی و مقدس نفوس کی روحانیت کائنات کے اس معراج کمال پر ہوتی ہے۔ جہاں عام انسانوں کے شہپر تخیل کے بھی پر جلتے ہیں۔ ان کے قلب و دماغ کی یہ بلندیاں اپنی نظیر آپ ہوتی ہیں۔ اس لیے کہ وہ تمام نوع انسانی کے لیے ایک نمونہ بنا کر بھیجے جاتے ہیں۔ بایں ہمہ وہ ہوتے تھے

انسان ہی ہیں۔ بشریت کے حدود سے خارج نہیں ہوتے۔ خدا کے عبد ہی ہوتے ہیں۔ خود معبود نہیں ہوتے اور جیسا کہ شروع میں کہا گیا ہے آتے اس لیے نہیں کہ انسانوں کو اپنی غلامی اور عبودیت سکھلائیں۔ بلکہ اس لیے کہ اپنی تعلیم و عمل سے انسانوں کو خدا کی ایسی عبودیت اور غلامی سکھائیں کہ جس سے تمام دنیا کی غلامی کے طوق و سلاسل اتر جائیں۔

| | |
|---|---|
| وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَن يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ | کسی انسان کو یہ بات زیبا نہیں کہ خدا اسے کتاب |
| وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ | وحکمت و نبوت عطا فرمائے اور وہ لوگوں سے کہے |
| كُونُوا عِبَادًا لِّي مِن دُونِ اللَّهِ وَلَٰكِن | کہ خدا کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ بلکہ (وہ یہی |
| كُونُوا رَبَّانِيِّينَ بِمَا كُنتُمْ تُعَلِّمُونَ | کہے گا) کہ تم اللہ والے بن جاؤ کہ تم کتاب سکھاتے بھی |
| الْكِتَابَ وَبِمَا كُنتُمْ تَدْرُسُونَ ـ (بقرہ ۳:۲) | ہو اور پڑھتے بھی ہو۔ |

حضور خاتم النبیین ہو کر تشریف لائے۔ اور اس مقصد رسالت کو اس انداز سے پورا کیا کہ آپ کے بعد نہ کسی اور پیغام کی ضرورت باقی رہی اور نہ اس پیغام پر کسی نئے سرے سے عمل کر کے دکھانے والے کی کہ یہ پیغام ازلی بصورت سرمدی۔ قرآن کی دفتین میں محفوظ و مصئون چلا آتا ہے۔ کہ باطل اس کے پاس تک نہیں پھٹک سکتا۔ اور اس پیغام پر عمل، ان نقوش قدم کے ذرّے ذرّے سے آفتاب کی طرح روشن اور زندہ ہے کہ جن نقوش قدم سے صراط مستقیم کے نشان اور ہر سے ادھر تک سیدھے ملتے چلے جاتے ہیں۔ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ۔

لیکن ذرا غور کیجیے کہ مسلمانوں نے اپنے رسول کے ساتھ کیا کیا! کیا وہی نہیں جس سے روکنے کے لیے حضور تشریف لائے تھے۔ یہ احمد بے میم (احد) یہ عرب بلا عین (رب) یہانتک کہ۔

وہی جو مستوی عرش ہے خدا ہو کر اتر پڑا وہ مدینہ میں مصطفےٰ ہو کر

وہ جن کے متعلق خدا کا ارشاد تھا کہ اپنے نفع و نقصان کے بھی مالک نہیں۔ بلکہ خدا کے محتاج ہیں

دگنا عذاب ہو۔

"اگر (بفرض محال) ہم تمہیں ثابت قدم نہ رکھتے تو تم ان کی طرف کچھ نہ کچھ جھک پڑتے اور اس صورت میں ہم تمہیں اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی دگنا عذاب دیتے اور کوئی ہمارے خلاف تمہارا مددگار نہ ہوتا۔ (۱۷: ۷۴)

کفار اعتراض پر اعتراض کرتے کہ رسول بھی ہمارے ہی جیسے انسان کیوں ہوں لیکن قرآن بار بار اس بات پہ زور دیئے جاتا کہ ہاں وہ انسان ہی ہیں اور انہیں انسان ہی ہونا چاہیے تھا۔ وہ عام انسانوں کی طرح کھاتے پیتے تھے اور بازاروں میں چلتے پھرتے تھے۔

"اور کہتے ہیں کہ اس رسول کو کیا ہوا ہے کہ یہ کھانا بھی کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا بھی ہے... (۷: ۲۵)

جواب ملتا ہے کہ:-

"ہم نے تم سے پہلے بھی جس قدر رسول بھیجے وہ سب کھانا بھی کھاتے تھے اور بازاروں میں چلتے پھرتے بھی تھے"... (۲۰: ۲۵)

اور پھر عام انسانوں کی طرح۔ اپنے وقت پر۔ مدت حیات ختم کر کے اس دنیا کو چھوڑ جاتے تھے

وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّن قَبْلِكَ الْخُلْدَ اور ہم نے تم سے پہلے کسی بشر کے لیے ہمیشہ رہنا تجویز نہیں أَفَإِن مِّتَّ فَهُمُ الْخَالِدُونَ (۲۱:۳۴) کیا۔ پھر اگر تم انتقال کر جاؤ گے تو کیا یہ ہمیشہ رہیں گے۔

البتہ ان کی علمی بصیرت۔ حقائق و معارف کے اس افق اعلیٰ پر ہوتی ہے جہاں عام انسانوں کی نگاہ نہیں پہنچ سکتی۔ ان کے تزکی و مقدس نفوس کی روحانیت کائنات کے اس معراج کمال پر ہوتی ہے جہاں عام انسانوں کے شہپر تخیل کے بھی پر جلتے ہیں۔ ان کے قلب و دماغ کی یہ بلندیاں اپنی نظیر آپ ہوتی ہیں۔ اس لیے کہ وہ تمام نوع انسانی کے لیے ایک نمونہ بنا کر بھیجے جاتے ہیں۔ بایں ہمہ وہ ہوتے

انسان ہی ہیں۔ بشریت کے حدود سے خارج نہیں ہوتے۔ خدا کے عبد ہی ہوتے ہیں۔ خود معبود نہیں ہوتے اور جیسا کہ شروع میں کہا گیا ہے آتے اس لیے نہیں ہیں کہ انسانوں کو اپنی غلامی اور عبودیت سکھلائیں۔ بلکہ اس لیے کہ اپنی تعلیم و عمل سے انسانوں کو خدا کی ایسی عبودیت اور غلامی سکھائیں کہ جس سے تمام دنیا کی غلامی کے طوق و سلاسل اتر جائیں۔

| | |
|---|---|
| وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ | کسی انسان کو یہ بات زیبا نہیں کہ خدا اسے کتاب |
| وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ | و حکمت و نبوت عطا فرمائے اور وہ لوگوں سے کہے |
| كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ | کہ خدا کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ بلکہ (وہ یہی |
| كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ | کہے گا) کہ تم اللہ والے بن جاؤ کہ تم کتاب سکھاتے بھی |
| الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ۔ (۳: ۷۹) | ہو اور پڑھتے بھی ہو۔ |

حضور خاتم النبیین ہو کر تشریف لائے۔ اور اس مقصد رسالت کو اس انداز سے پورا کیا کہ آپ کے بعد نہ کسی اور پیغام کی ضرورت باقی رہی اور نہ اس پیغام پر کسی نئے سرے سے عمل کر کے دکھانے والے کی کہ یہ پیغام ازلی بہ صوت سرمدی۔ قرآن کی دفتین میں محفوظ و مصئون چلا آتا ہے۔ کہ باطل اس کے پاس تک نہیں پھٹکتا۔ اور اس پیغام پر عمل ان نقوش قدم کے ذرّے ذرّے سے آفتاب کی طرح روشن اور زندہ ہے کہ جن نقوش قدم سے صراط مستقیم کے نشان ادھر سے ادھر تک سیدھے ملتے چلے جاتے ہیں۔ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ۔

لیکن ذرا غور کیجیے کہ مسلمانوں نے اپنے رسول کے ساتھ کیا کیا! کیا وہی نہیں جس سے روکنے کے لیے حضور تشریف لائے تھے۔ یہ احمد بے میم (احد) یہ عرب بلا عین (رب) یہانتک کہ۔

وہی جو مستوی عرش ہے خدا ہو کر اتر پڑا وہ مدینہ میں مصطفےٰ ہو کر

وہ جن کے متعلق خدا کا ارشاد تھا کہ اپنے نفع و نقصان کے بھی مالک نہیں۔ بلکہ خدا کے محتاج ہیں۔

انھیں تمام دنیا کے نفع و نقصان کا مالک و مختار قرار دیدینا۔ (انھیں معاذ اللہ) خدا بنا دینا نہیں تو اور کیا ہے؟ خدا کے عبد کو خدا کہنا۔ عجیب توحید ہے۔ جب اعتراض کیا جائے تو کہدیتے ہیں کہ صاحب! یہ صہبائے عشق و محبت کی سرمستیاں ہیں، انسان سب کچھ اپنے محبوب کو ہی سمجھتا ہے یہ عوام کی عقیدت کو جوش میں لانے کے لیے فی الواقع یہ جواب معقول نظر آتا ہے۔ لیکن سوال صرف اتنا ہے کہ امم سابقہ نے جو اپنے رسولوں کو خدا بنا لیا تھا تو کیا بغض و عناد کی بنا پر بنایا تھا؟ وہاں بھی یہی غلو محبت ہی تو تھا جس نے ان کے محبوب کو وہ کچھ بنا دیا جسے قرآن کریم نے شرک قرار دیا۔ بغض و عناد اور نفرت سے کبھی کسی نے رسولوں کو خدا نہیں بنایا۔ تو کیا پھر یہ دلیل پر بلعت نہیں کہ جو کچھ پہلی امتوں نے کیا وہ شرک اور اگر وہی کچھ۔ اسی جذبہ کے ماتحت۔ مسلمان کریں۔ تو عین توحید؟ ایک ہی بیج اور ایک ہی درخت سے دو مختلف پھل لینا۔ فطرت کا مذاق اڑانا ہے۔ حضور کی محبت جزو ایمان ہے۔ ایسی محبت جو ماں باپ اولاد۔ اموال۔ بلکہ خود اپنی جان کی محبت سے بھی زیادہ ہو۔ اور حقیقت یہ ہے کہ جب تک محبت نہ ہو۔ اتباع کامل ہو نہیں سکتا۔ جس عمل کی محرک آتش عشق ہو اس کا ایک لمحہ۔ سو سال کی ٹھنڈے پانی سے وضو کردہ سرد نمازوں سے زیادہ وزنی ہوتا ہے۔ کہ یہ صرف سر جھکاتا ہے اور وہ سر کٹاتا ہے۔ یہ زندہ رہنا چاہتا ہے کہ موت کے بعد کا کھٹکا مٹ جائے۔ اور وہ مرتا ہے کہ زندگی کسی پر سے نچھاور ہو کر ٹھکانے لگے۔ اسے ابھی حشر نشر۔ حساب۔ کتاب کے جھگڑے درپیش ہوتے ہیں۔ اور اس کی یہ حالت کہ تمیز ہی نہیں کیا جا سکتا کہ تلوار رگ جاں سے پہلے چھوئی تھی یا جان باب جنت سے۔ ؎

عشق نے اک جست میں طے کر دیے قصے تمام
اس زمین و آسمان کو بیکراں سمجھا تھا میں

لیکن صہبائے عشق کی سرمستیوں میں حفظ مدارج و مراتب بھی قرآن ہی نے سکھایا ہے۔ جو کہ بہک گیا وہ خمخانۂ یثرب کا متوالا ہی نہیں۔ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ جنت کی شراب میں سب کچھ ہے۔ لیکن سکر نہیں ہے۔ لہذا۔ خدا، خدا ہے۔ اور رسول۔ رسول۔ اور رسول کا رتبہ یہی ہے کہ ــــ

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

اس سے آگے بڑھنا بھی اتنا ہی گناہ ہے جتنا اس سے پیچھے ہٹنا۔ کہ مومن ہونے کو جہاں خدا کے لیے لا الٰہ الا اللہ کی شہادت کی ضرورت ہے۔ وہاں محمد کے لیے عبدہٗ ورسولہٗ کی شہادت کی بھی۔ اور یہی ایمان و محبت کی صحیح تصویر ہے۔ اس تصویر کے صحیح رُخ کے لیے دور رسالت اور صحابہ کبار کا طرز عمل دیکھیے حضور کی عمر بھر یہی تعلیم و تلقین رہی کہ اپنے آپ کو عام انسانوں سے بلند حیثیت نہ دیں۔ اور اپنے ماننے والوں کے قلب و دماغ پر خدا بنکر نہ چھا جائیں۔ اس کے لیے حضور نے ان میں حریت فکر و نظر کی ایسی روح پھونکی کہ آج اس مزعومہ جمہوریت کے دور میں بھی اس کی مثال نہیں مل سکتی۔ معاملات میں خاص صحابہ کا کئی ایک مواقع پر حضور کی رائے سے اختلاف اور اختلاف کی کامل آزادی۔ حضور کی رائے کے متعلق یہ تحقیق کہ آپ نے وہ رائے بحکم منصب رسول دیا ہے یا بحیثیت محمدؐ۔ یہ سب اس بات کا آئینہ دار ہے کہ حضورؐ ایک عبد مومن میں کس درجہ انسانیت کی آزادی پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اور ایک کا غلام بنا کر کس طرح دنیا بھر کی مادی غلامی سے نجات دلانا چاہتے تھے۔ یہی تھا وہ ماحول جس میں عقل انسانی نے صحیح نشو نما پائی۔ اور جس انسان کو خدا نے اسطرح پیدا کیا تھا کہ وہ حیوان کی طرح سر جھکا کر نہ چلے۔ وہ فی الحقیقت اس قابل ہوگیا کہ دنیا میں سر اٹھا کر چلے۔ اسلام انسان کو یہی سربلندیاں اور سرفرازیاں بخشنے آیا تھا۔ اور یہی اس دین فطرت کی خصوصیت تھی۔ ہم نے جب یہ خصوصیت کھو دی تو پھر وہیں جا گرے جہاں سے ابھرے تھے۔ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ۔ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ۔ کس قدر صحیح حقیقت ہے۔

---

**آئمہ پرستی** رسولوں کے بعد عوام کی عقیدت کے مرکز مذہبی پیشوا اور دین کے ائمہ ہوتے ہیں۔ قرآن کریم نے امم سابقہ کے کوائف و حالات سے ہمیں بتایا ہے کہ رسولوں کے بعد یہی لوگ ہیں جن کو خدا کا درجہ دیا جاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا۔

اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ. (۹: ۳۱) ان لوگوں نے خدا سے ورے ہی۔ اپنے مذہبی علماء وپیشوایان دین کو خدا بنا لیا۔

اس کے متعلق جب نبی اکرمؐ سے عرض کیا گیا کہ حضور! یہود و نصاریٰ کبھی اپنے احبار ورہبان کو سجدے تو نہیں کیا کرتے تھے۔ تو حضور نے فرمایا کہ کیا یہ لوگ اس چیز کو حلال نہیں سمجھتے تھے جسے وہ حلال بتادیں، اور اسے حرام جسے وہ حرام کہدیں؟ یہی ارباباً من دون اللہ بنانا ہے۔ یعنی جو منصب وحیثیت خدا کے لیے ہے وہ ان لوگوں کو دیدیں۔ یہی ان کی پرستش ہے" اس سے معلوم ہوا کہ ائمہ مذہب کی پرستش یہ ہے کہ۔

(۱) ان کے فیصلوں کو خدا کے فیصلوں کی جگہ دیدی جائے اور

(۲) ان کے ارشادات کو تنقید سے بالاتر سمجھا جائے۔

امم سابقہ نے ایسا کچھ اس لیے کیا تھا کہ ان کی آسمانی کتابوں کے اجارہ دار و محافظ ان کے مذہبی راہ نما تھے۔ لوگ رشد و ہدایت کے لیے ان کے محتاج تھے۔ چاہیئے یہ تھا کہ لوگ ان کے فیصلوں کے لیے کتاب کی سند مانگتے لیکن انہوں نے ایسا نہ کیا۔ بلکہ جو کچھ ان ارکین مذہب نے کہدیا اسے ہی فرمودہ الٰہی سمجھ لیا۔ ظاہر ہے کہ عوام ان کے فیصلوں کو اسی لیے خدا کا فیصلہ سمجھتے تھے کہ ان کے نزدیک وہ فیصلے خدا کے احکام کے مطابق ہوتے تھے یعنی وہ ایسا باور کر لیتے تھے۔ رفتہ رفتہ حالت یہ ہوگئی کہ لوگ خدا کے فیصلوں سے بے نیاز ہوگئے اور انہی احبار ورہبان کو خدا کا قائم مقام سمجھ لیا۔ اب ان کا ہر حکم وحی منزل کی طرح واجب التسلیم اور ان کا ہر فیصلہ آیت الٰہی کی طرح بالا از تنقید قرار دیا گیا۔ اسی کو قرآن کریم نے شرک قرار دیا ہے۔

قرآن کریم نے فرمایا کہ

قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ (۳: ۷۲) ہدایت وہی ہے جو اللہ کی ہدایت ہے۔

لہٰذا اتباع واجب قرآن ہی کی ہوئی۔ پھر

(۳) اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو واضح، مفصل اور آسان بنادیا کہ اس کے سمجھنے کے لیے کوئی خاص "برہمنوں" کی جماعت ہی مختص نہ ہو جائے۔

(۴) پھر قرآن کریم کی حفاظت کی ذمہ داری بھی خود اللہ نے لے لی کہ قیامت تک اس میں نہ رد و بدل ہو نہ ترمیم و تنسیخ۔

ان بدیہیات سے ظاہر ہے کہ دین کا تقاضا ہے کہ ہر زمانے کے مسلمان۔ قرآن کریم کی روشنی کے ماتحت عقل صحیح سے کام لے کر صراط مستقیم پر چلتے جائیں۔ خود بخود منزل مقصود تک پہنچ جائیں گے۔ ان کو راستہ میں اندھوں کی طرح لاٹھی کی ضرورت ہی نہیں کہ روشنی بھی موجود ہے اور بینائی بھی۔ لیکن غور سے دیکھئے کیا ہم واقعی اس روش پر چل رہے ہیں؟ عوام کو تو چھوڑ دیجیے کہ اول تو وہ قرآن کریم کا مصرف بجز ازیں کچھ جانتے کہ قسم اٹھانے کے کام آتا ہے۔ اور اگر ان میں سے بعض قرآن پڑھتے بھی ہیں تو ایسے کہ لَا یَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّاۤ اَمَانِیَّ۔ صرف الفاظ کی تلاوت کرتے ہیں۔ خواص۔ کہ جو مذہب کے واحد اجارہ دار بنے بیٹھے ہیں۔ ان کی یہ حالت کہ کسی معاملہ کے متعلق دینی فیصلہ پوچھیے۔ بتادیں گے کہ فلاں امام نے اس کے متعلق یہ فرمایا ہے۔ فلاں علامہ کی یہ رائے ہے۔ عینی میں ایسا لکھا ہے۔ شارح وقایہ کا یہ خیال ہے۔ غرض کہ ان کی سند کسی نہ کسی انسان تک جاکر رہ جائے گی۔ اس سے آگے نہیں بڑھ سکے گی۔ ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ۔ کہیں خدا کا نام نہیں کسی جگہ قرآن کا ذکر نہیں اور اعتراض کیجیے تو جھٹ کہہ دیں گے کہ میاں! ان حضرات (علیہم الرحمۃ) نے بھی تو قرآن پڑھ کر ہی ایسا لکھا ہے۔ ان سے بڑھ کر اور کون قرآن کو سمجھ سکے گا؟ غور فرمائیے! اس جواب میں۔ اور اس میں جو یہود و نصاریٰ اپنے احبار و رہبان کے متعلق دیتے تھے۔ کیا فرق رہ جاتا ہے۔ کیا انہوں نے ان کو اربابًا من دون اللہ ایسا ہی کچھ سمجھ کر نہیں بنایا تھا۔

معاملہ یوں ہوا کہ جب اسلامی سلطنت قائم ہوئی تو سلطنت کو لامحالہ تدوین قانون کی ضرورت لاحق ہوئی۔ اسلام میں چونکہ دین و دنیا الگ الگ شعبے نہیں ہیں اس لیے یہ قانون بھی مذہب ہی کی روشنی میں مرتب ہونا تھا۔ علماء عظام اور آئمہ کرام (علیہم الرحمۃ) کہ جن کو اللہ نے قلب و دماغ کا نور عطا فرمایا تھا، جمع ہوئے۔ اور وقت کی ضروریات کو سامنے رکھکر قانون کے ضابطے مرتب کیے۔ یہ ضابطے سرکاری توثیق سے مستند کرکے عدالتوں میں بھجوا دئے گئے کہ مقدمات کے فیصلے انہی کے مطابق ہوا کریں۔ ظاہر ہے کہ جب کسی آئینی حکومت کے ضوابط قانون مرتب ہوکر نافذ العمل ہو جائیں تو پھر سوائے حکومت کے اور کسی کو اجازت نہیں رہتی کہ وہ بھی قانون مرتب کر سکے یا ان میں ترمیم تنسیخ کر سکے۔ بعینہ جس طرح سرکاری ٹکسال کے بعد کسی کو سکہ رائج الوقت بنانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ یہ تھی فقہ کی ابتدا۔ اور یوں دوسروں کو ایک ہی فقہ کے مطابق فیصلے کرنے پر مکلف اور اس میں کمی بیشی یا رد و بدل کرنے سے منع کیا گیا تھا لیکن اس سے ظاہر ہے کہ۔

(۱) نہ تو حضرات فقہا، قیامت تک کا علم رکھتے تھے کہ ہر زمانہ کی ضرورتوں کے مطابق ایک ہی وقت میں مکمل قانون وضع کر دیں۔

(۲) نہ وہ (نعوذ باللہ) خدا ہونے کا دعوی کرتے تھے کہ وہ استنباط مسائل میں اپنے نتائج کو تنقید سے بالاتر قرار دیدیں۔

زمانہ کی ضرورتوں کے لحاظ سے ان قوانین میں تبدیلی کا ہونا بھی ضروری تھا اور اس قانون پر کسی معیار اعلیٰ (قرآن کریم) کی روشنی میں تنقید بھی کی جا سکتی تھی لیکن سلطنت نے جس بنا پر دوسروں کو قوانین میں رد و بدل کرنے (بالفاظ دیگر مزید اجتہاد) سے روکا تھا۔ وہ علت تو نظروں سے اوجھل ہو گئی اور بعد میں آنے والوں نے سمجھ لیا کہ بس اب تدبر و تفکر کا دروازہ باب نبوت کی طرح بند ہو گیا۔ قرآن جتنا سمجھا جانا تھا، سمجھا جا چکا۔ اس سے جو کچھ کیا جا سکتا تھا۔ حاصل کر لیا گیا۔ اب اس کا وجود تبرکاً

دنیا میں رہے تو رہے۔ عملی حیثیت سے امت اس سے بے نیاز ہو چکی۔ اس کے پڑھنے سے ثواب ضرور ملتا ہے لیکن اس کا سمجھنا دین پر اضافہ کرنا ہے۔ نتیجہ اس کا ظاہر ہے کہ رفتہ رفتہ قرآن حکیم جیسی زندہ اور زندگی بخش کتاب۔ منتروں کا مجموعہ بن کے رہ گئی۔ جس سے جھاڑ پھونک گنڈہ و تعویذ کا کام لیا جا سکے۔ یا زیادہ سے زیادہ اس کی ادبی اور لسانی لطافتوں پر بحث کر کے اسے الفاظ کا گورکھ دھندا سمجھ لیا جائے۔ کیا یہی تھی وہ غرض جس کے لیے قرآن کریم کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے لی تھی؟

"دین فقہ کا تعلق معاملات کی دنیا تک ہی تھا۔ اگر باب اجتہاد بند ہوتا تو وہ اسی حصہ تک بند ہوتا لیکن آہستہ آہستہ دین کے قصر رشید کا ہر ایک دروازہ اور کھڑکی بند کر دی گئی۔ حقائق و معارف پر بھی وہی چادر تقلید چھا گئی۔ حتیٰ کہ نوبت یہاں جا پہنچی کہ دین سے قطع نظر، دیگر علوم و فنون میں بھی جو کچھ سلف نے لکھ دیا قول فیصل اور حرف آخر سمجھ لیا گیا۔ اب زمانہ کچھ کہے آپ کی بصیرت کا تقاضا کچھ ہو، آپ نہ اس کے خلاف نہ اس سے زیادہ کچھ سمجھ سکتے ہیں جو سمجھا جا چکا۔ اور نہ کہہ سکتے ہیں جو کہا جا چکا۔ نہ سر میں دماغ اپنا ہو سکتا ہے۔ نہ سینے میں آپ کا دل اپنا۔ نہ آپ کی اپنی آنکھیں نہ سننے کان۔ اُولٰئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ۔ دنیا کہیں سے کہیں چلی گئی۔ لیکن امت مسلمہ کی سطح فہم و ادراک جو ہزار سال پہلے تھی وہی آج ہے۔

وہ تیری گلی کی قیامتیں کہ لحد سے مردے اکھڑ گئے — یہ مری جبین نیاز ہے کہ جہاں دھری تھی دھری رہی

غور تو کیجیے کیا یہ سلف کی پرستش نہیں؟ کیا یہ ان کو احبار و رہبان کی طرح خدا کا درجہ دینا نہیں؟ کیا ان کی نگاہ کو قیامت تک کے آنے والے واقعات کا مبصر اور تمام حالات و کیفیات کا واقف سمجھنا اور ان کے فیصلوں کو تنقید سے بالاتر قرار دینا، انھیں خدائی صفات کا حامل سمجھنا نہیں؟ اللہ تعالیٰ نے اللہ والے (ربانین) بننے کے لیے قرآن کریم کو ہی معیار قرار دیا تھا (۳ : ۷۹) اس نے تو قرآن کریم کو نازل فرما کر اس کی تبیین و تفصیل بھی اپنے ذمے لی تھی کہ لوگ اس باب میں بھی دوسروں کے

محتاج ہو کر ان کی عبودیت اختیار نہ کریں۔

الٓرٰ کِتٰبٌ اُحْکِمَتْ اٰیٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِیْمٍ خَبِیْرٍ ۔ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ۔ اِنَّنِیْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِیْرٌ وَّ بَشِیْرٌ (۱۱: ۱-۲)

ایسی کتاب کہ جس کی آیات محکم بنائی گئی ہیں پھر اس کے ساتھ صاف صاف بھی بیان کی گئی ہیں خدائے حکیم و خبیر کی طرف سے تاکہ تم اللہ کے سوا کسی اور کی عبودیت اختیار نہ کرو۔ (اور) میں تم کو اس کی طرف سے آگاہ کرنے اور بشارت دینے کے لیے (آیا) ہوں۔

پھر یہ بھی دیکھیے کہ اللہ تعالیٰ اس دین کی غرض کیا بتلاتا ہے جو نبی اکرم کے واسطہ سے دنیا تک پہنچا۔ سورۂ جاثیہ کے دوسرے رکوع میں سلسلۂ کلام یوں شروع ہوتا ہے کہ اللہ نے بنی اسرائیل کو کتاب و حکمت و نبوت عطا فرمائی ان کو دیگر اقوامِ عالم پر فضیلت عطا کی، اور انہیں دین کی بینات بھی دی گئیں لیکن انہوں نے علم آ جانے کے بعد باہمی ضد اور ہٹ سے اختلافات پیدا کر لیے۔ ان کے اختلافات کا تو قیامت میں فیصلہ کر دیا جائے گا لیکن دنیا کو تو ضرورت تھی کہ خدا کا وہ دین جو انسانی اختلافات کی نذر ہو کر مسخ ہو چکا تھا پھر سے دنیا کو مل جائے۔ اس کے لیے۔

ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰی شَرِیْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ۔ (۴۵: ۱۸)

پھر ہم نے تمہیں (اے رسول) دین کی ایک شریعت پر مبعوث کیا۔ پس اس کا اتباع کرو۔ اور ان لوگوں کے خیالات کا اتباع مت کرو جن کو علم نہیں ہے۔

یہ دین و شریعت کہاں ہے۔ اس کا جواب بھی وہیں ہے۔ کہ

هٰذَا بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ وَهُدًی وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ۔ (۴۵: ۲۰)

یہ قرآن ہے جو تمام نوعِ انسانی کے لیے بصیرت ہے اور ایمان والوں کے لیے ہدایت و رحمت۔

قرآن ہر زمانے کے انسانوں کے لیے بصائر ہے۔ اس لیے اس میں بار بار غور و فکر۔ تدبر و تفحص کی تاکید کی گئی ہے۔ جو ایسا نہیں کرتے ان کو کہیں شر الدواب کہا گیا۔ کہیں کالانعام بتایا گیا۔ جہنم ان سے

بھری گئی۔ ان کے قلوب پر مہریں۔ ان کی آنکھوں پر پردے اور ان کے کانوں میں ڈاٹ بتائے گئے۔

ایسے کہ جو کتاب اس طرح عقل و بصیرت کو دعوت دیتی ہو جس کے لانے والے کا سب سے پہلا دعویٰ یہ ہو کہ اَدْعُوْا اِلَی اللّٰہِ عَلٰی بَصِیْرَۃٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِیْ۔ اس کتاب میں کورانہ تقلید کی کہاں گنجائش ہے جمود و تعطل وہ کب روا رکھ سکتی ہے قرآن انسانوں کو ظلمت سے نکال کر نور کی طرف لے جانے کے لیے آیا تھا لیکن آنکھیں بند کرکے بیٹھا رہنے والا تو خواہ ظلمت میں ہو خواہ نور میں یکساں ہے۔ علم اجتماعی حیثیت سے قوموں میں وراثۃً منتقل ہوتا اور قومی سرمایہ کی طرح بڑھتا رہتا ہے۔ لیکن جو قوم علم کی کسی خاص سطح کو منتہائے کمال سمجھ کر فارغ ہو بیٹھے اس کا مآل معلوم۔ چنانچہ وہ قوم جو دنیا میں تمام نوع انسانی کی امامت کے لیے آئی تھی۔ ہمیشہ دنیا کے پیچھے پیچھے رہنے کی عادی ہو گئی۔ وہ ملت جس کے ہاتھ میں اس قدر عظیم الشان قندیل دی گئی تھی کہ جس کی روشنی مشرق و مغرب کے امتیازات مٹا کر اقصائے عالم کو منور کرنے والی تھی۔ اب ہر جگنو کو شمع راہ سمجھ کر اس کے پیچھے لپکنے کی خوگر ہو گئی۔ یہ بات آسان تھا۔ اس میں سہل انگاری اور آرام طلبی تھی۔ اجتہاد کے لیے ذہنی جہاد اور اس کے ساتھ ساتھ جسمانی مجاہدے کی ضرورت تھی۔ تقلید میں اس کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ جس کو باپ دادا کے ورثہ سے یا رستہ مل جائے۔ وہ خود محنت کیوں کرے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس وراثت میں سکہ ان کو وہ ملے جو اصحاب کہف کے سکہ کی طرح صدیوں پہلے کا ہو۔ درحقیقت تقلید اختیار کی وہ قوم کرتی ہے جس میں مجاہدانہ روح باقی نہ رہے۔ ہر قوم کی تاریخ ہمیں ایسا ہی بتاتی ہے۔ خود قرآن کریم اس پر شاہد ہے۔

> وہ تم سے پہلے (بھی) کوئی رسول کسی بستی میں نہیں آیا کہ وہاں کے خوش حال (آرام طلب) لوگوں نے یہ کہہ دیا ہو کہ ہم نے اپنے آباء کو ایک طریق پر پایا اور ہم انہی کے نشانات کا اقتدا کرتے چلے جا رہے ہیں۔ (۴۳: ۲۳)

لیکن یہ یاد رہے کہ اس مکافات عمل کے دن کہ جب "سمع و بصر و قلب" ہر ایک سے الگ الگ

باز پرس ہوگی۔ آپ یقیناً نہیں چھوٹ سکینگے کہ ہم نے فلاں امام کی تقلید کی تھی۔ فلاں عالم کا اتباع کیا تھا۔ متبوع حضرات آپ کے اس اتباع سے ہی انکار کر دیں گے۔ کیونکہ انہوں نے کبھی کسی کو ایسے اتباع کا حکم نہیں دیا تھا

"جس وقت وہ لوگ جو متبوع تھے اپنے متبعین سے بیزار ہو جائیں گے۔ اور سب عذاب کا مشاہدہ کریں گے۔ ان کے باہمی تعلقات سب منقطع ہو جائیں گے" (۲: ۱۶۶)

اس وقت متبعین سے یہ پوچھا جائیگا کہ تم نے جو ان کی پرستش شروع کر دی۔

"کیا تمہارے پاس پیغمبر بینات لے کر نہیں آئے تھے۔ وہ کہیں گے کہ ہاں آئے تو تھے۔ (۴۰: ۵۰)

اس سے خود سمجھ لیجیے کہ مقصد کیا ہوا۔

ہمارا مطلب یہ نہیں کہ سلف سے جو کچھ تمہارے پاس آیا ہے معاذ اللہ سب گمراہ کن ہے۔ ایسا کون کہہ سکتا ہے۔ مطلب صرف یہ ہے کہ جو کچھ تمہیں ان سے ملا ہے آنکھیں بند کر کے اس کی پیروی نہ کرو۔ بلکہ قرآنی کی روشنی میں ہمیشہ آنکھیں کھلی رکھو۔ وہ بھی تمہاری ہی طرح کے انسان تھے غلطی کر سکتے تھے لیکن قرآن کی کوئی کبھی غلطی نہیں کر سکتی۔ جو اس کسوٹی پر پورا اترے دین وہی ہے اور بس۔ ذالک الدین القیم۔

یہ تو ائمہ فقہ اور علماء سلف کی تقلید و اتباع سے متعلق تھا۔ ائمہ پرستی میں ان کے علاوہ ایک اور جماعت بھی ہے لیکن وہ ہمارے اس موضوع سے خارج ہے۔ اس لیے کہ وہ اپنے ائمہ حضرات کو معصوم اور منصوص مانتے ہیں۔ اور اس امامت کو ایک خاندان میں مقید و محدود سمجھتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ جس شخص کو فہم قرآن اس عقیدہ کی اجازت نہ دے اس کے نزدیک تو یہ عقیدہ سرتاسر نسل پرستی بن کر رہ جاتا ہے۔ اور یہ ایک ایسا بنیادی اور اصولی فرق ہے جس کی وجہ سے ہمارا ان حضرات سے مخاطب ہی بے معنی ہے۔ (باقی)

# رسائل و مسائل

# دیہات میں نماز جمعہ

پنجاب سے ایک دین دار بزرگ اپنے ایک عنایت نامہ میں تحریر فرماتے ہیں:-

"علماء احناف جمعہ کے لیے شہر کی شرط ابھی تک لگائے جاتے ہیں حالانکہ شہروں کی حالت اب ایسی ہو گئی ہے کہ وہاں دیہاتی مسلمانوں کو (جو تمدن جدید کے مکروہات سے ابھی بہت کچھ محفوظ ہیں) جانے سے جس قدر روکا جائے اتنا ہی بہتر ہے۔ میں ایک موضع کا مالک ہوں جس میں مسجد تعمیر کی ہے اور ایک مکتب دینیات کا جاری کیا ہے۔ اردگرد کے دیہات میں تھوڑی تھوڑی اسلامی آبادی ہے۔ وہ جمعہ کے جمعہ یہاں نماز کو آجاتے ہیں اور قرآن شریف کا درس، جمعہ کا خطبہ اور کلمہ وعظ سن جاتے ہیں۔ مدرس مکتب نماز یاد کراتا ہے اور جن کو صحیح یاد نہیں اُن کی تصحیح کراتا ہے، رمضان شریف میں مجمع بہت زیادہ ہو جاتا ہے۔ مگر علماء اس جگہ کے جمعہ کو جائز نہیں بتاتے۔ میں جمعہ کی نماز بند کر دوں تو یہ لوگ ہرگز شہر کو نہ جائیں گے اگر ان کو کہا جائے کہ یہاں جمعہ نہیں ہو سکتا، جمعہ کے روز ظہر کی نماز پڑھ جایا کرو تو اسے کوئی نہیں مانتا۔ جمعہ کی عظمت اور ثواب ہی کا اثر ہے جس کے باعث یہ لوگ آٹھویں روز نماز پڑھنے آجاتے ہیں۔ مجھے فکر ہے کہ اگر یہاں جمعہ کی نماز نہ ہوئی تو دیہات کے لوگ اس تعلیم اور وعظ سے بھی محروم ہو جائیں گے۔ یہاں سے قریب چند میل کے فاصلہ پر ایک شہر ہے جہاں کئی مسجدوں میں جمعہ ہوتا ہے۔ مگر وہاں کوئی عالم صحیح خیالات کا نہیں

جس سے کسی مفید تحریک کی امید ہو۔ اور شہر کے بازاروں میں سب کچھ وہی ہے جو آج کل سب جگہ ہے۔ اور کچھ نہیں تو جو دیہاتی وہاں جائے گا وہ کچھ نہ کچھ فضول خرچی تو کر ہی آئے گا۔ میری خواہش ہے کہ جناب اس کے متعلق ضرور کچھ نہ کچھ تحریر فرمائیں۔

**ترجمان القرآن۔** جمعہ کے متعلق فقہائے متاخرین جس قسم کے فتوے دے رہے ہیں، وہ اُس جمود کی روشن مثالوں میں سے ہیں جو کتاب وسنت سے اکتساب علم کرنے کے بجائے مجتہدین سلف کے اقوال پر کلی اعتماد کرنے کی بدولت پیدا ہوا ہے۔ مجتہدین سلف نے کتاب وسنت سے اکتساب علم کیا اور اپنے زمانہ کے حالات پر ان کو منطبق کرنے کی کوشش کی۔ صدیوں بعد مسلمانوں پر جو حالات آنے والے تھے لازم نہ تھا کہ ان کو بھی وہ دیکھتے اور جانتے، نہ درحقیقت ان پر بعد والوں کے لیے پیشگی اجتہاد کرنے کی کوئی ذمہ داری شرعاً یا عقلاً عائد ہوتی تھی۔ اب جو لوگ آنکھیں بند کرکے ہر ہر جزئیہ میں ان پر اعتماد کرتے ہیں اور ان کے اقوال سے سند لے کر اسقاط فرائض اور تحلیل حرام و تحریم حلال تک کا ارتکاب کر جاتے ہیں وہ دراصل ایک بہت بڑی ذمہ داری اپنے سر لیتے ہیں جس سے خدا کے سامنے وہ سبکدوش نہیں ہو سکتے کیونکہ خدا نے ان کو قرآن و اسوۂ رسول کی پیروی کا حکم دیا ہے، نہ کہ سلف کی پیروی کا، اور سلف کی پیروی میں اگر وہ غلطی کرتے ہیں تو اس کی ذمہ داری خود ان پر ہے نہ کہ سلف پر۔ سلف نے جو کچھ اجتہادات کیے تھے وہ بلاشبہ ہماری بہترین رہنمائی کرتے ہیں اور وہ شخص بھی غلطی کرتا ہے جو ان کے علم اور ان کی بصیرت کے ثمرات کو بیکار سمجھ کر پھینک دیتا ہے۔ لیکن ان بزرگوں کی رہنمائی سے ٹھیک ٹھیک فائدہ اٹھانے کے لیے ضروری ہے کہ ہماری نگاہوں کے سامنے بھی کتاب اللہ اور اسوۂ رسول اللہ کی شمع اسی طرح روشن رہے جس طرح سلف کے سامنے تھی، اور ہم بھی اس روشنی میں خدا کی دی ہوئی عقل و بصیرت سے اسی طرح کام لیں جس طرح ان بزرگوں نے لیا۔ ورنہ اگر ہم شمع کتاب وسنت کو اپنے سامنے سے ہٹا دیں اور عقل و فہم سے بھی کام نہ لیں اور صرف اقوال سلف کی حرف بحرف پیروی کرتے چلے جائیں تو ہم سے

ایسی غلطیاں سرزد ہوں گی جو دنیا اور آخرت دونوں میں ہم کو رسوا کردیں گی۔

اسی نماز جمعہ کے مسئلہ میں جو فقہی غلطیاں ہمارے مذہبی رہنماؤں سے زمانۂ حال میں سرزد ہوئی ہیں ان کو ملاحظہ فرمائیے۔ اللہ تعالیٰ نے جمعہ کی اقامت کا فرض عمومیت کے ساتھ مسلمانوں پر عائد کیا تھا۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے عمل کرکے ہم کو بتایا کہ اس فرض کو کس طرح ادا کیا جائے، کون ادا کرے، کہاں ادا کرے، کون سے اشخاص اس سے مستثنیٰ ہیں، کن حالات میں یہ فرض ساقط ہوتا ہے، وغیرہ۔ حضورؐ کے اس عمل کو دیکھ کر فقہائے امت نے مختلف احکام مستنبط کیے جن میں ایک طرف ان کی نگاہ ارشاد الٰہی و عمل رسول پر تھی اور دوسری طرف ان حالات پر تھی جن میں وہ زندگی بسر کر رہے تھے، اور جن میں انھیں ان احکام کو نافذ کرنا تھا۔ من جملہ ان جزئی احکام کے جو انہوں نے اس طور پر مستنبط کیے، ایک یہ بھی تھا کہ "جمعہ ویرانوں اور جنگلوں اور عارضی قیام گاہوں میں نہ پڑھا جائے بلکہ مستقل بستیوں میں قائم کیا جائے"۔ یہ ایک عام ہدایت تھی جو ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل اور بعض مجمل ارشادات سے حاصل ہوئی۔ اس کے بعد انہوں نے غور کیا کہ بستی کی قید لگانے سے شارع کا مقصود کیا ہے اور اس کے لیے کس قسم کی بستی ہونی چاہیے۔ اس سوال کے تصفیہ کا انحصار سراسر ان کے اپنے اجتہاد پر تھا، کیونکہ اس کے متعلق کوئی صریح ہدایت ان کو نہ ملی تھی۔ نیز اس کے تصفیہ میں اس زمانہ کے تمدنی حالات کو بھی بہت کچھ دخل تھا۔ فطری طور پر ان کے درمیان اختلاف واقع ہوا۔ کسی نے کہا کہ چھوٹی سے چھوٹی بستی میں بھی جمعہ پڑھا جائے جہاں کے باشندوں سے کم از کم ۱۲ مصلی بہم پہنچ سکتے ہوں۔ کسی نے کہا کہ ایسی بستی میں جمعہ قائم کیا جائے جہاں کم از کم چالیس ایسے آدمیوں کی مستقل سکونت ہو جن پر فریضۂ جمعہ عائد ہوتا ہے۔ حنفیہ نے کہا کہ جمعہ کے لیے گاؤں کے بجائے "شہر" ہونا چاہیے اور شہر کی تعریف میں خود حنفیہ کے درمیان بکثرت اختلافات ہوئے کیونکہ ہر امام مجتہد کے ذہن میں مقصود شارع کے لحاظ سے "بستی" کا ایک علٰحدہ تصور تھا اور ہر ایک نے اپنے مخصوص تصور کے مطابق شہر کی تعریف کی تھی۔ پھر اس امر میں بھی اختلاف ہوا کہ جو لوگ بستی سے دور ہوں ان کے لیے نماز جمعہ کی منادی پر

لبیک کہنا کس حد تک فرض ہے۔ کسی نے کہا کہ جس تک منادی کی آواز پہنچتی ہو اس کو آنا چاہیے۔ کسی نے کہا کہ جو دو میل کے فاصلہ پر ہو وہ آئے۔ کسی نے چار میل کہا، کسی نے چھ میل کہا۔ کسی نے کہا کہ جو شخص جمعہ کی نماز پڑھ کر رات سے پہلے تک اپنے گھر پہنچ سکتا ہو اس پر جمعہ میں شریک ہونا فرض ہے۔ اس باب میں ہر گروہ نے ایک طرف شریعت کے اصول تیسیر کی رعایت، اور دوسری طرف فرضیت جمعہ کے مصالح اور تیسری طرف اپنے زمانہ کے وسائل حمل ونقل کی حالت پر نظر کرکے اپنی اپنی فہم کے مطابق رائے قائم کی تھی اور یہ جملہ امور ان بزرگوں کے اجتہاد پر مبنی تھے۔ ان میں سے کوئی چیز بھی منصوص نہ تھی۔ مگر آج ہم سے کہا جاتا ہے کہ آپ سے ہزار برس پہلے شہریت کے تصور اور وسائل حمل ونقل کی حالت اور اقامت جمعہ کے تمدنی پہلو کو پیش نظر رکھ کر فقہاء کے ایک خاص گروہ نے جو جزئیات مستنبط کیے تھے ان کو بالکل منصوص احکام کی طرح مان لو، بلکہ ان غیر منصوص اجتہادی احکام کی بنیاد پر سرے سے اس فرض کو ساقط کردو جو نہ صرف منصوص ہے بلکہ غایت درجہ تاکید کے ساتھ عاید کیا گیا ہے۔

ایسی ہی غلطی ہندوستان پر انگریزی تسلط کی ابتداء میں کی جارہی تھی۔ فقہائے اسلام میں سے حنفیہ کے گروہ نے ایک دوسرا اجتہادی مسئلہ یہ بھی مستنبط کیا تھا کہ اقامت جمعہ کے لیے منجملہ اور شرائط کے ایک سلطان کا وجود بھی ہے یعنی جمعہ یا تو خود سلطان اسلام قائم کرے یا اس کا مقرر کیا ہوا حاکم۔ اس شرط کے مصالح پر کلام کرنے کا موقع نہیں۔ یہاں ذکر صرف یہ ہے کہ یہ شرط خواہ کیسی ہی مفید اور مبنی بر حکمت ہو بہرحال تھی ایک اجتہادی چیز کیونکہ کوئی واضح اور قطعی حکم اس کی تائید میں نہ تھا۔ مگر بہت سے علماء اسلام نے اس کو ویسی ہی قطعی شرط سمجھا جیسی کہ ایک منصوص شرط ہو سکتی تھی، اور جب ہندوستان میں اسلامی حکومت کی جگہ کفار کی حکومت قائم ہوئی تو یہ حضرات تمام مسلمانان ہند پر سے فریضہ جمعہ کو ساقط کردینے پر آمادہ ہوگئے۔ وہ تو خدا کا شکر ادا کیجیے کہ ہندوستان میں کچھ ایسے علماء بھی موجود تھے جن کے سینوں کو اللہ نے علم صحیح کیلئے کھول دیا تھا ورنہ قریب تھا کہ ہندوستان سے ہمیشہ کے لیے اقامت جمعہ کا خاتمہ ہو جاتا اور آج آپ صرف پرانے بڈھوں سے سنا کرتے کہ یہاں کبھی

جمعہ کی نماز بھی ہوا کرتی تھی آپ اندازہ نہیں کرسکتے کہ اگر اس غلطی کا ارتکاب ہوگیا ہوتا تو مسلمانان ہند کی جمعیت کو کتنا عظیم الشان نقصان پہنچتا۔ اور کیسے سخت وبال میں یہ قوم مبتلا ہو جاتی۔ مگر ہمارے فقہاء اتنا بڑا ظلم اپنے سر لینے پر تیار ہو گئے محض اس اعتماد پر کہ جب خدا پوچھے گا کہ تم نے میرے مقرر کیے ہوئے فرض کو مسلمانوں کی ایک قوم پر سے کیوں ساقط کر دیا، تو ہم کہدیں گے کہ صاحب ہدایہ نے لا یجوز اقامتھا الا للسلطان او لمن امرہ السلطان لکھ دیا تھا۔

اس بحث سے ہمارا مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ فقہائے مجتہدین نے اپنے زمانے میں کتاب وسنت سے شریعت کے جو احکام مستنبط کیے تھے، وہ بلاشبہ آج بھی ہمارے لیے نہایت مفید ہیں، اور آئندہ بھی مفید رہیں گے۔ مگر یہ سمجھنا کہ ان کے تمام جزئیات تمام زمانوں کے لیے اٹل قانون ہیں اور یہ خیال کرنا کہ ان کے اجتہادات بھی ویسے ہی ناقابل تغیر ہیں جیسے الٰہی احکام، اور یہ گمان کرنا کہ وہ قانون شرع کو مدون کر کے بعد آنے والی تمام نسلوں کو ہمیشہ کے لیے فکر و نظر کے استعمال اور تدبر فی الکتاب والسنہ سے بے نیاز کر گئے ہیں ایک ایسی غلطی ہے جو ہم کو اتباع شریعت سے بہت دور لے جانے والی ہے۔

شریعت کا صحیح اتباع کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اجتہادی احکام اور منصوص احکام کے فرق کو ہمیشہ ملحوظ رکھا جائے، اور اجتہادی احکام کو نافذ کرتے وقت یہ دیکھ لیا جائے کہ جس خاص حالت یا خاص زمانہ میں ہم کسی حکم کو نافذ کر رہے ہیں۔ اس میں یہ حکم شارع کے مقصود کو پورا کر رہا ہے یا نہیں۔ اگر نہیں کرتا تو ہمیں شارع کے مقصد کو اچھی طرح ملحوظ رکھ کر اس حکم میں حسب ضرورت ترمیم کرنی چاہیے، خواہ وہ ترمیم دوسرے ائمہ مجتہدین سے ماخوذ ہو یا بالکل جدید اجتہاد پر مبنی ہو۔

یہ مقدمہ ذہن نشین کرنیکے بعد اب اصل زیر بحث کی طرف رجوع کیجیے۔ یہ سوال کہ جمعہ کی نماز دیہات میں قائم کی جائے یا نہیں، بظاہر ایک بہت ہی جزئی سوال ہے، اور علمائے کرام عموماً اس کے جواب میں

صرف اتنا کہہ دینا کافی سمجھتے ہیں کہ لا یجوز کما فی الھدایہ یا یجوز کما فی المدونہ مگر حقیقت اس کو ٹھیک ٹھیک حل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ سب سے پہلے جمعہ کی شرعی حیثیت، اور اقامت جمعہ سے شارع کے مقصود کو سمجھا جائے، پھر یہ دیکھا جائے کہ کتاب اللہ وسنت رسول میں اقامت جمعہ کے متعلق کیا ہدایات دی گئی ہیں اور ان ہدایات میں کیا مصالح پوشیدہ ہیں، نیز اس امر کی تحقیق کی جائے کہ ان ہدایات کی بنا پر اقامت جمعہ فی القریٰ کے جواز و عدم جواز میں ائمہ مجتہدین کے درمیان جو اختلافات ہوئے ہیں، ان میں سے ہر ایک گروہ نے شارع کے پیش نظر مقاصد و مصالح کو کس حد تک ملحوظ رکھا ہے اب انہی مقاصد و مصالح کے لحاظ سے یجوز اور لا یجوز میں سے کونسا پہلو اختیار کرنا چاہیے۔

شریعت اسلامی کے احکام میں تدبر کرنے سے یہ بات ہم کو واضح طور پر معلوم ہوتی ہے کہ شریعت دراصل متقین وصالحین کی ایک ایسی جماعت بنانا چاہتی ہے جو زمین میں خلافت الٰہی کے فرائض کو ادا کرے، اور ایک ایسا تمدن وجود میں لائے جس میں انسانی فطرت کی بھلائیوں کو نشو ونما دینے اور برائیوں کو دبا دینے کی قوت ہو۔ اس بنیادی مقصد کی وجہ سے شریعت کے تمام احکام کا رجحان اجتماعیت کی طرف ہے۔ وہ اگرچہ اپنی پوری قوت افراد کے تزکیہ وتصفیہ پر صرف کرتی ہے، مگر اس کام میں اس کے پیش نظر محض فرد کو بحیثیت فرد پاک کرنا نہیں ہوتا، بلکہ اسے پاک کرکے ایک بہترین سوسائٹی کی رکنیت کے لیے تیار کرنا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے افراد کے تزکیہ کے لیے جتنی تدبیریں اختیار کی ہیں وہ کم و بیش سب کی سب ایسی ہیں جو فرداً فرداً ان کا تزکیہ بھی کرتی ہیں اور اس کے ساتھ ان کو باہم جوڑ کر ایک اعلیٰ درجہ کی جماعت بھی بناتی ہیں۔ مثال کے طور پر روزے کو لیجیے۔ یہ بجائے خود صرف فرد کے تزکیۂ نفس کا ذریعہ ہے لیکن شارع نے ایک ہی زمانہ میں تیس دن کے روزے تمام مسلمانوں پر فرض کیے تاکہ وہ اسی مزکی ومطہر حالت میں اس اجتماعی عبادت کے ذریعہ صالحین ومتقین کی ایک جماعت بن جائیں۔ زکوٰۃ کو دیکھیے اس کی تو بنیاد ہی

اجتماعیت پر ہے۔ یا ایک نفس کا تزکیہ ہی اس طرح کرتی ہے کہ وہ دوسرے نفس یا نفوس کی امداد و اعانت کرے۔ حج کو دیکھیے اس میں اجتماع کا پہلو اس قدر نمایاں ہے کہ اس کو نمایاں کرنے کی حاجت ہی نہیں۔ ان سب کے بعد نماز کو لیجیے جو ان سب سے زیادہ اہم ہے اور افراد کو صلاح و تقویٰ کی تربیت دینے کے لیے سب سے زیادہ کارگر تدبیر ہے کہ ہر روز پانچ مرتبہ وہ کام کرتی ہے جو سال میں تیس مرتبہ روزہ، اور سال میں ایک مرتبہ صدقہ اور عمر بھر میں ایک مرتبہ حج کرتا ہے۔ اس عبادت میں بھی شارع نے تربیت افراد کے ساتھ اپنے اصل مقصد یعنی مدنیت صالحہ کی تاسیس اور جماعت متقین کی تنظیم کو پیش نظر رکھا ہے وہ روزانہ پانچ مرتبہ نماز کو با جماعت ادا کرنے کا حکم دیتا ہے تاکہ کم یا زیادہ جتنے بھی مسلمان کہیں جمع ہوں یا جمع ہو سکتے ہوں وہ سب ملکر فریضہ ادا کریں۔ پھر وہ ہفتہ میں ایک مرتبہ ایک خاص وقت اس غرض کے لیے مقرر کرتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ مسلمان یکجا مجتمع ہوں اور مل کر باقاعدگی کے ساتھ خدا کا ذکر کریں اور اس کی عبادت بجا لائیں۔ اس ہفتہ وار اجتماع کے بعد وہ ہر سال اختتام ماہ صیام اور یادگار اسوۂ ابراہیمی جیسے اہم نفسیاتی مواقع پر ان کو اجتماع عام کی دعوت دیتا ہے تاکہ اسی عمارت کی تکمیل ہو جس کی نماز پنجگانہ تاسیس کرتی ہے اور نماز جمعہ توسیع و ترصیص۔

اس بیان سے یہ بات واضح ہو گئی کہ تمام عبادات میں شارع کا رجحان اجتماعیت کی جانب ہے اور وہ ہر عبادت میں موقع و محل کی مناسبت کے لحاظ سے انفرادیت اور انتشار کو زیادہ سے زیادہ گھٹانے اور اجتماعیت کو زیادہ سے زیادہ بڑھانے کی کوشش کرتا ہے۔ نماز پنجگانہ میں اس کا موقع نہ تھا کہ جماعت کو فرض کر دیا جاتا کیونکہ ہر روز ہر شخص کے لیے پانچ مرتبہ جماعت کے التزام کو فرض کر دینے میں بہت زیادہ حرج تھا۔ اس لیے صرف جماعت کی تاکید کر کے چھوڑ دیا گیا اور اجازت دے دی گئی کہ جو شخص با جماعت ادا نہ کر سکے وہ تنہا پڑھ لے۔ یہ ڈھیل جو شخصی حالات و ضروریات کے لحاظ سے دی گئی تھی اس کی تلافی کے لیے ہفتہ میں ایک مرتبہ ایک ایسی نماز فرض کی گئی جو بغیر جماعت کے

ادا ہی نہیں ہوتی یہی نماز جمعہ ہے، اور یہ فرض چونکہ اس رعایت کے نقصان کو پورا کرنے کے لیے عائد کیا گیا ہے جو نماز پنج گانہ میں انفرادیت اور انتشار کو بڑی حد تک راہ دیتی ہے، اس لیے شارع کا منشا یہ ہے کہ اس فرض کو ادا کرنے میں زیادہ سے زیادہ اجتماع کا اور جہاں تک ہو سکے تفرق اور انتشار کو دور کیا جائے۔

اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ جمعہ کی فرضیت پر کتاب و سنت میں اس قدر زور کیوں دیا گیا ہے اور اس کی اقامت کو اتنی اہمیت کس لیے دی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

| | |
|---|---|
| يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَوٰةِ مِن يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ۔ (الجمعۃ: ۲) | اے ایمان والو جب جمعہ کے روز نماز کے لیے ندا کی جائے تو دوڑو خدا کی یاد کی طرف اور خرید و فروخت چھوڑ دو یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانتے ہو |

نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:۔

| | |
|---|---|
| لقد هممت ان امر رجلا يصلي بالناس ثم احرق على رجال يتخلفون عن الجمعة بيوتهم۔ (مسلم) | میرا جی چاہتا ہے کہ اپنی جگہ کسی کو نماز پڑھانے کے لیے کھڑا کر جاؤں اور ان لوگوں کے گھروں کو آگ لگا دوں جو جمعہ کی نماز کے لیے نہیں آتے۔ |
| مَنْ تَرَكَ الْجُمُعَةَ مِنْ غيرِ ضرورةٍ كتب منافقًا في كتاب لا يمحى ولا يبدل (رواہ الشافعی) | جو شخص بلا ضرورت جمعہ چھوڑ دے اس کا نام منافق کی حیثیت سے اُس کتاب میں لکھا جائے گا جس کا لکھا نہ مٹایا جا سکتا ہے نہ بدلا جا سکتا ہے۔ |
| مَنْ كَانَ يؤمن باللهِ واليومِ الآخرِ فعليه الجمعة ..... فمن استغنى بلهو | جو کوئی اللہ اور روز آخرۃ پر ایمان رکھتا ہو اس پر جمعہ کے دن نماز جمعہ لازم ہے ..... پھر جو کوئی کھیل |

| | |
|---|---|
| و تجارۃ استغنی اللہ عنہ و اللہ غنی حمید (دار قطنی)۔ | تماشے یا کاروبار کی خاطر اس سے بے پروائی برتے اللہ اس سے بے نیازی برتے گا اور وہ پاک بے نیاز ہے۔ |
| لینتھین اقوام عن ودعھم الجمعات او لیختمن اللہ علی قلوبھم ثم لیکونن من الغافلین (مسلم)۔ | لوگ جمعہ کی نمازیں ترک کرنے سے باز آجائیں ورنہ اللہ ان کے دلوں پر مہر لگا دے گا۔ پھر وہ غفلت میں مبتلا ہو جائیں گے۔ |
| من ترک ثلث جمعات من غیر عذر کتب من المنافقین۔ | جو شخص بغیر کسی عذر کے تین جمعے چھوڑ دے اس کا نام منافقین میں لکھا جائے گا۔ |

یہ جمعہ کے لیے دوڑنے اور کاروبار چھوڑنے کی تاکید کیوں ہے؟ یہ نبی کریم جیسے رؤف و رحیم آقا کے دل میں تارکین جمعہ کے گھروں کو آگ لگا دینے کا جذبہ کس لیے پیدا ہو رہا ہے؟ آخر جمعہ میں کیا ہے جس کی وجہ سے ترک جمعہ اور نفاق کو ہم معنی قرار دیا گیا اور اس پر اتنی سخت وعیدیں بیان فرمائی گئیں؟ اس کی علت بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ جمعہ ہی کی اقامت امت مسلمہ کا قوام ہے اور اسی نماز سے نماز پنجگانہ کے مقصد کی تکمیل ہوتی ہے، اور یہی وہ چیز ہے جس سے اسلام کا اصل مقصد حاصل ہوتا ہے یعنی مدنیت فاضلہ و جمعیت صالحہ کی تشکیل۔ اس کا ضائع ہونا گویا اسلام کے مقصد کا ضائع ہونا ہے۔ اور اس کی بنا کو منہدم کرنا اسلام کی عمارت کو ڈھا دینا ہے۔

یہاں تک جو کچھ عرض کیا گیا اس سے دو باتیں معلوم ہو گئیں:-

ایک یہ کہ جمعہ کی فرضیت عام نمازوں کی فرضیت سے زیادہ موکد ہے اور اس کی اقامت اسلام کے مقاصد اصلیہ کی تکمیل کے لیے غایت درجہ اہمیت رکھتی ہے۔ لہذا فروعی و اجتہادی مسائل میں ان پہلوؤں سے بچنا چاہیے جن سے جمعہ ضائع ہوتا ہو اور ان پہلوؤں کو اختیار کرنا چاہیے جن سے جمعہ قائم ہوتا ہو۔

دوسرے یہ کہ اقامت جمعہ میں شارع کے پیش نظر مدنیت و اجتماعیت ہے، اور وہ اس ذریعے

وحشت اور انتشار کو دور کرکے اہل ایمان کو اجتماع اور اختلاف کی طرف لانا چاہتا ہے۔ لہٰذا جمعہ کو قائم کرنے میں اس امر کو خاص طور پر ملحوظ رکھنا چاہیے کہ جماعتیں منتشر نہ ہوں بلکہ زیادہ سے زیادہ اجتماع ہو۔

اب آگے بڑھیے کتاب اللہ میں جمعہ کی فرضیت اور اس کی تاکید تو اس قوت کے ساتھ بیان کی گئی ہے کہ اس کی طرف دوڑنے اور اس کے لیے سب کاروبار چھوڑ دینے کا حکم ہے فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ۔ مگر ان سوالات پر کوئی روشنی نہیں ڈالی گئی کہ یہ نماز کب پڑھی جائے۔ کہاں پڑھی جائے اور کہاں نہ پڑھی جائے، کون پڑھے اور کون نہ پڑھے، کن حالات میں پڑھی جائے اور کن میں نہ پڑھی جائے، ان سب سوالات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت پر چھوڑ دیا گیا اور اہل ایمان سے صرف اس قدر کہنے پر اکتفا کیا گیا کہ اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ جب پکارا جائے جمعہ کی نماز کے لیے۔

مذکورہ بالا سوالات کے متعلق تفصیلی ہدایات ہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور آپ کے متواتر عمل سے ملتی ہیں۔ اور مزید روشنی ان بزرگوں کے اقوال و اعمال سے حاصل ہوتی ہے جنہوں نے براہ راست حضور سے تعلیم پائی تھی۔ ان ذرائع سے ہم کو قطعی طور پر جو باتیں معلوم ہوتی ہیں وہ یہ ہیں۔

(۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ نے جمعہ کی نماز ہمیشہ ظہر کے وقت پڑھی ہے۔ لہٰذا جمعہ کا وقت ظہر کا وقت ہے۔

(۲) آپ نے اور آپ کے صحابہ نے کبھی خطبہ کے بغیر جمعہ نہیں پڑھا۔ لہٰذا جمعہ کی نماز کے ساتھ خطبہ ضروری ہے۔

(۳) جمعہ کی فرضیت سے غلام عورتیں بچے مسافر اور مریض مستثنیٰ ہیں۔ فرض جن پر عائد ہوتا ہے وہ صرف ایسے عاقل و بالغ مرد ہیں جو آزاد ہوں اور مقیم و تندرست ہوں۔ وغیرہ

(۴) عہد نبوی اور عہد صحابہ میں جمعہ کبھی ویرانوں اور جنگلوں اور عارضی فرودگاہوں (خیام

میں نہیں پڑھا گیا، لہٰذا اقامت جمعہ کیلیے ایسی جگہ ہونی چاہیے جہاں مستقل آبادی ہو۔

(۵) جمعہ کبھی پرائیویٹ مکانوں میں نہیں پڑھا گیا بلکہ ہمیشہ ایسی جگہ پڑھا گیا ہے۔ جہاں مسلمانوں کو حاضر ہونے کی آزادی ہو، لہٰذا جمعہ کے لیے اذن عام ضروری ہے۔

یہ وہ امور ہیں جن پر تمام امت کا اتفاق ہے، کیونکہ یہ قطعی طور پر ثابت ہیں جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا۔ ان کے علاوہ جتنے جزئی امور ہیں ان سے کوئی بھی قطعی طور پر ثابت نہیں ہے۔ اس لیے ان میں فقہاء کے درمیان بکثرت اختلافات ہوئے ہیں مثلاً یہ کہ نصاب جماعت کیا ہو؟ جمعہ کون قائم کرے؟ خطبے دو ہونے چاہئیں یا ایک کافی ہے؟ وقلم جرا۔ اسی قبیل سے ایک سوال یہ بھی ہے کہ جمعہ کے لیے کس قسم کی بستی ہونی چاہیے اور اس بستی سے کتنے فاصلہ تک کے لوگوں کو نماز کے لیے آنا چاہیے۔

امام شافعی کی رائے یہ ہے کہ ایسے قریوں میں جمعہ ناجائز ہے جن کے باشندے گرمی یا جاڑے میں کہیں اور منتقل ہو جاتے ہوں۔ ان کے سوا ایسے تمام قریوں میں جمعہ کی نماز ہو سکتی ہے جن میں چالیس یا اس سے زیادہ عاقل و بالغ آزاد مرد موجود ہوں۔ اس کی تائید میں وہ اس روایت سے استدلال کرتے ہیں جو ابن عباس سے مروی ہے کہ مدینہ کے بعد پہلا جمعہ جو پڑھا گیا وہ بحرین کے ایک قریہ جواثی میں تھا۔ نیز وہ روایت بھی ان کے لیے دلیل ہے کہ حضرت عمر نے اہل بحرین کے استفسار کا جواب دیتے ہوئے لکھا کہ جمعہ ادا کرو جہاں کہیں بھی ہو۔ مگر ان میں سے پہلی روایت میں محض قریہ کا لفظ ہے۔ جس کا کوئی مفہوم متعین نہیں کم از کم اس سے چالیس مردوں کی قید تو کسی طرح نہیں نکلتی اور ہم کچھ نہیں جانتے کہ امام صاحب کے نزدیک اس قید کا ماخذ کیا ہے۔ رہی دوسری روایت تو وہ جس قدر امام صاحب کی تائید میں ہے۔ اسی قدر ان کے خلاف بھی ہے۔ اس سے تو جنگل اور ویرانے میں بھی اقامت جمعہ کا جواز نکالا جا سکتا ہے حالانکہ امام صاحب اس کے ناجائز ہونے کو تسلیم کرتے ہیں۔

امام احمد کا مسلک۔ امام شافعی سے ملتا جلتا ہے اور ان کے دلائل بھی وہی ہیں۔

امام مالک کے نزدیک جمعہ کی نماز ہر ایسے قریہ میں ہو سکتی ہے جس کی آبادی مستقل ہو خواہ اس کی آبادی چالیس مردوں سے بھی کم ہو۔

امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ جمعہ صرف مصر یعنی شہر میں قائم کیا جا سکتا ہے۔ دیہات میں قائم کرنا جائز نہیں۔ ان کا استدلال ایک تو اس روایت سے ہے جو حضرت علی سے منقول ہے کہ لاجمعۃ ولاتشریق ولافطر ولااضحیٰ الا فی مصرجامع نیز وہ اس بات سے بھی دلیل لاتے ہیں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے جب ممالک فتح کیے تو دیہات میں کہیں بھی منبر نصب نہیں کیے۔ یہ گویا جمعہ کے لیے مصر کے شرط ہونے پر صحابہ کا اجماع ہے لیکن مصر کی تعریف میں خود حنفیہ کے درمیان بہت اختلافات ہیں حتیٰ کہ خود امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کے بھی دو مختلف قول ہیں۔ مثال کے طور پر چند اقوال ملاحظہ ہوں:۔

(۱) مصر جامع وہ ہے جہاں امیر اور قاضی ہو جو احکام نافذ کرے اور حدود جاری کرے۔

(۲) جہاں کی سب سے بڑی مسجد میں اگر سب باشندے جمع ہوں تو سما نہ سکیں۔

(۳) جہاں بازار اور شوارع اور محلے ہوں اور کوئی حاکم ایسا ہو جو ظالم سے مظلوم کا انصاف لے، اور کوئی عالم ایسا ہو جس کی طرف مسائل میں رجوع کیا جا سکے۔

(۴) امام جس مقام کو مصر قرار دے اور اقامت جمعہ کا حکم کرے۔

(۵) جہاں ہر پیشہ کا آدمی اپنے پیشہ سے بسر اوقات کر سکتا ہو۔

(۶) جس کی آبادی دس ہزار ہو۔

(۷) جس کی آبادی تین ہزار سے کم نہ ہو۔

اس قسم کی بیسیوں تعریفیں اور بھی ہیں جو فقہاء نے بیان کی ہیں۔

اب یہ امر غور طلب ہے کہ اول تو "مصر" کے شرط ہونے پر امت کا اجماع نہیں بلکہ محدثین اور

فقہاء کی ایک کثیر جماعت اس سے اختلاف رکھتی ہے، دوسرے یہ شرط اگر ثابت بھی ہو تو واضح طور پر معلوم نہیں کہ مصر کہتے کس کو ہیں۔ ایسی حالت میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس قسم کی مختلف فیہ اور مبہم شرط کے فقدان پر کیا نماز جمعہ جیسے موکد اور اہم فریضہ کو مسلمانوں پر سے ساقط کر دینا درست ہے؟ جو لوگ صرف فقہائے متقدمین کی عبارات پر اعتماد کرتے ہیں اور جن کی نظر کتب فقہ کے الفاظ سے آگے نہیں جاتی ان کے لیے یہ فتویٰ دینا بہت آسان ہے کہ فلاں مقام چونکہ "مصر" نہیں ہے لہٰذا وہاں کے باشندوں پر سے جمعہ کا فرض ساقط ہے لیکن ایک طرف تقویٰ اور دوسری طرف تفقہ اس کا مقتضی ہے کہ اسقاطِ فرض کی جرأت کرنے سے پہلے یہ دیکھا جائے کہ ائمہ مجتہدین رحمہم اللہ کے اختلافات کا منشا کیا ہے، اور انہوں نے شارع کے مقصد کو پورا کرنے کے لیے جو مختلف صورتیں اختیار کی ہیں ان کی اصلی روح کیا ہے۔

جیسا کہ ہم اوپر عرض کر چکے ہیں اقامت جمعہ میں دو امور بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ ایک جمعہ کی فرضیت، جو عام نمازوں سے بھی زیادہ موکد ہے، اور ہر عاقل بالغ آزاد اور تندرست مرد پر عائد ہوتی ہے۔ دوسرے اجتماعیت جس کا مقصد انتشار کو دور کرنا اور مسلمانوں کے درمیان زیادہ سے زیادہ اجتماع اور تالف پیدا کرنا ہے۔ ائمہ مجتہدین میں سے ہر ایک نے ان دونوں پہلوؤں پر نظر رکھی ہے، اور دونوں کو مرعی رکھنے کی کوشش کی ہے لیکن اس معاملہ میں اشکال یہ واقع ہوتا ہے کہ بعض حالات میں یہ دونوں پہلو جمع نہیں ہو سکتے۔ اگر فرضیت پر زیادہ زور دیا جاتا ہے تو اجتماعیت کا پہلو چھوٹ جاتا ہے، کیونکہ فرضیت کا تقاضا یہ ہے کہ دو چار آدمی بھی جہاں موجود ہوں، وہیں فرض ادا کر دیا جائے۔ اور اگر اجتماعیت پر زیادہ زور دیا جاتا ہے تو فرضیت کا پہلو کمزور ہو جاتا ہے، کیونکہ اس کا تقاضا یہ ہے کہ جہاں کافی اجتماع نہ ہو وہاں افراد پر سے فرض ساقط کر دیا جائے۔ ائمہ مجتہدین نے اس اشکال کو دور کرنے کے لیے دونوں پہلوؤں میں توازن پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ امام شافعی اور

امام احمد نے چالیس کو شارع کا دوسرا مقصد پورا کرنے کے لیے کافی سمجھا چنانچہ ہر ایسے قریہ میں اقامت جمعہ کا حکم دیدیا جہاں اجتماع کا یہ نصاب پورا ہوتا ہو، اور فتوی دیا کہ اس قریہ سے جہاں جہاں تک اذان کی آواز پہنچتی ہو وہاں کے ہر بالغ اور آزاد مرد پر نماز کے لیے آنا فرض ہے۔ امام مالک اجتماع کے لیے کم سے کم ۱۲۔ آدمیوں کی موجودگی کو کافی سمجھتے ہیں، اس لیے انہوں نے اور بھی زیادہ چھوٹے قریوں میں اقامت جمعہ کا حکم دیا اور ان سب لوگوں پر جمعہ کی حاضری لازمی قرار دی جو مقام جمعہ سے چھ میل کی حد میں ہوں۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ نے محسوس کیا کہ اس طرح قریہ قریہ میں اقامت جمعہ کی اجازت دینے سے انتشار پیدا ہوتا ہے، اور اجتماع سے شارع کا جو مقصد ہے وہ پوری طرح حاصل نہیں ہوتا۔ انہوں نے یہ بھی دیکھا کہ عراق و شام وغیرہ ممالک میں، جہاں عہد صحابہ کے آثار اس وقت تک بالکل تازہ تھے، کہیں دیہات میں منابر اور جوامع نہیں پائے جاتے۔ ان تک حضرت علی کا وہ اثر بھی پہنچا جس میں تصریح ہے کہ جمعہ صرف امصار (شہروں) میں قائم کیا جائے۔ انہوں نے یہ بھی سنا کہ جب حجاج نے اھواز میں جمعہ قائم کیا تو امام حسن بصری نے فرمایا "لعن اللہ الحجاج یترک الجمعۃ فی الامصار ویقیمها فی حلاقیم البلاد"۔ "خدا کی لعنت ہو حجاج پر یہ کم بخت شہروں کو چھوڑ کر ملک کے گوشوں میں جمعہ قائم کرتا ہے" ان سب باتوں پر نظر کرکے انہوں نے فتوی دیا کہ ہر علاقہ کے صدر مقام میں جمعہ قائم کیا جائے اور جن جن لوگوں پر جمعہ کا فرض عائد ہوتا ہو وہ سب مضافات سے صدر مقام پر اکٹھے ہو جایا کریں۔

اب ہمیں ایک نظر اس زمانہ کے حالات پر بھی ڈالنی چاہیئے وہ اسلامی حکومت کا زمانہ تھا جگہ جگہ پرگنوں اور قصبوں میں قاضی اور اصحاب شرط (کوتوال) مقرر تھے جو خصومات کے فیصلے کرتے اور مظالم کی دادرسی کرتے تھے۔ ایک کثیر جماعت کے مجتمع ہونے میں چونکہ فتنہ و فساد پیدا ہونیکا بھی احتمال ہے اس لیے اجتماع کی غرض سے ایسی ہی جگہ زیادہ مناسب تھی جہاں امن قائم کرنے والے موجود

ہوں۔ پھر اکابر احناف کا زمانہ وہ تھا جب عراق اور الجزیرہ اور فارس وغیرہ ممالک کی آبادی بہت زیادہ اوگھنی تھی۔ قصبات اور دیہات کثرت آبادی کے سبب سے باہم پیوستہ ہو گئے تھے۔ تمدن بھی انتہائی عروج پر تھا۔ صنعت و حرفت اور تجارت کے فروغ نے قصبوں کو بھی شہر بنا دیا تھا۔ انہی وجوہ سے "شہر" کی وہ تعریفیں کی گئیں جو آپ سنے اوپر دیکھی ہیں۔ ورنہ فی نفسہ قاضی اور کوتوال یا بازار اور شوارع یا دس ہزار اور تین ہزار کی آبادی کو فرضیت جمعہ کے اشتراط میں کوئی بھی دخل نہیں۔ اصل شرط "مصر" ہے۔ اور اس کے مدلول کو متعین کرنے کے لیے ہر فقیہ مجتہد نے وہ خصوصیات بیان کی ہیں جو اس کے پیش نظر امصار میں پائی جاتی تھیں۔ ان خصوصیات سے قطع نظر کر کے اگر دیکھا جائے کہ وہ چیز کیا ہے جس کی بنا پر "مصر" کو شرط جمعہ قرار دیا گیا ہے، تو معلوم ہوگا کہ وہ "مرکزیت" اور صرف مرکزیت ہے۔ جو مقام کسی علاقہ کا صدر مقام ہو یا جمعہ کی غرض کیلیے صدر مقام بنا لیا جائے وہ "مصر" ہے اور اس کے سوا دوسرے مقامات پر اقامت جمعہ کا ناجائز ہونا اس معانی میں نہیں ہے کہ ان مقامات کے لوگوں سے جمعہ کا فرض ساقط ہے، بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کو جمعہ کے لیے صدر مقام پر آنا چاہیے۔ اگر بغیر عذر شرعی کے وہ نہ آئیں گے تو گنہگار رہوں گے۔

اس باب میں فقہا حنفیہ کے اقوال کی چھان بین کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصر کی شرط عائد کرنے اور دیہات میں اقامت جمعہ کو ناجائز قرار دینے سے ان کا منشا بھی وہی تھا جو ہم نے سمجھا ہے علامہ ابن ہمام لکھتے ہیں:۔

| | |
|---|---|
| ولو مصر الامام موضعًا وامرهم بالاقامة فيه جاز (فتح القدير ج ۱ ص ۴۰۹) | اگر امام کسی مقام کو مصر قرار دے اور لوگوں کو جمعہ پڑھنے کا حکم دے تو جائز ہوگا۔ |

یہاں "مصر قرار دینے کا مجاز امام کو ٹھیرایا گیا ہے، اس لیے کہ صحیح معنوں میں اسلامی زندگی

بغیر امام اور امیر کے ہو نہیں سکتی۔ لیکن جہاں بدقسمتی سے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں امامت و امارت
کا منصب باقی نہ رہا ہو، وہاں امام مالک رحمہ اللہ کے اصول پر مسلمانوں کی جماعت باہمی اتفاق
سے وہ سب کام کر سکتی ہے جو شرع میں امام سے متعلق کئے گئے ہیں، یعنی بالفاظ دیگر ایسے حالات میں
مسلمانوں کا اتفاق رائے امام کا قائم مقام ہو جاتا ہے۔ پس اگر ایک دیہاتی علاقہ کے مسلمان باہمی
اتفاق سے اپنے علاقہ کے کسی بڑے گاؤں یا قصبہ کو جہاں مسلمانوں کی آبادی نسبتہً زیادہ ہو اور جہاں
کوئی بڑی مسجد بھی موجود ہو، جمعہ کی اغراض کے لیے "مصر" قرار دے لیں تو وہ مقام "مصر" ہی ہوگا
خواہ اس پر مصر کی اُن تعریفات میں سے کوئی تعریف صادق نہ آئے جو کتب فقہیہ میں مذکور ہیں۔

آگے چل کر علامہ موصوف لکھتے ہیں:

ومن كان في توابع المصر فحكمه حكم اهل المصر في وجوب الجمعة عليه بان ياتي المصر فيصليها فيه واختلفوا فيه فعن ابي يوسف ..... انما تجب في ثلثة فراسخ وقال بعضهم قدر ميل وقيل قدر ميلين وقيل ستة اميال وعن مالك ستة وقيل ان امكنه ان يحضر الجمعة ويبيت باهله من غير تكلف تجب عليه الجمعة والا فلا قال في البدائع وهذا حسن (فتح القدير ج ۱ ص ۴۱۲)

اور جو شخص مصر کے مضافات کا رہنے والا ہو اس پر بھی اہل مصر کی طرح جمعہ فرض ہے اور لازم ہے کہ وہ وہاں جا کر نماز پڑھے۔ مضافات کی حد میں فقہا کے درمیان اختلاف ہے ابو یوسف کہتے ہیں ..... کہ وہ تین کوس کی حد میں واجب ہے بعض نے ایک میل، بعض نے دو میل، بعض نے چھ میل کی حد قرار دی ہے۔ امام مالک نے بھی ۶ میل کہا ہے اور ایک قول یہ ہے کہ اگر کوئی شخص جمعہ میں شریک ہونے کے بعد رات آنے سے پہلے بلا کسی زحمت و تکلیف کے اپنے گھر پہنچ سکتا ہو اس پر جمعہ کی حاضری واجب ہے ورنہ نہیں۔ صاحب بدائع نے اسی قول کو پسند کیا ہے۔

بعض احادیث سے بھی اس موخر الذکر قول کی تائید نکلتی ہے۔ چنانچہ ترمذی نے ابوہریرہ سے روایت کیا ہے۔

عن النبی صلعم قال الجمعۃ من اٰواہ اللیل الیٰ اھلہ

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جمعہ اس پر فرض ہے جو رات تک اپنے بال بچوں میں پہنچ سکتا ہو۔

بخاری میں ہے:—

عن عائشۃ زوج النبی قالت کان الناس ینتابون الجمعۃ من منازلھم والعوالی فیاتون فی الغبار فیصیبھم الغبار والعرق فیخرج منھم العرق فاتی رسول اللہ صلعم انسان منھم وھو عندی فقال لو انکم تطھرتم لیومکم ھذا۔

حضرت عائشہ کی روایت ہے کہ لوگ اپنی فرودگاہوں اور عوالی سے نماز جمعہ کے لیے آیا کرتے تھے اور ان پر گرد اور پسینہ کی تہیں چڑھ جاتی تھیں۔ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے ہاں تشریف رکھتے تھے کہ ان لوگوں میں سے ایک شخص آپ کے پاس حاضر ہوا۔ آپ نے فرمایا بہتر ہو اگر تم اس دن غسل کر لیا کرو۔

پہلی حدیث تو صاف ہے رہی دوسری حدیث تو اس میں یہ ذکر ہے کہ لوگ شرکت جمعہ کے لیے عوالی سے آیا کرتے تھے۔ عوالی ان دیہات کا نام ہے جو مدینہ طیبہ کے مضافات میں واقع تھے۔ اور علامہ ابن حجر نے لکھا ہے کہ یہ دیہات مدینہ سے چار میل اور اس سے زیادہ مختلف فاصلوں پر تھے۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ عوالی سے اونٹ پر یا پیدل جمعہ کے لیے آتے ہوں گے وہ اس بیگ زمیں شام تک لگ بھگ ہی اپنے گھروں کو واپس پہنچتے ہوں گے۔ یہ اس زمانہ کی کیفیت ہے جب بسیں اور لاریاں نہ چلتی تھیں سائکلیں اور موٹر سائکلیں بھی نہ تھیں۔ ریل کا بھی وجود نہ تھا۔ پختہ سڑکیں تک نہ تھیں۔ اس زمانہ میں جب لوگوں کو چھ چھ میل کے فاصلوں سے آنے کے لیے کہا گیا تو آج جبکہ نقل و حمل کی آسانیاں بہت بڑھ گئی

ہیں لوگوں کے لیے بیس بیس میل سے بھی جمعہ کے لیے آنا کچھ مشکل نہیں۔ تاہم اختلاف احوال کو پیش نظر رکھکر یہ مناسب نہیں کہ فاصلہ کی مقدار میلوں کے حساب سے متعین کی جائے بلکہ وہی قید بہتر ہے جو شافعی نے بیان فرمائی ہے یعنی جو شخص نماز کے بعد مغرب تک اپنے گھر باسانی پہنچ سکتا ہو وہ اپنے علاقہ کے صدر مقام میں جاکر جمعہ پڑھے' اور جو نہ پہنچ سکتا ہو وہ اپنے ہی گاؤں میں ظہر پڑھ لیا کرے۔

اس سلسلہ میں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ فقہاء کرام نے مصر کی جو خصوصیات بیان کی ہیں وہ بالکل ناقابل لحاظ نہیں ہیں کسی دیہاتی علاقہ کے مسلمان جب اپنے علاقہ کے کسی قصبہ کو جمعہ کی اغراض کے لیے "مصر" قرار دینا چاہیں تو انھیں انتخاب میں حسب ذیل امور کا لحاظ رکھنا چاہیے۔

(۱) وہاں مسلمانوں کی آبادی زیادہ سے زیادہ ہو۔

(۲) کوئی بڑی مسجد موجود ہو جس میں زیادہ سے زیادہ اجتماع ہو سکتا ہو۔

(۳) کوئی ایسا عالم موجود ہو جو مسائل شرعیہ کی تعلیم دے سکے اور وعظ و تذکیر کی اچھی قابلیت رکھتا ہو۔

(۴) جہاں سرکاری حکام میں سے کوئی ایسا حاکم موجود ہو جو امن قائم رکھنے کا ذمہ دار ہو۔

یہ امور اقامت جمعہ کے شرائط میں سے نہیں ہیں، بلکہ مقام جمعہ کے انتخاب میں ان کو ملحوظ رکھنا انسب اور اولیٰ ہے۔ هٰذا ما عندی واللّٰہ اعلم بالصواب۔

# مطبوعات

**تفسیر سورہ کوثر** تالیف مولٰنا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ۔ ترجمہ مولٰنا امین احسن اصلاحی ضخامت تقریباً سوا سو صفحات قیمت ۸ر۔ دائرۂ حمیدیہ، سرائے میر (ضلع اعظم گڈھ)۔

ناظرین ترجمان القرآن کو یاد ہوگا کہ مولانا حمید الدین مرحوم کی اس تفسیر کا ترجمان صفحات میں باقساط شائع ہو چکا ہے۔ اب وہی چیز ایک مستقل رسالہ کی صورت میں دائرہ حمیدیہ سے شائع ہوئی ہے۔ مصنف علّام نے عموماً قرآن مجید کی چھوٹی چھوٹی صورتوں کے اسرار و معارف بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیے ہیں اور ان کے موقع نظم کلام موقع و محل اور جامع الفاظ پر اس قدر تفصیل کر نگاہ ڈالی ہے کہ ہر سورت اکثر و بیشتر مضامین قرآنی کا ایک جامع خلاصہ نظر آنے لگتی ہے لیکن خصوصیت کے ساتھ سورۂ کوثر کی تفسیر میں وہ اپنے انتہائی کمال کو پہنچ گئے ہیں۔ معنی کوثر کی تحقیق، عطیۂ کوثر کے بعد ہی صلوٰۃ اور نحر کا حکم دینے کی حکمت، پھر صلوٰۃ و نحر کے باہمی تعلق، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو نعمت کوثر سے سرفراز کرنے کے ساتھ کفار کو ابتر قرار دینے کی وجہ اور اس سے فتح مکہ کی کھلی ہوئی بشارت نکلنے پر انہوں نے غایت درجہ بالغ نظری کے ساتھ کلام کیا ہے اور ایسے ایسے نکات بیان کئے ہیں کہ اس چھوٹی سی صورت کی عظمت کا سکہ دل پر بیٹھ جاتا ہے حالانکہ یہ وہی سورت ہے جس کو لوگ یونہی رواروی میں پڑھ جاتے ہیں۔ مولٰنا نے فصل لربک وانحر کی جو تفسیر بیان فرمائی ہے، اسے خاص طور پر ان حضرات کو غور سے پڑھنا چاہیے جو آج کل قربانی کو ایک مہمل اور فضول رسم قرار دے رہے ہیں اور اسلامی زندگی کے پروگرام سے اس کو خارج کر دینا چاہتے ہیں۔

**تفسیر سورہ لہب** تالیف مولٰنا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ۔ ترجمہ مولٰنا امین احسن اصلاحی ضخامت ۴۴ صفحات قیمت ۲ر۔ دائرۂ حمیدیہ۔ سرائے میر (ضلع اعظم گڑھ)۔

قرآن مجید کی اس سورۃ پر دشمنان اسلام کا پرانا اعتراض ہے کہ یہ سراسر کوسنے اور گالیوں پر مشتمل ہے اور کوسنے اور گالیاں دینا خدا کی شان سے بعید ہے۔ علامہ حمید الدین کی تفسیر اس اعتراض کا پوری طرح قلع قمع کر دیتی ہے، اور سورۂ لہب کا اصلی حسن تفسیر کے آئینہ میں چمکتا نظر آتا ہے۔ انہوں نے ثابت کیا ہے کہ یہ سورۃ دراصل بد دعا نہیں بلکہ ایک ایسی پیشین گوئی ہے جو حرف بحرف صحیح نکلی۔ اس سلسلہ میں انہوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ کفار قریش میں سے خاص طور پر ابولہب کو ہلاکت اور تباہی کی پیشین گوئی کے لیے چن لینے اور پھر اس کے ساتھ اس کی بیوی کا ذکر کرنے کی کیا وجہ ہے، اور ان دونوں میاں بیوی کے لیے سیصلیٰ نارا ذات لہب اور حمالۃ الحطب اور فی جیدھا حبل من مسد کی جو سزائیں قیامت کے روز تجویز کی گئی ہیں وہ ان دونوں کے کیرکٹر سے کیا مناسبت رکھتی ہیں۔

اسباق النحو | تالیف مولانا حمید الدین فراہی رحمہ اللہ۔ ضخامت ۱۵ صفحات قیمت درج نہیں ہے غالباً ۲ر ہوگی۔ دائرہ حمیدیہ، سرائے میر (اعظم گڈھ)

اس کتاب میں مولانا نے عربی زبان کے قواعد کو انتہائی سہل انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ ایک اعلیٰ درجہ کے قواعد داں تھے۔ اور انہوں نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ اس فکر میں صرف کیا تھا کہ عربی زبان کی تحصیل کو زیادہ سے زیادہ سہل کیا جائے تاکہ اس کی تعلیم عام ہو سکے۔ یہ کتاب اسی فکر کا اولین نتیجہ ہے ہمارے پاس اس کا صرف وہ حصہ آیا ہے جس میں اسم کا بیان ہے فعل اور حرف کا بیان بعد کے رسائل میں ہے جو ہماری نظر سے نہیں گذرے۔ تاہم حصہ اول ہی کے مطالعہ سے ہم کو یقین ہوگیا کہ عربی زبان کی تعلیم کے لیے یہ سلسلہ نہایت مفید ثابت ہوگا۔

دفتر ترجمان القرآن کو اس رسالہ کے حسب ذیل نمبروں کی ضرورت ہے جو حضرات ان کو علیحدہ کرنا چاہیں وہ دفتر سے مراسلت کریں۔

محرم، شعبان، رمضان ۵۲ھ۔ محرم، صفر، ربیع الاول، ربیع الثانی ۵۳ھ۔ منیجر

مستشرق ڈاکٹر گستاولی بان کی شہرۂ آفاق تصنیف

# تمدن عرب

جو

مدتوں سے نایاب تھی پہلے ایڈیشن ۱۸۹۸ء کی صفحہ بہ صفحہ جامع خصوصیات کے علاوہ
نواب جیون یار جنگ بہادر۔ بی۔ اے بیرسٹرایٹ لا چیف جسٹس ہائیکورٹ حیدرآباد دکن کے

## عالمانہ، بصیرانہ، ناقدانہ، مقدمہ اور فاضل مترجم

# شمس العلماء ڈاکٹر سید علی بلگرامی

مرحوم کے جامع سوانح کے ساتھ نیز (۵) رنگین (۱۳۷) سادہ تصاویر (۳) نقشوں کے ہمراہ
جس کی قیمت پچاس روپے تھی مگر سو روپے میں بھی نہیں ملتی تھی اب

## اعلیحضرت فرمانروائے دکن ظلہ

کے جشن سیمین کی شادمانی میں اعظم اسٹیم پریس کی جانب سے شائع ہو چکی ہے
قیمت صرف پچیس روپے سنہری جلد خرچ ڈاک وغیرہ بذمہ خریدار

## عبدالقادر

پبلشر گورنمنٹ ایجوکیشنل پرنٹرز و پروپرائٹر اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن

مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس چارمینار

جلد (۱۰) عدد (۲)
صفر المظفر سنہ ۱۳۵۶ھ

رجسٹرڈ نمبر آصفیہ ۱۲۰
رجسٹرڈ نمبر ایم ۲۹۵۰

۵۰۶



ماہ نامہ

# ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابو الاعلیٰ مودودی

قیمت سالانہ (صمہ)
قیمت فی پرچہ (۸/)

# الجہاد فی الاسلام

## تالیف

## سید ابو الاعلیٰ مودودی

### مختصر فہرست مضامین حسب ذیل ہے۔

**اسلامی جہاد کی حقیقت** اس میں بتایا گیا ہے کہ قرآن کی تعلیم جہاد کن اہم حقائق پر مبنی ہے اور مذاہب عالم میں روح جہاد کا کیا مرتبہ ہے۔

**مدافعانہ جنگ** وہ اغراض جن کے لیے قرآن نے دفاعی جنگ کا حکم دیا ہے۔

**مصلحانہ جنگ** اصلاحی جنگ کے اصول و مقاصد کی تشریح اور ان اعتراضات کا مدلل جواب جو اس نوع کی جنگ پر کیے جاتے ہیں۔

**اشاعت اسلام اور تلوار** دعوت و تبلیغ کے متعلق اصول تعلیم اسلامی کی تشریح اور اس کی تحقیق کہ اشاعت اسلام میں تلوار کا کیا حصہ ہے۔

**قوانین جنگ** اسلام سے قبل کے وحشیانہ طریقہائے جنگ اور ان میں اسلام کی اصلاحات۔

**جنگ دوسرے مذاہب میں** جنگ کے متعلق ہندو مذہب بودھ مت مسیحیت اور عیسائیت کی تعلیمات کی تشریح اور اسلام سے ان کا مقابلہ۔

**جنگ اور تہذیب جدید** بین الاقوامی قانون جنگ کی تفصیل اور اسلامی قانون جنگ سے اس کا مقابلہ

ضخامت (۵۰۰) صفحات قیمت مجلد [illegible] انگریزی [illegible] سکۂ عثمانیہ غیر مجلد [illegible] انگریزی [illegible] سکۂ عثمانیہ

**دفتر ترجمان القرآن (حیدرآباد دکن)**

# فہرست مضامین

ماہ صفر ۱۳۵۶ھ جلد ۱۰ عدد ۲



دفتر ترجمان القرآن کو اس رسالہ کے حسب ذیل نمبروں کی ضرورت ہے جو حضرات ان کو بقیمت علیحدہ کرنا چاہیں وہ دفتر سے مراسلت کریں۔

محرم، شعبان، رمضان ۱۳۵۲ھ۔ محرم، صفر، ربیع الاول، ربیع الثانی ۱۳۵۴ھ تا

منیجر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# اشارات

گذشتہ صحبت اشارات کے سلسلہ میں ہم نے اُس انقلاب کی طرف مسلمانوں کو توجہ دلائی تھی جو عنقریب ہندوستان میں رونما ہونے والا ہے، اور جس کے آثار اب پوری طرح نمایاں ہو چکے ہیں ہمارا اصل مقصد مسلمانوں کو اس آنے والے انقلاب میں اپنے قومی تشخص اور اپنی قومی تہذیب کی حفاظت کے لیے تیار کرنا ہے مگر یہ مقصد اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنی موجودہ پوزیشن اور اس جدید انقلاب کی نوعیت کو اچھی طرح نہ سمجھ لیں، اور یہ نہ جان لیں کہ اس پوزیشن میں اس نوعیت کا انقلاب ان کی قومیت اور ان کی قومی تہذیب پر کس طرح اثر انداز ہوگا اور اس کے نتائج کیا ہوں گے۔

---

پچھلی صحبت میں ہم مسلمانوں کی موجودہ پوزیشن پر ایک سرسری تبصرہ کر چکے ہیں جس سے یہ حقیقت واضح ہو گئی ہوگی کہ ہندوستان کے مسلمان اس وقت کمزوری کی آخری سرحدوں پر ہیں۔

ان کا سوادِ اعظم اپنی قومی تہذیب اور اس کی امتیازی خصوصیات سے ناواقف ہے حتیٰ کہ اس میں اُن حدود کا شعور تک باقی نہیں رہا ہے جو اسلام کو غیر اسلام سے ممیز کرتی ہیں۔ اسلامی تعلیم، اسلامی تربیت اور جماعت کا ڈسپلن تقریباً مفقود ہو چکا ہے۔ ان کے افراد منتشر طور پر ہر قسم کے بیرونی اثرات قبول کر رہے ہیں اور جماعت اپنی کمزوری کی بنا پر بتدریج ان اثرات کو اپنے اندر جذب کرتی چلی جاتی ہے۔ ان کا قومی کیرکٹر اب مردانہ کیرکٹر نہیں رہا، بلکہ زنانہ کیرکٹر بن گیا ہے جس کی نمایاں خصوصیت تاثر و انفعال ہے۔ ہر طاقتور

ان کے خیالات کو بدل سکتا ہے، ان کے عقائد کو پھیر سکتا ہے، ان کی ذہنیت کو اپنے سانچے میں ڈھال سکتا ہے، انکی زندگی کو اپنے رنگ میں رنگ سکتا ہے، ان کے اصول حیات میں اپنی مرضی کے مطابق جیسا چاہے تغیر و تبدل کر سکتا ہے۔ وہ اول تو اتنا علم ہی نہیں رکھتے کہ یہ امتیاز کر سکیں کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہم کس خیال اور کس عملی طریقے کو قبول کر سکتے ہیں اور کس کو قبول نہیں کر سکتے۔ پھر ان کی قومی تربیت اتنی ناقص ہے کہ ان کے اندر کوئی اخلاقی طاقت ہی باقی نہیں رہی۔ جب کوئی چیز قوت کے ساتھ آتی اور گرد و پیش میں پھیل جاتی ہے تو خواہ وہ کتنی ہی غیر اسلامی ہو، یہ اس کی گرفت سے اپنے آپ کو نہیں بچا سکتے اور غیر اسلامی جاننے کے باوجود طوعاً و کرہاً اس کے آگے سپر ڈال ہی دیتے ہیں۔ اس پر مزید یہ کہ نظام جماعت حد سے زیادہ مضمحل ہو چکا ہے۔ ہماری سوسائٹی میں اتنی قوت ہی نہیں رہی کہ وہ اپنے افراد کو حدودِ اسلامی کے باہر قدم رکھنے سے باز رکھ سکے، یا اپنے دائرے میں غیر اسلامی خیالات اور طریقوں کی اشاعت کو روک سکے۔ افراد کو قابو میں رکھنا تو درکنار ہماری سوسائٹی تو اب افراد کے پیچھے چل رہی ہے۔ پہلے چند سرکش افراد اسلامی قانون کے خلاف بغاوت کرتے ہیں۔ سوسائٹی چند روز اس پر ناک بھوں چڑھاتی ہے، پھر دیکھتے دیکھتے وہی بغاوت ساری قوم میں پھیل جاتی ہے۔

---

انفرادیت اور لامرکزیت کی روز افزوں ترقی نے مسلمانوں کے شیرازۂ قومیت کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔ اور اجتماعی عمل کی کوئی صلاحیت اب ان میں نہیں پائی جاتی۔ شخصی اغراض اور ذاتی مفاد کی بنیاد پر جماعتیں بنتی ہیں اور پھر خود غرضی کی چٹان ہی سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتی ہیں۔ کوئی بڑی سے بڑی قومی مصیبت بھی آج مسلمانوں کے رہنماؤں اور ان کے قومی کارکنوں کو اتحاد عمل اور مخلصانہ و بے غرضانہ عمل پر آمادہ نہیں کر سکتی۔ تحریک خلافت کی ناکامی کے بعد سے مسلسل مصیبتیں مسلمانوں پر نازل ہوئیں۔ پیہم خطرات ان کے سامنے آئے۔ اگر کوئی ایک چیز بھی ان کو اشتراک عمل کے لیے

حسن تدبر کی تازہ ترین وقعہ مسجد شہید گنج کا ہے جس نے اس قوم کی کمزوری کا راز اپنوں سے زیادہ غیروں پر فاش کر دیا۔ ان کے اندر اتنی زندگی تو ضرور باقی ہے کہ جب کوئی مصیبت پیش آتی ہے تو تڑپ اٹھتے ہیں، مگر وہ اخلاقی اوصاف باقی نہیں جن کی بدولت یہ قومی مفاد کی حفاظت کے لیے اجتماعی کوشش کر سکیں۔ ان میں اتنی تمیز نہیں کہ صحیح رہنما کا انتخاب کر سکیں۔ ان میں اطاعت کا مادہ نہیں کہ کسی کو رہنما تسلیم کرنے کے بعد اس کی بات کو مانیں اور اس کی ہدایت پر چلیں۔ ان میں اتنا ایثار نہیں کہ کسی بڑے مقصد کے لیے اپنے ذاتی مفاد، اپنی ذاتی رائے، اپنی آسائش، اپنے مال اور اپنی جان کی قربانی کسی حد تک بھی گوارا کر سکیں۔

افلاس، جہالت اور غلامی نے ہمارے افراد کو بے غیرت، اور بندۂ نفس بنا دیا ہے۔ وہ روٹی اور عزت کے بھوکے ہو رہے ہیں۔ ان کا حال یہ ہو گیا ہے کہ جہاں کسی نے روٹی کے چند ٹکڑے اور نام و نمود کے چند کھلونے پھینکے، یہ کتوں کی طرح ان کی طرف لپکتے ہیں اور ان کے معاوضے میں اپنے دین و ایمان، اپنے ضمیر، اپنی غیرت و شرافت، اپنی قوم و ملت کے خلاف کوئی خدمت بجا لانے میں ان کو باک نہیں ہوتا۔ مسلمان کا ایمان جو کبھی سارے جہاں کی دولت سے بھی زیادہ قیمتی تھا، آج اتنا سستا ہو گیا ہے کہ ایک حقیر سی تنخواہ اسے خرید سکتی ہے، ایک ادنیٰ درجہ کی کرسی پر وہ قربان ہو سکتا ہے۔ ایک آبرو باختہ عورت کے قدموں پر وہ نثار کیا جا سکتا ہے، کسی ذرا سی شہرت و ناموری عطا کر کے اور دو چار جے کے نعرے لگا کر اس کو خرید لیا جا سکتا ہے۔ گذشتہ ڈیڑھ سو برس کا تجربہ بتا رہا ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف دشمنوں نے جو کچھ کرنا چاہا، اس کے لیے خود مسلمانوں ہی کی جماعت سے ایک دو نہیں ہزاروں اور لاکھوں خائن اور غدار ان کو مل گئے، جنہوں نے تقریر سے، تحریر سے، ہاتھ اور پاؤں سے حتیٰ کہ تلوار اور بندوق تک سے اپنے مذہب اور اپنی قوم کے مقابلہ میں دشمنوں کی خدمت کی۔ یہ ناپاک اور ذلیل ترین وصف جب ہمارے افراد میں موجود

ہے تو جس طرح چھ ہزار میل دور کے رہنے والوں نے اس سے فائدہ اٹھایا، اسی طرح ہم سے ایک دیوار بیچ رہنے والے بھی اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں، اور اگر ہماری فاش گوئی کسی کو بری نہ معلوم ہو تو ہم صاف کہدیں کہ انہوں نے اس سے فائدہ اٹھانا شروع کر دیا ہے۔ پرانی مارکیٹ میں جب سے سرد بازاری کے آثار نمایاں ہوئے ہیں، نئی مارکٹ میں ایمان کی خرید و فروخت کا بیوپار بڑھ رہا ہے۔ ہمارے کان خود اپنی قوم کے لوگوں کی زبانوں سے جب کمیونزم کا پروپیگنڈا سنتے ہیں، متحدہ ہندی قومیت میں جذب ہو جانے کی دعوت سنتے ہیں اور یہ آوازیں سنتے ہیں کہ اسلامی کلچر کوئی جداگانہ کلچر ہی نہیں ہے، تو ہمارا حافظہ ہم کو یاد دلاتا ہے کہ کچھ اسی نوعیت کی آوازیں اس وقت بھی بلند ہونی شروع ہوئی تھیں جب سرکار برطانیہ کی غلامی کا زرین پھندا ہمارے گلوں میں پڑ رہا تھا۔

---

ہماری قوم میں منافقین کی ایک بڑی جماعت شامل ہے اور اس کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے۔ بکثرت اشخاص، تعلیم یافتہ، صاحب قلم، صاحب زبان، صاحب مال و زر، صاحب اثر اشخاص ایسے ہیں جو دل سے اسلام اور اس کی تعلیمات پر یقین نہیں رکھتے، مگر نفاق اور قلبی بے ایمانی کی راہ سے مسلمانوں کی جماعت میں شریک ہیں۔ یہ اسلام سے عقیدۃً اور عملاً نکل چکے ہیں، مگر اس سے براءت کا صریح اعلان نہیں کرتے، اس لیے مسلمان ان کے ناموں سے دھوکہ کھا کر انھیں اپنی قوم کا آدمی سمجھتے ہیں، ان سے شادی بیاہ کرتے ہیں، ان سے معاشرت کے تعلقات رکھتے ہیں، اور ان زہریلے جانوروں کو اپنی جماعت میں چل پھر کر اور رہ بس کر زہر پھیلانے کا موقع دے رہے ہیں۔ نفاق کا خطرہ ہر زمانے میں مسلمانوں کے لیے سب سے بڑا خطرہ رہا ہے۔ مگر اس نازک زمانہ میں تو یہ ہمارے لیے پیام موت ہے۔ آنکھیں کھول کر دیکھیے کہ یہ منافقین کیسا مہلک زہر ہماری قوم میں پھیلا رہے ہیں۔ یہ اسلام کا مذاق اڑاتے ہیں،

اس کی اساسی تعلیمات پر حملے کرتے ہیں، مسلمانوں کو دہریت اور الحاد کی طرف دعوت دیتے ہیں، ان میں بے دینی اور بے حیائی اور قانون اسلامی کی خلاف ورزی کو نہ صرف عملاً پھیلاتے ہیں بلکہ کھلم کھلا زبان و قلم سے اس کی تبلیغ کرتے ہیں۔ ان کی تہذیب کو مٹانے کی ہر کوشش میں آپ دیکھیں گے کہ یہ دشمنوں سے چار قدم آگے ہیں۔ ہر وہ اسکیم جو اسلام اور مسلمانوں کی بیخ کنی کے لیے باہر سے نکلی ہو، اس کو مسلمانوں کی جماعت میں نافذ کرنے کی خدمت یہی ناپاک گروہ اپنے ذمہ لیتا ہے، اور اسلامی قومیت کا ایک جز ہونے کی وجہ سے اس کو اپنا کام کرنے کا خوب موقع ملتا ہے۔

---

یہ حالت ہے اس وقت ہماری قوم کی، اور اس حالت میں یہ ایک بڑے انقلاب کے سر پر کھڑی ہوئی ہے۔ انقلاب کی فطرت بحرانی اور طوفانی فطرت ہوتی ہے۔ وہ جب آتا ہے تو آندھی اور سیلاب کی طرح آتا ہے۔ اس کے زور کا مقابلہ اگر کچھ کر سکتی ہیں تو مضبوط جمی ہوئی چٹانیں ہی کر سکتی ہیں، یا وہ ٹھوس عمارتیں جو اپنی جڑ چھوڑ کر محض فضا کے سکون و جمود کی بدولت کھڑی ہوں، ان کا کسی انقلابی طوفان میں ٹھیرنا غیر ممکن ہے۔ اب جو کوئی صاحب بصیرت انسان اس وقت مسلمانوں کی حالت پر نگاہ ڈالے گا وہ بیک نظر معلوم کرلے گا کہ ان کمزوریوں کے ساتھ یہ قوم ہرگز کسی انقلاب کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس کے لیے انقلابی دور میں اپنے قومی تشخص اور اپنی قومی تہذیب کے خصائص کو بچا لے جانا اور اپنے حقوق کو پامالی سے محفوظ رکھنا بہت ہی مشکل ہے۔ اول تو جہالت کی بنا پر وہ بہت سے اجنبی اثرات کو بے جانے بوجھے قبول کرے گی۔ پھر زمانہ کا زور اس کو بہت سی ایسی چیزوں سے متاثر کر دے گا جن کو وہ جانتی ہوگی کہ اسلامی تعلیمات کے خلاف اور اسلامی تہذیب کے منافی ہیں۔ اس طرح ایک بڑی حد تک بلا مقابلہ شکست کھا جانے کے بعد اگر کچھ احساسات باقی رہ گئے اور کسی شدید حملے پر وہ بیدار بھی ہوئے اور اس نے اپنے حقوق کی حفاظت کرنی بھی چاہی تو نہ کر سکے گی، کیونکہ اپنی بدنظمی اور انتشار کی بدولت اس کے لیے

کوئی متحدہ جد و جہد کرنا مشکل ہوگا، اور خود اسی کے گروہ سے ہزاروں لاکھوں خائن، غدار اور منافق اس کے قومی حقوق کو پامال کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں گے۔

---

اگر آنے والا انقلاب محض ایک سیاسی انقلاب ہوتا تب بھی خطرہ کچھ کم نہ تھا، لیکن یہاں تو جو انقلاب آرہا ہے وہ سیاسی انقلاب سے بڑھ کر ایک فکری اور عمرانی انقلاب ہے۔ اس کے آثار و نتائج کو اگر آپ اچھی طرح سمجھنا چاہتے ہیں تو زیادہ گہری نظر سے اُن قوتوں کو دیکھیے جو اس انقلاب میں کام کر رہی ہیں۔

---

ہندوستان کی جدید وطنی حرکت دراصل نتیجہ ہے اُس تصادم کا جو انگریزی اقتدار اور ہندوستان کے درمیان گذشتہ ڈیڑھ سو سال سے ہو رہا ہے۔ یہ تصادم محض سیاسی نہیں ہے بلکہ فکری اور عمرانی بھی ہے، اور یہ عجیب بات ہے کہ فکری و عمرانی تصادم کا جو نتیجہ ہوا ہے وہ سیاسی تصادم کے نتیجہ سے بالکل برعکس ہے۔ انگریزی سیاست کے جور و استبداد اور معاشی لوٹ نے تو ہندوستان کے باشندوں کو آزادی کا سبق دیا اور ان میں یہ جذبہ پیدا کیا کہ بندِ غلامی کو توڑ کر پھینک دیں، لیکن انگریزی علوم و فنون اور انگریزی تہذیب و تمدن نے ان کو پوری طرح مغرب کا غلام بنا دیا، اور ان کے دماغوں پر اتنا زبردست قابو پالیا کہ اب وہ زندگی کا کوئی نقشہ اس نقشے کے خلاف نہیں سوچ سکتے جو ان کے سامنے اہلِ مغرب نے پیش کیا ہے۔ وہ جس قسم کی آزادی کے لیے جد و جہد کر رہے ہیں اس کی نوعیت صرف یہ ہے کہ ہندوستان سیاسی حیثیت سے آزاد ہو، اپنے گھر کا انتظام آپ کرے، اور اپنے وسائلِ معیشت کو خود اپنے مفاد کے لیے استعمال کرے۔ لیکن یہ آزادی حاصل کرنے کے بعد اپنے گھر کے انتظام اور اپنی

زندگی کی تعمیر کا جو نقشہ ان کے ذہن میں ہے وہ از سرتا پا فرنگی ہے۔ ان کے پاس جتنے اجتماعی تصورات ہیں، جس قدر عمرانی اصول ہیں، سب کے سب مغرب سے حاصل کیے ہوئے ہیں۔ ان کی نظر فرنگی نظر ہے، ان کے دماغ فرنگی دماغ ہیں، ان کی ذہنیت پوری طرح فرنگیت کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے۔ بلکہ انقلابیت نے تو ان کو (یا کم از کم ان کے سب سے زیادہ پرجوش طبقوں کو) فرنگیوں میں سے بھی اُس قوم کا تبع بنا دیا ہے جو انتہا پسندی میں تمام فرنگی اقوام کو پیچھے چھوڑ چکی ہے۔ وہ پکے مادہ پرست ہیں۔ ان کی نگاہ میں اخلاق و روحانیت کی کوئی قیمت نہیں۔ ان کو خدا پرستی سے نفرت ہے۔ مذہب کو وہ شروفساد کا ہم معنی سمجھتے ہیں۔ مذہبی اور اخلاقی قدروں کو وہ پرکاہ کے برابر بھی وقعت دینے کے لیے تیار نہیں۔ ان کو ہر ایسی قومیت اور ہر ایسے قومی امتیاز سے چڑ ہے جس کی بنیاد مذہب پر ہو۔ وہ زیادہ سے زیادہ رواداری جو مذہب کے ساتھ برت سکتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ اس کو اپنی عبادت گاہوں اور اپنے مراسم میں جینے دیں۔ باقی رہی اجتماعی زندگی تو اس میں مذہب اور مذہبیت کے ہر اثر کو مٹانا ان کا نصب العین ہے اور ان کے نزدیک اس اثر کو مٹائے بغیر کوئی ترقی ممکن نہیں۔ ہندوستانی قومیت کا جو نقشہ ان کے پیش نظر ہے۔ اس میں مذہبی جماعتوں کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔ وہ تمام امتیازی حدود کو توڑ کر وطنیت کی بنیاد پر ایک ایسی قوم بنانا چاہتے ہیں جس کی اجتماعی زندگی ایک ہی طرز پر تعمیر ہو، اور وہ طرز اپنے اصول و فروع میں خالص مغربی ہو۔

---

چونکہ اس جماعت کے مقاصد میں سیاسی آزادی کا مقصد سب سے مقدم ہے، اور وہی اس وقت حالات کے لحاظ سے نمایاں ہو رہا ہے، اس لیے مسلمانوں کے آزادی پسند طبقے اس کی طرف کھنچ رہے ہیں۔

انگریز کی غلامی ہندوستان کے تمام باشندوں کے لیے ایک مشترک مصیبت ہے۔ اس مصیبت سے نجات حاصل کرنے کے لیے مشترک جد وجہد کرنا ہر آئینہ معقول ہے۔ اور جو گروہ اس جد وجہد میں سب سے زیادہ سرگرم ہو اس کی طرف دلوں کا مائل ہونا، اور اس کے ساتھ شرکت عمل چاہنا بظاہر ضروری نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے علماء اور سیاسی رہنماؤں میں سے ایک بڑی جماعت اور مخلص جماعت کانگریس کی طرف جارہی ہے اور عامۂ مسلمین کو بھی ترغیب دے رہی ہے کہ اس میں شریک ہوجائیں لیکن عمل کی طرف قدم بڑھانے سے پہلے ایک مرتبہ اچھی طرح سوچ لینا چاہیے کہ اس کے نتائج کیا ہوں گے۔

مسلمانوں کی جو کمزوریاں ہم نے اوپر بیان کی ہیں وہ سب آپ کے سامنے ہیں۔ ان کو پیش نظر رکھ کر غور کیجیے کہ ان کمزوریوں کے ساتھ جب یہ قوم کانگریس میں شریک ہوگی اور اس کے عوام سے کانگریسی کارکنوں کا رابطہ قائم ہوگا تو آزادی وطن کی تحریک کے ساتھ ساتھ اور کس کس قسم کی تحریکیں ان کے درمیان پھیلیں گی؟ کس کس طرح مسلمانوں کے عوام اُن اجتماعی نظریات ان ملحدانہ افکار، ان غیر اسلامی طریقوں سے متاثر ہوں گے جو اس جماعت میں شائع و ذائع ہیں؟ کس طرح اسلامی جماعت کے رگ و ریشہ میں اُس فکری و عمرانی انقلاب کے عناصر پھیلائے جائیں گے جو سیاسی انقلاب کے ساتھ ہم رشتہ ہے؟ کس طرح مسلمانوں کے اندر ایک ایسی رائے عام تیار کرنے کی کوشش کی جائے گی جو علی رغم انف علماء روز عماء جدید ترین مغربی و اشتراکی بنیادوں پر اجتماعی زندگی کی تعمیر کے ہر نقشہ کی تائید کرے؟ کس طرح مسلمانوں کی نمائندگی کے لیے خود مسلمانوں کی جماعت سے وہ لوگ تیار کیے جائیں گے جو اسلامی کلچر کے خلاف ہر قسم کے طریقے رائج کرنے اور ہر قسم کے قوانین وضع کرنے میں حصہ لیں؟ ان حالات میں آپ کے پاس کونسی قوت ہے جس سے آپ اپنی قوم کو قابو میں رکھ سکیں گے؟ آپ نے اپنے عوام کو اسلامی تہذیب کے حدود میں رکھنے کا کیا بندوبست کیا ہے؟ آپ نے

ان کو غیر اسلامی اثرات سے بچانے کا کیا انتظام کیا ہے؟ آپ نے اپنے غداروں اور منافقوں کے فتنے کا کیا علاج سوچا ہے؟ آپ کے پاس اطمینان کرنے کا کونسا ذریعہ ہے کہ کسی ضرورت کے موقع پر آپ اسلامی حقوق کی حفاظت کے لیے مسلمانوں کو جمع کرسکیں گے اور ان کی متحدہ طاقت آپ کی پشت پر ہوگی؟

---

انگریز کے اقتدار کا خاتمہ کرنا یقیناً ضروری ہے بلکہ فرض ہے۔ کوئی سچا مسلمان غلامی پر ہرگز راضی نہیں ہوسکتا۔ جس شخص کے دل میں ایمان ہوگا وہ ایک لمحہ کے لیے بھی یہ نہ چاہے گا کہ ہندوستان انگریز کے پنجۂ استبداد میں رہے۔ لیکن آزادی کے جوش میں یہ نہ بھول جانا چاہیے کہ انگریزی اقتدار کی مخالفت میں مسلمان کا نظریہ ایک وطن پرست کے نظریہ سے بالکل مختلف ہے۔ ہم کو انگریز سے اس لیے عداوت نہیں ہے کہ وہ انگریز ہے، چھ ہزار میل دور سے آیا ہے، ہمارے وطن میں پیدا نہیں ہوا، بلکہ ہماری عداوت اس بنا پر ہے کہ وہ غیر صالح ہے۔ ناجائز طریقہ سے حکومت کرتا ہے۔ عدل کے بجائے جور پھیلاتا ہے، اصلاح کے بجائے فساد برپا کرتا ہے۔ اگر یہی کچھ دوسرے کریں تو ہم محض اس بنا پر ان کی حمایت نہیں کرسکتے کہ وہ ہمارے ہم وطن ہیں۔ مسلمان کی نگاہ میں وطنی اور غیر وطنی کوئی چیز نہیں۔ وہ غیر ملک کے صہیب اور بلال کو گلے لگا سکتا ہے مگر اپنے وطن کے ابوجہل اور ابولہب سے دوستی نہیں کرسکتا۔ پس اگر آپ مسلمان ہیں تو وطنیت کے ڈھنگ پر نہ سوچیے بلکہ حق پرستی کے ڈھنگ پر سوچیے۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے انگریزی غلامی کے بند توڑنا ضرور آپ کا فرض ہے مگر کسی ایسی حکومت کے قیام میں مددگار بننا آپ کے لیے ہرگز جائز نہیں جس کی بنیاد انہی اصولوں پر ہو جن پر انگریزی حکومت کی بنیاد ہے عام اس سے کہ وہ وطنی حکومت ہو یا غیر وطنی۔ آپ کا کام باطل کو مٹا کر حق کو قائم کرنا ہے۔ ایک باطل کو مٹا کر دوسرے باطل اور بدتر باطل کو قائم کرنا نہیں ہے۔ آپ انگریزی حکومت کے خلاف ہر اس گروہ سے موالات کیجیے جو اس کو مٹانا

چاہتا ہو۔ مگر یہ بتائیے کہ اس ظالم حکومت کو مٹا کر ایک عادل حکومت قائم کرنے کے لیے آپ نے کیا انتظام کیا ہے؟ کونسی طاقت آپ نے فراہم کی ہے جس سے آپ دوسری حکومت کی تشکیل حق کے اصولوں پر کرا سکیں؟ یہ نہیں تو جانے دیجیے۔ یہی بتائیے کہ آپ نے خود اپنی قوم کو باطل کے اثرات سے بچانے کا کیا بندوبست فرمایا ہے؟

---

آپ کہتے ہیں کہ ہم اپنی تہذیب اور اپنے قومی حقوق کی حفاظت کے لیے آئینی ضمانتیں لیں گے، ہم دستور اساسی میں ایسے تحفظات رکھوائیں گے جن سے ہمارے حقوق پر آنچ نہ آنے پائے۔ بلاشبہہ یہ سب کچھ آپ کر سکتے ہیں۔ مگر شاید آپ نے غور نہیں فرمایا کہ آئینی ضمانتیں اور دستور اساسی کے تحفظات اور دوسرے تمام کاغذی مواثیق صرف اُسی قوم کے لیے مفید ہو سکتے ہیں جن میں ایک طاقتور رائے عام موجود ہو، جو اپنے حقوق کو سمجھتی ہو، اپنی تہذیب کو جانتی ہو، اس کی خصوصیات کو عزیز رکھتی ہو، اس کی حفاظت کا ناقابل تسخیر ارادہ رکھتی ہو، اور منفرداً و مجتمعاً اس کی طرف سے مدافعت کے لیے ہر وقت سینہ سپر ہو۔ یہ صفات اگر آپ کی قوم میں موجود ہیں تو آپ کو کسی آئینی ضمانت اور کسی دستوری تحفظ کی بھی ضرورت نہیں۔ اور اگر آپ کی قوم ان صفات سے عاری ہے تو یقین رکھیے کہ کوئی ضمانت اور کوئی تحفظ ایسی حالت میں کار آمد نہیں ہو سکتا۔ آپ دستور اساسی کی ضمانتوں کو زیادہ سے زیادہ خارجی حملوں کے مقابلہ میں استعمال کر سکتے ہیں۔ مگر اندرونی انقلاب کا آپ کے پاس کونسا علاج ہے؟ مثال کے طور پر فرض کیجیے کہ کل مخلوط تعلیم شروع ہوتی ہے اور آپ کی قوم کے افراد خود اپنی مرضی سے دھڑا دھڑ اپنی لڑکیوں اور لڑکوں کو مخلوط مدارس میں بھیجتے ہیں۔ کونسا دستوری تحفظ اس تحریک کو اور اس کے زہریلے نتائج کو روکنے کے لیے استعمال کیا جائے گا؟ فرض کیجیے کہ سول میرج کے طریقہ پر مخلوط نکاحوں کا رواج پھیلتا ہے اور آپ کی قوم خود اس تحریک سے متاثر ہو جاتی ہے۔

کونسی آئینی ضمانت اس کی روک تھام کر سکے گی؟ فرض کیجیے کہ آپ کی اپنی قوم میں پروپیگنڈا کی قوت اور تعلیم کے وسائل سے ایک ایسی رائے عام تیار کر دی جاتی ہے جو قوانین اسلامی میں ترمیم و تنسیخ پر راضی ہو آپ کی اپنی قوم کے افراد ایسے قوانین کی حمایت کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں جو اصول اسلام کے خلاف ہوں۔ خود آپ ہی کے ووٹوں کی اکثریت سے ایسی تجویزیں پاس ہو جاتی ہیں جو آپکے تمدن کو اسلامی مناہج سے ہٹا دینے والی ہوں۔ وہ کونسے "بنیادی حقوق" ہیں جن کا واسطہ دے کر آپ ان چیزوں کو منسوخ کرا سکیں گے؟ فرض کیجیے کہ آپ کی قوم تدریج ہمسایہ اقوام کے طرز معاشرت، آداب و اطوار، عقائد و افکار کو قبول کرنا شروع کرتی ہے اور اپنے قومی امتیازات کو خود کھونے لگتی ہے۔ کونسا کاغذی میثاق اس تدریجی انجذاب کی روک تھام کریگا؟ آپ اس کے جواب میں یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ سب تمہارے خیالی مفروضات ہیں۔ اس لیے کہ جو مسلمان اس وقت وطنی تحریک میں شریک ہیں ان کے نمونے آپ کے سامنے موجود ہیں دیکھ لیجیے کہ ان کا طرز عمل انگریز کے غلاموں سے کچھ بھی مختلف نہیں۔ وہی ذہنی غلامی، وہی زنانہ انفعال و تاثر، وہی انجذابی کیفیت یہاں بھی نمایاں ہے جو آستانہ فرنگ کے طائفین و عاکفین میں نظر آتی ہے۔ پھر جب اپنی قوم کی کمزوری اور اس کی موجودہ مزاجی کیفیت کے یہ کھلے ہوئے علائم و آثار آپ کی آنکھیں دیکھ رہی ہیں تو آخر کس بھروسہ پر آپ ساری قوم کو ادھر لے جانا چاہتے ہیں؟ فرمائیے تو سہی کہ آپ نے باطنی انقلاب اور تدریجی انجذاب کو روکنے کے لیے کونسا تحفظ فراہم کر رکھا ہے؟

---

مسلمانوں میں اس وقت زیادہ تر تین گروہ پائے جاتے ہیں۔ ایک گروہ آزادی وطن کے لیے بے چین ہے اور کانگریس کی طرف کھنچ رہا ہے یا کھنچ گیا ہے۔ دوسرا گروہ اپنی قومی تہذیب اور اپنے قومی حقوق کی حفاظت کے لیے انگریز کی گود میں جانا چاہتا ہے اور آئندہ انقلاب کے خطرات سے بچنے کی

یہی صورت مناسب سمجھتا ہے کہ سرکار برطانیہ کا معاون بن کر آزادی کی تحریک کو روکے۔ تیسرا گروہ عالم حیرت میں کھڑا ہے اور خاموشی کے ساتھ واقعات کی رفتار کو دیکھ رہا ہے۔

ہمارے نزدیک یہ تینوں گروہ غلطی پر ہیں۔ پہلے گروہ کی غلطی ہم نے اوپر واضح کر دی۔ دوسرے گروہ کی غلطی بھی کچھ کم خطرناک نہیں۔ یہ لوگ اپنی کمزوریوں کی اصلاح کرنے کے بجائے دوسروں کی ترقی کو روکنا چاہتے ہیں اور یہ سمجھ رہے ہیں کہ ان کے ضعف کی تلافی غیروں کے سہارے سے ہو جائے گی۔ ایسی ذلیل پالسی دنیا میں نہ کبھی کامیاب ہوئی ہے نہ ہو سکتی ہے۔ جو قوم خود زندہ رہنے کی طاقت نہ رکھتی ہو، جس میں خود اپنے وجود اور اپنے حقوق کی حفاظت کا بل بوتا نہ ہو، وہ کب تک دوسروں کے سہارے پر جی سکتی ہے؟ کب تک کوئی سہارا اس کے لیے قائم رہ سکتا ہے؟ کب تک زمانے کے انقلابات اس کی خاطر رکے رہ سکتے ہیں؟ انگریز قیامت تک کے لیے ہندوستان پر حکومت کرنے کا پٹہ لکھوا کر نہیں لایا ہے۔ ہر قوم کے لیے ایک مدت ہوتی ہے۔ انگریز کے لیے بھی بہرحال ایک مدت ہے، اور وہ آج نہیں تو کل پوری ہوگی۔ اس کے بعد وہی قوم برسر اقتدار آئے گی جس میں ہمت اور طاقت ہوگی، عالی اوصاف ہوں گے، عزائم اور حوصلے ہوں گے، صلابت اور عصبیت ہوگی۔ اگر تم میں یہ اوصاف ہوں تو وہ قوم تم ہو سکتے ہو۔ اور اگر تم ان سے عاری ہو تو بہرحال تمہاری قسمت میں محکومی کی ذلت، اور ذلت کی موت ہی ہے۔ گھن کھائی ہوئی لاش کسی عصا کے سہارے پر کھڑی کی جائے تو وہ ہمیشہ کھڑی نہیں رہ سکتی۔ عصا کبھی نہ کبھی ہٹ کر رہے گا، اور لاش کبھی نہ کبھی گر کر رہے گی۔

تیسرے گروہ کی غلطی سب سے زیادہ خطرناک ہے۔ یہ دنیا ایک عرصۂ جنگ ہے جس میں تنازع للبقا کا سلسلہ جاری ہے۔ اس معرکہ میں اُن کے لیے کوئی کامیابی نہیں جو زندہ رہنے کے لیے مقابلہ اور مزاحمت کی قوت نہ رکھتے ہوں۔ خصوصیت کے ساتھ ایک دور کے خاتمہ اور دوسرے دور کے آغاز کا وقت تو قوموں کی قسمتوں کے فیصلہ کا وقت ہوتا ہے۔ ایسے وقت پر سکون اور جمود کے معنی ہلاکت اور

موت کے ہیں۔ اگر تم خود ہی مرنا چاہتے ہو تو بیٹھے رہو اور اپنی موت کی آمد کا تماشہ دیکھے جاؤ۔ لیکن اگر زندہ رہنے کی خواہش ہے تو سمجھ لو کہ اس وقت کا ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔ یہ سستی رفتار کا زمانہ نہیں ہے صدیوں کے تغیرات اب مہینوں اور برسوں میں ہو جاتے ہیں۔ جس انقلاب کے سامان اس وقت ہندوستان اور ساری دنیا میں ہو رہے ہیں وہ طوفان کی سی تیزی کے ساتھ آ رہا ہے۔ اب تمہارے لیے زیادہ سے زیادہ دس پندرہ سال کی مہلت ہے۔ اگر اس مہلت میں تم نے اپنی کمزوریوں کی تلافی نہ کی اور زندگی کی طاقت اپنے اندر پیدا نہ کی تو پھر کوئی دوسری مہلت تمہیں نہ ملے گی۔ اور تم وہی سب کچھ دیکھو گے جو دوسری کمزور قومیں اس سے پہلے دیکھ چکی ہیں۔ اللہ کا کسی قوم کے ساتھ رشتہ نہیں ہے کہ وہ اس کی خاطر اپنی سنت کو بدل ڈالے۔

جمود بہر حال ٹوٹنا چاہیے۔ حرکت کی ضرورت ہے اور شدید ضرورت ہے مگر نری حرکت کسی کام کی نہیں حکمت اور تدبر کے ساتھ حرکت ہونی چاہیے۔ خصوصاً نازک اوقات میں تو حرکت بلا تدبر کے معنی خود اپنے پاؤں چل کر خندق میں جا گرنے کے ہیں۔ یہ اندھے جوش اور والہانہ شتاب روی کا وقت نہیں۔ قدم اٹھانے سے پہلے ٹھنڈے دل و دماغ سے کام لے کر سوچیے کہ قدم کس سمت میں اٹھانا چاہیے؟ آپ کی منزل مقصود کیا ہے؟ اس کی طرف جانے کا صحیح راستہ کونسا ہے؟ اس راستہ پر چلنے کے لیے آپ کو کس سامان کی ضرورت ہے؟ کن کن مرحلوں سے آپ کو گذرنا ہوگا؟ اور ہر مرحلے سے سلامت گذر جانے کے لیے کیا تدبیریں اختیار کرنی پڑیں گی؟

آئندہ اشاعت میں انہی سوالات پر ہم تفصیل کے ساتھ بحث کریں گے۔

## مقالات

# شخصیت پرستی

## (۲)

از جناب چودہری غلام احمد صاحب پرویز

(۴) روات پرستی | اس جامد تقلید کی خرابیوں کا احساس آج سے کچھ عرصہ پہلے ہوا اور ایک جماعت پیدا ہوئی جس نے اس کی شکست و ریخت کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ یہ کوشش بڑی مبارک تھی لیکن شائد ابھی مسلمانوں کے ابتلاء کا زمانہ ختم نہیں ہوا تھا۔ اس لیے اُن کے ساتھ بھی یہی ہوا کہ۔

خواستم پیکاں برآرم در جگر نشتر شکست

ائمہ پرستی کے کانٹوں سے دامن چھڑانے گئے تھے خود ایک اور جھاڑی میں الجھ کے رہ گئے۔

نبی اکرم نے خدا کا پیغام دنیا تک پہنچا دیا، اور اس پر عمل کر کے دکھا دیا کہ یہ ہے دین جس کی تکمیل ہوئی ہے لہٰذا ظاہر ہے کہ دین نام ہوا قرآن کریم اور اسوۂ حسنہ کا۔ قرآن کی حفاظت کا ذمہ تو خود باری تعالیٰ نے لیا رہا اسوۂ حسنہ تو وہ چونکہ ایک محسوس شے تھا، وہ قرناً بعد قرنٍ متواتر چلا آتا ہے۔ لہٰذا یہ دونوں یقینی ہیں۔ ان کے علاوہ حضور کے جو اقوال و افعال اور اس عہد مبارک کے جو حالات ہم تک بروایت آحاد پہنچینگے وہ یقینی نہ ہوں گے ظنی ہوں گے۔ احادیث کا مجموعہ اسی شق میں داخل ہے اگر وہ بھی جزو دین ہوتا تو حضور احادیث مقدسہ کو قرآن کی طرح لکھوا کر، یاد کرا کر، سن کر سنا کر، اُن کے حفظ و ضبط کا اطمینان فرما کر تشریف لے جاتے کہ منصب رسالت کا یہ تقاضا تھا لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔ لیکن جب بعد میں اس عہد مبارک کے حالات، جو سینہ بسینہ روایات

کی صورت میں چلے آتے تھے، قلمبند ہوئے، تو احادیث کے مجموعے بھی مرتب ہوئے مورخین نے عام تاریخ کی چھان بین اپنی بساط و احتیاط کے مطابق کی۔ جامعین احادیث (علیہم الرحمۃ) نے احادیث کی ان سے بھی زیادہ تحقیق اور احتیاط سے تدوین کی۔ کیونکہ محبوب اور ہادی کی باتیں تھیں۔ ان کی جمع و تدوین میں محبت و عقیدت کا جذبہ بھی ساتھ شامل تھا۔ مزید احتیاط یہ بھی کی کہ جن جن واسطوں سے کسی قول یا فعل منسوب الی الرسول کو انہوں نے لیا تھا وہ واسطے بھی محفوظ کر لیے فجزاھم اللہ احسن الجزاء لیکن احادیث کے ان مجموعوں کی چھان بین اس نہج سے کی گئی کہ جس جس راوی سے کوئی حدیث لی تھی اس کے متعلق حتی الامکان تحقیق کر لیا گیا کہ وہ ثقہ تھا۔ صحیح الحفظ تھا، پرہیزگار تھا، متقی تھا۔ عام طور پر جھوٹ نہیں بولتا تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔ اب اس سلسلہ میں دیکھیے کہ کس قدر انسان راستہ میں آ گئے۔

(۱) لاکھوں رواۃ حدیث۔

(۲) علماء جرح و تعدیل۔

(۳) جامعین احادیث۔

اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ مجموعے تمام تر انسانی کاوش و احتیاط کے رہین منت ہیں اور چند تاریخ کی دیگر کتب سے زیادہ قابل اعتماد ہیں لیکن بالآخر ہیں تو انسانی کارنامے ہی خدا کی حفاظت کی ذمہ داری تو ان کے ساتھ نہیں۔ اب ان جامعین احادیث اور علماء جرح و تعدیل کو تنقید سے بالاتر سمجھ لینا اور ان کی بات کو جوں کا توں تسلیم کر لینا۔ ان کو بشریت کی سطح سے اوپر لیجانا ہے۔ اور حضرات رواۃ کے متعلق خواہ وہ کتنے ہی ثقہ اور متقی ہوں یہ عقیدہ رکھنا کہ ان سے غلط بیانی یا مفہوم کو غلط سمجھنے یا غلط ادا کرنے کا [illegible] تھا۔ ان کو معصوم [illegible] حضرات انبیاء کرام کا [illegible] [illegible]

طلب ہے کہ قول اول اور قول آخر میں کس قدر انسانی قلوب کی آمیزش ہو جائے گی ضروری نہیں کہ یہ آمیزش
ارادۃً ہی ہو، غیر ارادی طور پر غیر محسوس طور پر اس کا اثر اس میں آجائے گا۔ زاویۂ آمیزش کی حفاظت ہی بالاّ
کردی ہو اس کا تو کچھ ٹھکانا ہی نہیں) یا تو یہ ہوتا کہ قرآن کی طرح حفظ احادیث بھی بالالفاظ ہوتا یعنی
الفاظ رسول صلعم حفظ کیے جاتے یا لکھے جاتے، اور بعینہٖ وہی الفاظ حرفاً حرفاً منتقل کیے جاتے لیکن
ایسا قطعی تواتر تو سوائے چند احادیث کے اور کہیں ثابت نہیں تواتر معنوی ہیں۔ ان حضرات انسانی کو
نظر انداز کر دینا فی الحقیقت ان انسانوں کو مافوق البشر سمجھ لینا ہے۔ اور ارباب جرح و تعدیل کے
متعلق یہ کہہ دینا کہ انہوں نے جھوٹ اور سچ کی تمیز یا دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر کے رکھ دیا
بہت بڑا دعویٰ ہے اس قسم کا علم غیب تو خود نبی اکرم کو بھی نہیں دیا گیا تھا۔ اب اس قسم کے کسی مجموعہ
کو جزو دین قرار دینا اور یہ کہنا کہ یہ قرآن کی طرح جوں کا توں واجب العمل ہے دین پر بہت بڑا
الزام ہے یہ ظاہر ہے کہ ان مجموعوں کو سب "اقوال منسوب الی الرسول" ہی قرار دیتے ہیں۔ پھر ان کو
ایسا سمجھنا کہ یہ بھی "اقوال الرسول" کی طرح واجب الاطاعت ہیں کیسے درست ہو سکتا ہے؟
دوسری بات یہ ہے کہ تمام کتب سماوی کو جو قرآن کریم نے ظنی اور ناقابل اعتبار قرار دیا ہے، اس کی
بھی تو یہی وجہ تھی کہ ان کی حفاظت بالالفاظ نہیں ہوئی تھی۔ اصل صحائف کے ضائع ہو جانے کے بعد
ان کے حافظین نے ان صحائف کو اسی طرح سے مرتب کیا تھا جس طرح احادیث کے مجموعے ایک مدت
کے بعد مرتب ہوئے۔ چنانچہ جس طرح ان میں تحریف، وضع، الحاق، ترمیم، نسیان کی گنجائش تھی اسی
طرح احادیث کے مجموعوں میں بھی تھی۔ اُن میں بھی ایسا کچھ ہوا اور اِن میں بھی۔ واضعین احادیث
کے تذکرے خود اس پر شاہد ہیں۔ ارباب جرح و تعدیل نے جو لاکھوں حدیثوں کو غیر معتبر سمجھ کر مسترد کر دیا
یہ اس کی زندہ دلیل ہے۔ اب اگر کتب سابقہ کا کوئی نسخہ یقینی طور پر ان رسولوں کا قول قرار نہیں
دیا جا سکتا، تو احادیث کا کوئی مجموعہ کس طرح یقینی طور پر حضورؐ کے ارشادات گرامی کا مجموعہ قرار دیا

جا سکتا ہے۔ اتباعِ حدیث میں آپ بزعمِ خویش اطاعتِ رسول کر رہے ہوتے ہیں لیکن غور فرمائیے کہ ایک حدیث کو جزوِ دین ماننے کے لیے آپ کتنے انسانوں کو معصوم اور منزہ عن الخطا ماننے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ مقلدین نے تو زیادہ سے زیادہ چار انسانوں کو منزہ عن الخطا قرار دیا تھا مگر یہ اپنے آپ کو تقلید کے پھندے سے آزاد سمجھتے ہوئے لاکھوں انسانوں کو منزہ عن الخطا قرار دے رہے ہیں اور خوش ہیں کہ ہم آزاد ہو گئے۔

باندھتے ہیں سرو کو آزاد اور وہ پا بہ گل　　　کیا وہ آزادی جہاں یہ حال ہو آزاد کا

حقیقت یہ ہے کہ احادیث کی تنقید میں اسناد سے بڑھ کر معیارِ قرآنی کو اہمیت دینی چاہیے تھی ہمارے پاس قرآن ایک مستند ضابطۂ دین موجود ہے، ظاہر ہے کہ نبی اکرم کا کوئی ارشاد اصولِ قرآنی کے خلاف قطعاً نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا ظنّی شئے کو یقینی شئے سے پرکھ لیجیے۔ معاملہ طے ہو جائے گا۔ اسناد کو مدارِ صحت قرار دینے میں یہ خرابی ہے کہ جب آپ نے ایک سلسلۂ رواۃ کے متعلق یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ ثقہ ہیں تو اب جو بات بھی ان کی وساطت سے آپ تک پہنچے گی اُسے لازمی طور پر "قولِ رسول" ماننا پڑے گا۔ خواہ اس کی حیثیت قرآنی میزان میں کچھ ہی کیوں نہ اُترے حالانکہ یہ بدیہیات میں سے ہے کہ ایک شخص کا متقی و پرہیزگار ہونا اس بات کے لیے بھی مستلزم نہیں کہ اس کی یادداشت [illegible] اور اگر یادداشت بھی درست ہو تو یہ ضروری نہیں کہ اس میں معانی وحقائق تک [illegible] اور پھر اصل اسپرٹ اور موقع و محل کی فقیہانہ جزئیات کو ملحوظ رکھ کر آگے منتقل کرنے کی صلاحیت بھی بدرجۂ اتم پائی جائے یہ ایک ایسی کھلی ہوئی حقیقت ہے جسے کوئی عقیدہ جھٹلا نہیں سکتا اس قسم کی روایت پرستی نے ہمیں اصلِ دین سے اس قدر دور پھینک دیا ہے جس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں شبہ نہیں کہ اصولِ حدیث میں یہ بات بھی داخل ہے کہ صحیح حدیث وہ ہے جو اصولِ قرآنی کے خلاف نہ ہو لیکن احادیث کے مجموعوں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قاعدہ کی رعایت میں بہت سہل انگاری برتی گئی ہے۔ اگر آج یا عتنا

لیاجائے کہ فلاں حدیث قرآن کریم کی تعلیم کے خلاف پڑتی ہے تو اس کا جواب فوراً یہ دیدیا جاتا ہے
کہ یہ تمہارے فہم قرآن کا نقص ہے۔ قرآن جیسا ائمہ متقدمین سمجھ گئے ہیں آج کون ویسا سمجھ سکتا ہے
لہذا آپ کو ماننا ہوگا کہ یہ ظاہری تعارض، در اصل تعارض نہیں ہے خواہ اس کے ماننے میں آپ کی
بصیرت بغاوت کرے۔ خود قرآن کریم کی کھلی کھلی تعلیم اس کی تردید کر رہی ہو۔ حیرت ہے کہ جب یہی
دلیل اہل فقہ، فقہ کے وجوب میں لائیں تو یہ پائے چوبین قرار دی جائے لیکن جب اپنے دعوی کا اثبات
مقصود ہو تو اس کو حصن حصین سمجھ لیاجائے۔ چونکہ آج ہمارا دین یا تو وہ ہے جو تقلید کے راستے آیا ہے
یا وہ جو روایات کے ذریعہ سے پہنچا ہے، اس لیے آج جو دین سے عام بغاوت نظر آرہی ہے (مقلدین
مغرب کا میں ذکر نہیں کر رہا، ان کے علاوہ بھی) وہ ہونی ضروری تھی (۱) میرا تو خیال یہ ہے کہ جس طرح
مقلدین حضرات بعض فقہی مجبوریوں کے وقت ادھر ادھر کے راستے تلاش کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں،
اسی طرح روایات کے پابند حضرات پر بھی کبھی نہ کبھی ایسی حالت ضرور آجاتی ہوگی کہ جس چیز کے صحیح
ماننے پر ان کی بصیرت دلالت نہ کرتی ہو (بشرطیکہ وہ فہم قرآن پر مبنی ہو) وہ لپنے آپ کو اسے صحیح ماننے یا
ظاہر کرنا مجبور کرتے ہوں کہ ایسا نہ کرنے سے انھیں ہزارہا ایسے انسانوں کو انسان ماننا پڑتا ہے جنہیں وہ اپنی عقیدہ
کی رو سے بالاتر از انسان سمجھے بیٹھے ہیں حالانکہ اگر یہ حضرات آتنی سی بات سمجھ لیں کہ قرآن یقینی ہے
اور اس کے ماسوا ہمارے دیگر ذرائع علم ظنی، تو بات صاف ہو جاتی ہے کہ یقین کو چھوڑ کر ظن کا
اتباع کسی طور بھی جائز نہیں ہو سکتا۔

وَمَا يَتَّبِعُ أَكْثَرُهُمْ إِلَّا ظَنًّا ۔ إِنَّ الظَّنَّ — ان میں سے اکثر ظن کا اتباع کرتے ہیں، حالانکہ ظن (انسان کو)
لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا إِنَّ اللّٰهَ عَلِيمٌ — حق سے کچھ بھی بے نیاز نہیں کرتا، اور اللہ جانتا ہے جو
بِمَا يَفْعَلُونَ (۱۰: ۳۶) — کچھ وہ کرتے ہیں۔

روایات پرستی (بلکہ رواۃ پرستی) کے مظاہرے کی ہمارے سامنے دو اہم شہادتیں، یعنی سنی اور شیعہ

جماعتوں کا وجود ہے۔ سنی حضرات کے مجموعے اپنے ہیں اور ان کا سلسلۂ روایت تابعین و صحابہ (علیہم الرحمۃ) تک پہنچتا ہے۔ جو تعلیمات ان مجموعوں میں جناب نبی اکرمؐ کی طرف منسوب کی جاتی ہے، اس سے بہت ہی مختلف تعلیم احادیث کے اُن مجموعوں میں ہے جو شیعہ حضرات کے پاس ہیں اور جن کا سلسلۂ روایت بھی اسی طرح تابعین و صحابہ (علیہم الرحمۃ) تک پہنچتا ہے۔ اب یہ حضرات (کم از کم سنی حضرات) تو یہ تصور میں بھی نہیں لا سکتے کہ جو بزرگان دین ان احادیث کے راوی ہیں جو شیعہ حضرات کے مجموعوں میں ہیں وہ (نعوذ باللہ) سب جھوٹے اور غیر معتبر تھے۔ ان کو بھی لامحالہ ثقہ ماننا پڑے گا۔ اب صورت معاملہ یوں ہوئی کہ ثقہ روات کی جماعت سے وہ احادیث امت کو ملیں جو سنی حضرات کے ہاں صحیح ہیں۔ اور ثقہ رواۃ ہی کی ایک دوسری جماعت سے وہ احادیث ملیں جو شیعہ حضرات کے ہاں صحیح ہیں۔ اور دونوں آپس میں ٹھیریں متناقض رواۃ کی جہت سے احادیث پرکھنے کے اصول پر آپ کو لازماً ان دونوں قسم کی احادیث کو اقوال رسولؐ ماننا پڑے گا۔ اور یہ دونوں مجموعے واجب الاتباع ہو جائیں گے۔ اب فرمائیے کہ احادیث کو دینی حجت (یقینی شے) نہ ماننے والوں کے خلاف آپ جو معصیت رسول کا الزام عائد کرتے ہیں اگر وہی اعتراض شیعہ حضرات آپ پر وارد کریں (اور وہ ایسے اعتراضات اکثر و بیشتر کرتے رہے ہیں) تو آپ کے پاس کیا جواب ہے؟ احادیث کو قرآن کریم کے معیار پر جانچ لیجیے۔ یہ سب جھگڑے ختم ہو جائیں گے۔ اگر کسی راوی کے ثقہ ہونے کے لیے یہ بھی شرط ہے کہ وہ ارباب جرح و تعدیل یا جامعین احادیث کا ہم مسلک بھی ہو، تو یہ تو صاف پارٹی بازی ہے۔ انصاف نہیں ہے۔ یہ کیا ضرور ہے کہ جو جماعت آپ کی ہم مسلک نہ ہو۔ اس میں سب کے سب جھوٹے اور غیر معتبر ہی ہوں۔ باقی رہی معصیت رسول، سو اگر آج کوئی بات ثابت ہو جائے کہ وہ حضورؐ کا ارشاد ہے تو پھر اسے جو دین نہ مانے اس کو دین سے کیا علاقہ کہ یہ وہ معصیت رسول ہے جس کی سزا ابدی جہنم ہے۔

پھر ایک چیز اور بھی ہے۔ یہ تو سب کو تسلیم ہے کہ حضور کے بعض ارشادات بہ منصب رسالت ہوتے تھے، اور بعض بالکل ذاتی حیثیت سے۔ میں اس کی تفصیل میں نہیں الجھنا چاہتا کہ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے، اور اس کی بہت سی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ احادیث کے موجودہ مجموعوں میں جس قدر حضور کے اقوال و اعمال درج ہیں ان میں یہ تخصیص تو کہیں نہیں کی گئی کہ حضور نے کس حیثیت سے ایسا کیا یا ایسا فرمایا۔ اور اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں کہ امت کے لیے اطاعت اسی کی واجب ہے، جو حضور نے بہ منصب رسالت فرمایا ہو۔ ذاتی حیثیت کے متعلق تو خود حضور کے ارشادات موجود ہیں کہ وہ واجب الاتباع نہیں۔ اب ہم ان احادیث میں سے کسے واجب الاتباع قرار دیں اور کسے نہ قرار دیں؟ ظاہر ہے کہ جس چیز کا پہلے قول رسول ہونا ہی ظنّی ہو، اور پھر یہ بھی یقینی نہ ہو کہ اسے حضور نے کس حیثیت سے فرمایا تھا، اسے دین قرار دے دینا کس قدر زیادتی ہے مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ کا اطلاق اگر عمومی بھی مان لیا جائے، تو بھی احادیث کے مجموعے تو اس ذیل میں آتے ہی نہیں۔ کیونکہ یہ مجموعے تو رسول نے ہم کو نہیں دیے۔ رسول اور امت کے درمیان اس باب میں تو لاکھوں متفرق انسان آ گئے ہیں اور پھر یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ جب امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ لاکھوں حدیثوں کو یہ کہہ کر مسترد کر دیں کہ وہ اقوال رسول نہیں ہو سکتیں تو آج امت سے یہ حق کیوں چھن گیا کہ وہ امام بخاری یا دیگر ائمہ احادیث کے مجموعوں کو بھی پرکھ سکیں؟ اگر آج بھی ان مجموعوں کو قرآن کریم کی روشنی میں پرکھ کر ایک الگ مجموعہ تیار کر لیا جائے تو ہر چند وہ بھی یقینی تو نہیں ہوگا لیکن اس میں ایسی باتیں تو نہ ہوں گی جنہیں رسول اللہ کی طرف منسوب کرنے کی قرآن اجازت نہ دے۔ اور جن سے انسانی بصیرت ابا کرے۔ چونکہ یہ مجموعہ پھر تنقید سے بالاتر نہیں ہو سکتا اس لیے ممکن ہے کہ آنے والے زمانہ میں جوں جوں فہم قرآن بڑھتا چلا جائے۔ یہ مجموعہ اور مہذب ہوتا

چلا جائے۔

لیکن سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ ان حضرات کی خدمت میں جب کبھی ایسی بات پیش کیجیے، وہ عوام کے جذبات کو فوراً یہ کہکر مشتعل کر دیتے ہیں کہ لو بھئی! دیکھو، یہ کہتا ہے کہ (نعوذ باللہ) سب صحابہؓ جھوٹے تھے۔ اور رسول اللہؐ کی سب باتیں (معاذ اللہ) رطب و یابس ہیں۔ توبہ توبہ استغفر اللہ اتنا کہکر وہ خوش ہو جاتے ہیں کہ بس اب خدائی فوج اس ملحد و زندیق کو زندہ نہ چھوڑے گی۔ لیکن وہ یقین رکھیں کہ ان ملاحدہ و زنادقہ" کے استیصال کے بعد بھی قرآن زندہ رہے گا اور ہر اس چیز کو مٹا کر چھوڑے گا جو اس کے خلاف پڑے گی، خواہ اسے آپ ائمۂ سلف کی طرف منسوب کر دیجیے خواہ خود نبی اکرمؐ کی ذات مقدس کی طرف۔ اور اس کے بعد یا تو قرآن باقی رہے گا یا عمل متواتر (اسوۂ حسنہ) جو یقینی دین ہے۔ لہٰذا ڈرنا چاہیے اس وقت سے جب یہ پوچھا جائے گا کہ کیا تمہارے پاس میزان کے یہ دو پلڑے موجود نہ تھے کہ تم حق و باطل کی تمیز کر سکتے۔ (باقی)۔

# استدراک

جناب پرویز کا اصل مقصد یہ ہے کہ روایات کی پابندی میں جو غلو کیا جاتا ہے، اور احادیث کے مجموعوں پر جس طرح آنکھیں بند کر کے ایمان لایا جاتا ہے، یہ بھی اسی قسم کی غلطی ہے جس قسم کی غلطی فقہائے مجتہدین کی اندھی تقلید کرنے والے اور ان کے اجتہادات کو تنقید سے بالاتر سمجھنے والے حضرات کر رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں چوہدری صاحب نے جو طریق بحث و استدلال اختیار کیا ہے اُس سے یہ غلط فہمی پیدا ہونے کا خدشہ ہے کہ وہ اس گروہ کے مسلک کی طرف جھک گئے ہیں جو بزعم خود "اہل قرآن" کے نام سے موسوم ہے پچھلے دنوں سفر دہلی کے موقع پر ہم نے چوہدری صاحب سے

بانی عرض کیا تھا کہ مضمون کے اس حصہ پر نظر ثانی فرمالیں چنانچہ انہوں نے وعدہ بھی کر لیا تھا کہ جو مقامات حد اعتدال سے ہٹ گئے ہیں ان کو بدل دیں گے، لیکن غالباً مشغولیت کی وجہ سے وہ اپنا وعدہ پورا نہ کر سکے۔ چونکہ ان کے مضمون کا سلسلہ توڑنا مناسب نہیں ہے، اس لیے اس حصہ کو ہم بجنسہٖ شائع کر رہے ہیں، مگر چند امور کی توضیح ضروری سمجھتے ہیں تاکہ کوئی غلط فہمی پیدا نہ ہو۔ ہمیں معلوم ہے کہ خود صاحب مضمون کے خیالات بھی اس مسئلہ میں وہی ہیں جو ہم اپنے نوٹ میں ظاہر کر رہے ہیں۔

اس سے تو کسی مسلمان کو انکار نہیں ہو سکتا کہ امور دین میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا قول و عمل واجب الاتباع ہے اور قرآن کے بعد جس چیز کے ذریعہ سے ہم کو اپنے دین کا علم حاصل ہوتا ہے وہ حضور کا طریقہ ہی ہے۔ اس کے بعد سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ طریق نبوی کے علم کی کیا کیا صورتیں ہیں، اور کس صورت کا دین میں کیا مرتبہ ہے۔

جو باتیں حضور سے ہم تک پہنچی ہیں ان کو دو حصوں پر تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک حصہ وہ ہے جو تواتر کے ساتھ آیا ہے، خواہ وہ تواتر عملی ہو یا خبری۔ دوسرا حصہ وہ جو تواتر کے ساتھ نہیں آیا۔ ان میں سے پہلے حصہ کے متعلق [illegible] کا اتفاق ہے کہ وہ یقینی ہے، اور عقل بھی یہ فیصلہ کرتی ہے کہ اسے ثابت شدہ حقیقت [illegible] یقینی ہونا مسلمات میں سے ہے۔ رہا دوسرا حصہ تو صوراً اس کو [illegible] علم ضروری ہے مگر اختلاف جو کچھ واقع ہوتا ہے وہ اس امر میں ہے کہ اس اصولی ظنیت کی بنا پر اخبار آحاد کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے؟ اس مسئلہ میں تین مختلف مسلک ہیں۔

ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ احادیث کا تمام مجموعہ ظنی ہے، اس لیے وہ من حیث الکل رد کر دینے کے قابل ہے، کیونکہ جو چیز ظنی ہے وہ ثابت شدہ نہیں اور جو ثابت شدہ نہیں لائق اتباع نہیں مگر تھوڑے سے غور

کے بعد اس مسلک کی غلطی واضح ہو جاتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ کوئی مظنون چیز "ثابت شدہ" نہیں ہوتی لیکن کسی چیز کا "ثابت شدہ" نہ ہونا یہ معنی کب رکھتا ہے کہ وہ رد ہی کر دینے کے قابل ہو؟ اگر اتباع کے لیے یقینی ہونا شرط ہے تو فرمائیے کہ "یقینیات" دنیا میں ہیں کتنے؟ آپ کی زندگی کے کتنے معاملات ایسے ہیں جن میں آپ صرف یقینیات کی پیروی کرتے ہیں اور مظنونات کو من حیث الکل رد کر دیتے ہیں؟ تجزیہ و تحلیل کے چند ہی مدارج طے کر کے آپ کو معلوم ہو جائیگا کہ یہ قاعدہ زندگی میں نہ کبھی چلا ہے نہ چل سکتا ہے۔ مظنونات کو من حیث الکل قبول کر لینا جس درجہ کی غلطی ہے، اسی درجہ کی غلطی ان کو من حیث الکل رد کر دینا بھی ہے۔ عقل سلیم کا اقتضا یہ ہے (اور اسی کی پیروی زندگی کے تمام معاملات میں انسان کرتا ہے) کہ تمام مظنونات کو ایک ہی لکڑی سے نہ ہانکا جائے، بلکہ ان کے درمیان تمیز کی جائے، ان میں سے ہر ایک کو جدا جدا جانچ کر دیکھا جائے، اور تحقیق کے مختلف ذرائع سے کام لے کر یہ دریافت کیا جائے کہ کونسی چیز "یقین" سے کس درجہ قریب یا کس درجہ بعید ہے؟ جو چیز بعید ہو اسے رد کر دو۔ جو چیز قرب و بعد کے درمیان ہو اس میں توقف کرو۔ اور جو چیز قریب یا اقرب ہو، اس کو بلحاظ اس کے درجۂ قرب کے قبول کر لو۔ یہی اصول ہے جس پر دنیا کے سارے معاملات میں عمل کیا جاتا ہے، اور چونکہ ہمارا دین غیر معقول نہیں ہے، اس لیے اسی کی پیروی دین کے معاملات میں بھی کرنی چاہیے۔ کم از کم ہمیں تو قرآن میں کوئی ایک آیت بھی ایسی نہیں ملی جو اس اصول کو خلاف حق قرار دیتی ہو۔ جن آیات میں ظن پر چلنے والوں کی برائی وارد ہوئی ہے ان کا مقصد یہ نہیں ہے کہ ظن کوئی گناہ ہے یا اس سے بالکلیہ اجتناب واجب ہے، بلکہ اس کا منشا صرف یہ ہے کہ جو ظن و تخمین، وحی کے خلاف ہو، یا جس کو وحی سے بے نیاز اور بے پروا ہو کر اختیار کیا جائے وہ گمراہی کا سبب ہے۔

احادیث کو بالکلیہ رد کر دینے سے عملاً جو خرابی واقع ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ جزئیات میں

انسان رسالت کی رہنمائی سے محروم ہوجاتا ہے، اور دین پر عمل کرنے کی تفصیلی صورتوں میں قیاس ورائے کا دخل اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ اس سے اصولی احکام کی اصل اسپرٹ کے بھی ضائع ہوجانے کا خوف ہے۔ نیز اس میں یہ بھی خطرہ ہے کہ جب تفصیلات میں سرے سے کوئی سند ہی نہ ہوگی، تو لامحالہ انفرادیت راہ پائے گی۔ ہر شخص اپنی رائے اور اپنے رجحان کے مطابق جو صورت چاہے گا اختیار کرے گا، اور کوئی ایسی قوت باقی نہ رہے گی جو تفرق وانتشار اور اختلاف عمل کو انفرادیت کی آخری حدود تک پہنچنے سے روک سکتی ہو۔ مثال کے طور پر ایک نماز جمعہ ہی کو لے لیجیے جس پر تفصیلی بحث ابھی پچھلے مہینہ آپ کی نظر سے گذر چکی ہے۔ ہمارے پاس علم یقین کے جو ذرائع ہیں، ان میں سے پہلا اور سب سے بڑا ذریعہ یعنی قرآن ہم کو صرف اتنی ہدایت دیتا ہے کہ "جب نماز جمعہ کے لیے بلایا جائے تو سب کام چھوڑ کر دوڑ پڑو"۔ دوسرا ذریعہ یعنی عمل متواتر ہم کو اس سے تھوڑی دور آگے لے جاکر چھوڑ دیتا ہے۔ وہ صرف اتنا علم ہم کو دیتا ہے کہ جمعہ کا وقت ظہر کا وقت ہے، اس کے لیے جماعت شرط ہے، اس سے پہلے خطبہ ہونا چاہیے، اس کی رکعتیں دو ہیں، اور اس کے لیے اذن عام ضروری ہے۔ ان امور کے بعد جتنے عملی جزئیات ہیں ان میں سے کوئی چیز بھی قرآن یا عمل متواتر سے ہم کو معلوم نہیں ہوتی۔ اب اگر اخبار آحاد کو بحیثیت مجموعی رد کردینے کا اصول اختیار کیا جائے، تو نتیجہ یہ ہوگا کہ ہر شخص جزئیات کو اپنی رائے سے مقرر کرے گا، اور کسی رائے کو بھی کوئی ایسی اختیارٹی حاصل نہ ہوگی جس کی بنا پر اسے دوسری رائے کے مقابلہ میں ترجیح دی جاسکے اور مسلمانوں کی کسی بڑی جماعت پر اس کی پیروی لازم ہوجائے۔ آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ اس سے جزئیات میں کتنی افراتفری برپا ہوگی، نظام جماعت کو کتنا نقصان پہنچے گا، اور کس طرح بعض صورتوں میں مقاصد شریعت تک فوت ہوجائیں گے۔ اس میں شک نہیں کہ اخبار آحاد سے جو تفصیلات معلوم ہوتی ہیں وہ بھی کچھ نہ کچھ مختلف ہیں اور ان کی بنا پر بھی متعدد مذہب نکلتے ہیں۔ مگر اول تو ان میں شکل پانچ سات

مذاہب نکلنے کی گنجائش ہے، اور پھر ان سے جتنے مذہب بھی نکلتے ہیں ان میں سے ہر ایک کو کسی بالاتر اقتدار کی سند حاصل ہے جس کی قوت سے مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت اس کا اتباع کرتی ہے۔ بخلاف اس کے اخبار آحاد کو بالکلیہ رد کرنے کے بعد بے شمار مذاہب کی گنجائش نکل آتی ہے، اور ان میں سے کسی مذہب کو بھی کوئی ایسی سند حاصل نہیں ہوتی جو زیادہ نہیں، دو ہی مسلمانوں کو کسی ایک جزئیہ میں ایک طریقہ پر جمع کر دے۔ نتیجہ اس کا بالکل ظاہر ہے۔ جمعہ کی قوت جامعہ ختم ہو کر رہ جائے گی اور اختلاف عمل اس مقصد ہی کا خاتمہ کر دے گا جس کے لیے اقامت جمعہ فرض کی گئی ہے۔

جمعہ کو ہم نے صرف مثال کے طور پر پیش کیا ہے۔ ورنہ اگر آپ غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ اسلام کے نظام شرعی کو جو چیز ایک مستقل عملی نظام بناتی ہے اور مسلمانوں کی تہذیب، تمدن، معاشرت، معیشت، سیاست، غرض ان کی پوری اجتماعی زندگی اور انفرادی برتاؤ کو ایک مستقل تفصیلی شکل میں ڈھالتی ہے وہ وہی علم ہے جو اخبار آحاد سے ہم کو حاصل ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پبلک اور پرائیویٹ زندگی، آپ کے اخلاق، آپ کی عادات، آپ کا طریق عبادت، آپ کا طرز تعلیم و تبلیغ، آپ کا طرز عدالت، آپ کے قانونی فیصلے، زندگی کے مختلف شعبوں میں آپ کی ہدایات اور آپ کا طرز عمل، پھر آپ کے خلفاء اور صحابہ اور اہل بیت اور تابعین کے آثار، یہی وہ چیزیں ہیں جو اسلام کی عملی زندگی کا پورا نقشہ پیش کرتی ہیں، اور اسی نقشہ پر اسلام ایک مکمل نظام حیات بنتا ہے۔ مگر ان چیزوں کے حصول کا ذریعہ نہ قرآن ہے نہ تواتر۔ صرف اخبار آحاد ہی ہیں جو ہم تک معلومات اور ہدایات کا عظیم الشان ذخیرہ پہنچاتی ہیں۔ ان کو مٹا دیجیے یہ اسلام محض ایک ڈھانچہ رہ جائے گا جس پر گوشت پوست کچھ نہ ہوگا، جس کی شکل اور جس کے خط و خال کو ہر شخص جس طرح چاہے گا بنائے گا۔ اس صورت میں درحقیقت کوئی ایک نظام

قائم ہی نہ ہوسکیگا، کجا کہ کوئی ایسی تہذیب وجود میں آسکے جو اسلامی تہذیب ہو۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث کی مخالفت آج وہی لوگ کر رہے ہیں جو در اصل اسلامی تہذیب کے نظام کو توڑنا چاہتے ہیں۔ وہ اس کے تعینات کی حدود میں اپنی اہوا اور خواہشات کی پیروی کے لیے کوئی گنجائش نہیں پاتے اس لیے انہوں نے یہ مسلک اختیار کیا ہے کہ اُس چیز ہی کو مٹا دو جو اس نظام کی حد بندی کرتی ہے پھر ہم آزاد ہو جائیں گے کہ اسلام کے ڈھانچے پر جس طرح چاہیں گوشت پوست چڑھائیں، اور جیسی چاہیں اس کی شکل بنا دیں۔

یہ لوگ احادیث کو مجموعی حیثیت سے مردود قرار دینے کے لیے اُن حدیثوں کو مثال میں پیش کرتے ہیں جو باہم متعارض ہیں، یا جن میں انبیاء علیہم السلام پر طعن پایا جاتا ہے، یا جو صریح عقل کے خلاف ہیں یا قرآن کے خلاف نظر آتی ہیں۔ ان نمونے کے افراد سے یہ لوگ پورے مجموعہ کے غلط اور قابل رد ہونے پر استدلال کرتے ہیں۔ مگر یہ استدلال ایسا ہی ہے جیسے کسی قوم کے چند افراد کی بدمعاشی سے پوری قوم کی بدمعاشی پر استدلال کیا جائے۔ جب ہر روایت بلحاظ متن اور بلحاظ اسناد دوسری روایت سے مختلف ہے تو ہر روایت کے متعلق جدا جدا تحقیق کرکے رائے قائم کرنی چاہیے کہ وہ قبول کرنے کے لائق ہے یا رد کرنے کے لائق۔ سب کو ایک مجموعہ کی حیثیت سے لینا اور پورے مجموعہ کے متعلق ایک ہی رائے قائم کرنا کسی معقول انسان کا فعل نہیں ہو سکتا۔ اگر یہ لوگ احادیث پر فرداً فرداً نگاہ ڈالیں گے تو ان کو معلوم ہوگا کہ جہاں ایک قلیل تعداد ایسی حدیثوں کی ہے جنہیں دیکھ کر دل گواہی دیتا ہے کہ یہ حدیثیں رسول اللہ کی نہیں ہوسکتیں وہاں ایک کثیر تعداد ایسی حدیثوں کی بھی ہے جو حکمت کے جواہر سے لبریز ہیں جن میں قانون اور اخلاق کے بہترین اصول پائے جاتے ہیں، جو اسلام کی حقیقت اور اس کے مصالح و حکم پر بہترین روشنی ڈالتی ہیں اور جن کو دیکھ کر دل گواہی دیتا ہے کہ یہ ایک رسول ہی کی حدیثیں ہوسکتی ہیں۔ پھر اگر

یہ لوگ ستو پرست اور انصاف پسند ہوتے تو انہیں نظر آتا کہ محدثین کرام نے عہد رسالت اور عہد صحابہ کے اخبار و آثار جمع کرنے اور ان کو چھانٹنے اور ان کی حفاظت کرنے میں جتنی محنتیں کی ہیں جو دنیا کے کسی گروہ نے کسی دور کے حالات کے لیے نہیں کیں۔ انہوں نے احادیث کی تنقید و تنقیح کے لیے جو طریقے اختیار کیے وہ ایسے ہیں کہ کسی دور گذشتہ کے حالات کی تحقیق کے لیے ان سے بہتر طریقے عقل انسانی نے آج تک دریافت نہیں کیے۔ تحقیق کے زیادہ سے زیادہ معتبر ذرائع جو انسان کے امکان میں ہیں وہ سب اس گروہ نے استعمال کیے ہیں اور ایسی سختی کے ساتھ استعمال کیے ہیں کہ کسی دور تاریخ میں ان کی نظیر نہیں ملتی۔ درحقیقت یہی چیز اس امر کا یقین دلاتی ہے کہ اس عظیم الشان خدمت میں اللہ تعالیٰ ہی کی توفیق شامل حال رہی ہے، اور جس خدا نے اپنی آخری کتاب کی حفاظت کا غیر معمولی انتظام کیا ہے، اسی نے اپنے آخری نبی کے نقوش قدم اور آثار ہدایت کی حفاظت کے لیے بھی وہ انتظام کیا ہے جو اپنی نظیر آپ ہی ہے۔

یہ تو اس گروہ کا حال تھا جو احادیث کی اصولی ظنیت کی بنا پر انھیں بالکلیہ رد کر دینا چاہتا ہے۔ اب دوسرے گروہ کو لیجیے جو دوسری انتہا کی طرف گیا ہے۔ یہ لوگ محدثین کے اتباع میں جائز حد سے بہت زیادہ تشدد اختیار کرتے ہیں۔ ان کا قول یہ ہے کہ محدثین کرام نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر کے رکھدیا ہے۔ ایک ایک حدیث کو چھانٹ کر وہ بتا چکے ہیں کہ کون کس حد تک قابل اعتبار ہے اور کون کس حد تک ناقابل اعتبار۔ اب ہمارا کام صرف یہ ہے کہ ان بزرگوں نے احادیث کے جو درجے مقرر کر دیے ہیں انہی کے مطابق ہم ان کو اعتبار اور حجیت کا مرتبہ دیں۔ مثلاً جو قوی الاسناد ہے اس کے مقابلہ میں ضعیف الاسناد کو چھوڑ دیں، جسے وہ صحیح قرار دے گئے ہیں اسے صحیح تسلیم کریں اور جس کی صحت میں وہ قدح کر گئے ہیں اس سے بالکل استناد نہ کریں، ان کے معروف کو معروف اور ان کے منکر کو منکر مانیں، رواۃ کے عدل اور ضبط اور ثقاہت کے متعلق جن جن آراء کا وہ اظہار کر گئے ہیں ان پر گویا ایمان لے آئیں، ان کی نگاہ میں احادیث کے معتبر یا غیر معتبر ہونے کا جو معیار

ہے ٹھیک ٹھیک اسی معیار کی ہم بھی پابندی کریں، مثلاً مشہور کو شاذ پر، مرفوع کو مرسل پر اور مسلسل کو منقطع پر لازماً ترجیح دیں، اور ان کی کھینچی ہوئی حد سے یک سر مو تجاوز نہ کریں۔ یہی وہ مسلک ہے جس کی مخالفت جناب پرویز کرنا چاہتے ہیں اور حق یہ ہے کہ ان کی مخالفت بالکل جائز ہے۔

محدثین رحمہم اللہ کی خدمات مسلم۔ یہ بھی مسلّم کہ نقدِ حدیث کے لیے جو مواد انہوں نے فراہم کیا ہے وہ صدرِ اول کے اخبار و آثار کی تحقیق میں بہت کار آمد ہے۔ کلام اس میں نہیں بلکہ صرف اس امر میں ہے کہ کلیتہً ان پر اعتماد کرنا کہاں تک درست ہے۔ وہ بہرحال تھے تو انسان ہی۔ انسانی علم کے لیے جو حدیں فطرۃ اللہ نے مقرر کر رکھی ہیں ان سے آگے تو وہ نہیں جا سکتے تھے۔ انسانی کاموں میں جو نقص فطری طور پر رہ جاتا ہے اس سے تو ان کے کام محفوظ نہ تھے۔ پھر آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ جس کو وہ صحیح قرار دیتے ہیں وہ حقیقت میں بھی صحیح ہے؟ صحت کا کامل یقین تو خود ان کو بھی نہ تھا۔ وہ بھی زیادہ سے زیادہ یہی کہتے تھے کہ اس حدیث کی صحت کا ظنِ غالب ہے۔ مزید براں یہ ظنِ غالب جس بنا پر ان کو حاصل ہوتا تھا وہ بلحاظ روایت تھا نہ کہ بلحاظِ درایت۔ ان کا نقطۂ نظر زیادہ تر اخباری ہوتا تھا۔ فقہ ان کا اصل موضوع ہی نہ تھا، اس لیے فقیہانہ نقطۂ نظر سے احادیث کے متعلق رائے قائم کرنے میں وہ فقہائے مجتہدین کی بہ نسبت کمزور تھے۔ پس ان کے کمال کا جائز اعتراف کرتے ہوئے یہ ماننا پڑے گا کہ احادیث کے متعلق جو کچھ بھی تحقیقات انہوں نے کی ہے اس میں دو طرح کی کمزوریاں موجود ہیں۔ ایک بلحاظ اسناد، دوسرے بلحاظ تفقہ۔

اس مطلب کی توضیح کے لیے ہم ان دونوں حیثیتوں کے نقائص پر تھوڑا سا کلام کریں گے۔

کسی روایت کو جانچنے میں سب سے پہلے جس چیز کی تحقیق کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ روایت جن لوگوں کے واسطے سے آئی ہے وہ کیسے لوگ ہیں۔ اس سلسلہ میں متعدد حیثیات سے ایک ایک راوی کی جانچ کی جاتی ہے۔ وہ جھوٹا تو نہیں ہے؟ روایتیں بیان کرنے میں غیر محتاط تو نہیں؟ فاسق اور

بدعقیدہ تو نہیں؟ وہمی یا ضعیف الحفظ تو نہیں؟ مجہول الحال ہے یا معروف الحال؟ ان تمام حیثیات سے رواۃ کے احوال کی جانچ پڑتال کر کے محدثین کرام نے اسماء الرجال کا عظیم الشان ذخیرہ فراہم کیا ہے جو بلاشبہ نہایت بیش قیمت ہے۔ مگر اس میں کونسی چیز ہے جس میں غلطی کا احتمال نہ ہو۔

اول تو رواۃ کی سیرت اور ان کے حافظہ اور ان کی دوسری باطنی خصوصیات کے متعلق بالکل صحیح علم حاصل ہونا مشکل۔ دوسرے خود وہ لوگ جو ان کے متعلق رائے قائم کرنے والے تھے، انسانی کمزوریوں سے مبرا نہ تھے نفس ہر ایک کے ساتھ لگا ہوا تھا، اور اس بات کا قوی امکان تھا کہ اشخاص کے متعلق اچھی یا بری رائے قائم کرنے میں ان کے جذبات کا بھی کسی حد تک دخل ہو جائے۔ یہ امکان محض امکان عقلی نہیں ہے بلکہ اس امر کا ثبوت موجود ہے کہ بارہا یہ امکان فعل میں آ گیا ہے۔ حماد جیسے بزرگ تمام علمائے حجاز کے متعلق رائے ظاہر کرتے ہیں کہ "ان کے پاس علم نہیں تمہارے بچے بھی ان سے زیادہ علم رکھتے ہیں"۔ عطاء اور طاؤس اور مجاہد جیسے فضلاء کے حق میں بھی ان کی یہی رائے ہے۔ یہ حماد کون ہیں؟ امام ابوحنیفہ کے استاد اور ابراہیم النخعی کے جانشین۔ امام زہری کو دیکھیے۔ اپنے زمانہ کے اہل مکہ پر ریمارک کرتے ہیں مارأیت قوماً انقض لعری الاسلام من اھل مکۃ۔ حالانکہ مکہ اس وقت جلیل القدر علماء و صلحاء سے خالی نہ تھا۔ شعبی اور ابراہیم النخعی دونوں بڑے درجہ کے لوگ ہیں۔ مگر ایک دوسرے پر کس طرح چوٹ کرتے ہیں۔ شعبی کہتے ہیں کہ ابراہیم النخعی رات کو ہم سے مسائل پوچھتا ہے اور صبح لوگوں کے سامنے اپنی طرف سے بیان کرتا ہے"۔ ابراہیم النخعی کہتے ہیں کہ "وہ کذاب مسروق سے روایت کرتا ہے حالانکہ مسروق سے وہ ملا تک نہیں"۔ ضحاک کو دیکھیے ایک مرتبہ اپنی بات کی پچ میں آ کر صحابہ کرام کے متعلق کہہ گئے کہ "ہم ان سے زیادہ جانتے ہیں" سعید بن جبیر جیسے متقی بزرگ ایک مسئلہ میں شعبی پر جھوٹ کا الزام رکھتے ہیں، اور عکرمہ کے حق میں اپنے غلام سے کہتے ہیں کہ لاتکذب علی کما کذب عکرمہ علی ابن عباس۔ امام مالک کی جلالت

شان دیکھیے اور محمد بن اسحاق جیسے شخص کے حق میں ان کا یہ فرمانا دیکھیے کہ ذالك دجال الدجاجلة۔ اس سے بڑھ کر عجیب یہ کہ وہ تمام علماء عراق پر سخت طعن کرتے ہیں اور ان کے حق میں فرماتے ہیں کہ انزلوھم منزلة اھل الکتاب لا تصدقوھم ولا تکذبوھم۔ امام ابوحنیفہ کس قدر جلیل القدر اور محتاط فقیہ ہیں۔ اعمش کے حق میں فرماتے ہیں کہ اس نے کبھی نہ رمضان کا روزہ رکھا نہ غسل جنابت کیا۔ وجہ صرف یہ تھی کہ اعمش الماء من الماء کے قائل تھے اور حذیفہ کی حدیث کے مطابق سحری کیا کرتے تھے۔ عبداللہ بن المبارک کس پایہ کے ثقہ بزرگ ہیں۔ ایک مرتبہ ان پر بھی ضد نے غلبہ کیا اور امام مالک کے حق میں ان کے منہ سے یہ الفاظ نکل گئے کہ "میں اس کو عالم نہیں سمجھتا" یحییٰ بن معین نے تو بڑے بڑے ثقات پر چوٹیں کی ہیں۔ زہری، اوزاعی، ابوعثمان النہدی، طاوس غرض اس عہد کے متعدد بڑے بڑے لوگوں پر وہ طعن کر گئے ہیں، حتٰی کہ امام شافعی تک کے حق میں انہوں نے کہا کہ لیس بثقة۔ ان سب سے بڑھ کر عجیب بات یہ ہے کہ بسا اوقات صحابہ رضی اللہ عنہم پر بھی بشری کمزوریوں کا غلبہ ہو جاتا تھا اور وہ ایک دوسرے پر چوٹیں کر جاتے تھے۔ ابن عمر نے سنا کہ ابوہریرہ وتر کو ضروری نہیں سمجھتے۔ فرمانے لگے کہ ابوہریرہ جھوٹے ہیں۔ حضرت عائشہ نے ایک موقع پر انس اور ابوسعید خدری رضی اللہ عنہما کے متعلق فرمایا کہ وہ حدیث رسول اللہ کو کیا جانیں۔ وہ تو اس زمانہ میں بچے تھے۔ حضرت حسن بن علی سے ایک مرتبہ وشاھدٍ ومشھودٍ کے معنی پوچھے گئے۔ انہوں نے اس کی تفسیر بیان کی۔ عرض کیا گیا کہ ابن عمر اور ابن الزبیر تو ایسا اور ایسا کہتے ہیں۔ فرمایا دونوں جھوٹے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک موقع پر مغیرہ بن شعبہ کو جھوٹا قرار دیدیا۔ عبادہ بن الصامت نے ایک مسئلہ بیان کرتے ہوئے مسعود بن اوس انصاری پر جھوٹ کا الزام لگا دیا، حالانکہ وہ بدری صحابہ میں سے ہیں۔

اس قسم کی مثالیں پیش کرنے سے ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ اسماء الرجال کا سارا علم غلط ہے
بلکہ ہمارا مقصد صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ جن حضرات نے رجال کی جرح و تعدیل کی ہے وہ بھی تو آخر
انسان تھے، بشری کمزوریاں ان کے ساتھ بھی لگی ہوئی تھیں۔ کیا ضرور ہے کہ جس کو انہوں نے ثقہ قرار دیا
ہو وہ بالیقین ثقہ اور تمام روایتوں میں ثقہ ہو، اور جس کو انہوں نے غیر ثقہ ٹھہرایا ہو وہ بالیقین
غیر ثقہ ہو۔ اور اس کی تمام روایتیں پایۂ اعتبار سے ساقط ہوں۔ پھر ایک ایک راوی کے
حافظہ اور نیک نیتی اور صحت ضبط وغیرہ کا حال بالکل صحیح معلوم کرنا تو اور بھی مشکل ہے، اور ان
سب سے زیادہ مشکل یہ تحقیق کرنا ہے کہ ہر راوی نے ہر روایت کے بیان میں اُن تمام جزئیات
کو ملحوظ بھی رکھا ہے یا نہیں جو فقیہانہ نقطۂ نظر سے استنباط مسائل میں اہمیت رکھتی ہیں۔

یہ تو فن رجال کا حال ہے۔ اس کے بعد دوسری اہم چیز سلسلۂ اسناد ہے۔ محدثین نے ایک
ایک حدیث کے متعلق یہ تحقیق کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہر راوی جس شخص سے روایت لیتا ہے آیا
وہ اُس کا ہم عصر تھا یا نہیں، ہم عصر تھا تو اس سے ملا بھی تھا یا نہیں، اور ملا تھا تو آیا اس نے
یہ خاص حدیث خود اُسی سے سنی یا کسی اور سے سن لی اور اس کا حوالہ نہیں دیا۔ ان سب چیزوں
کی تحقیق انہوں نے اُسی حد تک کی ہے جس حد تک انسان کر سکتے تھے، مگر لازم نہیں کہ ہر ہر روایت
کی تحقیق میں یہ سب امور ان کو ٹھیک ٹھیک ہی معلوم ہو گئے ہوں۔ بہت ممکن ہے کہ جس روایت
کو وہ متصل السند قرار دے رہے ہیں وہ درحقیقت منقطع ہو اور انہیں یہ معلوم نہ ہو سکا ہو کہ بیچ میں کوئی
ایسا مجہول الحال راوی چھوٹ گیا ہے جو ثقہ نہ تھا۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ جو روایتیں مرسل یا
معضل یا منقطع ہیں، اور اس بنا پر پایۂ اعتبار سے گری ہوئی سمجھی جاتی ہیں ان میں سے بعض ثقہ
راویوں سے آئی ہوں اور بالکل صحیح ہوں۔

یہ اور ایسے ہی بہت سے امور ایسے ہیں جن کی بنا پر اسناد اور جرح و تعدیل کے علم کو

کلیتہً صحیح نہیں سمجھا جاسکتا۔ یہ مواد اس حد تک قابل اعتماد ضرور ہے کہ سنت نبوی اور آثار صحابہ کی تحقیق میں اس سے مدد لی جائے اور اس کا مناسب لحاظ کیا جائے، مگر اس قابل نہیں ہے کہ بالکل اسی پر اعتماد کر لیا جائے۔

جیسا کہ ہم نے اوپر عرض کیا، محدثین رحمہم اللہ کا خاص موضوع اخبار و آثار کی تحقیق تھا، اس لیے ان پر اخباری نقطۂ نظر غالب ہو گیا تھا، اور وہ روایات کو معتبر یا غیر معتبر قرار دینے میں زیادہ تر صرف اسی چیز کا لحاظ فرماتے تھے کہ اسناد اور رجال کے لحاظ سے وہ کیسی ہیں۔ رہا فقیہانہ نقطۂ نظر تو وہ ان کے موضوع خاص سے ایک حد تک غیر متعلق تھا، اس لیے اکثر وہ ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا تھا، اور وہ روایات پر اس حیثیت سے کم ہی نگاہ ڈالتے تھے۔ اسی وجہ سے اکثر ایسا ہوا ہے کہ ایک روایت کو انہوں نے صحیح قرار دیا ہے حالانکہ معنی کے لحاظ سے وہ زیادہ اعتبار کے قابل نہیں، اور ایک دوسری روایت کو وہ قلیل الاعتبار قرار دے گئے ہیں، حالانکہ معنیً وہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔ یہاں اس کا موقع نہیں کہ مثالیں دے کر تفصیل کے ساتھ اس پہلو کی توضیح کی جائے۔ مگر جو لوگ علوم شریعت پر نظر رکھتے ہیں ان سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ محدثانہ نقطۂ نظر بکثرت مواقع پر فقیہانہ نقطۂ نظر سے ٹکرا گیا ہے اور محدثین کرام صحیح احادیث سے بھی احکام و مسائل کے استنباط میں وہ توازن اور اعتدال ملحوظ نہیں رکھ سکے ہیں جو فقہاء مجتہدین نے ملحوظ رکھا ہے۔

اس بحث سے یہ بات معلوم ہو گئی کہ جس طرح حدیث کو بالکلیہ رد کر دینے والے غلطی پر ہیں اسی طرح وہ لوگ بھی غلطی سے محفوظ نہیں ہیں جنہوں نے حدیث سے استفادہ کرنے میں صرف روایات ہی پر اعتماد کر لیا ہے۔ مسلک حق ان دونوں کے درمیان ہے، اور یہ وہی ہے جو ائمہ مجتہدین نے اختیار کیا ہے۔ امام ابوحنیفہ کی فقہ میں آپ بکثرت ایسے مسائل دیکھتے

ہیں جو مرسل اور معضل اور منقطع احادیث پر مبنی ہیں یا جن میں ایک قوی الاسناد حدیث کو چھوڑ کر ایک ضعیف الاسناد حدیث کو قبول کیا گیا ہے، یا جن میں احادیث کچھ کہتی ہیں اور امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کچھ کہتے ہیں۔ یہی حال امام مالک کا ہے۔ باوجودیکہ اخباری نقطۂ نظر ان پر زیادہ غالب ہے، مگر پھر بھی ان کے تفقّہ نے بہت سے مسائل میں ان کو ایسی احادیث کے خلاف فتویٰ دینے پر مجبور کیا جنہیں محدثین صحیح قرار دیتے ہیں چنانچہ لیث بن سعد نے ان کی فقہ سے تقریباً ۷۰ مسئلے اس نوعیت کے نکالے ہیں۔ امام شافعی کا حال بھی اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں معاذ اللہ اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ یہ لوگ کسی حدیث کو حدیث صحیح جان کر اس سے انحراف کرتے تھے نہیں، بلکہ اصل معاملہ یہ تھا کہ ان کے نزدیک صحتِ حدیث کا مدار صرف اسناد پر نہ تھا۔ اسناد کے علاوہ ایک اور کسوٹی بھی تھی جس پر وہ احادیث کو پرکھتے تھے، اور جس حدیث کے متعلق ان کو اطمینان ہو جاتا تھا کہ یہ حقیقت سے اقرب ہے اسی کو قبول کر لیتے تھے خواہ وہ خالص محدثانہ نقطۂ نظر سے مرجوح ہی کیوں نہ ہو۔

یہ دوسری کسوٹی کونسی ہے؟ ہم اس سے پہلے بھی اشارۃً اس کا ذکر کئی مرتبہ کر چکے ہیں۔ جس شخص کو اللہ تعالیٰ تفقّہ کی نعمت سے سرفراز فرماتا ہے اس کے اندر قرآن اور سیرت رسول کے غائر مطالعہ سے ایک خاص ذوق پیدا ہو جاتا ہے جس کی کیفیت بالکل ایسی ہوتی ہے جیسے ایک پرانے جوہری کی بصیرت کہ وہ جواہر کی نازک سے نازک خصوصیات تک کو پرکھ لیتی ہے۔ اس ذوق کا مالک اسلام کا مزاج شناس ہو جاتا ہے۔ وہ اس کی روح کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ اس کی نظر بحیثیت مجموعی شریعت حقہ کے پورے سسٹم پر ہوتی ہے، اور وہ اس سسٹم کی طبیعت کو پہچان جاتا ہے۔ اس کے بعد جب جزئیات اس کے سامنے آتے ہیں تو اس کا ذوق اسے بتا دیتا ہے کہ کونسی چیز اسلام کے مزاج اور اس کی طبیعت سے مناسبت رکھتی ہے اور کونسی نہیں رکھتی۔ روایات پر جب وہ نظر ڈالتا ہے

تو اُن میں بھی یہی کسوٹی رد و قبول کا معیار بن جاتی ہے۔ اسلام کا مزاج عین ذاتِ نبوی کا مزاج ہے جو شخص اسلام کے مزاج کو سمجھتا ہے اور جس نے کثرت کے ساتھ کتاب اللہ و سنتِ رسول اللہ کا گہرا مطالعہ کیا ہوتا ہے وہ نبی اکرم کا ایسا مزاج شناس ہو جاتا ہے کہ روایات کو دیکھ کر خود بخود اس کی بصیرت اسے بتا دیتی ہے کہ ان میں سے کونسا قول یا کونسا فعل میرے سرکار کا ہو سکتا ہے، اور کونسی چیز سنتِ نبوی سے اقرب ہے۔ یہی نہیں بلکہ جن مسائل میں اُس کو قرآن و سنت سے کوئی چیز نہیں ملتی، ان میں بھی وہ کہہ سکتا ہے کہ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے فلاں مسئلہ پیش آتا تو آپ اُس کا فیصلہ یوں فرماتے۔ یہ اس لیے کہ اس کی روح، روحِ محمدیؐ میں گم اور اس کی نظر بصیرتِ نبوی کے ساتھ متحد ہو جاتی ہے۔ اس کا دماغ اسلام کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے، اور وہ اسی طرح دیکھتا اور سوچتا ہے جس طرح اسلام چاہتا ہے کہ دیکھا اور سوچا جائے۔ اس مقام پر پہنچ جانے کے بعد انسان اسناد کا زیادہ محتاج نہیں رہتا۔ وہ اسناد سے مدد ضرور لیتا ہے، مگر اس کے فیصلے کا مدار اس پر نہیں ہوتا۔ وہ بسا اوقات ایک غریب، ضعیف، منقطع السند، مطعون فیہ حدیث کو بھی لے لیتا ہے اس لیے کہ اس کی نظر اس افتادہ پتھر کے اندر ہیرے کی جوت دیکھ لیتی ہے۔ اور بسا اوقات وہ ایک غیر معلل، غیر شاذ، متصل السند، مقبول حدیث سے بھی اعراض کر جاتا ہے، اس لیے کہ اس جامِ زرین میں جو بادۂ معنی بھری ہوئی ہے وہ اسے طبیعتِ اسلام اور مزاجِ نبوی کے مناسب نظر نہیں آتی۔

یہ چیز چونکہ سراسر ذوقی ہے اور کسی ضابطہ کے تحت نہیں آتی، نہ آسکتی ہے اس لیے اس میں اختلاف کی گنجائش پہلے بھی تھی اور اب بھی ہے اور آئندہ بھی رہے گی۔ چنانچہ اسی وجہ سے ائمہ مجتہدین کے درمیان تخریجِ احادیث میں بکثرت اختلافات ہوئے ہیں۔ پھر یہ کوئی ایسی چیز نہیں کہ ایک شخص کا ذوق لامحالہ دوسرے شخص کے ذوق کے کلیۃً مطابق ہی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ہی مسلک کے ائمہ نے بہت سے مسائل میں ایک دوسرے سے اختلاف کیا ہے۔ امام ابو حنیفہ

اور ان کے اصحاب کے اقوال میں جو اختلافات پائے جاتے ہیں وہ اس کی ایک روشن مثال ہیں۔ پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ ہر مجتہد کا ذوق ہر مسئلہ میں صواب ہی کو پہنچ جائے۔ انسان بہرحال کمزوریوں کا مجموعہ ہے۔ اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کا مجتہد بھی غلطی کر سکتا ہے اور کر جاتا ہے۔ اسی بنا پر ائمہ مجتہدین ہمیشہ ڈرتے رہے ہیں۔ اور انہوں نے ہمیشہ اپنے متبعین کو یہ ہدایت کی ہے کہ ہم پر بالکل اعتماد نہ کرلو۔ خود بھی تحقیق کرتے رہو اور جب کوئی سنت ہمارے قول کے خلاف ثابت ہو جائے تو ہمارے قول کو رد کر کے سنت کی پیروی کرو۔ امام ابو یوسف فرماتے ہیں کہ لایحل لاحد ان یقول مقالتنا حتی یعلم من این قلنا۔ امام زفر کا قول ہے انما ناخذ بالرای ما لم نجد الاثر فاذا جاء الاثر ترکنا الرأی و اخذنا بالاثر۔ امام مالک کا ارشاد ہے انما انا بشر اخطئ و اصیب فانظروا فی رائی فکلما وافق الکتاب والسنۃ فخذوہ وکلما لم یوافق الکتاب والسنۃ فاترکوہ امام شافعی کا بیان ہے کہ اذا صح الحدیث فاضربوا بقولی الحائط اور لا قول لاحد مع سنۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ غرض یہ کہ تمام ائمہ بالاجماع کہتے ہیں کہ جب شخص پر کسی مسئلہ میں سنت رسول روشن ہو جائے اس کے لیے پھر کسی دوسرے شخص کا قول لینا حرام ہے، خواہ وہ کیسے ہی بڑے مرتبہ کا شخص ہو۔

## نوٹ

[یہ استدراک یہاں تک پہنچ چکا تھا اور اس کا ایک معتدبہ حصہ پریس بھی جا چکا تھا کہ جناب پرویز کا عنایت نامہ وصول ہوا جس میں انہوں نے حسب وعدہ اپنے مدعا کی توضیح فرمادی ہے۔ ان کی خواہش کے مطابق سطور ذیل کو ان کے مضمون کے تتمہ کی حیثیت سے درج کیا جاتا ہے]

"میں یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ نہایت ضروری سمجھتا ہوں۔ تصریحات بالا سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ میں اُس گروہ کے مسلک کی تائید کر رہا ہوں جسے عام طور پر منکرین حدیث یا اہل قرآن کہا جاتا ہے میں اس سے پیشتر اپنے متعدد مضامین میں اس حقیقت کو بے نقاب کر چکا ہوں کہ اس فرقہ کو رسول کی حیثیت کے تعین میں سخت ٹھوکر لگی ہے۔ وہ اس امر سے چشم پوشی کر رہے ہیں کہ قرآن کریم میں کیوں حصر کے ساتھ ارشاد ہے کہ ہم نے انسانوں ہی کو رسول بنایا۔ ان کے نزدیک اگر قرآن کعبے کی چھت سے لٹکا دیا جاتا یا کسی چٹان پر منقوش ملجاتا تو بھی ایسا ہی تھا جیسا رسول عربی کی وساطت سے دنیا کو ملا۔ رسول کی حیثیت ان کے نزدیک آلہ ابلاغ سے زیادہ نہیں۔ متشددین فی الحدیث طبقہ اگر اس افراط کی طرف چلا گیا کہ ہر قول منسوب الی الرسول کو قول رسول قرار دیکر واجب الاتباع تسلیم کرنے لگا تو دوسری طرف یہ اہل قرآن ہونے کے مدعی اس تفریط میں جا گرے کہ عمل رسول کو جو امت کے لیے اُسوۂ حسنہ ہے ایک بیکار محض شئے سمجھ کر قرآن کریم کو اپنی ذہنی قیاس آرائیوں کی جولانگاہ بنانے لگے۔ یہ بحث کہ تواتر کیا ہے، یہ کس طرح یقینی ہے، آج تواتر میں جو جزئی اختلافات پیدا ہو چکے ہیں ان کی وجوہات کیا ہیں، اور ان کی حیثیت کیا ہے، وغیرہ وغیرہ، یہ ایک جداگانہ موضوع ہے اور بتوفیق باری تعالیٰ اس کی تشریح ایک الگ مضمون میں کر دی جائے گی۔ اس مقام پر صرف اس قدر سمجھ لینا چاہیے کہ روایات کے متعلق جو کچھ اوپر لکھا گیا ہے اس سے مقصد یہ ہے کہ ان کو ہمیشہ قرآن کے تابع رہنا چاہیے کیونکہ جس نہج و اسلوب سے روایات ہم تک پہنچی ہیں وہ ظنی ہے یقینی نہیں ہے۔ برعکس اس کے قرآن یقینی ہے۔ اور جس کسوٹی پر روایات کو پرکھا گیا ہے وہ بجائے خویش ظنی ہے۔ قرآن کی روشنی میں احادیث کو پرکھا جاتا تو بڑی حد تک ان پر قیاس کیا جا سکتا تھا۔ باقی رہا اسوۂ حسنہ تو رسول پر ایمان کا مفہوم ہی یہی ہے کہ اس کو واجب الاتباع سمجھا جائے۔"

# اسلام

جناب مولوی داؤد اکبر صاحب اصلاحی

یہ عجیب بات ہے کہ بعض الفاظ بہت شائع و ذائع ہوتے ہیں یا بالفاظ دیگر یوں کہیے کہ ہر خاص و عام کے زبان زد ہوتے ہیں لیکن ان کی حقیقت بہت ہی زیادہ غامض و مستور ہوا کرتی ہے۔ انہی میں سے لفظ اسلام بھی ہے۔ اس چھوٹے سے لفظ میں کتنی گہرائی ہے؟ اس کے باطن میں کیا کیا حقائق و رموز پوشیدہ ہیں، اور اس کے جمال میں کتنی دلکشی و دلفریبی ہے، اس کا صحیح اندازہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ اس مختصر لفظ کی روحانیت دلوں میں گھر کر جائے لیکن رونا تو اسی کا ہے کہ اسکی روحانیت مدعیان دین فطرۃ نے ایسی کھو گئی ہے کہ سارے عالم اسلامی میں اگر چراغ لے کر ڈھونڈا جائے تو فیصدی شاید ہی ایک دل اس دولت گرانمایہ سے معمور ملے گا۔ مدعیوں کی کمی نہیں اس لیے کہ آمنا و صدقنا کا دعویٰ ہر چہار جانب سے بہانگ دہل ہو رہا ہے لیکن اسلمنا اور اطعنا کے جذبہ سے خالی۔ ایسا کیوں ہے؟ یہ اس لیے کہ امت مرحومہ کے فرزندوں نے اسلام کو ایک محدود چار دیواری میں محصور کر رکھا ہے۔ وہ اسلام کا طغرائے امتیاز اس سے زیادہ نہیں سمجھتے کہ مسلمانوں جیسے نام رکھ لیں، گائے کا گوشت کھا لیں، مساجد میں رسماً حاضری دیا کریں۔ لیکن کیا لفظ اسلام کا یہی محدود مفہوم قرآن پاک سے بھی نکلتا ہے؟۔

قبل اس کے کہ اسلام کے آثار و نتائج کی تفصیل بیان کی جائے مناسب ہوگا کہ اس کا مفہوم بیان کر دیا جائے تاکہ اس کے ثمرات و برکات سمجھنے میں آسانی ہو۔

**اسلام کا مفہوم** | لغت میں اسلام کے معنی "سر نہادن للطاعت" کے ہیں یعنی فرمانبرداری میں

سرجھکا دینا۔ اور اصطلاح قرآن میں اس سے وہ جذبہ مقصود ہے جو لوگوں میں طاعت و فدویت کا افسوں پھونک دے، جس سے انسان اپنی عزیز سے عزیز چیز بھی راہ خدا میں قربان کرنے سے دریغ نہ کرے، بلکہ ہمہ آن فدویت کا پتلا بنا رہے اگر جانی قربانی کا اشارہ ہو تو بے دریغ جام شہادت پینے کے لیے تیار رہو جائے اور اگر مال و جائداد مطلوب ہو تو اس میں بھی لیت ولعل نہ کرے۔ لیت ولعل اس راہ میں جرم عظیم ہے جو ہچکچایا گو کہ وہ سب کچھ قربان کر دے روح اسلام سے خالی متصور ہوگا۔ اس لیے کہ اس راہ میں کوئی پیشکش بھی بغیر خلوص کے شرف قبولیت نہیں حاصل کر سکتی۔ الغرض اسلام کی بہترین تعبیر دوسرے لفظوں میں فدویت کاملہ وطاعت خالصہ ہے

اسلام کی اس تشریح کے بعد اب ہم اس کے آثار و نتائج بیان کریں گے

اسلام فطرت کائنات ہے ہم بتا چکے ہیں کہ اسلام نام ہے فدویت کاملہ وطاعت خالصہ کا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ آیا اس جذبۂ فطری سے صرف انسان ہی بہرہ مند ہے یا دیگر مخلوقات الٰہی بھی اس میں برابر کی شریک ہیں؟ میرے خیال میں ہر وہ شخص جس میں تفکر و ادراک کا جوہر ہے اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ ساری کائنات میں ہم آہنگی و توافق ہے، یہ سارا کا سارا نظام کسی غیر مرئی طاقت کے سامنے جبین نیاز خم کئے ہوئے ہے لیکن ہر ایک کا طرز عبودیت جداگانہ ہے۔ زمین اپنے دفائن اگلتی ہے آسمان پانی کا انتظام کرتا ہے، درخت پھل لاتا ہے، سورج اور چاند موسم کو خوش گوار بناتے ہیں الغرض یہ پوری کائنات اپنی اپنی ڈیوٹیوں میں لگی ہوئی ہیں۔ یہی ان کی عبادت ہے اور انسان کو دعوت دے رہی ہے کہ وہ بھی اس کے ساتھ اپنا ساز چھیڑے تاکہ دونوں کے نغموں سے دنیا معمور ہو جائے۔ اسی حقیقت کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ — دیکھتے نہیں! کہ جتنی مخلوقات آسمان اور زمین میں ہیں اللہ کی تسبیح کرتی ہیں اور پرند پر پھیلائے ہوئے

صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ۔ اپنی نماز اور تسبیح کے طریقہ سے واقف ہیں اور اللہ
(النور: ۴۱) جو کچھ یہ کرتے ہیں اس سے خوب واقف ہے۔

اسی حقیقت کو ایک دوسری آیت میں یوں بیان کیا گیا ہے۔

وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ (بنی اسرائیل: ۵) کوئی بھی نہیں (مخلوقات میں سے) مگر یہ کہ اس کی تسبیح میں مشغول ہے مگر تم ان کی تسبیح کو سمجھتے نہیں ہو۔

اسی حقیقت کو ایک اور مقام پر یوں دہرایا ہے۔

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ (الرعد: ۲) اور جس قدر مخلوقات آسمان و زمین میں ہیں چارو ناچار سب کی سب اللہ ہی کے آگے سربسجود ہیں صبح اور شام۔

الغرض قرآن کی آیات کے استقصار سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے جذبۂ فطری سے اس کائنات کا ذرہ ذرہ معمور ہے، یہ پورا نظام رزاق عالم کی تسبیح و تقدیس میں نغمہ سنج ہے، کسی کو بھی اُس کی بندگی سے مجال انکار نہیں، سب اس کی کبریائی و برتری کا راگ الاپ رہے ہیں۔

يُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۔ زمین اور آسمان میں جو کچھ ہے سب اس کی تسبیح کرتا ہے اور وہ قوت والا اور حکیم ہے۔

تفصیل بالا سے یہ حقیقت بے نقاب ہوگئی ہوگی کہ اسلام فطرت کائنات ہے زمین و آسمان کا ذرہ ذرہ اسی کا نغمہ ریز ہے۔ اب ہم یہ بتائیں گے کہ یہی دین و مذہب کی روح بھی ہے، اس کے بغیر تمام ملل و ادیان بے معنی ہیں۔

اسلام مع شرائع ہے | دنیا میں آج تک جتنے صحیفے نازل ہوئے ہیں ہر ایک کی دعوت و تلقین کا مرکز اسلام ہی رہا ہے۔ اسی حقیقت کو کہیں سیاست کے رنگ میں پیش کیا گیا ہے، کہیں حلم و عفو

مگر غالب ہے ... (علیہا السلام) ... ایک تیسرے رنگ میں لوگوں کے سامنے پیش کیا جس کی گونج سے ... چنانچہ قرآن پاک نے اس آیت میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے

إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ إِلَّا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ وَمَن يَكْفُرْ بِآيَاتِ اللَّهِ فَإِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ. فَإِنْ حَاجُّوكَ فَقُلْ أَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلَّهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ وَقُل لِّلَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ وَالْأُمِّيِّينَ أَأَسْلَمْتُمْ فَإِنْ أَسْلَمُوا فَقَدِ اهْتَدَوا. الآية...

(آل عمران: ۲)

دین تو خدا کے نزدیک اسلام ہی ہے اور اہل کتاب جو اختلاف میں پڑ گئے تو یہ اس وقت ہوا جبکہ علم الٰہی کے پاس آچکا تھا اور یہ آپس کی ضد سے ہوا۔ خدا کی آیات سے انکار جو کوئی بھی کرے گا اللہ کو اس کا حساب لیتے کچھ دیر نہیں لگتی پس اگر اس پر بھی تم سے وہ جھگڑا کریں تو کہہ دو کہ میں اور میرے ساتھیوں (صحابہؓ) نے تو خدا کے آگے سر تسلیم خم کر دیا اور اہل کتاب اور امیوں سے کہو کہ تم اسلام لاتے ہو یا نہیں۔ پھر اگر اسلام لائیں تو ضرور وہ راہ یاب ہیں۔...

مذکورۂ بالا آیت کی ابتدا و انتہا کے ٹکڑوں پر غور کیجیے تو دو حقیقتوں کا انکشاف ہوگا۔

(۱) تمام ملل و ادیان کی اساس اسلام رہا ہے یعنی آج تک جتنے مذاہب آئے ہیں ایک ہر کی سوح رواں اسلام ہی تھا۔

(۲) چونکہ ہمیشہ سے یہی جملہ شرائع کا مصدر رہا ہے اسی لیے قرآن نے بھی اسی کا لوگوں سے مطالبہ کیا اور بآواز بلند کہا کہ جو اس حقیقت کو تسلیم کرے گا خدا دین و دنیا دونوں میں اسے بلند و برتر کرے گا اور جو اس سے کترائے گا خدا کی زمین اس پر تنگ ہو جائے گی اور ہر طرح کی ذلت و نکبت کا مورد ہوگا تاریخ شاہد ہے کہ چند نفوس نے اسی شراب کو پی کر تمام جبابرہ و قیاصرہ کی مستحکم حکومتوں کو پارہ پارہ کیا اور ان کی جگہ خلافت قائم کی، اور تمام باطل قوانین مٹا کر عادلانہ ضوابط جاری کیے

اور ارضِ الٰہی کو ہر طرح کے ظلم وستم سے پاک کر دیا۔

یہ جان لینے کے بعد کہ اسلام جملہ شرائع کی روح ہے، سوال ہوتا ہے کہ آخر یہ چیز پیدا کس طرح ہوتی ہے؟ قرآن پاک نے اس سوال کا متعدد جگہ جواب دیا ہے۔

اسلام کا مصدر | دل اور عقل انسانی زندگی کے چراغ ہیں۔ یہ جن لوگوں میں روشن ہوتے ہیں ان کے عقائد میں استحکام اور اعمال میں ورزش پائی جاتی ہے اور جو لوگ فطرت کے اس چراغ کو گل کر لیتے ہیں ان کے عقائد میں تذبذب اور اعمال میں عدم توازن پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی لیے قرآن پاک نے فاقدین بصیرت کو مردہ سے تعبیر کیا ہے اور صاحب نور و ہدایت کو حیات و جاوید والا قرار دیا ہے۔ ذیل کی آیت اس بارہ میں فیصلہ کن ہے،

اِنَّمَا يَسْتَجِيبُ الَّذِيْنَ يَسْمَعُوْنَ وَالْمَوْتٰى دعوت حق کان رکھنے والے ہی سنیں گے رہے مردے
يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ ثُمَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ (الانعام) انھیں خدا اٹھائے گا پھر اس کے پاس پلٹائے جائینگے

مذکورہ بالا آیت میں تصریح ہے کہ حق و رشد کی دعوت پر وہی لوگ لبیک کہتے ہیں جن کی عقل و فکر ہر طرح کی کثافتوں سے مجلّی اور جن کا دل تمام بیماریوں سے پاک ہوتا ہے۔

یہ معلوم کر لینے کے بعد کہ اسلام کا منبع دل اور عقل ہے ایک نظر اس جماعت قدسی کے مذہب پر بھی ڈال لینی چاہیے جنہوں نے مختلف وقتوں میں خدا کا پیام دنیا کو پہنچایا ہے اور جن کی زندگی کا مدعا محض حق و صداقت کی نشر و اشاعت تھا وہ انبیا علیہم السلام کی مقدس جماعت ہے۔ خدا کی اس محبوب جماعت نے کلمۂ حق کی خاطر جو قربانیاں کی ہیں وہ نہایت حیرت انگیز ہیں۔ ممکن ہے مادہ پرست حضرات اسے اساطیر الاولین سمجھیں لیکن یہ ان کی جہالت ہوگی، اس لیے کہ یہ تو وہ حقائق ثابتہ ہیں جن کا انکار ممکن ہی نہیں۔

انبیا علیہم السلام کا مذہب اسلام تھا | اس میں شک نہیں کہ انبیا علیہم السلام کی مقدس جماعت کا سلسلہ

بڑے ہی اہم مقصد کے لیے ہوا تھا۔ اس کی اہمیت کا اندازہ کرنا ہو تو ان کی مسلسل قربانیوں کی تاریخ پر نظر ڈالنی چاہیے۔ ان کی حیات طیبہ کا ایک ایک عمل فدویت کے اثر میں ڈوبا ہوا لے گا۔ وہ رزق کے طالب تھے تو اس لیے کہ خدا کی راہ میں زیادہ سے زیادہ قربانی کر سکیں وہ نکاح کرتے تھے تو اس لیے کہ اپنی اولاد میں دین خدا کے نور کو روشن کریں اور اس کو پھیلانے والی جماعت وجود میں لائیں۔ یوں تو اس جماعت قدسی کا ہر ایک فرد اسلام و فدویت میں آپ ہی اپنا نظیر تھا مگر حضرت خلیل اللہ کی پوری حیات طیبہ مسلسل قربانیوں سے لبریز ہے بالخصوص حضرت ابراہیم کی وہ فدویت ہمیشہ یادگار رہے گی جس کی مثال تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے۔ وہ سیدنا اسمٰعیل کی قربانی کا واقعہ ہے۔ یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے بلکہ تاریخ کا وہ مشہور کارنامہ ہے جسے دنیا کبھی نہیں بھول سکتی اور ہمیشہ ہمیش اس کی برسی منائے گی۔ اس لیے کہ اس میں زندگی کا فلسفہ مضمر ہے، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت ابراہیم کو بڑی بڑی دعاؤں اور سماجتو کے بعد اولاد ملی تھی۔ وہ بھی بڑھاپے میں۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ایسی اولاد کتنی پیاری ہوگی؟ ابھی حضرت اسمٰعیل کی ولادت پر چند ہی سال گذرتے ہیں کہ خواب میں آپ اپنی محبوب اولاد کی قربانی کا اشارہ پاتے ہیں۔ گو کہ خواب میں تاویل کی گنجائش بھی تھی مگر یہ قتیلان حق کے مسلک کے خلاف ہے اس لیے آپ بلا لیت و لعل اپنی اسی چہیتی اولاد پر چھری چلانے کے لیے آمادہ ہو گئے جو آپ کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور بڑھاپے کی لکڑی تھی۔ خیر یہ تو بوڑھے باپ کی کرامات ہیں لیکن تعجب ہے حضرت اسمٰعیل کی عزیمت و فدویت پر، اور آپ کا یہ قول تو ہمیشہ ہمیشہ دنیا کو استقامت کا سبق دیتا رہے گا کہ "اِفْعَلْ مَا تُؤْمَرُ" یہ جملہ گو بہت مختصر ہے مگر حقیقت میں اسلام کی تعبیر یہی ہے چنانچہ جب باپ بیٹا امر خداوندی بجا لانے کے لیے تیار ہو گئے اور قریب تھا کہ حضرت ابراہیم کی چھری محبوب اولاد کی گردن پر چل جائے فرشتۂ غیب نے کمال فدویت و للّٰہیت کی خوشخبری ان

الفاظ میں سنائی "قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا إِنَّا كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ۔"

تفصیل بالا سے معلوم ہوا کہ حضرت ابراہیم کی قربانی کا واقعہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے بلکہ یہ وہ مقام ہے جہاں بڑوں بڑوں کے قدم میں لغزش پیدا ہوجاتی ہے لیکن اس مجسمۂ اسلام نے اپنے تمام جذبات وعواطف کو امرالٰہی پر بھینٹ چڑھا دیا اور حقیقت میں شہید حق اسماعیل کی گردن پر چھری چلانے کے لیے ہاتھ کو حرکت نہیں دی بلکہ سوائے فدویت کے استیصال کے لیے ہاتھ کو جنبش دی۔

اب ذرا ایک نظر اس جماعت پر بھی ڈال لینی چاہیے جو خیر الامم سے معروف ہے اور جو بانیٔ اسلام کی دعا میں مُسلمہ سے موسوم ہے۔

**امت محمدیہ کا اسلام** حضرت ابراہیم اور اسمٰعیل نے اپنے لیے اور اپنی ذریت میں سے ایک جماعت کے لیے سراپا اسلام وطاعت کی دعا کی تھی تفصیل بالا سے ظاہر ہے کہ دونوں برگزیدہ ہستیاں کڑے سے کڑے امتحان میں پورے طور پر کامیاب ہوئیں لیکن سوال یہ ہے کہ وہ جماعت جس کی اسلامیت کے لیے آپ نے دعا کی تھی اس نے آخر کونسی قربانی کی؟ اور اگر اس طرح کی کوئی قربانی نہ کی تھی تو پھر اس بلندترین خطاب کی کیسے مستحق ہوگئی ہمارے نزدیک قربانی وایثار کی جو مثال حضرت ابراہیم نے پیش کی تھی غلامان محمد بھی آپ کے اسوہ پر چلے، غزوۂ بدر میں تو ہوبہو وہی نقشہ پیش آیا۔ جگر کے ٹکڑے آمنے سامنے تھے باپ اگر کافر ہے تو بیٹا مسلمان ہے اور دینی جوش نے اسے ایسا مست کردیا ہے کہ تمام مادی علائق کاٹ کر بے دردی سے اس پر حملہ آور ہوجاتا ہے یہ اسی فدویت کاملہ کی تاسی نہیں ہے تو پھر کیا ہے؟ یہی نہیں بلکہ امت محمدیہ کی زندگی کا مقصد ہی قرآن نے فدویت قرار دیا ہے۔

قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ لَا شَرِيكَ لَهُ — کہہ دے کہ میری نماز اور میری قربانی اور میری زندگی اور میری موت اس رب العالمین کے لیے

بِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ، ہے جس کا کوئی ساجھی نہیں اور مجھکو ایسا ہی حکم دیا
(الانعام ۲۰) گیا ہے اور میں اس کے فرمانبرداروں میں پہلا فرمانبردار ہوں

مذکورۂ بالا آیات اس بارہ میں فیصلہ کن ہیں اسی لیے اس جذبہ کی آبیاری کے لیے اسلام نے قربانی کو ضروری قرار دیا ہے۔

ایمان کے ساتھ ساتھ عملاً اسلام بھی ضروری ہے | قرآن پاک کی بے شمار آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان کے لیے اعمال صالحہ کا ظہور ضروری ہے۔ اس کے بغیر ایمان بے معنی ہے چنانچہ اعراب کے دعوی ایمان کو ناقص ٹھیرایا۔ فرمایا۔

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْـًٔا اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ (حجرات ۲)

اعراب کہتے ہیں کہ ہم مومن ہیں کہدو کہ تم ایمان نہیں لائے ہاں کہو کہ ہم مسلمان ہوگئے اور ایمان کا تو ہنوز تمہارے دلوں میں گذر تک بھی نہیں ہوا اور اگر تم لوگ اللہ اور اس کے رسول کے حکم پر چلو تو اللہ تمہارے عملوں میں سے کسی طرح کی کانٹ چھانٹ نہیں کرے گا ضرور خدا بخشنے والا مہربان ہے۔

آثار اسلام | ایمان واسلام لازم وملزوم ہیں۔ ایمان کا تعلق دل سے ہے اور اسلام کا اعمال سے ان میں سے پہلے کی روحانیت جتنی زیادہ تیز ہوگی اسی قدر جذبۂ اسلام کی اسپرٹ زیادہ ہوگی قرن اوّل کے لوگوں میں یہ دونوں چیزیں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ وہ خدا کے سامنے جھک کر تمام طاقتوں سے بے نیاز ہوگئے تھے باطل قوتیں گو کہ بہت زور شور سے ان کے روحانی وظاہری اجتماع پر حملہ آور ہوئیں مگر تاریخ شاہد ہے کہ ہمیشہ پسپا ہوئیں۔ باطل پرست دنیا نے ان کی راہ میں طرح طرح کے روڑے اٹکائے لیکن کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ ان کی کوئی تدبیر کارگر

ہوئی ؟ تاریخ کے صفحات سے گو کہ مسلمانوں کے کارنامے مٹا دینے کی کوشش کی گئی لیکن یہ تو وہ حقائق ثابتہ ہیں جن کا انکار ممکن ہی نہیں،

ثبت است برجریدۂ عالم دوام ما

مومن فدیہ ہوتا ہے | قرآن مجید کے استقراء سے معلوم ہوتا ہے کہ مومن سراپا اسلام وطاعت ہوتا ہے چنانچہ ذیل کی آیت میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنجِيلِ وَالْقُرْآنِ وَمَنْ أَوْفَىٰ بِعَهْدِهِ مِنَ اللَّهِ فَاسْتَبْشِرُوا بِبَيْعِكُمُ الَّذِي بَايَعْتُم بِهِ وَذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ۔ التَّائِبُونَ الْعَابِدُونَ الْحَامِدُونَ السَّائِحُونَ الرَّاكِعُونَ السَّاجِدُونَ الْآمِرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَالنَّاهُونَ عَنِ الْمُنكَرِ وَالْحَافِظُونَ لِحُدُودِ اللَّهِ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ۔ (التوبہ ۱۴)

خدا نے مسلمانوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال (اس وعدہ پر) خرید لئے ہیں کہ ان کے بدلے ان کو جنت ملے گی یہ خدا کی راہ میں لڑتے ہیں مارتے ہیں اور آپ بھی مارے جاتے ہیں یہ خدا کا پکا وعدہ ہے جس کا پورا کرنا اللہ نے اپنے اوپر لازم کر لیا ہے، توراۃ اور انجیل اور قرآن میں، اور خدا سے بڑھ کر کون اپنا وعدہ پورا کرنے والا ہے۔ تو اپنے سودے کی جو تم نے خدا کے ساتھ کیا ہے خوشیاں مناؤ اور یہ بڑی کامیابی ہے توبہ کرنے والے عبادت گذار حمد کرنے والے سفر کرنے والے رکوع کرنے والے سجدہ کرنے والے نیک کام کی صلاح دینے والے اور برے کام سے منع کرنے والے اور حدود الٰہی کی محافظت کرنے والے۔ اور اے پیغمبر مومنین کو خوش خبری سنا دو۔

مذکورۂ بالا آیات سے مومنین کی گوناگوں خصوصیات ٹپکتی ہیں لیکن ہر ایک کی روح رواں

جذبۂ اسلام و فدویت ہی ہے۔

(۱) مومن اپنی جان و مال کو خدا کی دین سمجھتا ہے اور جلد از جلد اسے ادا کر کے سبکدوشی کا متمنی ہوتا ہے۔

(۲) سراپا اسلام و طاعت ہوتا ہے حق کے لیے اپنی گردن کٹانا باعث فخر و مباہات تصور کرتا ہے

(۳) دفع منکرین میں ایڑی سے چوٹی تک کا زور صرف کرنا اپنی زندگی کا نصب العین تصور کرتا ہے اور دنیا میں امن و امان پھیلانے کے لیے ہر طرح کی قربانی کا جذبہ اس میں موجزن ہوتا ہے۔

(۴) حدود الٰہی کی حفاظت میں ہر طرح کی مصیبتیں انگیز کرنے کے لیے ہمہ آن مستعد و کمربستہ ہوتا ہے کسی مادی مانع کی اسے ذرہ برابر بھی پروا نہیں ہوتی۔ بلکہ جوں جوں موانع ہمت شکن ہوتے ہیں اس سے کہیں زیادہ دفع باطل میں زور و قوت آتی ہے۔

<u>معیار برتری اسلام ہے</u> یہ تو غالباً سب کو تسلیم ہے کہ مذاہب کی جان اسلام و فدویت ہے اس کے بغیر تمام ادیان بے حقیقت سے معلوم ہوتے ہیں۔ حضرت موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام کی دعوت کا نچوڑ بھی یہی ہے لیکن جب اہل کتاب کی روحانیت پر مادیت کا غلبہ ہوا تو انھوں نے بہت سی بے بنیاد باتیں اپنی کتاب میں بڑھا دیں اور انھیں پر پھولے نہ سمائے لیکن جب آخری شریعت آئی تو اس نے ان کے تمام مکر و فریب کو طشت از بام کر دیا مثلاً وہ کہتے کہ جنت ہماری میراث ہے ہم خدا کے چہیتے ہیں جو زمین پر ہم باندھیں گے آسمان پر بھی باندھا جائیگا اور جو زمین پر کھولیں گے آسمان پر بھی کھولا جائے گا لیکن قرآن نے بہ بانگ دہل کہا کہ یہ من گھڑت باتیں ہیں جنھیں دین و مذہب سے دور کا بھی علاقہ نہیں۔ اصل یہ ہے کہ اپنے اندر اسلام و فدویت کا جذبہ پیدا کرو اس کے بغیر نجات کا دروازہ کبھی نہیں کھلنے کا۔ فرمایا۔

| | |
|---|---|
| بَلٰی مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (البقرہ: ۱۱۲) | لیکن ہاں جس نے خدا کے آگے سر تسلیم خم کر دیا اور وہ نیکوکار بھی ہے تو اس کے لیے اس کا اجر اللہ کے پروردگار کے یہاں ہے اور ایسے لوگوں پر نہ خوف طاری ہوگا اور نہ وہ آزردہ خاطر ہوں گے۔ |

# التعلیق الصبیح علی مشکوٰۃ المصابیح

تالیف جناب مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی

مشکوٰۃ شریف علم حدیث کی مشہور مستند کتابوں میں سے ہے جس میں صحاح ستہ اور دوسری معتبر کتب حدیث کا عطر نکال کر رکھ دیا گیا ہے۔ فاضل مولف نے عربی زبان میں اس کی شرح لکھی ہے جس کے متعلق مولانا انور شاہ صاحب مرحوم و مغفور جیسے علامۂ اجل کی شہادت ہے کہ ابتک اس کتاب کی اس سے بہتر شرح نہیں لکھی گئی۔ اس میں پچھلی تمام شرحوں کی خوبیاں جمع کر دی گئی ہیں۔ اور ان پر حسب ذیل خصوصیات کا اضافہ کیا گیا ہے :-

۱۔ اسرار شریعت اور حقائق و معارف اسلامیہ کے بیان کی طرف خاص توجہ کی گئی ہے۔

۲۔ ہر باب کی ابتدا میں اس کے مضمون کے لحاظ سے تمام آیات قرآنیہ جمع کر دی گئی ہیں تاکہ حدیث اور قرآن کے درمیان مطابقت واضح ہو جائے۔

۳۔ صحابہ و تابعین کے مذہب مفصل بیان کیے گئے ہیں اور اختلافی مسائل میں ائمہ اربعہ کے مذاہب پر مفصل بحث کی گئی ہے۔

یہ کتاب فاضل مؤلف نے خود دمشق جا کر چھپوائی ہے۔ کاغذ اور طباعت بہترین ہے۔ چار جلدیں طبع ہو چکی ہیں دو جلدیں عنقریب چھپ کر آنے والی ہیں قیمت [illegible] کلدار ۔ [illegible] حالی علاوہ محصول ڈاک

دفتر ترجمان القرآن سے طلب فرمایئے

## رسائل و مسائل

# نماز اور خطبہ جمعہ کی زبان

(۱) کیا یہ امر واقعہ ہے کہ امام اعظم الحنفی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا یہ اجتہاد تھا کہ نماز عجمی زبان میں پڑھنا جائز ہے؟ اگر ایسا تھا تو کیا علماء دین امام صاحب کے اس اجتہاد پر از سر نو غور فرما کر نماز کے کسی بھی زبان میں پڑھے جانے کی بابت جواز یا عدم جواز کا فتویٰ صادر فرمائیں گے؟

(۲) آیۂ کریمہ "لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ وَاَنْتُمْ سُکَارٰی حَتّٰی تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ" میں بحالت سکر نماز پڑھنے کی نہی فرمائی گئی ہے۔ اور اس کی علت یہ بیان کی گئی ہے کہ ایسی حالت میں انسان جو کچھ کہتا ہے اس کو سمجھتا نہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ نماز کی صحت کے لیے ایک ضروری شرط یہ ہے کہ نماز میں جو کچھ پڑھا جائے اس کو پڑھنے والا سمجھے بھی۔ اس لیے اگر کوئی شخص اپنی مادری زبان میں فریضۂ نماز کو ادا کرتا ہے اور جو کچھ وہ اس نماز میں پڑھتا ہے اس کے ایک ایک لفظ کو سمجھتا ہے تو کونسی وجہ ہے کہ اس کی ایسی نماز جائز اور مقبول نہ ہو؟

(۳) کیا علماء کرام کے نزدیک عیدین اور جمعہ کا خطبہ مخاطبین کی مادری زبان میں دیا جانا جائز ہے یا نہیں؟ اگر ناجائز ہے تو کیوں؟ کہا جائے گا کہ عیدین اور جمعہ کا خطبہ عربی زبان کے سوا کسی دوسری زبان میں دیا جانا سنت نبوی کے خلاف ہے اس لیے ناجائز ہے۔ لیکن سنت نبوی یہ تھی کہ ایسے خطبہ کے دوران میں جو کچھ حضور پر نور کی زبان فیض ترجمان سے

نکلے اس کو ۔ سامعین سنیں اور سمجھیں اور اس میں جو کچھ، اوامر و نواہی ہوں ان پر کاربند ہونے کی کوشش کریں اور جو کچھ حکم اور نصائح ہوں ان سے سبق آموز ہوں ۔ وہ صورت جس میں سامعین میں سے ۹۹ فیصدی خطبہ کا ایک لفظ بھی نہ سمجھ سکتے ہوں وہ ان اوامر و نواہی سے جو خطبہ میں بیان کیے جاویں کیونکر کسی قسم کا استفادہ حاصل کر سکتے ہیں ۔ اور ایسا خطبہ کیونکر سنت نبوی کے مطابق قرار دیا جا سکتا ہے ؟

عیدین اور جمعہ کے خطبہ کو عربی زبان تک محدود رکھنے سے جو مواقع شارع اسلام نے اوامر و نواہی شرعیہ کی اشاعت کے کافۃ المسلمین کے لیے پیدا فرمائے ہیں ان کا سد باب ہوتا ہے یا نہیں اور خطبہ کا خطبہ ایسی صورت میں ایک فعل عبث ہو جاتا ہے یا نہیں جبکہ اس کے مفہوم کو سامعین میں سے کوئی یا اکثر نہیں سمجھتے۔

میں جانتا ہوں کہ بعض لوگ جمعہ اور عیدین کے خطبوں میں "علمی" کی اردو کی نظمیں پڑھتے ہیں مگر میرا یہ خیال ہے کہ ان کا یہ عمل علما کے متفق بہ طریقہ کے خلاف ہے اس لیے اس کی ضرورت ہے کہ علما، اس مسئلہ سے متعلق خاص طور پر توجہ فرما کر اپنا فتویٰ عوام کے فائدے کے لیے صادر فرمائیں ۔ فقط

محمد ذکار اللہ خان ۔ از دتیا ۔

**ترجمان القرآن** ۔ یہ درحقیقت ایک استفتا ہے جس کے اصل مخاطب علماء کرام ہیں ۔ اس رسالہ کے اڈیٹر کو نہ منصب افتا حاصل ہے نہ وہ اس کا اہل ہے کہ مسائل شرعیہ میں فتویٰ دینے کی ذمہ داری اٹھا سکے، مگر سائل محترم نے حسن ظن سے کام لے کر اس سے بھی خواہش کی ہے کہ اپنی تحقیق بیان کرے، لہذا مختصر طور پر امور مسئول عنہا کے متعلق احکام شریعت کی توضیح کی جاتی ہے، اس توضیح کی حیثیت ہرگز کسی فتوے کی نہیں ہے ۔ بلکہ یہ صرف اس غرض کے لیے ہے کہ حضرات علماء ان معروضات پر غور فرمائیں اور اگر مبنی بر صواب پائیں تو قبول کرلیں ۔

**چند ضروری مقدمات** قبل اس کے کہ اصل بحث پر کچھ عرض کیا جائے، چند مقدمات ذہن نشین کر لیجیے کہ ان سے ہمارے آئندہ بیانات کو سمجھنے میں سہولت ہوگی۔

(۱) یہ امر مسلم ہے کہ شریعت حقہ کی بنیاد حکمت اور مصلحت پر قائم ہے۔ شارع حکیم نے کوئی حکم بھی بے معنی اور بے مقصد نہیں دیا ہے، نہ کسی حکم کو بجا لانے کا طریقہ مقرر کرنے میں کہیں حکمت مصلحت کو نظر انداز کیا ہے۔ جب یہ مسلم ہے تو لامحالہ یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ شریعت کا صحیح اتباع تفقہ کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ جو شخص یہ نہیں جانتا کہ کسی کام کا حکم دینے یا کسی فعل سے منع کرنے میں شارع کے پیش نظر کونسا مقصد اور کونسی مصلحت ہے، اور جو شخص یہ نہیں سمجھتا کہ کسی حکم کی بجا آوری کے لیے شارع نے جو عملی صورت مقرر کی ہے اُس خاص صورت میں کیا حکمت مدنظر ہے، اور اصل مقصد کی تحصیل میں کون کونسا جزئیہ کس کس طرح مددگار ہوتا ہے، اس کے لیے زندگی کے مختلف احوال میں شریعت کا صحیح اتباع کرنا بہت مشکل بلکہ تقریباً محال ہوگا۔ اس کے پاس شریعت کا صرف جسم ہوگا، اس کی روح نہ ہوگی۔ وہ محض استخوان کا مالک ہوگا، مغز کو نہ پاسکے گا۔ بعض حالات میں نہیں بلکہ اکثر حالات میں وہ اس طرح عمل کرے گا کہ بظاہر تو وہ شارع کے احکام کی پیروی ہوگی، مگر درحقیقت شارع کے اصلی مقاصد فوت ہو جائیں گے، کیونکہ اس کی نگاہ احکام کی مجرد عملی صورتوں اور ان کے جزئیات پر ہوگی۔ ان احکام میں جو مصالح اور مقاصد پوشیدہ ہیں وہ اس کی نظر سے اوجھل ہی رہیں گے، پھر کس طرح وہ مقاصد و مصالح کے لحاظ سے جزئیات میں تغیر و تبدل کر سکے گا؟

(۲) یہ حقیقت یقیناً ناقابل انکار ہے کہ شارع نے غایت درجہ کی حکمت اور کمال درجہ کے علم سے کام لے کر اپنے احکام کی بجا آوری کے لیے زیادہ تر ایسی ہی صورتیں تجویز کی ہیں جو تمام ازمنہ و امکنہ اور تمام احوال میں اس کے مقاصد کو پورا کرتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود بکثرت جزئیات ایسے بھی ہیں جن میں تغیر حالات کے لحاظ سے تغیر ہونا ضروری ہے۔ جو حالات عہد رسالت اور عہد

صحابہ میں عرب اور دنیائے اسلام کے تھے، لازم نہیں کہ بعینہ وہی حالات ہر زمانہ اور ہر ملک کے ہوں۔ لہٰذا احکامِ اسلامی پر عمل کرنے کی جو صورتیں ان حالات میں اختیار کی گئی تھیں، ان کو ہو بہو تمام زمانوں اور تمام حالات میں قائم رکھنا اور مصالح و حکم کے لحاظ سے ان کے جزئیات میں کسی قسم کا رد و بدل نہ کرنا ایک طرح کی رسم پرستی ہے جس کو روحِ اسلامی سے کوئی علاقہ نہیں۔ ایک موٹی سی مثال لیجیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کے لیے سورج کی حرکت کے لحاظ سے اوقات مقرر فرمائے ہیں اس لیے کہ عرب اور دیگر ممالک کے بیشتر حصوں کے لیے تعینِ اوقات کی یہی صورت مناسب ہے لیکن اگر کوئی شخص قطبین کے قریب رہنے والوں کے لیے بھی نمازوں کے اوقات متعین کرنے میں وہی سورج کے طلوع و غروب اور سایہ کے اتار چڑھاؤ کا لحاظ کرے تو بظاہر یہ شارع کے منصوص احکام کی حرف بحرف پیروی ہوگی، مگر درحقیقت اس سے شارع کا اصل مقصد فوت ہو جائے گا اور اس کا شمار خلاف ورزی احکام میں ہوگا۔ کیونکہ اس کا لازمی نتیجہ ترکِ صلوٰۃ اور اسقاطِ فرض ہے پس معلوم ہوا کہ جزئیات میں دلالۃ النص اور اشارۃ النص تو درکنار، صراحۃ النص کی پیروی بھی تفقہ کے بغیر درست نہیں ہوتی۔ اور تفقہ کا اقتضاء یہ ہے کہ انسان ہر مسئلہ میں شارع کے مقاصد و مصالح پر نظر رکھے، اور انہی کے لحاظ سے جزئیات میں تغیرِ احوال کے ساتھ ایسا تغیر کرتا رہے جو شارع کے اصولِ تشریع پر مبنی اور اس کے طرزِ عمل سے اقرب ہو۔

(۳) مگر تفقہ کے معنی یہ نہیں ہیں کہ انسان محض اپنی عقل و فہم کی پیروی کرنے لگے اور اس کے پیچھے پیچھے جدھر چاہے نکل جائے خواہ وہ حدودِ شریعت سے متجاوز ہی کیوں نہ ہو۔ اس قسم کی عقل پرستی وہ چیز نہیں ہے جس کو اسلام کی اصطلاح میں "تفقہ" کہتے ہیں، بلکہ یہ وہ چیز ہے جس کو قرآن میں اتباعِ ہوا کہا گیا ہے ہوا پرستی کی لازمی خصوصیت افراط پسندی ہے اور اسلامی "تفقہ" کی سب سے بڑی خصوصیت اعتدال اور توازن ہے۔ ہوا پرست ہر معاملہ میں کسی ایک مصلحت یا ایک فائدہ کا ایسا شیدائی بن جاتا ہے کہ اس کی

خاطر دوسرے مصالح اور فوائد سے آنکھیں بند کر لیتا ہے بخلاف اس کے تفقہ اسلامی تمام مصالح اور فوائد کا مناسب لحاظ کرتا ہے، اور کسی مصلحت کو اگر نظر انداز بھی کرتا ہے تو صرف اس صورت میں جبکہ کوئی عظیم تر مصلحت اس چھوٹی مصلحت کی قربانی چاہتی ہو۔ پھر مصلحت اور مضرت کے معیار میں بھی اسلامی تفقہ اور ہوا پرستی کے درمیان اختلاف ہے۔ ہوا پرست اسلام کے معیار پر نہیں بلکہ اپنے رجحان طبع کے معیار پر مصلحت و مضرت کا تعین کرتا ہے اور مصالح میں سے بعض کو اہم اور بعض کو غیر اہم قرار دیتا ہے بخلاف اس کے اسلامی تفقہ کا مقتضا یہ ہے کہ آپ کی نظر اسلام کی نظر ہو۔ آپ اس چیز کو مصلحت سمجھیں جسے اسلام مصلحت سمجھتا ہے اور اس چیز کو مضرت سمجھیں جسے اسلام مضرت سمجھتا ہے، اور مختلف مصالح اور مضرات کے درجے مقرر کرنے میں بھی وہی معیار مد نظر رکھیں جو اسلام کے پیش نظر ہے۔ پس کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ مجرد عقل پرستی کا نام تفقہ ہے اور ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ اپنی عقل کی پیروی میں شریعت کے جس حکم کو جس طرح چاہے بدل دے۔ ہرگز نہیں اور یقیناً نہیں۔ اسلامی تفقہ یہ نہیں ہے کہ آپ اپنی نگاہ میں جس چیز کو مصلحت سمجھتے ہیں اس کی خاطر ان بہت سی مصلحتوں کو قربان کر دیں جنہیں شارع نے اپنے احکام میں ملحوظ رکھا ہے یا آپ بزعم خود جس مضرت کو اہم سمجھتے ہیں اس سے بچنے کے لیے ایسی بہت سی مضرتوں کو قبول کریں جن سے شارع آپ کو بچانا چاہتا ہے بلکہ اسلامی تفقہ یہ ہے کہ آپ شارع کی تمام مصلحتوں کو سمجھنے کی کوشش کریں، اور ان میں سے ایک ایک کو وہی اہمیت دیں جو خود شارع نے دی ہے، اور جزئیات میں تغیر و تبدل اس طور پر کریں کہ شارع کے قائم کیے ہوئے توازن میں فرق نہ آنے پائے۔ یاد رکھیے کہ شارع کے تجویز کردہ طرز عمل میں تغیر صرف اسی صورت میں جائز ہو سکتا ہے جب کہ تغیر احوال کی بنا پر اس کی پیروی سے کوئی ایسی مصلحت فوت ہوتی ہو جو آپ کے شخصی رجحان کے لحاظ سے نہیں بلکہ خود شارع کے نقطۂ نظر سے اہم ہو۔ پھر ایسی صورت میں بھی صرف

اس حد تک جزئی تغیر کیا جا سکتا ہے کہ اس اہم تر شرعی مصلحت کی حفاظت کے ساتھ دوسری شرعی مصلحتوں کو نقصان نہ پہنچے یا اگر پہنچے بھی تو وہ ایسی مصلحتیں ہوں جو شارع کی نگاہ میں نسبتہً زیادہ اہمیت نہ رکھتی ہوں۔

(۴) نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے تربیت یافتہ بزرگوں کے عمل سے احکام کے استنباط میں ایک قاعدہ کو ملحوظ رکھنا نہایت ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ "شرعی عمل" اور "طبعی" یا "عادی" عمل میں فرق کیا جائے۔ شرعی عمل سے مراد ایسا عمل ہے جو اس بنا پر اختیار کیا گیا ہو کہ شریعت کا منشا وہی خاص طرز عمل اختیار کرنے سے پورا ہوتا ہے۔ اور طبعی یا عادی عمل سے وہ طرز عمل مراد ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ نے اپنے شخصی وطبعی رجحان یا اپنے خاص زمانے اور ملک کے اجتماعی حالات کے اقتضا سے اختیار کیا تھا۔ دوسری قسم کا طرز عمل متعدد حیثیات سے ہمارے لیے سبق آموز اور موجب رشد و ہدایت ہو سکتا ہے، مگر اس سے شرعی احکام کا استنباط درست نہیں۔ دلیل شرعی صرف پہلی قسم ہی کا طرز عمل ہے۔ بعض معاملات میں ان دونوں کا فرق بالکل نمایاں ہوتا ہے، حتیٰ کہ ہر شخص سرسری نظر میں اس کو سمجھ سکتا ہے، مگر بعض امور، خصوصاً دینی امور میں یہ دونوں طرز عمل اس درجہ مخلوط ہوتے ہیں کہ ان کے درمیان فرق کرنا بہت ہی مشکل ہوتا ہے، اور یہی وہ مقام ہے جہاں ایک قسم کے طرز عمل کو دوسری قسم کے طرز عمل کی حیثیت سے لینے اور اس سے غیر مناسب نتائج اخذ کرنے کی غلطی اکثر پیش آئی ہے۔ اور بڑے بڑوں کو پیش آئی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک ہی وقت میں رسول بھی تھے، ایک انسان بھی تھے ایک عرب بھی تھے۔ ایک خاص زمانہ اور خاص اجتماعی ماحول کے رہنے والے بھی تھے۔ آپ کے ہر فعل میں خواہ وہ دینی ہو یا دنیوی، یہ سب حیثیتیں ایک ساتھ موجود تھیں، ان مختلف حیثیات کے مخلوط ہونے کی وجہ سے یہ تمیز کرنا بہت مشکل ہے کہ کسی فعل میں کونسا حصہ آپ کی حیثیت رسالت سے تعلق

رکھتا ہے تاکہ اسے حجت شرعی بنایا جائے۔ اور کونسا حصہ آپ کی دوسری حیثیات سے متعلق ہے جو حجت شرعی نہیں۔ اس سے زیادہ اختلاط حیثیات صحابۂ کرام کے افعال میں ہے۔ ہمارے لیے ان کے عمل میں شرعی رہنمائی صرف اس حیثیت سے ہے کہ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بلاواسطہ تربیت پائی ہے اور آپ سے احکام شریعت کا براہ راست استفادہ کیا ہے۔ اس حیثیت کے علاوہ ان کی دوسری حیثیات جس قدر بھی ہیں وہ خواہ کتنی ہی اہمیت رکھتی ہوں، بہرحال کسی شرعی ہدایت کی حامل نہیں۔ اب ان کے افعال میں خصوصاً دینی افعال میں یہ تمیز کرنا بسا اوقات بہت مشکل ہو جاتا ہے کہ کونسی چیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شرعی ہدایت پر مبنی ہے، کونسی ان کی رائے اور اجتہاد پر، اور کونسی ان کے خاص شخصی اور زمانی و مکانی حالات پر۔ یہاں امتیاز کا ذریعہ ہمارے پاس صرف ایک ہے اور وہ یہ ہے کہ قرآن اور سنت کے وسیع اور غائر مطالعہ سے ہمارے اندر جو اسلامی بصیرت پیدا ہوتی ہے اس سے ہم شرعی عمل اور طبیعی دعادی عمل کے باریک فرق کو محسوس کرتے ہیں، اور ہمارا ذوق ہم کو بتاتا ہے کہ کونسی چیز طبیعت اسلام سے تعلق رکھتی ہے، اور کونسی اس سے غیر متعلق ہے، کونسی چیز مصالح شرعیہ کی حامل ہے اور کونسی نہیں، کونسی چیز اسلامی سسٹم کا ایک جزء ہے اور کونسی نہیں۔ پھر اس باب میں اختلاف کی بھی کافی گنجائش ہے، کیونکہ ایک شخص کا ذوق اور اس کی بصیرت لازماً دوسرے شخص کے ذوق اور بصیرت سے بالکل مطابق نہیں ہو سکتی، اگرچہ ماخذ دونوں کا ایک ہی ہو۔ لہٰذا کسی شخص کو یہ کہنے کا حق نہیں کہ صرف وہی چیز "شرعی" ہے جس کو میری بصیرت شرعی کہہ رہی ہے، اور دوسرے شخص کی بصیرت جس کو "شرعی" کہتی ہے وہ قطعاً و یقیناً غلط ہے۔

ان مقدمات کو ذہن نشین کر لینے کے بعد نماز اور خطبہ جمعہ کی زبان کے مسائل پر الگ الگ غور کیجیے۔ اس لیے کہ ان دونوں مسئلوں کی نوعیتیں باہم مختلف ہیں، اگرچہ بظاہر ایک نظر آتی ہیں۔

**نماز کی زبان** | نماز کی زبان کے متعلق آج کل عام طور پر اسی آیت سے استدلال کیا جاتا ہے۔

جس کا حوالہ سوال میں دیا گیا ہے یعنی لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ (نشہ کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ تا وقتیکہ تم یہ نہ جانو کہ کیا کہہ رہے ہو) لیکن درحقیقت اس آیت سے استدلال درست نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حَتّٰى تَعْلَمُوْا فرمایا ہے، حَتّٰى تَفْقَهُوْا یا حَتّٰى تَفْهَمُوْا نہیں فرمایا۔ علم اور فقہ و فہم میں جو باریک فرق ہے اس کو ملحوظ نہ رکھنے کی وجہ سے لوگوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ دوران نماز میں ایک ایک لفظ اور ایک ایک فقرے کے معنی و مفہوم کو سمجھنا، اور ہر لفظ کے معنی کی طرف ملتفت رہنا ضروری ہے اور جب تک یہ فہم اور التفات حاصل نہ ہو، نماز صحیح نہیں ہوتی۔ حالانکہ یہ بداہتہً غلط ہے۔ اگر ایک عربی نہ جاننے والے کی نماز محض اس وجہ سے صحیح نہیں ہو سکتی کہ وہ نماز میں جو کچھ پڑھتا ہے اسے نہیں سمجھتا، تو ایک عربی داں کی نماز بھی ایسی حالت میں درست نہ ہونی چاہیے جبکہ وہ سمجھ سمجھ کر نہ پڑھ رہا ہو، اور اول سے لے کر آخر تک پوری نماز میں ایک ایک لفظ کے معنی کی طرف ملتفت نہ ہو۔ ایسی کڑی شرط کے ساتھ تو شاید مشکل ہی سے کوئی شخص روزانہ پانچوں وقت کی نمازیں صحیح ادا کر سکتا ہے۔ اس لیے کہ زندگی میں انسان پر ہر طرح کے حالات گزرتے ہیں، کبھی رنجیدہ ہوتا ہے، کبھی متفکر ہوتا ہے، کبھی کسی کام میں اس کا ذہن مشغول ہوتا ہے، کبھی غیر محسوس طور پر خیالات اور خطرات اس کے ذہن میں داخل ہو جاتے ہیں اور کافی دیر تک اس کو یہ شعور بھی نہیں ہوتا کہ میرا ذہن کدھر بھٹک گیا۔ اگر نماز کے لیے یہ شرط ہو کہ ان سب دماغی و قلبی کیفیات سے بالکل خالی ہو کر انسان پورے شعور اور التفات کے ساتھ کھڑا ہو تو نماز ادا کرنا ہی مشکل ہو جائے۔ لیکن یہ وہ سختیاں ہیں جو انسان خود اپنی عقل سے اپنے لیے پیدا کرتا ہے۔ شارع نے اس پر ایسی سختی نہیں کی، کیونکہ وہ اس کی فطری کمزوریوں کو خوب جانتا ہے۔ اس نے سمجھ اور التفات اور استغراق اور خشوع و خضوع کو نماز کا کمال اور اس کا حسن ضرور قرار دیا ہے، اور اس کی خواہش یہی ہے کہ انسان کی نماز ایسی ہی کامل اور حسین ہو، لیکن اس نے ان چیزوں کو شرطِ نماز قرار

نہیں دیا کہ بغیر ان کے نماز درست ہی نہ ہو۔

آیت کا صحیح مفہوم قرآن کی آیت پر غور کیجیے۔ اگر سمجھنا اور معانی کی طرف ملتفت ہونا ہی صحت نماز کے لیے ضروری تھا اور اسی بنا پر حالت سکر میں نماز سے دور رہنے کا حکم دیا گیا تھا، تو پھر سکر ہی میں کونسی خصوصیت تھی؟ یہ بھی کہنا چاہیے تھا کہ جب تم متفکر ہو تو نماز سے دور رہو جب تمہیں رنج یا پریشانی یا کسی اور قسم کی ذہنی مشغولیت لاحق ہو تب بھی نماز کے پاس نہ آؤ۔ جب تمہیں محسوس ہو کہ دوران نماز میں تمہارے خیالات کسی اور طرف بھٹک گئے ہیں تب بھی نماز توڑ دو اور پھر سے شروع کرو۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان میں سے کوئی قید بھی نہیں لگائی بلکہ صرف حالت سکر میں نماز پڑھنے سے منع فرمایا اور اس کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ اس حالت میں تم کو علم نہیں ہوتا کہ کیا کہہ رہے ہو۔ اس سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ سکر میں کسی اور قسم کی بے خبری ہوتی ہے جو عدم فہم اور عدم التفات سے ماسوا ہے۔ اس حالت میں انسان کو یہ بھی شعور نہیں رہتا کہ وہ عبادت کے لیے کھڑا ہوا ہے یا کسی اور کام کے لیے، قرآن پڑھ رہا ہے یا کچھ اور، قبلہ رخ بھی ہے یا نہیں۔ اس پر کچھ ایسی مدہوشی طاری ہوتی ہے کہ وہ اپنے آپے میں نہیں ہوتا۔ ہوسکتا ہے کہ قرآن پڑھتے پڑھتے کوئی شعر گانے لگے۔ یا خدا کا ذکر کرتے کرتے کچھ اور اول فول بک جائے۔ یا قبلہ رخ کھڑے کھڑے کسی دوسری طرف ڈھلک پڑے یا نماز پڑھتے پڑھتے بھول جائے کہ نماز پڑھ رہا ہوں اور پوری نماز چھوڑ کر کسی سے باتیں کرنے لگے یا مصلے پر سے کہیں چل کھڑا ہو۔ اللہ تعالیٰ کا مقصد حتّٰی تعلموا ما تقولون سے دراصل ایسی ہی بے شعوری کی طرف اشارہ کرنا ہے اور مدعا یہ ہے کہ جب تم اپنی حماقت سے اپنے اوپر ایسی حالت طاری کرو جس میں تم کو اپنی زبان اور اپنے دل و دماغ پر قابو ہی نہ رہتا ہو تو ہمارے دربار میں حاضر ہونے کی جرأت نہ کرو۔

اس تشریح سے یہ بات واضح ہوگئی کہ آیت مذکورۃ الصدر کا کوئی تعلق نماز کی زبان سے

نہیں ہے، اور اس سے یہ استدلال کرنا درست نہیں کہ نماز مادری زبان میں پڑھنا ضروری ہے جسے مصلی اچھی طرح سمجھتا ہو۔

ائمہ مجتہدین کے اختلافات اب یہ سوال باقی رہ گیا کہ آیا نماز کا عربی زبان میں ہونا ضروری ہے؟ اور کیا غیر عربی میں نماز ناجائز ہے؟ اس سوال کا حل اپنے طریق پر عرض کرنے سے پہلے ہم ان اختلافات کو بیان کئے دیتے ہیں جو اس باب میں ائمہ مجتہدین کے درمیان ہوئے ہیں، تاکہ مسئلہ کی صحیح شرعی حیثیت کے سمجھنے میں آسانی ہو۔

امام اعظم کا مذہب امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ کی رائے یہ ہے کہ فارسی میں (اور فارسی کی کچھ خصوصیت نہیں[1]، ہر زبان میں) نماز پڑھنا یا خدا کا نام لے کر ذبح کرنا، یا اذان دینا (بشرطیکہ وہ غیر عربی اذان معروف ہو اور اس کو سن کر لوگ جان لیں کہ اذان ہے) جائز ہے خواہ ایسا کرنے والا عربی پڑھنے پر قادر ہو یا نہ ہو۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ قرآن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وَاِنَّہٗ لَفِیْ زُبُرِ الْاَوَّلِیْنَ یعنی وہ پچھلی کتابوں میں بھی ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ قرآن اپنے موجودہ نظم کے ساتھ پچھلی کتابوں میں نہ تھا، پس لامحالہ یہ ماننا پڑے گا کہ وہ ان کتابوں میں اپنے معنی کے اعتبار سے تھا اور جب وہ معنوی ہونے کے باوجود "قرآن" ہی تھا تو یہ ماننے میں کیا قباحت ہے کہ قرآن کا فارسی ترجمہ بھی معنیً قرآن ہے اور نماز میں اس کا پڑھنا جائز ہے۔ ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ وَلَوْ جَعَلْنٰہُ قُرْاٰنًا اَعْجَمِیًّا (اگر ہم اس کو عجمی قرآن بناتے) اس سے معلوم ہوا کہ اگر عجمی زبان میں بھی یہ معانی ادا کیے جاتے تب بھی وہ قرآن ہی ہوتا۔ مزید براں روایات میں آیا ہے کہ ایران

[1] ابوسعید البردعی نے امام صاحب کا یہ مسلک نقل کیا ہے کہ فارسی کے سوا کسی دوسری زبان میں پڑھنا درست نہیں لیکن کرخی نے لکھا ہے کہ امام اعظم کا صحیح مسلک یہ ہے کہ ہر زبان میں پڑھنا جائز ہے۔ صاحب ہدایہ نے بھی اسی کو صحیح قرار دیا ہے چنانچہ لکھتے ہیں ویجوز بای لسان کان سوی الفارسیۃ ھو الصحیح۔

کے نومسلموں نے سلمان فارسی سے درخواست کی تھی کہ سورۂ فاتحہ ہم کو فارسی میں لکھ دیجئے۔ چنانچہ انہوں نے لکھ دی اور وہ اس کو نمازوں میں پڑھتے رہے یہاں تک کہ جب ان کی زبانیں نرم ہو گئیں اور وہ عربی پڑھنے پر قادر ہو گئے تو انہوں نے عربی میں پڑھنی شروع کر دی۔ ان دلائل کی بنا پر امام صاحب کی رائے یہ ہے کہ اگر غیر عربی میں نماز پڑھی جائے تو ادا ہو جائے گی، مگر وہ اس کو مکروہ قرار دیتے ہیں کیونکہ یہ سنت متوارثہ کے خلاف ہے۔ بلکہ ابو بکر رازی نے تو لکھا ہے کہ امام صاحب نے آخر میں اپنی اس رائے سے رجوع کر لیا تھا اور امام ابو یوسف اور امام محمد کی رائے قبول کر لی تھی۔

صاحبین کا مذہب | امام ابو یوسف اور امام محمد کی رائے یہ ہے کہ اگر کوئی شخص عربی پڑھنے پر قدرت رکھتا ہو تو غیر عربی میں نماز پڑھنا درست نہیں۔ ہاں اگر وہ عربی کا تلفظ کرنے پر قادر ہی نہ ہو تو غیر عربی میں پڑھ سکتا ہے۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ نماز میں قرآن پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے (فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ) اور قرآن کے ترجمہ پر "قرآن" کا اطلاق نہیں ہوتا۔ لہٰذا جس نماز میں قرآن کے بجائے اس کا ترجمہ پڑھا جائے وہ نماز ہی نہ ہو گی۔ مگر جو شخص عربی کے تلفظ پر قادر ہی نہ ہو اس کے لیے مجبوری ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دی ہے۔ ایسے شخص کی نماز بالکل اسی طرح ہو جائے گی جس طرح اس شخص کی نماز جو رکوع و سجود سے عاجز ہو اور اشارہ سے ادا کرے۔

امام شافعی کا مذہب | امام شافعی کا ایک قول وہی ہے جو صاحبین کا اوپر مذکور ہوا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ جو شخص عربی تلفظ پر قادر نہ ہو وہ بغیر قرأت کے نماز ادا کرے۔ اگر اس نے فارسی ترجمہ پڑھا تو نماز فاسد ہو جائے گی کیونکہ کلام اللہ کا ترجمہ کلام اللہ نہیں، کلام الناس ہے۔ اللہ کا کلام صرف عربی قرآن ہے، لقوله تعالیٰ اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا [1]

[1] اس بحث کی تفصیلات کیلئے ملاحظہ ہو کتاب المبسوط للسرخسی جلد اول صفحہ ۳۷۔ و فتح القدیر و شرح العنایۃ علی الہدایہ جزو اول صفحہ ۱۹۹ تا ۲۰۱

**مسئلہ کی پوری تحقیق** ان تفصیلات سے معلوم ہوا کہ سلف صالح کے پیش نظر سوال کی نوعیت صرف یہ تھی کہ اگر نماز غیر عربی میں پڑھی جائے تو آیا ہو بھی جائے گی یا نہیں؟ کسی نے کہا کہ ہوگی مگر مکروہ ہوگی کسی نے کہا کہ سرے سے ہوگی ہی نہیں۔ کسی نے کہا کہ عاجز کی نماز ہو جائے گی بالکل اُس طرح جیسے معذور کی نماز اشارہ سے ہو جاتی ہے لیکن موجودہ زمانہ کے مجتہدین کے سامنے سوال کی نوعیت اس سے بالکل مختلف ہوگئی ہے۔ وہ اس سوال پر اس حیثیت سے نگاہ ڈالتے ہیں کہ آیا غیر عربی داں کی نماز عربی میں ادا بھی ہوتی ہے یا نہیں؟ اور آیا غیر عرب کے لیے عربی میں نماز اولیٰ ہے یا اپنی مادری زبان میں؟ اب چونکہ صورت مسئلہ بدل گئی ہے، لہذا جواب مسئلہ کی صورت بھی بدل جانی چاہیے۔

**مصالح شرعیہ** نماز کے لیے کونسی زبان انسب اور اولیٰ ہے؟ اس سوال کے صحیح حل کا انحصار ایک دوسرے سوال کے صحیح حل پر ہے اور وہ یہ ہے کہ اسلام میں نماز کی حیثیت کیا ہے اور اس سے کون کونسے شرعی مصالح وابستہ ہیں؟ اس سے پہلے ہم اس حقیقت کی طرف اشارہ کر چکے ہیں کہ اسلام کا اصل مقصد محض فرد کی تہذیب نفس اور اس کا تزکیہ ہی نہیں ہے بلکہ وہ افراد کو فرداً فرداً پاک اور متقی بنا کر دراصل ایک اعلیٰ درجہ کی صالح جماعت بنانا چاہتا ہے جو زمین پر اللہ تعالیٰ کی خلافت کے فرائض ادا کرے۔ اسی غرض کے لیے اس نے تمام عبادات اس طریقہ پر فرض کی ہیں کہ ان میں رجوع الی اللہ کے ذریعہ سے تقویٰ کی روح پھونکنے کے ساتھ ساتھ ان کو صالحین کی ایک جماعت بھی بناتی چلی جائیں۔ اور ان عبادات میں سب سے اہم عبادت نماز ہے جو تہذیب نفس بھی کرتی ہے قرآنی ہدایات کی اشاعت بھی کرتی ہے قرآن کی حفاظت بھی کرتی ہے اور مسلمانوں کو ایک جماعت بھی بناتی ہے۔
نماز کی ان مختلف حیثیات اور اسلام کے ان متعدد مقاصد پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز محض ایک بندے کی اپنے خدا سے مناجات ہی نہیں ہے، اور محض ایک ایک فرد میں الگ الگ روح تقویٰ پھونکنے کا ذریعہ ہی نہیں ہے بلکہ وہ اسلام کا قوام بھی ہے اور انفرادی مصلحت سے

عظیم تر مصالح بھی اس سے وابستہ ہیں۔

اب دیکھیے کہ جہاں تک انفرادی مصالح کا تعلق ہے ان کے لحاظ سے ضروری ہے کہ انسان نماز میں جو کچھ پڑھے اس کو سمجھے بھی تاکہ تہذیب نفس اور تزکیہ روح کا مقصد پوری طرح حاصل ہو سکے۔ اس غرض کے لیے نماز کا اُس زبان میں ہونا مفید ہوگا جسے مصلّی جانتا اور سمجھتا ہو لیکن انفرادی مصالح سے اہم تر جو مصالح شارع کے پیش نظر ہیں ان کو یہ چیز نقصان پہنچا دے گی۔

اولاً قرآن کی حفاظت کا عظیم الشان مقصد اس سے بڑی حد تک فوت ہو جائیگا جب لوگ قرآن کے ترجمہ کو بھی قرآن سمجھنے لگیں گے اور یہ خیال عام ہو جائیگا کہ عبادت اور تلاوت کے مقاصد کے لیے ترجمہ اصل کتاب کا قائم مقام ہے تو اصل کتاب سے اعتنا رکم ہو جائے گا، اس کو یاد کرنیکا ذوق باقی نہ رہے گا۔ اور ترجمہ ہی کو عملاً بطور اصل لے لیا جائے گا۔

ثانیاً اصل کتاب اللہ سے بے اعتنائی اور تراجم کی طرف روز افزوں التفات کا نتیجہ دین کی خرابی کے سوا کچھ نہ ہوگا، کیونکہ ناقص اور باہم مختلف و متعارض ترجموں کے الگ الگ جماعتوں اور الگ الگ قوموں میں معتبر بن جانے سے اسلام کا انجام بھی وہی ہوگا جو مسیحیت اور یہودیت کا ہوا۔

ثالثاً اس سے امت کی وحدت کا خاتمہ ہو جائے گا اور اسلام میں لسانی قومیتوں کی بنا پڑ جائے گی۔ ہر زبان بولنے والوں کی نمازیں اور جماعتیں الگ الگ ہوں گی۔ ایرانی عرب کے پیچھے نماز نہ پڑھے گا۔ اور ترک ہندیوں کی جماعت میں شریک نہ ہوگا۔ ایک ہی جگہ بنگالیوں اور مدراسیوں اور پنجابیوں کی جماعتیں لسانی قومیت کی بنیاد پر الگ الگ قائم ہوں گی، اور نماز کے ٹکڑے ہوتے ہی اُمت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے۔

ان عظیم تر اجتماعی نقصانات سے بچنے کے لیے ناگزیر ہے کہ نماز کے لیے ایک ہی بین الملی زبان ہو اور وہ وہی زبان ہو جس میں قرآن نازل ہوا ہے۔ رہا انفرادی نقصان تو اس کو دو

رنا کچھ زیادہ مشکل نہیں۔ نماز کا بیشتر حصہ وہ ہے جس کے لیے ایک ہی عبارت مقرر ہے۔ تکبیر، تسبیح، سمیہ، تعوذ، سورہ فاتحہ، تشہد، ان سب کا ترجمہ زیادہ سے زیادہ ایک دو گھنٹہ میں آسانی ذہن شین ہو سکتا ہے۔ عام طور پر جو سورتیں نماز میں پڑھی جاتی ہیں وہ بھی دس بارہ سے زیادہ نہیں ہیں۔ اور بہت چھوٹی چھوٹی ہیں۔ ان کے ترجمے یاد کر لینا بھی کچھ مشکل نہیں۔ اس کے بعد قرآن کی صرف بڑی بڑی سورتیں باقی رہ جاتی ہیں جو کبھی کبھار سورہ فاتحہ کے ساتھ ملائی جاتی ہیں، سو اگر بعض یا بیش تر مصلی ان کو نہ سمجھیں تو یہ ایسی کونسی قباحت ہے جس سے بچنے کے لیے تمام اجتماعی مصالح کی قربانی گوارا کر لی جائے۔

دلائل شرعیہ | مصالح اور حکم سے قطع نظر کر کے جب ہم منقولی احکام پر غور کرتے ہیں تو ہمیں امام ابو یوسف اور امام محمد کا مسلک سب سے زیادہ صحیح نظر آتا ہے اور قرین قیاس یہی ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے بھی آخر کار اسی کی طرف رجوع فرمایا ہوگا۔

قرآن مجید میں صاف طور پر فرمایا گیا ہے کہ نماز میں قرآن کی تلاوت کرو۔ یَا اَیُّھَا الْمُزَّمِّلُ قُمِ اللَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا نِّصْفَہٗ اَوِ انْقُصْ مِنْہُ قَلِیْلًا اَوْ زِدْ عَلَیْہِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِیْلًا۔ اِنَّ رَبَّکَ یَعْلَمُ اَنَّکَ تَقُوْمُ اَدْنٰی مِنْ ثُلُثَیِ اللَّیْلِ وَنِصْفَہٗ وَثُلُثَہٗ وَطَآئِفَۃٌ مِّنَ الَّذِیْنَ مَعَکَ ..... فَتَابَ عَلَیْکُمْ فَاقْرَءُوْا مَا تَیَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْکِ الشَّمْسِ اِلٰی غَسَقِ اللَّیْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ کَانَ مَشْھُوْدًا۔ اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَہٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ

یہ تمام آیات نماز میں تلاوت قرآن کا حکم دیتی ہیں اور ان میں القرآن (الف لام تعریفی کے ساتھ) کے پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے جس کا اطلاق ترجمہ قرآن پر نہ لغوی حیثیت سے ہوتا ہے نہ معنوی حیثیت سے۔

قرآن میں متعدد مقامات پر تصریح ہے کہ اسم قرآن کا مسمّٰی صرف عربی قرآن ہے اور کلام اللہ

وہی ہے جو عربی الفاظ کے ساتھ خدا نے نازل فرمایا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کے جو معنی بیان کیے جائیں گے، خواہ وہ عربی ہی کیوں نہ ہوں، وہ نہ صرف یہ کہ قرآن نہ ہوں گے بلکہ اس کے مثل بھی نہ ہوں گے۔ لہٰذا وہ کبھی قرآن کے قائم مقام ہو ہی نہیں سکتے۔ وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا - اِنَّا اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِىْ عِوَجٍ تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا - وَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ - قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ -

یہ تصریح بھی قرآن ہی میں ہے کہ تحریف سے حفاظت کا وعدہ صرف اس کتاب سے متعلق ہے جو خدا کے پاس سے نازل ہوئی ہے۔ انسانوں کے کیے ہوئے تراجم سے تعلق نہیں ہے ان میں ہر طرح سے تحریف کا دروازہ کھلا ہوا ہے، خواہ وہ ارادی تحریف ہو یا مترجمین کے عجز اور ان کے عدم فہم اور ان کی قلتِ علم کی بنا پر ہو۔ وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ - لہٰذا نماز میں قرآن کا ترجمہ پڑھنے والا یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ وہ لفظاً نہیں تو معنیً قرآن کی صحیح تلاوت کر رہا ہے۔

رجوع الی اللہ اور انابت اور خشیت جو نماز کی اصل جان ہے۔ اس کو پیدا کرنے کی خاصیت جیسی قرآنِ منزل من اللہ میں ہے ویسی کسی اور کلام میں نہ ہو سکتی ہے نہ پائی جاتی ہے اس پر بھی خود قرآن شاہد ہے۔ اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِىَ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ -

ایسے صریح اور محکم شرعی دلائل کو دیکھنے کے بعد یہ کہنا بہت ہی مشکل ہے کہ جو نماز ترجمہ

قرآن پڑھ کر ادا کی جائے وہ درست ہو جاتی ہے۔ مگر وہ ہو نا کیسا! ہم تو کہتے ہیں کہ وہ کسی درجہ میں بھی ادائے فرض کے لیے کافی نہیں۔ البتہ جیسا کہ صاحبین نے فرمایا ہے اس شخص کا معاملہ بالکل جداگانہ ہے جو عربی تلفظ پر قادر ہی نہ ہو۔ اس کے حق میں یہی فتوی مناسب ہے کہ جب تک وہ عربی میں نماز پڑھنے کے قابل نہ ہو جائے۔ اس کا فریضہ غیر عربی کے ساتھ ادا ہو جائے گا، اس لیے کہ وہ قانون اضطرار کے تحت آجاتا ہے۔ (باقی)

---

# کیا نجات کیلیے صرف کلمۂ توحید کافی ہے؟

"ایک حدیث کے متعلق جناب سے تشفی مطلوب ہے۔

من قال لا الٰہ الا اللہ دخل الجنۃ اس حدیث میں ایمان بالرسل کے بغیر جنت کی بشارت دی گئی ہے حالانکہ قرآن میں ایمان بالرسل پر جس شدت سے تاکید ہے ظاہر ہے تاآنکہ کوئی ایمان بالرسل کے بغیر نہ راہ ہدایت پاسکتا ہے نہ فوز و فلاح۔ نہ آخرت کی زندگی میں اس کے لیے کوئی حصہ ہے۔ نیز اس حدیث میں عمل صالح کی بھی کوئی شرط نہیں ہے۔ اگرچہ اعمال صالحہ جزو ایمان نہیں ہیں مگر قرآن کریم میں تو آخرت کی کامیابی و کامرانی انعام و اکرام اور جنت کی بشارت، اپنے صاحب ایمان اور صالح بندوں ہی کو دی گئی ہے جیسا کہ آیات ذیل سے واضح ہوتا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ ... جَزَاؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنَّاتُ عَدْنٍ الآیۃ

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنَّاتٍ الآیۃ۔

وَمَنْ يُؤْمِنْ بِاللَّهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّئَاتِهِ وَيُدْخِلْهُ جَنَّاتٍ الآیۃ

ہماری سطح بین نظروں میں یہ حدیث قرآن کے خلاف واقع ہو رہی ہے براہ کرم جناب اپنے شغف علمی اور محققانہ نظر سے مستفید فرما کر مطمئن فرمائیں تو موجب صد ممنونیت۔

صفوۃ الرحمٰن نظام آباد۔

**ترجمان القرآن** سب سے پہلے یہ غلط فہمی دور ہو جانی چاہیے کہ یہ حدیث قرآن کے خلاف ہے قرآن مجید میں بھی ایک جگہ فرمایا گیا ہے:

| | |
|---|---|
| إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا | بے شک جن لوگوں نے کہا کہ خدا ہی ہمارا رب ہے، |
| تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا | پھر اس (قول) پر جم گئے ان پر ملائکہ اترتے ہیں (اور |
| وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي | کہتے ہیں کہ) خوف کھاؤ اور نہ رنج کرو اور اس جنت |
| كُنْتُمْ تُوعَدُونَ (حم السجدہ ۴:۳۰) | کی خوش خبری سے شاد کام ہو جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے |

دیکھیے یہاں بھی وہی بات دوسرے لفظوں میں کہی گئی ہے جو آپ کی نقل کردہ حدیث میں پائی جاتی ہے جس طرح اس آیت سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا کہ نجات اور بخشش اور دخول جنت کے لیے صرف توحید کا اعتقاد کافی ہے اور ایمان بالرسل اور عمل صالح کی ضرورت نہیں، اسی طرح مذکورہ بالا حدیث سے بھی ایسا نتیجہ نکالنا درست نہیں۔ علی ہٰذا القیاس جس طرح قرآن مجید کی یہ آیت اُن آیات سے معارض نہیں جو آپ نے پیش فرمائی ہیں، اُسی طرح یہ حدیث بھی اُن آیات سے معارض نہیں۔

حدیث اور قرآن دونوں کو سمجھنے میں ایک غلطی عام طور پر پیش آتی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ قرآن اور کتب حدیث دونوں کو لوگ عام تصنیفات کی طرح دیکھنا چاہتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح دوسری کتابوں میں ایک ایک مضمون ایک ایک جگہ بتمام و کمال بیان کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، اسی طرح قرآن و حدیث میں بھی کی گئی ہوگی لیکن اصل معاملہ یہ نہیں ہے۔ قرآن ۲۳ سال کی مدت میں مختلف مواقع پر مختلف حالات اور ضروریات کے مطابق تھوڑا تھوڑا کرکے نازل ہوا ہے۔ اسی طرح احادیث میں حضور کے وہ اقوال جمع کئے گئے ہیں جو ۲۳ سال کے طویل زمانہ میں آپ نے مختلف مواقع پر مختلف حالات میں حسب ضرورت ارشاد فرمائے ہیں۔ ان دونوں میں ایک چیز تو اسلام کی مرکزی تعلیم ہے جسے بار بار مختلف طریقوں سے دوہرایا گیا ہے۔ اور دوسری چیز اسلامی ہدایت کی تفصیلات ہیں جن کو کہیں یکجا اور کہیں جدا جدا مختلف حالتوں اور مختلف ضرورتوں کے لحاظ سے بیان کیا گیا ہے صحیح نتیجہ اخذ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ان سب پر بحیثیت مجموعی نگاہ ڈالی جائے، ورنہ اگر کسی ایک ٹکڑے کو کہیں سے

لے لیا گیا اور دوسرے متعلق اجزا سے صرفِ نظر کرکے اسی کو ایک مستقل چیز سمجھ لیا گیا تو یقیناً غلط فہمی واقع ہوگی۔

مثال کے طور پر قرآن میں کہیں تو صرف ایمان باللہ پر زور دیا گیا ہے جیسا کہ اوپر منقول ہوا۔ کہیں صرف یوم آخر کے اقرار کی تاکید ہے (الانعام: ۱۲) کہیں خدا کے ساتھ یوم آخر کا ذکر ہے (سورہ بقرہ) کہیں خدا کے ساتھ رسولوں پر ایمان لانے کا حکم ہے۔ (آل عمران: ۱۸) کہیں خدا کے ساتھ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی تعلیم ہے (النور: ۹) کہیں یوم آخر اور کتب الٰہی پر اعتقاد رکھنے کی شدید تاکید ہے۔ (النساء رکوع اول) کہیں خدا اور انبیاء اور ملائکہ کے انکار کو کفر و فسق قرار دیا گیا ہے (بقرہ: ۱۲) اور کہیں ایمان کے پانچ اجزا پورے بیان کر دئے گئے ہیں یعنی ایمان باللہ، ایمان بالرسل، ایمان بالکتب، ایمان بالملائکہ اور ایمان بالیوم الآخر (بقرہ: ۲۲) ان مختلف مقامات میں درحقیقت کوئی اختلاف نہیں ہے بلکہ ایک مقام پر ایمانیات کو یکجا بیان کرکے دوسرے مقامات پر ان میں سے ایک ایک دو دو کو حسب موقع و ضرورت زیادہ زور دے کر پیش کیا گیا ہے۔ اب اگر کوئی شخص اس اصل سے قطع نظر کرلے اور کسی ایک آیت کو لے کر یہ دعویٰ کردے کہ مومن ہونے کے لیے صرف خدا کی توحید پر یا محض خدا اور یوم آخر پر یا فقط خدا اور رسولوں پر ایمان لانا کافی ہے، اور یہ گمان کرے کہ اجزائے ایمان میں سے بعض کا انکار کرکے بھی بعض کا اقرار انسان کے لیے نافع ہوسکتا ہے، تو دراصل یہ قرآن کی زبان اور اس کے اندازِ بیان سے قطعی ناواقفیت کا نتیجہ ہوگا۔

اسی طرح قرآن میں کہیں صرف ایمان پر زور دیا گیا ہے جیسا کہ آیت اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا میں ہے۔ اور کہیں ایمان کے ساتھ تقویٰ اور عمل صالح کو نجات کے لیے شرط ٹھیرایا گیا ہے، مثلاً وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَلَکُمْ اَجْرٌ عَظِیْمٌ (آل عمران: ۱۸) اور وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ۔

پھر اعمال صالحہ میں سے بھی کسی جگہ ایک کی تاکید ہے اور کسی جگہ دوسرے کی۔ کہیں نماز اور زکوٰۃ پر زور دیا جا رہا ہے، کہیں راستبازی اور حسن معاملہ پر، کہیں عفت اور حفظ فروج پر، کہیں صلۂ رحمی اور قرابتداروں کے حقوق پر، کہیں مساکین و یتامیٰ کی مواسات پر، کہیں والدین کی خدمت پر، کہیں ازدواجی قانون کے حدود پر، کہیں اکل حلال اور ترک حرام پر۔ ان میں سے ہر ایک کو اپنی اپنی جگہ اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ گویا فلاح و نجات کا مدار اسی پر ہے۔ اگر کوئی شخص ان احکام اور ہدایات کے پورے مجموعہ سے قطع نظر کر کے محض کسی ایک آیت کو لے اور اس سے یہ نتیجہ نکالے کہ قرآن مجید محض ایمان پر نجات کی بشارت دیتا ہے بغیر اس کے کہ اس کے ساتھ عمل صالح ہو، یا اعمال صالحہ میں سے صرف نماز یا زکوٰۃ یا عفت یا صلۂ رحمی یا کسی اور چیز کو کافی سمجھتا ہے بغیر اس کے کہ اس کے ساتھ دوسرے حسنات بھی ہوں، تو یہ اس کی قلت تدبر کا نتیجہ ہوگا۔ قرآن تو اپنی مجموعی تعلیم میں فکری، عملی زندگی کے لیے ایک مکمل اسکیم پیش کرتا ہے جس میں ایمانیات، اخلاقیات، اور عملی قوانین سب اپنی اپنی مناسب جگہ پر ہیں۔ مگر اس نے ان چیزوں کو ذہن نشین کرنے کے لیے ایک خاص حکیمانہ طریقہ اختیار کیا [illegible] وہ یہ ہے کہ ایک ایک ہدایت کو وہ الگ الگ مناسب مواقع پر [illegible] کسی کسی خاص واقعہ [illegible]

[illegible]

سمجھا [illegible] کرنے۔

تربیت اس لیے اختیار کیا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کا مقصد محض ایک اسکیم یا ایک ہدایت نامہ مرتب کر دینا نہیں تھا، بلکہ درحقیقت اپنی اسکیم کو نافذ کرنا اور ایک جماعت کی زندگی میں انقلاب پیدا کرنا تھا جس کے لیے تدریج اور ترتیب اور موقع و محل کی مناسبت اور نفسیات انسانی کی رعایت ناگزیر تھی۔

ٹھیک ٹھیک اسی حکیمانہ طریقہ کی پیروی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمائی ہے۔ ۲۳ سال کی پیغمبرانہ زندگی میں آپ ہر وقت تبلیغ و تعلیم اور اصلاح و ہدایت میں مشغول رہتے تھے۔ ہر قسم کے لوگ آپ کے پاس آتے تھے۔ ہر ایک کی ذہنیت، ہر ایک کی استعداد، ہر ایک کی اخلاقی، اقتصادی اور علمی حالت جداگانہ تھی۔ اگر آپ ہر وقت ہر شخص سے ایک ہی لگی بندھی بات کہتے اور ایک ہی قسم کی ہدایات دے کر رخصت کر دیا کرتے تو آپ کو وہ کامیابی کبھی نصیب نہ ہوتی جس نے تاریخ میں انقلاب پیدا کر دیا۔ آپ حکیم مطلق کے شاگرد تھے، اور اس حکیم نے جو طریق ہدایت اپنی کتاب میں اختیار کیا تھا اسی کی پیروی آپ بھی کرتے تھے۔ آپ کی تعلیم موقع و محل کی رعایت کے ساتھ ہوتی تھی۔ جس وقت جو موقع ہوتا تھا، اس وقت وہی بات آپ کی زبان سے نکلتی تھی اور سیدھی دلوں میں اتر جاتی تھی۔ یہ چیزیں جو منتشر طور پر حدیثوں میں پھیلی ہوئی ہیں ان سب کو مجموعی حیثیت سے دیکھیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری تعلیم کیا تھی اور آپ کس طرح اس کو ذہن نشین کرتے تھے۔ اگر آپ ان اکائیوں کو جوڑ کر ایک منظم عدد نہ بنائیں گے، اور ایک ایک فرد کو الگ کر کے اس سے نتائج اخذ کرنے لگیں گے تو ویسی ہی غلطی پیش آئے گی جیسی آیات قرآنی کو متفرق دیکھنے سے پیش آسکتی ہے۔

اس قاعدہ کو ملحوظ رکھ کر اب ان احادیث پر نظر ڈالیے جن میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کلیات مختلف طریقوں سے بیان فرمائی ہیں۔

آپ سفر میں تھے۔ ایک اعرابی نے آکر آپ کے اونٹ کی نکیل تھام لی اور عرض کیا

یا رسول اللہ مجھے کوئی ایسی چیز بتائیے جو مجھ کو جنت سے قریب اور دوزخ سے دور کر دے۔ فرمایا تعبد اللہ ولا تشرک بہ شیئًا و تقیم الصلوٰۃ و توتی الزکوٰۃ و تصل الرحم اللہ کی عبادت کر اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کر نماز کا پابند رہ۔ زکوٰۃ دے اور قرابتداروں کے حقوق ادا کر"۔ دیکھیے۔ یہاں ایک ایسا شخص سامنے ہے جو آپ کی رسالت کا قائل ہے۔ حیات اخروی کا قائل ہے۔ اسلام قبول کر چکا ہے۔ اس کو تمام ایمانیات اور اخلاقیات کی تفصیل مطلوب نہیں۔ وہ صرف ترقی درجات کے لیے ہدایت مانگ رہا ہے۔ آپ اس کی ضرورت کے مطابق اس کو تعلیم دیتے ہیں کہ جس عقیدہ پر اسلام کی بنیاد قائم ہے اس میں مضبوط ہو جا، اور اللہ کے حقوق اور بندوں کے حقوق ادا کیے جا۔

ایک دوسرے موقع پر کوئی اعرابی حاضر ہوا اور اس نے عرض کیا کہ مجھے ایسا عمل بتائیے جو مجھ کو جنت میں پہنچا دے آپ نے فرمایا تعبد اللہ ولا تشرک بہ شیئا و تقیم الصلوٰۃ المکتوبۃ و تؤتی الزکوٰۃ المفروضۃ و تصوم رمضان "وہ عمل یہ ہے کہ تو صرف اللہ کی بندگی کرے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیرائے، جو نماز فرض کی گئی ہے اس کا پابند رہے۔ جو زکوٰۃ مقرر کر دی گئی ہے وہ ادا کرتا رہے۔ اور رمضان کے روزے رکھے۔ اس نے کہا خدا کی قسم میں اس سے نہ زیادہ کچھ کروں گا نہ کم۔ جب وہ واپس چلا گیا تو حضور نے فرمایا جو شخص اہل جنت میں سے کسی کو دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی کرنی چاہتا ہو وہ اس شخص کو دیکھ لے۔ اب حضور کی تعلیم اور اس شخص کے جواب اور پھر آپ کے آخری ارشاد پر غور کیجیے۔ ایک سچا مسلمان سامنے تھا۔ نبی کی ہر ہدایت کو صدق دل سے قبول کرنے کو تیار رہتا تھا۔ اس کو صرف یہ سمجھانے کی ضرورت تھی کہ خدا کی جنت میں داخل ہونے کے لیے بڑی بڑی ریاضتوں اور مجاہدوں کی حاجت نہیں، چلے کھینچنے اور رات رات بھر وظیفے

پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ اسی دنیا داری کی زندگی میں اگر تو اپنے اعتقاد کو شرک سے پاک رکھے اور خدا کے عائد کیے ہوئے فرائض ادا کرتا رہے تو جنت تجھے مل سکتی ہے۔

اس کے بعد ایک دوسری قسم کی حدیث ملاحظہ کیجیے۔

معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو جب آپ نے ایک مشن پر بھیجا تو فرمایا کہ تم اہل کتاب کی ایک قوم میں پہنچو گے سب سے پہلے ان کو اس بات کی دعوت دینا کہ لا الٰہ الا اللہ کی شہادت دیں اور یہ تسلیم کریں کہ میں اللہ کا رسول ہوں جب وہ اس کو مان لیں تو ان سے کہنا کہ اللہ نے تم پر رات دن میں پانچ نمازیں فرض کی ہیں۔ جب وہ اس کو بھی مان لیں تو کہنا کہ اللہ نے تم پر زکوٰۃ بھی فرض کی ہے جو تمہارے مالداروں سے لی جائے گی اور تمہارے غریبوں کو دیدی جائے گی جب وہ اس کو بھی مان لیں تو خبردار ان کے مال کو ہاتھ نہ لگانا اور مظلوم کی بد دعا سے بچنا کہ اس کے اور خدا کے درمیان کوئی حجاب نہیں۔ اسی نوعیت کی دوسری احادیث میں ہے امرت ان اقاتل الناس حتی یشھدوا ان لا الٰہ الا اللہ وان محمداً رسول اللہ ویقیموا الصلوٰۃ ویوتوا الزکوٰۃ فاذا فعلوہ عصموا منی دماءھم واموالھم وحسابھم علی اللہ۔ (مجھے حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں سے جنگ کروں تا آنکہ وہ گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی خدا نہیں اور یہ کہ محمد اللہ کا رسول ہے، اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں۔ پھر جب انھوں نے ایسا کر دیا تو مجھ سے اپنی جانوں اور مالوں کو بچا لیا۔ اس کے بعد ان کا حساب اللہ کے ہاتھ ہے) اور امرت ان اقاتل الناس حتی یشھدوا ان لا الٰہ الا اللہ ویومنوا بی وبما جئت بہ فاذا فعلوا ذٰلک عصموا منی دماءھم واموالھم الا بحقھا وحسابھم علی اللہ (مجھے حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں سے جنگ کروں تا آنکہ وہ گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی خدا نہیں، اور مجھ پر اور ان سب باتوں پر ایمان لائیں جو میں لایا ہوں پھر جب انھوں نے ایسا کر دیا تو مجھ سے اپنی جانوں

اور مالوں کو بچا لیا۔ الا یہ کہ ان کے خلاف کوئی حق قائم ہو جائے۔ اس کے بعد ان کا حساب اللہ کے ذمہ ہے) ان احادیث میں حضور نے اسلام کا دستوری قانون بیان فرمایا ہے اور وہ یہ ہے کہ جب کوئی شخص خدا کی وحدانیت اور آپ کی رسالت کو ماننے کا اقرار کرلے تو وہ دائرۂ اسلام میں آجاتا ہے۔ یہ بات کہ وہ حقیقی مومن ہے یا نہیں اس کا فیصلہ اللہ کرنے والا ہے ہم اس کا فیصلہ کرنے کے مجاز نہیں کہ لعراد مرا ن اشق عن قلوب الناس ولا عن بطونھم[1] عصمت، جان و مال مجرّد کلمۂ توحید اور اعتقادِ رسالت کے اقرار سے ثابت ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد کسی کو دست درازی کا حق نہیں رہتا البتہ اگر کوئی شخص خدا کا حق یا بندوں کا حق ادا کرنے سے انکار کرے تو اس کو جرم کے مطابق سزا دی جا سکتی ہے۔

دیکھیے یہاں کوئی خاص شخص پیش نظر نہ تھا بلکہ عام ہدایات دی جارہی تھیں اس لیے صرف قانون کے حدود بیان کرنے پر اکتفا کی گئی۔ یہ نہیں فرمایا کہ اقرار توحید و رسالت اور ادائے فرائض سے ہر شخص کے لیے جنت واجب ہو جائے گی۔ نیز اس موقع پر آپ نے ہر شخص کو تمام ایمانیات اور عملی قوانین سے آگاہ کرنے کا حکم بھی نہیں دیا، کیونکہ یہاں صرف یہ سمجھانا مقصود تھا کہ اسلام اور غیر اسلام کی حد کیا ہے۔ اور اسلام کی سرحد میں داخل ہوتے ہی انسان کو کیا حقوق حاصل ہو جاتے ہیں۔ یہ ٹھیک ٹھیک اس آیت کے مطابق ہے جس میں فرمایا گیا ہے فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ۔ (اگر وہ کفر و شرک سے توبہ کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو انہیں چھوڑ دو)۔ پس کسی شخص کو ان قانونی ہدایات سے یہ نتیجہ نکالنے کا حق نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صرف توحید و رسالت کے اقرار اور ادائے نماز و زکوٰۃ ہی میں اسلام کو محدود رکھتے تھے۔ اور ان کے سوا کسی اور چیز کی کوئی اہمیت آپ کی نگاہ میں نہ تھی۔

---

[1] مجھکو لوگوں کے دل چیرنے اور ان کے باطن ٹٹولنے کا حکم نہیں دیا گیا۔

اوپر اپنے دو قسم کی حدیثیں دیکھیں۔ ایک وہ جن کے مخاطب خاص لوگ تھے۔ ان میں آں حضرت صلعم نے ان لوگوں کے مخصوص حالات کو پیش نظر رکھ کر تعلیم دی ہے۔ دوسری وہ جن کا موضوع انتظام عمومی تھا۔ ان میں حضور نے عام قانونی ہدایات دی ہیں اور اسلام و کفر کا اتینہ بیان فرمایا ہے۔ اب آن احادیث کو دیکھیے جن کے مخاطب خواص صحابہ تھے۔

ایک مرتبہ حضور سواری پر چلے جا رہے تھے اور معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ آپ کے ردیف تھے۔ آپ نے تین مرتبہ ٹھیر ٹھیر کر آواز دی یا معاذ بن جبل۔ اور حضرت معاذ نے ہر مرتبہ عرض کیا لبیک یا رسول اللہ وسعدیک۔ اس طرح تین مرتبہ پکار کر جب آپ نے مخاطب کو اچھی طرح اپنی جانب متوجہ کر لیا اور آپ کو یقین ہو گیا کہ جو بات آپ فرمانا چاہتے ہیں اس کو سننے والا خاص اہمیت کے ساتھ سنے گا تب فرمایا جانتے ہو بندوں پر خدا کا کیا حق ہے؟" انہوں نے عرض کیا اللہ اور اس کے رسول کو زیادہ علم ہے فرمایا" اللہ کا حق اس کے بندوں پر یہ ہے کہ صرف اسی کی بندگی کریں اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھیرائیں" تھوڑی دور آگے چل کر پھر آواز دی یا معاذ بن جبل۔ انہوں نے عرض کیا لبیک یا رسول اللہ وسعدیک۔ فرمایا" پھر جانتے ہو کہ بندوں کا اللہ پر کیا حق ہے جبکہ وہ ایسا کر دیں"؟ انہوں نے عرض کیا اللہ اور اس کے رسول کو زیادہ علم ہے۔ فرمایا" ان کا حق یہ ہے کہ اللہ ان کو عذاب نہ دے"۔ حضرت معاذ نے یہ سن کر پوچھا"کیا میں لوگوں کو اس کی بشارت دے دوں"؟ فرمایا نہیں! ان کو بشارت نہ دو کیوں کہ وہ اسی پر بھروسہ کر بیٹھیں گے"۔

ایک اور موقع پر حضور اپنے خاص صحابیوں کے درمیان بیٹھے تھے۔ یکایک آپ اٹھے اور تشریف لے گئے جب بہت دیر گذر گئی تو صحابہ کو تشویش ہوئی کہ کہیں کوئی حادثہ پیش نہ آ جائے ڈھونڈنے نکلے سب سے پہلے جو صاحب گئے وہ حضرت ابوہریرہ تھے۔ یہ سرکار کو تلاش کرتے ہوئے انصار کے ایک باغ پہنچے جس کا دروازہ تلاش کے باوجود نہ ملا۔ آخر ایک چھوٹی سی نہر کے رستے اندر پہنچے۔ دیکھا کہ

حضور تشریف فرما ہیں۔ آپ نے پوچھا کیسے آئے۔ انہوں نے ماجرا عرض کیا۔ آپ نے اپنی دونوں جوتیاں اٹھا کر انہیں دے دیں اور فرمایا انہیں لے جاؤ اور باغ کے پیچھے جو شخص ایسا ملے جو لا الٰہ الا اللہ کی شہادت دیتا ہو اور اس پر دل سے یقین رکھتا ہو اسے جنت کی بشارت دے دو۔ یہ اس حکم کی تعمیل کے لیے روانہ ہوئے۔ راستہ میں سب سے پہلے حضرت عمر ملے۔ انہوں نے پوچھا یہ جوتیاں کیسی ہیں۔ انہوں نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نعلین ہیں اور آپ نے مجھے ایسا اور ایسا کہنے کا حکم دیا ہے۔ حضرت عمر نے یہ سن کر ان کے ایک زور کا ہپ رسید کیا اور کہا کہ واپس جاؤ۔ یہ گرتے پڑتے بھاگے اور جا کر حضور سے سارا معاملہ بیان کیا۔ اتنے میں حضرت عمر بھی پہنچ گئے۔ آپ نے پوچھا کہ عمر! کس چیز نے تم کو اس حرکت پر آمادہ کیا؟ انہوں نے عرض کیا میرے ماں باپ آپ پر قربان کیا آپ نے ابو ہریرہ کو ایسا اور ایسا کہنے کے لیے بھیجا تھا؟ حضور نے فرمایا ہاں۔ حضرت عمر نے عرض کیا ایسا نہ کیجیے۔ مجھے خوف ہے کہ لوگ اسی پر بھروسہ کر بیٹھیں گے۔ انہیں عمل کے لیے چھوڑ دیجیے۔ آپ نے فرمایا اچھا تو انہیں عمل کے لیے چھوڑ دو۔

ایک مرتبہ حضرت ابو ذر غفاری حاضر ہوئے تو دیکھا کہ آپ ایک سپید کپڑا اوڑھے ہوئے لیٹے ہیں۔ یہ واپس ہو گئے۔ دوبارہ حاضر ہوئے تو آپ اٹھ چکے تھے۔ ان کو دیکھ کر فرمایا ما من عبد قال لا الٰہ الا اللہ ثم مات علیٰ ذالك الا دخل الجنة۔ جس بندے نے کہدیا کہ اللہ کے سوا کوئی خدا نہیں اور اسی پر جان دی وہ ضرور جنت میں داخل ہوگا۔ انہوں نے پوچھا وان زنیٰ وان سرق (اگرچہ اس نے زنا کی ہو؟ اگرچہ اس نے چوری کی ہو؟) آپ نے فرمایا وان زنیٰ وان سرق۔ انہوں نے پھر یہی پوچھا اور آپ نے پھر یہی جواب دیا۔ انہوں نے سہ بارہ پوچھا۔ آپ نے فرمایا ہاں وان زنیٰ وان سرق علیٰ رغم انف ابی ذر۔

ان تینوں حدیثوں پر غور کیجیے۔ مخاطب وہ لوگ ہیں جن کے کامل الاسلام ہونے میں کوئی شبہہ نہیں۔ وہ تعلیمات قرآنی اور قوانین اسلامی سے نہ صرف خوب واقف ہیں بلکہ ان پر پوری طرح عامل بھی ہیں۔

ان کے سامنے حضورؐ نے جو کچھ فرمایا اس سے یہ اندیشہ کرنے کی گنجائش ہی نہ تھی کہ وہ دوسرے ایمانیات اور اعمال صالحہ کو غیر ضروری سمجھ لیں گے۔ اس لیے ان کو آپ نے یہ حقیقت بتا دی کہ اسلام میں سب سے اہم چیز عقیدۂ توحید ہے، اور یہ ایسی چیز ہے کہ جس کا یہ اعتقاد درست ہو اور پوری طرح راسخ ہو جائے وہ اللہ کے عذاب میں گرفتار نہیں ہو سکتا۔ اس عقیدہ کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو بالکل خدا کی رضا کا تابع کر دے اور راہ راست پر قائم ہو جائے۔ سچے موحد کے لیے آیات الٰہی سے انکار اور مرضات الٰہی سے انحراف دونوں ناممکن ہیں، لہٰذا اس کا موحد ہونا ہی اس کے صحیح الایمان اور طاہر الاخلاق اور صالح الاعمال ہونے کو مستلزم ہے۔ تاہم اگر وہ غلطی سے مرتکب گناہ ہو بھی جائے تو یقیناً وہ اپنے گناہ پر متنبہ ہوتے ہی توبہ کرے گا۔ اور اگر توبہ کی توفیق نہ بھی ملی تو بقدر گناہ سزا پا کر آخر کار ضرور جنت میں داخل ہوگا۔ خلود فی النار کی سزا اس کو ہرگز نہیں مل سکتی۔

مذکورۂ بالا احادیث اور ان کی ہم معنی دوسری احادیث کا یہی مفہوم صحابۂ کرام نے سمجھا تھا اور یہی ان کا حقیقی مفہوم تھا۔ ان میں سے کسی نے بھی یہ خیال نہ کیا کہ بس عقیدۂ توحید ہی کافی ہے، اس کے بعد نہ رسالت کو ماننے کی ضرورت ہے، نہ کلام اللہ کو، اور نہ پاکیزگی اخلاق مطلوب ہے، نہ خیریت اعمال۔ ایسا غلط مفہوم وہ کس طرح سمجھ سکتے تھے، جبکہ ان کو پوری طرح بتا دیا گیا تھا کہ اسلام کیا ہے اور اس میں کن چیزوں کا اعتقاد، کن عبادات کی پابندی، کن حدود کی حفاظت، کن قوانین کی اطاعت اور کن طریقوں سے اجتناب ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے یہ تعلیم صرف کاملین کو دی اور عوام کے سامنے اس کو بیان کرنے سے منع فرما دیا۔ معاذ بن جبل والی حدیث میں آپ نے اس کی وجہ بھی خود ہی بیان فرما دی ہے کہ عام لوگ اس کو سن کر غلط فہمی میں پڑ جائیں گے۔ حضرت ابوہریرہ والی حدیث میں ایک شخص کو یہ شبہہ ہو سکتا ہے کہ آپ نے شاید عوام سے اس کو بیان کرنے کی اجازت دی تھی۔ خود حضرت عمرؓ کو بھی ایسا ہی شبہہ ہوا تھا۔ لیکن دراصل حضورؐ کا مقصد کامل الاسلام

لوگوں کو بشارت دینا تھا۔ چنانچہ جب حضرت عمر نے اپنا اندیشہ بیان کیا تو آپ نے ان کی رائے سے اتفاق فرمایا۔ اسی طرح حضرت ابوذر والی حدیث میں بھی کوئی شخص یہ شبہ نہیں کر سکتا کہ قال لا الٰہ الا اللہ سے مجرد زبانی قول مراد ہے۔ اس لیے کہ حضور نے دوسرے مواقع پر تصریح فرمائی ہے کہ دخول جنت کے لیے توحید پر کامل ایمان کی ضرورت ہے کہیں مستیقناً بھا قلبہ فرمایا۔ کہیں عبد غیر شاک فرمایا۔ اور کہیں دوسرے الفاظ ارشاد فرمائے ہیں جو اسی معنی پر دلالت کرتے ہیں۔

بہرحال یہ اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ جن احادیث میں توحید کی اہمیت بیان کی گئی ہے ان کا خطاب دراصل ان لوگوں سے ہے جو تمام شرائط کے ساتھ دائرۂ اسلام میں داخل ہو چکے ہوں۔ نہ کہ اُن لوگوں سے جو مسلمان ہی نہ ہوں۔ پھر مسلمانوں کو بھی اعتقادِ توحید پر دخول جنت کی بشارت دینے سے یہ مراد نہیں کہ بس خدا کی وحدانیت مان لو۔ پھر جس قسم کی بدعقیدگی، اور فسق و فجور، اور بدعت و معصیت میں چاہو مبتلا ہو جاؤ، بلکہ اس کا مقصد یہ بتانا ہے کہ مسلمان کی کامیابی کا مدار سب سے بڑھ کر اعتقادِ توحید کی صحت اور مضبوطی پر ہے۔ اس میں اگر خرابی آ گئی تو پھر کوئی چیز نافع نہیں ہو سکتی اور اگر یہ صحیح و مضبوط ہو تو آخر کار کامیابی حاصل ہو کر رہے گی۔ اسی جہت سے اس معنی کی احادیث اُس آیت قرآنی سے مطابق ہوتی ہیں جس میں فرمایا گیا ہے کہ۔ اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ۔

---

# مطبوعات

**الجمعۃ والبلد** | تالیف مولوی شیخ محمد رفعت اللہ صاحب صدیقی۔ ضخامت ۴۴ صفحات۔ ایک آنہ کا ٹکٹ بھیج کر ذیل کے پتہ سے طلب کیا جا سکتا ہے:۔ مولوی عثمان احمد صاحب مقام بسو۔ پوسٹ میاریا

اس رسالہ میں مؤلف نے اس مسئلہ پر بحث کی ہے کہ فقہ حنفی میں اقامت جمعہ کے لیے مصر کی جو شرط لکھی گئی ہے اس کا صحیح مفہوم کیا ہے، اور آیا ہندوستان کے دیہات و قصبات میں نماز جمعہ کو موقوف کرنا درست ہے یا نہیں۔ یہ مسئلہ علمائے احناف میں مختلف فیہ ہے۔ ایک جماعت "مصر" کی انہی تعریفات پر زور دیتی ہے جو قدیم کتب فقہیہ میں پائی جاتی ہیں۔ مگر مؤلف نے احادیث و اقوال فقہا سے یہ ثابت کیا ہے کہ اس باب میں بہترین فتویٰ وہ ہے جو حضرت ملا نظام الدین رحمۃ اللہ اور مولانا عبد الحی فرنگی محلی رحمۃ اللہ نے دیا ہے، یعنی یہ کہ اقامت جمعہ کی غرض کے لیے ہر اس بستی پر شہر کا اطلاق ہوگا جو بالکل کوردہ نہ ہو، اور جہاں آبادی کی تمام ضروریات پوری کرنے کے لیے اہل حرفہ اور دوکاندار موجود ہوں۔ اسی سلسلہ میں جمعہ کے متعلق دوسرے مسائل بھی آگئے ہیں، مثلاً احتیاط الظہر، اور ایک ہی شہر میں متعدد مقامات پر جمعہ کی اقامت، اور خطبہ کی زبان وغیرہ۔

**نظام عمل** | تالیف مولانا عبد الحامد قادری، بدایونی۔ ضخامت ۲۲۵ صفحات۔ قیمت عـہ

ملنے کا پتہ:۔ محمد عابد القادری۔ دار التصنیف، مولوی محلہ بدایوں۔

اس کتاب میں مؤلف نے آیات و احادیث سے مسلمان کی زندگی کا پورا نظام عمل پیش کیا ہے۔ عقائد، عبادات، اخلاق، معاملات، قوانین معاشرت، اصول سیاست، نظم معیشت غرض اسلامی

زندگی کے اکثر و بیشتر پہلو اس میں بیان کر دیے گئے ہیں، اور جگہ جگہ مسائل اسلامی کو سمجھانے کے لیے دلچسپ اور دل نشین تشریحات بھی کی گئی ہیں۔ زبان نہایت سلیس اور عام فہم ہے۔ مسائل کے بیان میں فقیہانہ اور متکلمانہ بحثوں سے اجتناب کر کے صرف وہی معلومات پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے جن کی عام مسلمانوں کو ضرورت ہے۔ ترتیب کتاب میں اصلاح و ترقی کی بہت گنجائش تھی۔ مگر مولف کی یہی خدمت کیا کچھ کم قابل داد ہے کہ انہوں نے کثرت مشاغل کے باوجود ایک ایسی کتاب مرتب کر دی جو موجودہ حالات میں عامہ مسلمین کی مذہبی رہنمائی کے لیے بہت مفید ہے۔

عباد الله | تالیف مولوی میر محمد صاحب ربانی، مدرس فارسی ہائی اسکول۔ رحیم یار خاں۔ ریاست بہاولپور۔ ضخامت ۸۰ صفحات۔ قیمت درج نہیں۔

مؤلف نے تعلیمات قرآنی کی اشاعت کے لیے تفسیر قرآن کا ایک سلسلہ شروع کیا ہے اور سہولت کے لیے اس کو چھوٹے چھوٹے رسالوں کی صورت میں شائع کرنا چاہتے ہیں۔ زیر نظر رسالہ اس سلسلہ کا پہلا نمبر ہے۔ اس میں سورہ فرقان کے چھٹے رکوع کی تفسیر بیان کی گئی ہے جو وعباد الرحمن یمشون علی الارض ھونا۔ سے شروع ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس رکوع میں مومن کی صفات مفصل بیان فرمائی ہیں۔ مؤلف نے ابتدا میں اس کا لفظی ترجمہ دیا ہے اور پھر ایک ایک صفت کی تشریح کی ہے۔ بیان عام فہم اور موثر ہے۔ اس قسم کے رسالوں کی اشاعت مسلمانوں کے اخلاق و اعمال کی اصلاح کے لیے بہر طور مفید ہے۔

معلم الصلاۃ | تالیف حکیم سید محمد حسن صاحب بخاری۔ کیمبل پور۔ ضخامت ۴۴ صفحات قیمت ۲؍

اس رسالہ میں مؤلف نے ان تمام عبارتوں اور قرآنی سورتوں اور دعاؤں کا سلیس ترجمہ اردو اور پنجابی زبان میں لکھا ہے جو نماز میں پڑھی جاتی ہیں۔ ابتدا میں قرأت کے ابتدائی اصول سمجھائے ہیں۔ پھر تمام عربی عبارات کے الگ الگ الفاظ لکھ کر ان کے نیچے لفظی ترجمہ اور لفظی

ترجمہ کے نیچے با محاورہ ترجمہ درج کیا ہے۔ غیر عربی داں لوگوں کو سمجھ کر نماز ادا کرنے میں یہ کتاب بہت مدد دے سکتی ہے۔

**تحفۂ اسلام** | انجمن رفیق الاسلام گوڈگانوہ ایک مدت سے خاموشی کے ساتھ تبلیغ دین کی خدمت انجام دے رہی ہے۔ اس نے اب تک متعدد رسالے مفت شائع کیے ہیں جو سب کے سب عوام کی رہنمائی کے لیے مفید ہیں۔ زیر نظر رسالہ اس سلسلہ کا چودہواں رسالہ ہے جس میں اسلام کی تعلیمات کا خلاصہ بہت ہی سلیس پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔ اس میں نہ صرف ضروری معلومات درج کی گئی ہیں بلکہ دماغوں کو اپیل کرنے والے دلائل کے ساتھ اسلام کی ہر ہر تعلیم کو سمجھانے کی بھی کوشش کی گئی ہے۔ یہ رسالہ جیبی تقطیع کے ۴۴ صفحات پر ختم ہوا ہے۔ پانچ پیسے کے ٹکٹ بھیج کر طلب کیا جا سکتا ہے۔

**دعائیں** | تالیف مولوی ابوالحسن علی صاحب معلم دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ ضخامت ۲۲ صفحات قیمت ۲ر

اس رسالہ میں مؤلف نے قرآن مجید اور احادیث نبوی سے دعائیں جمع کی ہیں اور ہر دعا کے مقابل اس کا ترجمہ دے دیا ہے۔ دعا درحقیقت عبادت کا مغز اور اس کی جان ہے خدا پرستی اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ بندہ اپنی ہر حاجت میں خدا کی طرف رجوع کرے، اور زندگی کے ہر معاملہ میں اس سے مدد مانگے۔ علاوہ بریں دعا اس نصب العین اور مطمح نظر پر بھی روشنی ڈالتی ہے جو دعا مانگنے والے کے پیش نظر ہو۔ انسان جس قدر بلند خیال اور پاکیزہ خو ہوگا ویسی ہی بلند اور پاک اس کی حاجتیں بھی ہوں گی، اور انہی حاجتوں کا اظہار وہ اپنی دعاؤں میں کرے گا۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے جو دعائیں ہم کو سکھائی ہیں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی کے مختلف احوال میں اٹھتے بیٹھتے اور سوتے جاگتے جو دعائیں اپنے خدا سے مانگی ہیں وہ ایک طرف ہم کو یہ بتاتی ہیں کہ مسلمان کس طرح ہر ہر معاملہ میں خدا کی طرف رجوع کرتا ہے، اور دوسری طرف

تعلیم دی گئی ہے کہ ایک سچے مسلمان کے مقاصد حیات کیا ہیں اور اس کی نگاہ میں کیا چیزیں اہمیت رکھتی ہیں جن کو وہ اپنے مولیٰ کی مدد سے حاصل کرنا چاہتا ہے۔

سبق نحو حصہ دوم | تالیف مولانا حمید الدین فراہی مرحوم ضخامت ۰ ۶ صفحات قیمت ۶/
مدرسۃ الاصلاح سرائے میر

ہم اس کتاب کے حصہ اول پر اس سے پہلے تبصرہ کر چکے ہیں جس میں اسم کی بحث تھی۔ اب یہ دوسرا حصہ بھی شائع ہو گیا ہے جو فعل کے بیان میں ہے۔ حصہ اول پر جو رائے ظاہر کی جا چکی ہے اس پر اب کسی اضافہ کی حاجت نہیں۔

تفسیر آیۃ الیوم اکملت لکم دینکم (۲) وصیت رسول (۳) مسلمانوں پر ایک نظر | یہ تینوں رسائل مولوی سید ابو الحسن علی صاحب معلم دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کی تالیف سے ہیں

پہلے رسالہ میں مؤلف نے تکمیل دین کے معنی سمجھائے ہیں۔ تکمیل دین کے معنی یہ ہیں کہ خدا کو جو کچھ ہدایت دینی تھی اور بندوں کو دین و دنیا کی بہتری کے لیے جس ہدایت کی ضرورت تھی وہ پوری کی پوری دے دی گئی۔ اب اس میں کچھ گھٹانے کی ضرورت ہے نہ بڑھانے کی۔ مسلمان اگر فلاح پا سکتے ہیں تو دین کی پوری تعلیم پر اعتقاد رکھ کر اور عمل کر کے ہی پا سکتے ہیں۔ کمی کریں گے تب بھی نقصان اٹھائیں گے اور زیادتی کریں گے تب بھی نقصان اٹھائیں گے۔ دوسرے رسالہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری وصیتیں جمع کی گئی ہیں اور مسلمانوں کو توجہ دلائی گئی ہے کہ اگر تم کو سرکار سے محبت ہے تو ان وصیتوں کو پورا کرو۔

تیسرے رسالہ میں مؤلف نے بتایا ہے کہ اس زمانہ میں مسلمانوں کو دیکھ کر قلب پر تین اثر پڑتے ہیں۔ پہلی نظر میں حسرت ہوتی ہے کہ یا تو یہ امت کبھی ہزاروں کی تعداد میں تھی، یا اب کروڑوں تک پہنچ چکی ہے اور روئے زمین کے گوشہ گوشہ میں پہنچی ہوئی ہے۔ دوسری نظر میں حیرت طاری ہو جاتی ہے کہ یا تو اس قلیل اور بے سروسامان گروہ کی سطوت کا وہ عالم تھا، یا اب اس عظیم الشان قوم کی کمزوری اس حد کو پہنچ گئی ہے۔ تیسری نظر میں دل پر حسرت چھا جاتی ہے کہ کاش ان بیکار کروڑوں کی بجائے ہی کار آمد ہزاروں اس قوم میں ہوتے۔ تین پیسے کے ٹکٹ بھیج کر تینوں رسالے مفت طلب کیے جا سکتے ہیں۔ ملنے کا پتہ دفتر ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

مشہور مستشرق ڈاکٹر گستاولی بان کی شہرۂ آفاق تصنیف

# تمدن عرب



جو

مدتوں سے نایاب تھی پہلا ایڈیشن ۱۸۹۸ء کی صفحہ بہ صفحہ جامع خصوصیات کے علاوہ

نواب جیون یار جنگ بہادر بی۔ اے بیرسٹر ایٹ لا چیف جسٹس ہائیکورٹ حیدرآباد دکن کے

عالمانہ، مبصرانہ، ناقدانہ، مقدمہ اور فاضل مترجم

## شمس العلماء ڈاکٹر سید علی بلگرامی

مرحوم کے جامع سوانح کے ساتھ نیز (۵) رنگین (۱۲۷) سادہ تصاویر (۳) نقشوں کے ہمراہ

جس کی قیمت پچاس روپے تھی مگر سو روپے میں بھی نہیں ملتی تھی اب

## اعلیٰحضرت فرمانروائے دکن مد ظلہ

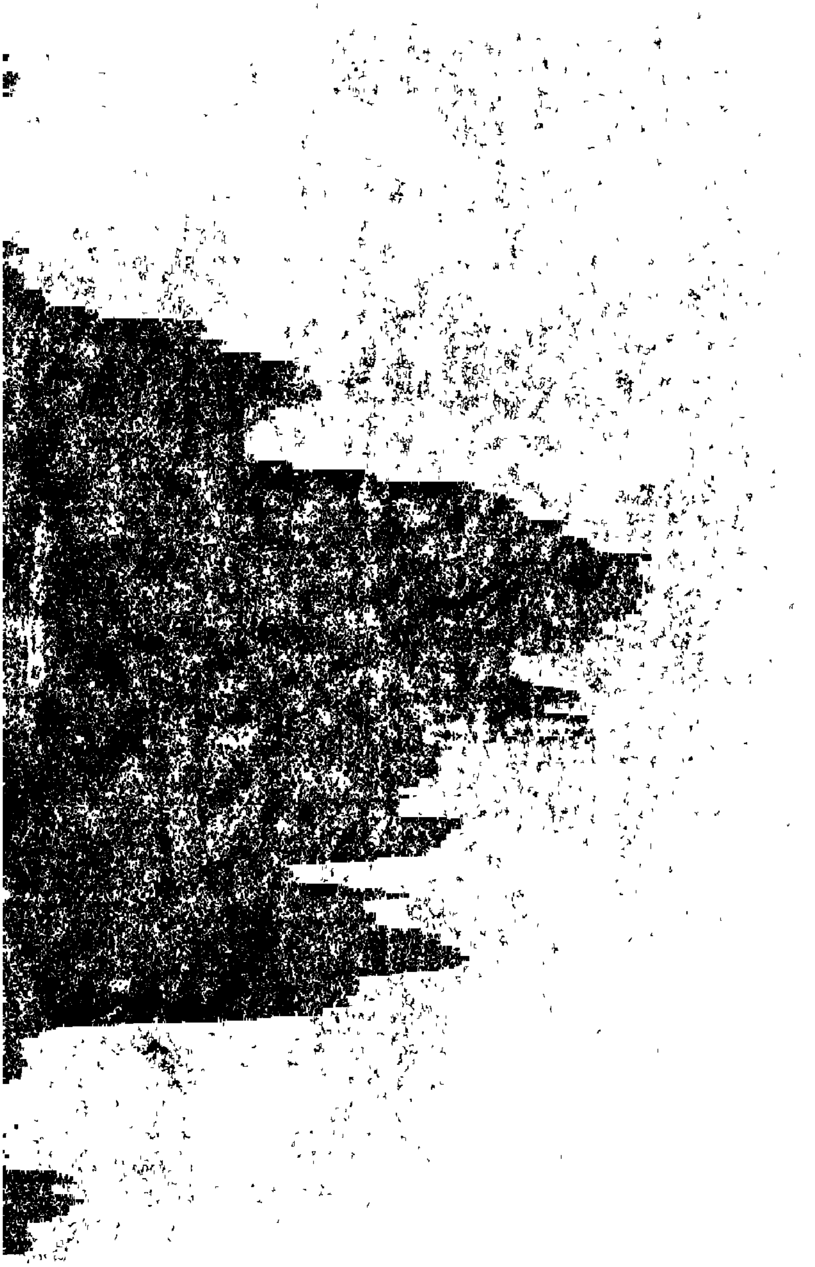
کے جشن سیمین کی شادمانی میں اعظم اسٹیم پریس کی جانب سے شائع ہو چکی ہے

قیمت صرف پچیس روپے سنہری جلد خرچ ڈاک وغیرہ بذمہ خریدار

## عبدالقادر

منیجر گورنمنٹ ایجوکیشنل پرنٹرز و پروپرائٹر اعظم اسٹیم پریس چارمینار حیدرآباد دکن

ملنے کا پتہ اعظم اسٹیم پریس چارمینار



# فہرست مضامین

ماہ ربیع الاول ۱۳۵۶ھ جلد ۱۰ عدد ۳



---

دفتر ترجمان القرآن کو اس رسالہ کے حسب ذیل نمبروں کی ضرورت ہے۔ جو حضرات ان کو بقیمت نکالنا چاہتے ہوں وہ دفتر سے مراسلت کریں۔

محرم، شعبان، رمضان، ۵۲ھ۔

محرم، صفر، ربیع الاول، ربیع الثانی ۵۴ھ

منیجر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# اشارات

کئی مہینے سے پرچہ بہت تاخیر سے شائع ہو رہا ہے۔ خریداروں کی شکایات جس قدر بڑھتی جاتی ہیں میری شرمندگی بھی اسی قدر بڑھ رہی ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ تاخیر کے جو اسباب ہیں اُن کا علاج میرے اختیار میں نہیں۔ تاوقتیکہ رسالہ کے ہمدرد اور قدرشناس میری اعانت نہ کریں، میں اِن مشکلات کو دفع نہیں کر سکتا جن کی وجہ سے اس کی زندگی خطرہ میں پڑ گئی ہے۔ اگر یہ کوئی تجارتی رسالہ ہوتا اور میں نے اپنی ذاتی غرض کے لیے اس کو جاری کیا ہوتا تو بلاشبہ اس کو چلانے یا نہ چلانے کی ذمہ داری تمام تر میری ذات پر ہوتی۔ قوم کو یہ کہنے کا حق تھا کہ ہمیں تمہاری مشکلات سے کیا بحث۔ چیز اچھی دوگے اور وقت پر دوگے، خرید لیں گے، نہ دوگے نہ خریدیں گے۔ لیکن شاید یہ بات میں کسی خودستائی و انکسار کے بغیر کہہ سکتا ہوں کہ ترجمان القرآن سے میرا کوئی ذاتی مفاد وابستہ نہیں، بلکہ پوری قوم کا مفاد وابستہ ہے۔ گو اپنی حد تک میں اپنا فرض سمجھ کر ہی اس کو چلا رہا ہوں، اور اپنے آپ ہی کو اس کا ذمہ دار سمجھتا ہوں، مگر کم از کم مجھے یہ کہنے کا حق تو ضرور ہے کہ جس طرح اس خدمت کو انجام دینا میرا فرض ہے، اسی طرح مجھے اس کی انجام دہی کے قابل بنانا قوم کا بھی فرض ہے۔ میں اپنے ان دوستوں اور ہمدردوں کا دل سے شکرگزار ہوں جنہوں نے رسالے کی اشاعت بڑھانے میں میری مدد کی ہے، لیکن محض چند افراد کی کوششوں سے کیا ہو سکتا ہے، ضرورت تو اجتماعی کوشش کی ہے۔ اب ایسا وقت آگیا ہے کہ اگر اس پرچہ کو زندہ رکھنا ہے اور فی الواقع اس کی زندگی کی کوئی ضرورت محسوس کی جاتی ہے تو اس کے تمام ہمدردوں کو خاص طور پر توسیع اشاعت

کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔ آئندہ پانچ مہینوں میں اس کی زندگی اور موت کا فیصلہ ہونا ہے اگر خریداروں کی تعداد میں کافی اضافہ نہ ہوا، تو میں عرض کیے دیتا ہوں کہ محض ساڑھے تین سو خریداروں سے اس معیار کے پرچے کو چلانا میری قدرت سے باہر ہے۔

---

اس رسالہ میں اب تک متعدد مضامین ایسے شائع ہو چکے ہیں جن کا محض ایک مرتبہ رسالہ میں شائع ہو جانا کافی نہیں، بلکہ انہیں مستقل کتابی صورت میں طبع کرنے اور کثرت سے پھیلانے کی ضرورت ہے۔ مثال کے طور پر چند مضامین کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے جن کے عنوانات دیکھ کر ناظرین کو ان کی اہمیت یاد آجائے گی۔

اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی۔

قومیت اسلام (فتنۂ وطن پرستی کا رد)

قرآن اور حدیث (فتنۂ انکار حدیث کا رد)

رسالت (ایمان بالرسالت کی اہمیت اور ان بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ جو رسالت کے باب میں پائی جاتی ہیں)

اسلام اور ضبط ولادت

عبادت

حقوق الزوجین

سود

پردہ

ان کے علاوہ اشارات کے زیر عنوان جو کچھ لکھا گیا ہے اگر اس کے بھی متعدد مجموعے تالیف ہو کر الگ مستقل مرتب کر کے شائع کیے جائیں تو یقیناً مفید ثابت ہوں گے۔ ممکن ہے کہ قدردانوں میں کسی کو ہمت

اختلاف نہ ہو۔ اور ایسا کون ہے جس کی ہر بات سے ہر شخص متفق ہو جائے؟ لیکن اصول کی حد تک میں سمجھتا ہوں کہ جن لوگوں نے مذکورۂ بالا مضامین کو پڑھا ہے وہ بالاتفاق تسلیم کریں گے کہ میں نے ایک صحیح اور متوسط راستہ کی طرف مسلمانوں کو دعوت دی ہے، اور اسلامی تعلیمات کی تشریح و تفہیم میں وہ طریقہ اختیار کیا ہے جو افراط و تفریط سے پاک اور ضروریات زمانہ کے مطابق ہے۔ دورِ جدید کی گمراہیوں کے استیصال اور مسلمانوں کے بگڑے ہوئے نقطۂ نظر کی اصلاح اور ان کے اندر دین کی سمجھ اور عمل کی روح اور اطاعت کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے ان مضامین کی اشاعت ضروری ہے، اور حالات جس قدر زیادہ بگڑتے جاتے ہیں اسی قدر یہ ضرورت بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ میں ایک مدت سے اس ضرورت کو محسوس کر رہا تھا۔ مگر میری خواہش یہ تھی کہ مجھے خود اپنی قوت بازو سے اس کام کو انجام دینے کی توفیق میسر آ جائے اور کسی سے مدد مانگنے کی حاجت نہ ہو۔ اسی انتظار میں مہینوں پر مہینے اور سال پر سال گزر گئے۔ اب دیکھتا ہوں کہ ایک طوفان عظیم مسلمانوں کے سر پر آ پہنچا ہے، اور اس طوفان سے ان کا بسلامت گزر جانا بغیر اس کے ممکن نہیں کہ ان کے اندر دین کی سمجھ اور طریق اسلام و طریق کفر و فسق کی تمیز پیدا کی جائے۔ اسی خطرہ نے مجھ کو اپنی ہٹ سے باز آ جانے پر مجبور کر دیا ہے اور آج میں دلی کراہت کے ساتھ اس کام میں اپنی قوم کے دولتمندوں سے مدد مانگتا ہوں۔

---

اجتماعی مفاد کے لیے اجتماعی کوشش ناگزیر ہے۔ تنہا ایک شخص اپنی قوت اور اپنے ذرائع سے کوئی بڑا کام نہیں کر سکتا۔ خود ہمارے آقا و مولیٰ علیہ وعلیٰ آلہ التحیۃ والسلام نے بھی تبلیغ دین اور جہاد فی سبیل اللہ میں اپنی امت سے مدد لی ہے۔ پس اگر ان کی ملت کا ایک خادم اسی کام کے لیے قوم سے مدد مانگے تو یہ کوئی عیب نہیں۔ لیکن جو چیز آج تک مجھ کو یہ طریقہ اختیار کرنے سے روکتی رہی، اور جس کی وجہ سے آج بھی میں اس میں کراہیت محسوس کرتا ہوں وہ صرف یہ ہے کہ ایک طرف قومی کارکنوں نے

حرکات سے نہ صرف اپنا بلکہ قومی خدمت کا بھی اعتبار کھو دیا ہے اور دوسری طرف آج کل مسلمانوں کے حوصلے پست اور اخلاق ان سے بھی زیادہ پست ہو گئے ہیں۔ اول تو خدا کی راہ میں صرف کرنے کا خالص جذبہ ہی ان میں برائے نام باقی رہ گیا ہے۔ پھر اگر وہ اس راہ میں کچھ نکالتے بھی ہیں تو دل کی تنگی ان کے نفس میں ہزار قسم کی بدگمانیاں پیدا کرتی ہے اور اس پر اخلاق کی یہ حالت ہے کہ اپنے ایک بھائی کو بے ایمان، خائن، چور کہہ دیتے ہیں ان کو ذرا تامل نہیں ہوتا۔ پچھلے چند برسوں میں پبلک فنڈ سے کام کرنے والوں کی جو رسوائیاں ہو چکی ہیں ان کا حال اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہوں ایسی حالت میں کسی عام چندہ کی ذمہ داری اپنے سر لیتے ہوئے میری روح کانپتی ہے۔ مگر چونکہ کام ضروری ہے اور وقت کا تقاضا شدید ہے اس لیے بڑے تامل اور کافی غور و خوض کے بعد میں نے ایک تجویز سوچی ہے اور اس کو یہاں بیان کیے دیتا ہوں۔

---

تجویز یہ ہے کہ ترجمان القرآن کے ناظرین میں سے جو اصحاب ذی استطاعت ہوں وہ اس میں صرف سو سو روپے یکمشت دے دیں۔ اگر پچیس تیس آدمی بھی ایسے نکل آئیں تو ڈھائی تین ہزار کی رقم جمع ہو سکتی ہے جس سے مذکورۂ بالا رسائل بآسانی طبع کرا لیے جائیں گے۔ ان رسالوں کی قیمت لاگت سے دس فی صدی زیادہ رکھی جائے گی اور ان کی فروخت سے جو کچھ وصول ہوگا اس کو انہی رسالوں کی دوبارہ اشاعت اور ایسے ہی دوسرے رسالوں کی اشاعت کے لیے مخصوص رکھا جائیگا۔ نہ میں خود اس کو استعمال کروں گا، نہ ترجمان القرآن میں صرف کروں گا۔ تمام حسابات باقاعدہ رکھے جائیں گے اور ہر سہ ماہی یا چھٹے مہینے معطی صاحبان کے پاس بھیج دیے جائیں گے۔ کسی معطی کا نام شائع نہ کیا جائے گا۔ اس لیے کہ مسلمان کی خیرات کا اشتہار دینا دراصل اس کے روپے کو ضائع کرنا ہے اور ایسے مال میں کوئی برکت بھی نہیں ہوتی جس میں ریا اور نمائش کا جذبہ شامل ہو جائے۔ صرف

وہی حضرات اس کام میں حصہ لیں جو محض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے طالب ہوں اور آخرت کے ثواب کا یقین رکھتے ہوں۔ چھوٹے چھوٹے متفرق چندے شکریہ کے ساتھ واپس کر دیے جائیں گے۔ اس لیے کہ میں معطیوں کی تعداد محدود رکھنا چاہتا ہوں۔ پچیس تیس آدمیوں کو حساب آسانی سے دے سکوں گا مگر ہزار آدمیوں کو حساب دینا میرے بس کا کام نہیں۔

---

ممکن ہے کہ بعض لوگوں کو لاگت سے دس فی صدی زیادہ قیمت رکھنے پر اعتراض ہو، لہٰذا رفع شک کے لیے یہ عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ ترجمان القرآن میں ابھی اور بہت سے مضامین شائع ہونے والے ہیں جو نہایت اہم مسائل سے تعلق رکھتے ہیں۔ عنقریب ایک مضمون کا سلسلہ شروع ہونے والا ہے جس میں کمیونزم پر مفصل تنقید ہوگی اور اصول اسلام سے اس کا تقابل کیا جائے گا۔ اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی کی تکمیل بھی کرنی ہے۔ اب تک اس کے صرف تین باب لکھے گئے ہیں۔ دو باب ابھی باقی ہیں اور وہ موجودہ زمانہ کی ضروریات کے لحاظ سے خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ان میں اسلام کے نظام اجتماعی کا نقشہ اپنی تمام تفصیلات کے ساتھ پیش کیا جائے گا جس سے اسلامی زندگی کی پوری تصویر سامنے آجائے گی اور ایک ہی مرقع میں لوگ دیکھ لیں گے کہ یہاں اخلاق، معاشرت، معیشت، سیاست، عدل و قانون، اور بین الاقوامی تعلقات کے مختلف شعبوں کو کس شکل میں، کس طریقہ سے اور کس تناسب کے ساتھ رکھا گیا ہے۔ یہ اور ایسی ہی دوسری چیزیں جو آئندہ نکلنے والی ہیں، ان کی اشاعت کا بھی کوئی بندوبست ہونا چاہیے۔ بجائے اس کے کہ بار بار لوگوں سے اعانت کی اپیل کی جائے، میں زیادہ مناسب یہ سمجھتا ہوں کہ انہی رسالوں کی قیمت میں لاگت پر اتنا اضافہ کر دیا جائے کہ اس سے دوسرے رسالوں اور کتابوں کی اشاعت کے لیے سرمایہ جمع ہو جائے۔ اس طرح چند اشخاص پر زیادہ بار پڑنے کے بجائے بہت سے اشخاص پر تھوڑا تھوڑا بار پڑے گا، اور نشر و تبلیغ کا

سلسلہ وسیع کرنے میں زیادہ آسانی ہوگی۔

---

میں جانتا ہوں کہ مسلمانوں میں دین کے لیے ایثار و قربانی کا جو تھوڑا بہت جذبہ باقی ہے وہ مالداروں سے زیادہ غریبوں میں پایا جاتا ہے۔ اس بنا پر وہ لوگ شکایت کریں گے جو روپے دینے کی استطاعت نہیں رکھتے۔ وہ کہیں گے کہ تم اس سعادت کو مالداروں کے لیے مخصوص کرنا چاہتے ہو، اور ہمیں محض اس بنا پر محروم کر رہے ہو کہ ہم مالدار نہیں ہیں۔ لیکن درحقیقت میں ان کو محروم کرنا نہیں چاہتا۔ ان کے لیے اس سعادت میں حصہ لینے کی ایک دوسری صورت ہے، اور وہ یہ ہے کہ وہ حسب حیثیت ان کتابوں اور رسالوں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں خرید کر قوم کے ان طبقات تک پہنچانے کی کوشش کریں جن کی اصلاح مقصود ہے۔ میں دراصل ایک شفاخانہ قائم کر رہا ہوں۔ دین داروں میں سے جو مالدار ہیں وہ اس شفاخانہ کے قائم کرنے میں حصہ لیں، اور ان میں سے جو غریب ہیں وہ اس کی دوائیں مریضوں تک پہنچانے میں حصہ لیں۔ اصلی سعادت یہ ہے کہ آپ کے دل میں قومی امراض کے استیصال اور شفائے روحانی کے ایصال کا جذبہ ہو۔ آپ کا دل ایک ایسی ماں کا سا دل ہونا چاہیے جو اپنے بچوں کو بیمار دیکھ کر بے چین ہو جاتی ہے، اور ان کے علاج میں کسی امکانی کوشش اور کسی بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہیں کرتی۔ آپ جن لوگوں میں رہتے ہیں، جن سے ملتے جلتے ہیں، جن کے ساتھ آپ کو کسی طرح سابقہ پیش آتا ہے، ان میں دیکھیے کہ کون کون بیمار ہیں، اور کس کس مرض کے بیمار ہیں۔ جو شخص جس مرض میں مبتلا ہو اسی مرض کی دوا اس کو دیجیے۔ زندقہ و الحاد کا مریض ہو، اسے "اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی" پڑھائیے۔ وطن پرستی کا بیمار ہو، اس کو "قومیت اسلام" دیجیے۔ کمیونزم کا حملہ کسی پر ہو گیا ہو، اس کا علاج "سود" کے مضمون سے کیجیے۔ آزادی نسواں کی بیماری میں "پردہ" کی خوراک استعمال کرائیے۔ فرنگیت کے بیماروں کو "اشارات" کے مختلف مجموعے

دیجیے غرض جتنی دبائیں آج کل آپ کی قوم میں پھیلی ہوئی ہیں ان کو مٹانے پر کمربستہ ہوجائیے اور اپنے وقت، اپنے مال اور اپنی محنت کا کچھ حصہ خدا کے دین اور اس کے رسول کی امت کے لیے بھی نکالیے کہ ان چیزوں پر محض آپ کے نفس ہی کا حق نہیں ہے بلکہ خدا اور اس کے رسول کا بھی حق ہے آپ خدا کے ثواب کی خواہش رکھتے ہیں تو خدا کا ثواب اتنا سستا نہیں کہ محض دس پانچ روپے دے کر خرید لیا جائے۔ اس کے لیے جہاد کی ضرورت ہے، اور جہاد یہی ہے کہ آج رسول اللہ کے گھر میں جو آگ لگ رہی ہے اس کو بجھانے کی کوشش کیجیے۔

---

ان صفحات میں اسلامی ہند کے مستقبل پر جو بحث شروع کی گئی ہے اس کا سلسلہ آگے بڑھانے سے پہلے ایک بات کی توضیح ضروری معلوم ہوتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اس بحث میں ہمارے مخاطب صرف وہی لوگ ہیں جو مسلمان کی حیثیت سے جینا اور مرنا چاہتے ہیں۔ اور جن کی نگاہ میں زندگی کے تمام مسائل سے زیادہ اہم اور اقدم سوال یہ ہے کہ ہندوستان میں اسلام نہ صرف قائم اور باقی رہے، بلکہ اس کو عزت اور طاقت حاصل ہو۔ باقی رہے وہ لوگ جو وقت کے مسائل کو صرف ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے دیکھتے ہیں، اور جن کی نگاہ میں مسلمان ہونا یا نہ ہونا کوئی اہمیت نہیں رکھتا، اور جو سیاسی و معاشی فلاح کو دوسرے تمام مسائل پر مقدم رکھتے ہیں، تو وہ سرے سے ہمارے مخاطب ہی نہیں ہیں۔ لہٰذا ان کا ہم سے بحث کرنا بالکل فضول ہے۔ ہمارے اور ان کے درمیان کوئی مشترک بنیاد نہیں ہے۔ وہ ایک جہاز کے مسافر ہیں۔ اور ہم دوسرے جہاز کے۔ ان کو صرف ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے سیاسی آزادی اور معاشی استقلال کی ضرورت ہے، عام اس سے کہ مسلمان رہیں یا نہ رہیں۔ بخلاف اس کے ہمارے لیے مسلمان رہنے کا سوال ہی اصل سوال ہے، اور ہندوستان کی آزادی ہم اس لیے اور اس شرط پر چاہتے ہیں کہ وہ اسلا

سرزمین پر اسلام کی عزت قائم کرنے میں مددگار ہو۔ پس جو مسلمان سیاسی معاملات میں حصہ لے رہے ہیں ان کے درمیان سب سے پہلے یہی امتیاز قائم ہونا چاہیے کہ وہ ان دونوں راستوں میں سے کس راستے کے مسافر ہیں۔ جو لوگ "ہندوستانیت" کی راہ پر ہیں وہ اپنی راہ پر جائیں، ہمیں ان سے کوئی واسطہ نہیں ہم ان سے صرف اتنا کہیں گے کہ براہ کرم منافقت چھوڑ دو اور اپنی پوزیشن صاف طور پر ظاہر کردو تاکہ کوئی دھوکا نہ کھائے۔ اور جو لوگ "اسلامیت" کی راہ پر ہیں وہ ہمارے ہم سفر ہیں ہماری اور ان کی منزل مقصود ایک ہے بمعرض بحث میں صرف یہ سوال ہے کہ اس منزل کی طرف جانے کے لیے صحیح راستہ کونسا ہے۔ وہ جس راستہ کو صحیح سمجھتے ہیں اس کا صحیح ہونا ثابت کردیں، ہم دل و جان سے اُن کے ساتھ ہیں۔ لیکن اگر وہ راستہ غلط ہے تو پھر اخلاص کا اقتضا یہ ہے کہ وہ اُس راستہ کی طرف آئیں جس کا صحیح ہونا ثابت کر دیا جائے کم از کم دین و ملت کے معاملہ میں مسلمان کے اندر نفسانیت اور کبر و عجب نہ ہونا چاہیے۔ کسی حق پرست کا یہ کام نہیں کہ وہ کسی طریقہ پر صرف اس لیے اڑا رہے کہ وہ اس پر چل پڑا ہے اور اب پلٹنے میں اس کی عزت (جھوٹی عزت) کو ٹھیس لگتی ہے۔

چند غلط فہمیاں تھیں جن کو دور کرنے کے لیے اس توضیح کو آج کی صحبت کا دیباچہ بنانا ضروری سمجھا گیا۔ اب ہم کو اس مقام سے چلنا ہے جہاں سے پچھلی صحبت کا سلسلہ منقطع ہوا تھا۔

---

ہماری منزل مقصود جیسا کہ اشارۃً اوپر عرض کر دیا گیا، صاف اور واضح طور پر یہ ہے کہ ہندوستان میں اسلام نہ صرف قائم رہے بلکہ عزت اور طاقت والا بن جائے۔ آزادی ہند ہمارے نزدیک مقصود بالذات نہیں۔ بلکہ اس اصل مقصد کے لیے ایک ضروری اور ناگزیر وسیلہ ہونے کی حیثیت سے مقصود ہے۔ ہم صرف اُس آزادی کے لیے لڑنا چاہتے ہیں، بلکہ صحیح تر یہ ہے کہ اپنے مذہب کی رو سے لڑنا فرض جانتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہو کہ یہ ملک کلیۃً نہیں تو ایک بڑی حد تک دارالاسلام بن جائے۔

لیکن اگر آزادی ہند کا نتیجہ یہ ہو کہ یہ جیسا دار الکفر ہے ویسا ہی رہے یا اس سے بدتر ہو جائے تو ہم بلا کسی مداہنت کے صاف صاف کہتے ہیں کہ ایسی آزادی وطن پر ہزار مرتبہ لعنت ہے، اور اس کی راہ میں بولنا، لکھنا، روپیہ صرف کرنا، لاٹھیاں کھانا اور جیل جانا سب کچھ حرام قطعی حرام ہے۔

یہ ایسی صاف بات ہے جس میں دو رائیں ہونے کی کوئی گنجائش ہی نہیں خصوصاً جو شخص قرآن اور سنت پر نظر رکھتا ہے اور منافق نہیں ہے وہ تو اس کے برحق ہونے میں چون و چرا نہیں کر سکتا۔

---

منزلِ مقصود کا انتہائی مقام یعنی ہندوستان کو کلیۃً دار الاسلام بنانا تو اتنا بلند مقام ہے کہ آج کل کا کم ہمت مسلمان اس کا قصد کرنے کی جرأت اپنے اندر نہیں پاتا۔ خیر جانے دیجیے اس کو اس سے فروتر درجے میں جس مقصد کے لیے ہم کو لڑنا چاہیے وہ کم سے کم یہ ہے کہ ہندوستان نہ تو بیرونی کفار کے تسلط میں رہے اور نہ اندرونی کفار کے کامل تسلط میں چلا جائے، بلکہ آزاد ہو کر شبہ دار الاسلام بن جائے۔

اب آگے بڑھنے سے پہلے اس بات کو سمجھ لیجیے کہ شبہ دار الاسلام سے کیا مراد ہے۔ اگر کوئی شخص اس کے معنی یہ سمجھتا ہے کہ مسلمانوں کے سے نام رکھنے والوں کو اسمبلیوں اور کونسلوں میں نشستیں اور سرکاری عہدے مل جائیں اور ہندوستان کے معاشی ثمرات میں ان کو بھی متناسب حصہ ملے، اور آزاد ہندوستان کی تمام عمرانی ترقیات سے (خواہ وہ ترقیات کسی صورت میں ہوں) انھیں بلا امتیاز مستفید ہونے کا موقع ملے تو ہم کہیں گے کہ وہ غلطی پر ہے۔ ہم جس چیز کو شبہ دار الاسلام سمجھتے ہیں، اور جو چیز درحقیقت اس نام سے موسوم ہو سکتی ہے وہ یہ ہے کہ ہندوستان کی حکومت میں ہم محض "ہندوستانی" ہونے کی حیثیت سے نہیں بلکہ "مسلمان" ہونے کی حیثیت سے حصہ دار ہوں، اور ہمارا یہ حصہ اس حد تک طاقتور ہو کہ:-

(۱) ہم اپنی قوم کی تنظیم اصولِ اسلامی کے مطابق کر سکیں یعنی ہم کو حکومت کے ذریعہ سے اتنی قوت

حاصل ہو کہ ہم مسلمانوں کے لیے اسلامی تعلیم و تربیت کا انتظام کر سکیں، ان کے اندر غیر اسلامی طریقوں کے رواج کو روک سکیں، ان پر اسلامی احکام جاری کر سکیں، اور اپنی قوم میں جو اصلاحات ہم خود اپنے طریق پر نافذ کرنے کی ضرورت سمجھیں ان کو خود اپنی طاقت سے نافذ کر سکیں، مثلاً زکوٰۃ کی تحصیل، اوقاف کی تنظیم، قضا شرعی کا قیام، قوانین معاشرت کی اصلاح وغیرہ۔

(۲) ہم اس ملک کے نظم و نسق اور اس کی تمدنی و معاشی تعمیر جدید میں اپنا اثر اس طرح استعمال کر سکیں کہ وہ ہمارے اصول تمدن و تہذیب کے خلاف نہ ہو۔ یہ ظاہر ہے کہ وسیع پیمانہ پر تمام ملک کی اجتماعی زندگی اور معاشی تنظیم اور تدبیر مملکت کی مشین جو شکل بھی اختیار کرے گی اس کا اثر دوسری قوموں کی طرح ہماری قوم پر بھی پڑے گا۔ اگر یہ تعمیر جدید اس نقشہ پر ہو جو اپنے اصول و فروع میں کلیتہً ہماری تہذیب کی ضد ہے تو ہماری زندگی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ ایسی صورت میں ہمارے لیے ناگزیر ہو جائیگا کہ یا تو ہم تمدن و معیشت کے اعتبار سے غیر مسلم بن جائیں، یا پھر ہماری حیثیت اس ملک میں تمدنی و معاشی اچھوتوں کی سی ہو کر رہ جائے۔ اس نتیجہ کو صرف اسی طرح روکا جا سکتا ہے کہ ہند جدید کی تشکیل پر ہم اپنا اثر کافی قوت کے ساتھ ڈال سکیں۔

(۳) ہندوستان کی سیاسی پالیسی میں ہمارا اتنا اثر ہو کہ اس ملک کی طاقت کسی حال میں بیرون ہند کی مسلمان قوموں کے خلاف استعمال نہ کی جا سکے۔

---

یہ مقصد جس کی ہم نے توضیح کی ہے وہ کم سے کم چیز ہے جس کے لیے ہم کو لڑنا چاہیے۔ مدافعت کا پہلو صرف کمزور اختیار کرتے ہیں اور ان کا آخری انجام شکست ہے۔ اگر آپ اپنا مقصد صرف اُن حقوق کے حصول کو بناتے ہیں جن کا اطمینان کانگریس نے اپنے "بنیادی حقوق" والے ریزولیوشن میں دلایا ہے تو آپ دھوکے میں ہیں۔ آپ کی تہذیب، زبان، پرسنل لا، اور مذہبی حقوق کا تحفظ بھی (جسے آپ کافی سمجھے بیٹھے

ہیں؛ دراصل اس کے بغیر ممکن نہیں کہ آپ فارورڈ پالیسی اختیار کرکے حکومت کی تشکیل میں طاقت ور حصہ دار بننے کی کوشش کریں۔ اس میں اگر آپ نے غفلت کی اور حکومت کا اقتدار اُن لوگوں کے ہاتھ میں چلا گیا جو مسلمان نہیں ہیں تو یقین رکھیے کہ کوئی کانسٹی ٹیوشن آپ کو من حیث المسلم ہلاک ہونے سے نہ بچا سکے گا۔ انگریزی حکومت نے بھی آپ کے بہت سے حقوق تسلیم کر رکھے ہیں، مگر غور کیجیے وہ کیا چیز ہے جس نے آپ کو خود اپنے حقوق سے دست بردار کرا دیا؟ انگریز نے آپ سے کبھی نہیں کہا کہ اپنی زبان میں لکھنا پڑھنا بولنا سب چھوڑ دو اور میری زبان اختیار کرلو؟ پھر کیا چیز ہے جس نے آپ کی قوم کے ہزاروں لاکھوں افراد کو اپنی زبان سے بیگانہ بنا دیا اور انگریزی کا آپنا غلام بنایا کہ وہ اپنے گھروں میں اپنی بیویوں اور بچوں تک سے انگریزی بولنے لگے؟ انگریز نے آپ سے کبھی نہیں کہا کہ تم نماز روزہ چھوڑ دو، زکوٰۃ نہ دو، شراب پیو، اور اپنے مذہب کے سارے احکام کو نہ صرف بالائے طاق رکھ دو بلکہ ان کا مذاق تک اڑاؤ۔ پھر کس چیز نے آپ کی قوم کے لاکھوں کروڑوں افراد کو ایک صدی کے اندر اپنے دین و ایمان سے عملاً منحرف کر ڈالا؟ انگریز نے آپ سے کبھی یہ مطالبہ نہیں کیا تھا کہ اپنی معاشرت بدل دو، اپنا لباس بدل دو، اپنے مکانوں کے نقشے بدل دو، اپنے آداب و اخلاق بدلو، اپنی صورتیں بگاڑو، اپنے بچوں کو انگریز بناؤ، اپنی عورتوں کو میم صاحب بناؤ، اپنے تمدن اور اپنی تہذیب کے سارے اصول چھوڑ کر پوری زندگی ہمارے نقشے پر ڈھال لو۔ پھر وہ کونسی چیز ہے جس نے آپ سے یہ سب کچھ کرا ڈالا؟ ذرا دماغ پر زور ڈال کر سوچیے۔ کیا اس کا سبب غیر مسلم اقتدار کے سوا اور بھی کچھ ہے؟ ڈھائی تین لاکھ انگریز چھ ہزار میل دور سے آتے ہیں۔ آپ سے الگ تھلگ رہتے ہیں۔ قصداً آپ کے اندرونی معاملات اور آپ کے تمدنی و معاشرتی مسائل میں دخل دینے سے پرہیز کرتے ہیں۔ پھر بھی ان کے اقتدار کا یہ اثر ہوتا ہے کہ بیرونی جبر سے نہیں بلکہ اندرونی انقلاب سے آپ کی کایا پلٹ ہو جاتی ہے اور آپ خود بخود اپنے اُن بنیادی اور فطری حقوق تک سے دست بردار ہو جاتے ہیں جن کو کوئی حکومت اپنی رعایا سے نہیں چھینتی اور نہیں چھین سکتی۔ اب ذرا اندازہ لگائیے کہ اگر آزاد ہندوستان کی حکومت غیر اسلامی نقشہ

پر بن گئی اور اس کا اقتدار ان ہندوستانیوں کے ہاتھ میں چلا گیا جو مسلمان نہیں ہیں، تو اس کے اثرات کیا ہوں گے؟ وہ انگریزوں کی طرح قلیل التعداد بھی نہیں۔ آپ سے الگ تھلگ رہنے والے بھی نہیں۔ اور پھر غیر ملکی بھی نہیں ہیں کہ سیاسی پالیسی ان کو تمدنی و معاشرتی مسائل میں دخل دینے سے روکے۔ ان کے اقتدار میں آپ کے اندرونی تحول و انقلاب کا کیا حال ہوگا اور کانسٹی ٹیوشن کی کون کونسی دفعات آپ کو خود اپنے حقوق کی پامالی سے روک سکیں گی؟

---

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، مسلمانوں کے لیے ایسی آزادیٔ وطن کے لیے لڑنا تو قطعی حرام ہے جس کا نتیجہ انگلستانی غیر مسلموں سے ہندوستانی غیر مسلموں کی طرف اقتدار حکومت کا انتقال ہو۔ پھر ان کے لیے یہ بھی حرام ہے کہ وہ اس انتقال کے عمل کو بیٹھے ہوئے خاموشی سے دیکھتے رہیں، اور ان کے لیے یہ بھی حرام ہے کہ اس انتقال کو روکنے کے لیے انگلستانی غیر مسلموں کا اقتدار قائم رکھنے میں معاون بن جائیں۔ اسلام ہم کو ان تینوں راستوں پر جانے سے روکتا ہے۔ اب اگر ہم مسلمان رہنا چاہتے ہیں اور ہندوستان میں اسلام کا وہ حشر دیکھنے کے لیے تیار نہیں ہیں جو اسپین اور سسلی میں ہو چکا ہے تو ہمارے لیے صرف ایک ہی راستہ باقی ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم آزادیٔ ہند کی تحریک کا رخ حکومت کفر کی طرف سے حکومت حق کی طرف پھیرنے کی کوشش کریں، اور اس غرض کے لیے ایک ایسی سرفروشانہ جنگ پر کمر بستہ ہو جائیں جس کا انجام یا کامیابی ہو یا موت۔

یا تن رسد بجاناں یا جاں زتن برآید

---

اوپر کی سطروں میں ہمارا نصب العین پوری طرح واضح ہو چکا ہے۔ ہم آزادیٔ ہند کے مخالف نہیں ہیں، بلکہ ہر آزادی خواہ سے بڑھ کر اس کے خواہشمند ہیں اور اس کے لیے جنگ کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں لیکن

وطن پرست کے نصب العین سے ہمارا نصب العین مختلف ہے۔ وہ صرف ایسی آزادی چاہتا ہے جس کا نتیجہ "ہندوستانی" کی نجات ہو۔ اور ہم وہ آزادی چاہتے ہیں جس کا نتیجہ "ہندوستانی" کے ساتھ "مسلم" کی نجات بھی ہو۔

نصب العین کی اس تعیین کے بعد ہمیں جس سوال پر اپنی تمام قوتِ فکر صرف کر دینی چاہیے وہ طریقِ جنگ کا سوال ہے۔ یہ سوال نظریات سے حل کرنے کا نہیں ہے، بلکہ اس کا تعلق عملی سیاست سے ہے۔ ہم کو اپنے مقصد تک پہنچنے کے لیے ایسی ہی تدبیریں سوچنی ہیں جن کے ذریعہ سے کامیابی کے حصول کی زیادہ سے زیادہ امید کی جا سکتی ہو۔ سب سے زیادہ پریشانی کا سبب یہ ہے کہ بہت قیمتی وقت ہم کھو چکے ہیں، اور بہت ہی کم وقت اب باقی ہے۔ جو خطرات آج ہم کو چونکا رہے ہیں وہ دراصل ۱۹ء میں پوری طرح نمایاں ہو چکے تھے اور ۳۰ء و ۳۱ء میں تو ایک اندھا بھی ان کو دیکھ سکتا تھا۔ جو کچھ آج ہم سوچ رہے ہیں اس کو سوچنے اور عمل شروع کر دینے کا اصلی وقت وہ تھا۔ مگر افسوس کہ ہمارے سردار محض فضول حرکات میں اپنا وقت گنواتے رہے، اور انہوں نے اپنی قوم کو سنبھالنے کے لیے کچھ بھی نہ کیا۔ اب کہ طوفان ہمارے سر پر آ چکا ہے، ہم بہت سی اُن تدبیروں کو چھوڑ دینے پر مجبور ہیں جو کارگر ہیں مگر دیر طلب ہیں۔ ہمیں اب وہ طریقے اختیار کرنے چاہییں جو تھوڑے وقت میں کوئی مفید نتیجہ پیدا کر سکیں۔

---

# مقالات

# شخصیت پرستی

(۴)

(از جناب چوہدری غلام احمد صاحب پرویز)

۴۔ پیر پرستی عبادات میں اخلاص کا ہونا ضروری ہے۔ اسے قرآنی اصطلاح میں احسان کہتے ہیں اگر اخلاص نہ ہو تو پھر عبادات یا تو محض ریاکاری ہو جاتی ہے یا مشینی عمل کہ جس میں حرکت تو ہوتی ہے لیکن روح مفقود۔ جب عوام میں کچھ ظاہرداری آنے لگی تو حقیقت بین نگاہوں نے اخلاص پر زور دیا اور عبادات کے اصل مقصد یعنی تزکیۂ نفس اور صفائی قلب کی طرف توجہ دلائی۔ یہ تھی تصوف کی ابتدا۔ لیکن جس طرح اور شعبوں میں غلو و تشدد ہوا اسی طرح بلکہ اس سے بڑھ کر، اس شعبہ میں ہوا۔ رفتہ رفتہ ایک نیا دین قائم ہو گیا جس کو تعلق باطن سے قرار دیا گیا، اور جو دین متواتر چلا آتا تھا اُسے شریعت ظاہری کا لقب دیدیا گیا۔ آہستہ آہستہ اس ظاہری شریعت کے بے روح اور باطنی طریقت کے حقیقتِ دین قرار دئیے جانے سے اول الذکر ایک بے معنی فرسودہ اور بیکار سا عمل تصور ہونے لگا اور اصل شریعت یہی باطن پرستی ہو گئی۔ گویا یہ "مغزِ قرآن" تھا جسے اہلِ معرفت نے اپنے لیے مخصوص کر لیا اور "استخواں کا ڈھیر پیشِ سگاں" پھینکدیا۔ ظاہر ہے کہ جب شریعت ظاہری کو اس درجہ مہمل اور گھناؤنا بنا دیا جائے تو اس پر عمل بھی کیسے ہو سکتا ہے۔ تھوڑے ہی عرصہ میں ہوا یہ کہ وہ تمام عبادات و مناسک جن کے ذریعہ سے صدرِ اول کے مسلمانوں نے (رضی اللہ عنہم) دین و دنیا کی برکات حاصل کر لی تھیں اساطیر الاولین ہو گئیں اور ان کی جگہ ایسے اعمال و وظائف نے لے لی جو یا تو ایران کے آتشکدوں سے آئے تھے یا یونان کے اشراقیین کے زندہ کیے ہوئے تھے۔ اس سے آگے بڑھے تو ہندوستان کی ویدانت نے اس کے ماتھے پر سیندور کا قشقہ لگا دیا۔

توحید کی تباہی، دیکھتے کے لیے فیصلے کا بہانہ بن گئی۔ مرکز کی بربادی، ملت کا انتشار، نہ سینوں میں وہ دل نہ دماغوں میں وہ حوصلے۔ مجاہدانہ ولولے، سپاہیانہ امنگیں، چلہ کشی اور زاویہ نشینی میں بدل گئیں۔ اب نہ وہ عقیدے تھے نہ اعمال۔ زندہ خدا کا زندہ مذہب جس نے سوتی ہوئی دنیا کو جگا دیا تھا، اب دنیا کو سلانے کے کام آنے لگا۔ چونکہ یہ تمام علوم سینہ بسینہ منتقل ہوتے چلے آرہے تھے، اس لیے خدا، رسول، قرآن، شریعت، سب مٹ مٹا کر ایک انسان میں جمع ہو گئے جسے مرشد طریقت کہا گیا۔ انسان پرستی نسل پرستی کی طرف متوجہ ہوئی۔ اور "دنیوی خلافت" کی طرح اس "روحانی خلافت" کا سلسلہ بھی وراثتاً منتقل ہونے لگا۔ اب اس پیر اور برہمیت میں کچھ زیادہ فرق نہ رہا۔ پیر کا حکم بالکل خدا کا حکم ہے۔ اس کے کسی قول اور عمل پر تنقید نہیں ہو سکتی۔ لب کشائی تو ایک طرف دل میں بھی اس کے خلاف گرانی محسوس نہیں ہونی چاہیے کہ پیر دل کی لغزشوں اور آنکھ کی خیانتوں سے حاضر و غائب اسی طرح واقف ہے جس طرح خدا۔ خدا کی ناراضی تو پھر بھی گوارا کی جا سکتی ہے لیکن پیر کی ناراضی بڑی سخت چیز ہے کیونکہ اس سے تو انسان دنیا و عقبیٰ دونوں میں راندۂ درگاہ ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد کہیں ٹھکانا ہی نہیں۔ پھر نہ خدا اس کی مدد کر سکتا ہے نہ کوئی انسان حتیٰ کہ اگر کسی وقت خدا اور پیر میں سے ایک کو چھوڑنے اور دوسرے کو رکھنے کی مجبوری لاحق ہو جائے تو فیصلہ یہ ہو کہ "ہر تیاگوں گر نا تیاگوں"[1]۔ اللہ اکبر! اسلام انسانی استبداد مٹانے آیا تھا۔ ملوکیت کا استبداد تو انسان کے جسم تک ہی محدود تھا لیکن اس استبداد کو دیکھیے کہ دل و دماغ پر مستولی ہے۔ رگ و ریشہ تک میں اترا ہوا ہے قلب و روح پر چھایا ہوا ہے۔ اگر پیر کی عظمت کے خلاف دل میں بھی کوئی خیال گذر جاتا ہے تو یہ ڈرتا ہے لرزتا ہے، کانپتا ہے۔ حالانکہ مومن کی شان یہ تھی کہ اسے خدا کے سوا دونوں عالم میں کسی کا ڈر نہیں ہو سکتا تھا۔ خوف کا نشیمن تو مشرک کا قلب ہے جو عاجز و درماندہ مخلوق کے سامنے جھکتا ہے۔

[1] خدا کو چھوڑ سکتا ہوں لیکن پیر کو نہیں چھوڑ سکتا۔ یہ ایک مشہور صوفیانہ ہندی دوہے کا آخری مصرع ہے۔

سَنُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَا أَشْرَكُوا بِاللَّهِ (۱۵۱:۳)
ہم کفار کے دلوں میں رعب ڈال دیں گے اس لئے کہ وہ خدا کے ساتھ شرک کرتے ہیں۔

اور ان انسانوں سے ڈرتا ہے جو خود اس جیسے ہیں۔

إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ عِبَادٌ أَمْثَالُكُمْ (۱۹۴:۷)
یقیناً جن لوگوں کو تم خدا کے سوا پکارتے ہو وہ خود تمہارے ہی جیسے بندے ہیں۔

کہتے ہیں کہ صاحب ہم مرشد کو سجدہ تو نہیں کرتے، پھر یہ شرک کیسے ہوا۔ لیکن انہیں معلوم نہیں کہ شرک ایک سجدہ تک ہی محدود نہیں۔ غیر کو سجدہ تو شرک کی ایک محسوس شکل ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی اس کی بہت سی شکلیں ہیں جو غیر مرئی اور غیر محسوس ہیں۔ وہاں تک شرک کی وسعت اس حد تک ہے کہ

أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَٰهَهُ هَوَاهُ (۴۳:۲۵)
کیا تم نے اس کو بھی دیکھا جس نے اپنی خواہشات کو ہی اپنا خدا بنا لیا۔

فرمائیے اتباع خواہشات میں کس کو سجدہ کیا جاتا ہے؟ اس میں شرک یہی ہے کہ اتباع جو صرف خدا کے فرمان کا ہونا چاہیے تھا، غیر خدا کی طرف منتقل ہو گیا۔ غیر خدا چاہے وہ انسان ہو یا اپنا نفس ہی کیوں نہ ہو، جب مالک و مطاع بنا لیا جائے اور خدا کے قوانین سے بے نیاز ہو کر اس کی پیروی کی جائے تو یقیناً شرک ہے۔ اب دیکھئے کیا پیر کی اطاعت اس طرح نہیں کی جاتی کہ جو کچھ وہ حکم دے، بلا سند کتاب و سنت، واجب الاتباع سمجھ لیا جائے؟ کہتے ہیں کہ ہم پیر کی اطاعت اس لئے کرتے ہیں کہ ع

سالک بے خبر نبود ز راہ و رسم منزلہا

لیکن کیا یہود و نصاریٰ جس بنا پر اپنے احبار و رہبان کی اطاعت کرتے تھے وہ اس سے کچھ مختلف تھی؟ پھر خدا نے قرآن میں اس کو شرک کیوں قرار دیا؟ کہتے ہیں کہ ہم اطاعت مرشد تقرب الٰہی کے لئے کرتے ہیں۔ لیکن دیکھئے کہ مشرک کس غرض سے غیر خدا کی بندگی کرتے تھے:-

وَالَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِہٖٓ اَوْلِیَآءَ ۘ اور جو لوگ خدا کے سوا دوسروں کو کارساز بناتے ہیں
مَا نَعْبُدُھُمْ اِلَّا لِیُقَرِّبُوْنَآ اِلَی اللّٰہِ زُلْفٰی ؕ وہ کہتے ہیں کہ ہم تو ان کی پرستش اس لیے کرتے ہیں کہ
(۳ : ۳۹) کہ وہ ہم کو خدا کا مقرب بنا دیں۔

کہتے ہیں کہ ہم پیر کو وسیلہ بناتے ہیں معرفت الٰہی کے لیے۔ اس کی سند میں یہ آیت پیش کی جاتی ہے
یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَابْتَغُوْٓا اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور اس کی طرف
اِلَیْہِ الْوَسِیْلَۃَ (۳۵ : ۵) وسیلہ ڈھونڈھو۔

حالانکہ یہی آیت ان کے اس دعوے کی تردید کر رہی ہے۔ اوپر کا حصۂ آیت کا آدھا ٹکڑا ہے
باقی حصہ اس وسیلہ کی تشریح کر رہا ہے کہ
وَجَاھِدُوْا فِیْ سَبِیْلِہٖ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ۔ اور اس کے رستہ میں جہاد کرو تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ

یعنی تقرب الٰہی کا حقیقی وسیلہ جس کے اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے، یہ ہے کہ راہ حق میں باطل کے خلاف جانفشانی اور سخت جد وجہد کی جائے۔ یہ وسیلہ وہی چیز ہے جسے غالب نے "تقرب بہر طاعت" سے تعبیر کیا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کسی انسان کا دامن تھام لو اور علم و عمل سے بے پروا ہو کر یہ سمجھ بیٹھو کہ جس کا دامن تھاما ہے، وہی خدا سے لے جا کر ملا دے گا۔ ایسے اندھے توسل کی تو اسلام نے ہرگز تعلیم نہیں دی۔ آنکھیں بند کر کے کسی انسان کی پیروی کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اگر پیشوا گمراہ ہو تو وہ پیرووں کے ریوڑ کو جس گڑھے میں چاہے لے جا کر پھینک دے۔ توسل کے اسی غلط تصور نے یہاں تک نوبت پہونچا دی کہ سندھ کے ایک پیر صاحب نے اپنے گھر کو کعبہ قرار دیا اور ان کے مرید اس کعبہ کا حج کرنے لگے۔

اصل یہ ہے کہ ایک غلط طریقہ کو جائز و برحق ثابت کرنے کے لیے نہایت معصوم صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔ اور قرآن و حدیث کی آیتیں اس غرض کے لیے توڑ مروڑ کر پیش کی جاتی ہیں کہ اس

طریقہ کی چند ظاہری صورتوں کو مشروع ثابت کر دیا جائے۔ حالانکہ اگر اس کی روح کو دیکھا جائے تو وہ قطعاً منافی اسلام ہے۔ پیر کے اندر وہ تمام صفات جمع کر دی جاتی ہیں جو صرف خدا کے لیے مخصوص ہیں۔ اس سے ڈرتے ہیں اس لیے کہ اس کی ناراضگی سے نقصان و ضرر پہنچتا ہے۔ لے مناتے ہیں اس لیے کہ اس کی خوشنودی سے منافع و مقاصد حاصل ہوتے ہیں حالانکہ نفع و نقصان کا واحد مالک آقائے حقیقی ہے۔

قُلْ فَمَنْ يَمْلِكُ لَكُمْ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا إِنْ أَرَادَ بِكُمْ ضَرًّا أَوْ أَرَادَ بِكُمْ نَفْعًا (۴۸:۱۱) کہیے کہ اگر تمہیں اللہ نفع یا نقصان پہنچانا چاہے تو وہ کون ہے جو اس کے سامنے تمہارے لیے کسی بات کا بھی اختیار رکھتا ہو۔

چونکہ پیر کے متعلق یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ اسے محکمۂ قضا و قدر میں دخل حاصل ہوتا ہے اس لیے اس سے دعائیں کرائی جاتی ہیں۔ بلاشبہ ایک مومن کا دوسرے مومن کے لیے دعائیں کرنا نیک عمل ہے اور جس قدر کوئی خلوص دل سے دعا کرے گا اسی قدر اس کی اجابت کی زیادہ امید ہوگی۔

لیکن اس نیت سے دعائیں کرانا کہ خدا ہماری تو سنتا نہیں ان کی وہاں تک رسائی ہے اس لیے ان سے بات منوا لیں گے یقیناً خدا کے متعلق بڑا غلط اندازہ ہے اللہ تو ہر بندۂ مومن سے فرماتا ہے کہ اُدْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ مجھ سے دعا کرو میں تمہاری دعا قبول کروں گا۔ اور أَمَّنْ يُجِيبُ الْمُضْطَرَّ إِذَا دَعَاهُ کون ہے جو کسی بے قرار کی فریاد رسی کرتا ہے؟ ءَإِلَٰهٌ مَعَ اللَّهِ کیا وہ اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا بھی ہے؟ وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ اور جب میرے بندے میری بابت تم سے پوچھیں تو کہہ دو کہ میں (ان سے) قریب ہی ہوں۔ ہر پکارنے والے کی پکار سنتا ہوں جب کہ وہ مجھے پکارے۔

یاد رکھیے کہ ہدایت قرآن میں آچکی۔ ظاہر۔ باطن۔ شریعت طریقت سب کچھ وہی ہے۔ خدا کے

ملنے کا راستہ بھی وہی ہے جسے خدا ہی نے صراط مستقیم کہا۔ اور جسے خود نبی اکرمؐ نے امت کو دکھا دیا
اب اس کے سوا کوئی راستہ نہیں کوئی چور دروازہ نہیں جس کے راستے کوئی دوسرا خدا تک لے جائے
اور یہ راستہ صرف اسی طرح ملتا ہے کہ تمام انسانوں کی غلامی کا طوق اتار کر صرف ایک خدا کی غلامی
اختیار کر لی جائے۔ یہی خود رسول اللہ نے کیا۔ اور اسی کے کرنے کا حکم دیا۔

اِنَّ اللّٰهَ رَبِّیْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ۔ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ۔ (۳ : ۵) میرا اور تمہارا رب وہی اللہ ہے ۔ اسی کی غلامی اختیار کرو۔ یہ ہے صراط مستقیم۔

اس کے علاوہ اور کوئی راز نہیں جو حضور خفیہ خفیہ کسی ایک کو بتا گئے ہوں۔ کہ یہ چیز تبلیغ رسالت کے منافی تھی جس کے لیے حضور مامور تھے۔

باقی رہی بزرگوں کی تعظیم تو اس میں بلاشبہ بڑی سعادت ہے۔ ان کی مبارک زندگیاں ہمارے لیے تقویت ایمان کا موجب ہیں اس لیے کہ انہوں نے دنیا کو بتا دیا کہ کس طرح اپنے نفس کے شیطانی رجحانات کو تقوی و خشیت الٰہی کی قوتوں سے مغلوب کیا جا سکتا ہے۔ اور کس طرح ایک اللہ کا ہو کر سارے جہان کی غلامی سے نجات حاصل ہو سکتی ہے۔ یہ وہ حضرات ہیں جنہوں نے تمام دنیا کی مخالفت کے باوجود بڑے بڑے کفر و الحاد کے مرکزوں میں جا کر قرآن وا وحدت کی روشنی راہ گم کردہ انسانوں تک پہونچائی۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان کے اعمال صالحہ آج اس ا[illegible] ... وہ پرستی کے بو[illegible] میں روشنی کے میناروں کی طرح محکم و استوار کھڑے ہیں کہ حوادث [illegible] [illegible] ... ہیں اور ان سے سر ٹکرا کر لوٹ جاتے ہیں۔ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ

لیکن تعظیم اور تعبد کے باریک فرق کو بھول جانے سے صحیح راستہ گم ہو جاتا ہے [illegible] کبھی نہیں بھولنا چاہیے۔

[illegible] وہ پرستی | پیر پرستی کی غلامی کا طوق پیر کی زندگی تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ [illegible]

[illegible] مرنے کے بعد وہ اسی طرح قلب و دماغ پر چھایا رہتا ہے جیسا زندگی میں۔ بلکہ اب اس کی عزت پہلے سے بھی زیادہ سخت ہو جاتی ہے کہ اب وہ دربار خداوندی کا حاضر باش تصور کیا جاتا ہے۔ بلکہ عقیدۂ "وصول الی الحق" کی رو سے تو وہ خدا میں مل کر خود خدا بن جاتا ہے۔ وہ تمام مریدوں کے حالات سے باخبر ہوتا ہے۔ ہر ایک کی دعائیں سنتا ہے۔ ان کی مشکل کشائی کرتا ہے۔ مصیبت میں بعض اوقات بنفس نفیس تشریف لا کر حاجت روائی کرتا ہے۔ غرضیکہ جو کچھ اللہ تعالیٰ کو کرنا چاہیے تھا اب اس کی جگہ پیر صاحب کرتے ہیں۔ حالانکہ مُردوں کے متعلق قرآن کریم کا کھلا کھلا فیصلہ ہے کہ یوم بعث تک وہ اس دنیا والے کی سننے اور جواب دینے پر قادر نہیں ہیں۔

إِن تَدْعُوهُمْ لَا يَسْمَعُوا دُعَاءَكُمْ — اور اگر تم ان کو پکارو گے تو وہ تمہاری پکار نہیں سنیں گے۔
وَلَوْ سَمِعُوا مَا اسْتَجَابُوا لَكُمْ — اور اگر سنیں بھی تو جواب نہیں دے سکتے
وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكْفُرُونَ بِشِرْكِكُمْ (۳۵:۱۴) — اور قیامت کے دن وہ تمہارے شرک سے انکار کر دیں گے

ان کو تو اتنا بھی علم نہیں کہ وہ کب قیامت کے لیے اٹھائے جائیں گے۔

"اور جن کو یہ اللہ کے سوا پکارتے ہیں وہ کوئی چیز پیدا نہیں کر سکتے بلکہ خود مخلوق ہیں۔ وہ [illegible] زندہ نہیں ہیں اور ان کو اتنی بھی خبر نہیں کہ کب اٹھائے جائیں گے (۱۶:۲۱)"

[illegible] ہم نے جس قدر پرستش کی گنائی ہیں اگر آپ بنظر تعمق دیکھیں گے تو ان میں ایک چیز بطور قدر [illegible] اور وہ ماضی پرستی ہے۔ یہی ان تمام غلط عقائد کی اصل ہے۔ اسلام مستقبل کا [illegible] الاذہب تھا لیکن انسانی ذہن (ماضی پرست) نے جس مذہب کی تشکیل کی وہ تو [illegible] ہی ہو سکتا تھا جس کی رو سے ہمیشہ یہ کہنا پڑتا ہے کہ آنے والا زمانہ [illegible] ہے۔ اور [illegible] تھا یہ کلجگ ہے اور وہ ست جگ تھا۔ آپ آج سے پیچھے ہٹتے جائیے اور ہر ایک کی [illegible] اٹھائیے جس کا عہد آپ کے نزدیک بڑا مقدس اور نورانی تھا۔ آپ دیکھیں گے کہ

وہ بھی یہی کہا کرتے ہوں گے کہ ہمارا زمانہ بڑا تاریک ہے۔ اور گذشتہ زمانہ بڑا تابندہ تھا۔ ذہن انسانی کی کمزوری اسی ہے۔ اور اسی اعتقاد کا نتیجہ ہے کہ جو شئے گذشتہ زمانہ سے متعلق ہو واجب التعظیم ہوجاتی ہے۔ ائمہ پرستی اسلاف پرستی، مردہ پرستی، سب اسی ماضی پرستی کی مختلف شاخیں ہیں۔ اور جب تک ماضی پرستی کا تخیل درست نہ ہوگا حقائق پرستی کبھی نہیں آئے گی۔ ہمارا یہ مطلب نہیں کہ ہم ماضی سے بے نیاز ہو جائیں۔ نہ ہی ہمارے آباء کی وراثت سے ہم اس سے متمتع کیوں نہ ہوں لیکن ماضی کے متعلق یہ سمجھ لینا کہ ہر ایک فن عہد ماضی میں اپنی تکمیل کو پہنچ گیا اور ایسا مکمل ہوگیا کہ اس میں کوئی نقص، کوئی کمی باقی نہیں رہی۔ نہ اس پر اضافہ ہو سکتا ہے نہ ترمیم۔ نہ اس پر تنقید ہو سکتی ہے نہ تنقیح۔ یہ ہے ماضی پرستی۔ دین یقیناً مکمل ہو چکا۔ اور اس اعتبار سے عہد رسالت مآب اور عہد صحابہ کبار نوع انسانی کی تاریخ میں اسلام کا مکمل ترین عہد ہے کہ اس وقت قرآن ہدایت تھا اور اسوۂ حسنہ اس کے لیے روشنی تھی اور دین میں ابھی ذہن انسانی کی کارفرمائیاں نہیں ہوئی تھیں۔ لیکن حقائق قرآنی تو کسی زمانہ کے ساتھ وابستہ نہیں ہیں۔ قرآن تو کتاب فطرت ہے۔ اور جس طرح فطرت کے رازہائے سربستہ ذہن انسانی کی نشو و ارتقاء کے ساتھ بے نقاب ہوتے چلے جا رہے ہیں، اور فطرت کی کوئی شئے کسی مقام پر بھی جا کر یہ نہیں کہتی کہ بس اب مجھ میں مزید تحقیق بیکار ہے۔ میرے سینے میں جس قدر راز گہرے تھے اور موجود تھے وہ سب باہر آچکے ہیں۔ اسی طرح قرآن کریم کے حقائق بھی عقل انسانی کے ساتھ ساتھ جلوہ بار ہوتے جائیں گے۔ اور چونکہ یہ نوع انسانی کی ہدایت کے لیے آخری کتاب ہے اس لیے جب تک دنیا میں انسان باقی ہیں یہ ان کی بڑھتی ہوئی ضروریات کے مطابق سامان ہدایت دیتی چلی جائے گی۔ اسی اعتبار سے ہم کہتے ہیں کہ قرآن کسی خاص ماحول میں مقید نہیں ہو سکتا لیکن ماضی پرستی ہمیں ایسا کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ اور یہی ہے وہ چیز جس سے دماغ پر سخت بیڑیاں پڑ جاتی ہیں۔ عقلیں معطل ہو جاتی ہیں۔ تو ائے عمل مضمحل ہو جاتے ہیں۔ فکر و نظر کی قوتیں سلب ہو جاتی ہیں۔

کبھی قدم اٹھتے بھی ہیں تو منہ کا رخ چونکہ پیچھے کی طرف ہوتا ہے۔ اس لیے ہر قدم پر منزل سے اور بُعد ہو جاتا ہے۔ قومیں آگے بڑھتی ہیں اور یہ قوموں کے امام پیچھے ہٹتے جاتے ہیں۔ دنیا اوپر کو ابھرتی ہے اور یہ نیک پیشوا نیچے کو جاتے ہیں۔ ان کے پاؤں میں اتنی بوجھل زنجیریں ہیں کہ وہ انہیں اوپر اٹھنے ہی نہیں دیتیں۔ جن قوموں میں دین رسوم پرستی بن کے رہ گیا اور یہ ماضی پرستی کا ہی دوسرا نام ہے، وہ قومیں کبھی ابھر نہیں سکیں۔ انھوں نے کبھی ابھرنا بھی چاہا تو چونکہ ان کا اصل دین ان سے گم ہو چکا تھا، اس لیے انہیں سہارا دینے کو کوئی چیز نہ ملی تھی۔ لیکن افسوس ہے مسلمانوں پر کہ ان کے پاس خدا کی کتاب زندہ۔ اس کے رسول کا اسوۂ حسنہ زندہ۔ اور یہ قوم پھر بھی مردہ کی مردہ۔ سچ ہے زمین شور پیدا رحمت کیا کہ یاری کرے گا۔ وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ

---

حقائق پرستی: آپ نے غور فرمایا کہ یہ تمام پرستشیں جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے اس لیے پیدا ہو گئیں کہ مسلمانوں نے بھی دیگر مذاہب کے متبعین کی طرح، حقائق پرستی کو چھوڑ کر، شخصیت پرستی اختیار کر لی۔ حالانکہ ان کے پاس حقائق ازلی کا مکمل دستور اپنی اصلی صورت میں موجود تھا اور انہیں اس کو چھوڑ کر کسی ظن وتخمین کے اتباع کی ضرورت ہی نہ تھی۔ مصیبت یہ ہوئی ہے کہ علوم وفنون کی نشر و اشاعت زیادہ تر عہد عباسیہ میں ہوئی لیکن اس زمانہ میں مرکز اسلام پر یکسر عجمیت غالب آچکی تھی۔ اور شاہ پرستی عجمیوں کی فطرت میں داخل تھی۔ اس لیے اگر ایک طرف بادشاہ ظل اللہ قرار دیا گیا۔ تو دوسری طرف ائمۂ دین و علوم کی پرستش بھی کسی کم درجہ تک نہیں کرائی گئی۔ حالانکہ ظاہر ہے کہ تنقید کی حد سے بالاتر وہ چیزیں ہو سکتی ہیں جن پر ایمان لانے کے لیے ہم مکلف ہیں نہ کہ ہر انسان۔ خدا۔ رسول۔ کتاب۔ ملائکہ آخرت۔ اجزائے ایمان ہیں اور اس لیے تنقید سے بلند۔ لیکن کسی اور انسان پر ایمان لانا تو کہیں نہیں لکھا۔ اس لیے ان کو تنقید سے بالا کیوں سمجھا جائے؟ اس میں شبہ نہیں کہ جب قوم کی غلط عقیدت وارادت

جاتا ہے [illegible] کی طرف سے پیدا ہوتی ہے اور جو [illegible] سے [illegible] چلی آتی ہے اس کو [illegible] کی عقیدت اور ارادت سے بدل دینا آسان نہیں۔ ذہنی غلامی کے جو طوق و سلاسل انسان اپنے [illegible] اپنی گردنوں میں ڈال لیتے ہیں اور جن کے وہ اب اس درجہ خوگر ہو چکے ہیں کہ وہ گویا فطرت ثانیہ بن چکے ہیں ان کا اتار پھینکنا اب تقریباً محال معلوم ہوتا ہے۔ آپ نے نہیں دیکھا کہ جس کسی پرندے کو ایک [illegible] پنجرے میں بند رکھا جائے تو وہ پیار [illegible] قفس کا اس درجہ عادی ہو جاتا ہے کہ اس کا دروازہ [illegible] کھلا چھوڑ دیجئے تو خود پنجرے کے آگے آگے چلتا ہے اور وہ اس [illegible] اور جب کبھی اسے باہر [illegible] کا بند دروازہ کھولتے ہیں، حالانکہ اس کے بازوؤں میں قوت بھی ہوتی ہے [illegible] آزادی کی فضا [illegible] اس کی آنکھوں کے سامنے ہوتی ہے لیکن اس کے نزدیک جو آرام قفس کے گوشے میں ہوتا ہے، کھلی فضا میں نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ کھلی فضا کو [illegible] سمجھنے لگتا ہے۔ بالکل یہی [illegible] ہے [illegible] ذہنی قیدی کی وجہ سے [illegible] جو لوگ [illegible] ہو چکے ہیں ان کے اتار پھینکنے سے [illegible] ہوتا ہے گویا ایک متاع گراں بہا چھوٹ رہی ہے۔ دین ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے۔ عاقبت خراب ہو رہی ہے لیکن یہ سب [illegible] کے [illegible] ذہن کے [illegible] میں [illegible] حقیقت نہیں [illegible] ہدایت نظر آتی ہے وہ ہدایت نہیں [illegible] فریب ہے۔ اور یہ اس لیے کہ

وَمَن يَعْشُ عَن ذِكْرِ الرَّحْمَٰنِ نُقَيِّضْ لَهُ شَيْطَانًا فَهُوَ لَهُ قَرِينٌ ۝ وَإِنَّهُمْ لَيَصُدُّونَهُمْ عَنِ السَّبِيلِ وَيَحْسَبُونَ أَنَّهُم مُّهْتَدُونَ (۴۳: ۳۶-۳۷)

جو شخص خدا کے ذکر (قرآن) سے آنکھیں بند کر لیتا ہے تو ہم اس پر ایک شیطان مقرر کر دیتے ہیں، جو ہر وقت اس کے ساتھ رہتا ہے۔ وہ (شیاطین) ان کو راہ سے گمراہ کرتے [illegible] روکتے رہتے ہیں، اور یہ سمجھتے ہیں کہ یہ سیدھے راستے پر ہیں۔

آخر میں حضرات علمائے کرام کی خدمت میں بادب درخواست کروں گا کہ وہ تصریحات بالا پر ذرا ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں، اور دیکھیں کہ قرآن کریم کی تعلیم ہمیں کدھر بلا رہی ہے اور ہم کدھر جا رہے ہیں۔ ان حضرات کو شکایت ہے کہ نیا تعلیم یافتہ طبقہ دین سے بیگانہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ یہ حقیقت ہے لیکن ان حضرات نے کبھی اس پر بھی غور فرمایا کہ آخر اس کی وجہ کیا ہے۔ چونکہ یہ حضرات عملی دنیا سے بالعموم الگ رہتے ہیں اس لئے انہیں معلوم ہی نہیں ہو سکتا کہ الحاد و بیدینی کی اس رو کا سرچشمہ کہاں ہے؟ یہ دین کی اتنی ہی خدمت اور ان بیماریوں کا صرف اتنی قدر علاج کافی سمجھتے ہیں کہ اپنے مواعظ و فتاویٰ میں ان لوگوں کو مردود و مطعون قرار دیا جائے۔ لیکن اس سے تو اصلاح نہیں ہو سکتی۔ اس سے مرض اور بڑھ جاتا ہے۔ مجھے نوجوانوں کی ایسی جماعت سے ملنے ملانے کا بہت موقع ملتا ہے۔ درحقیقت میری زندگی ہی ان میں گذر رہی ہے۔ اس لیے مجھے ان کی ذہنی افتاد اور رجحانات قلبی کے مطالعہ کا خوب موقع ملتا ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ ان میں سے بہتوں کے ساتھ یہ ہوا کہ ان کی فطرت صحیحہ نے مذہبیات کے اُس حصہ سے بغاوت کرنی چاہی جو انسانوں کا وضع کردہ ہے۔ لیکن ان پر جبر کیا گیا کہ وہ اُسے بھی دین خداوندی ہی سمجھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اُس حصہ سے بھی بغاوت کرنے لگے جو فی الواقع خدا کی طرف سے تھا۔ چنانچہ مجھے کئی ایک ایسے نوجوانوں سے سابقہ پڑا جو اسی طرح حامیان دین کے بگاڑے ہوئے مریض تھے۔ میں نے ان کے سامنے آہستہ آہستہ وہ دین پیش کیا جو فی الحقیقت دینِ حق ہے۔ تو میں نے دیکھا کہ وہ حقیقت کے گرویدہ ہو گئے۔ چنانچہ ان میں سے اب اکثر ایسے ہیں جو اپنی بیشتر مساعی خود دین کی مدافعت میں صرف کرتے ہیں۔ میں نے ایسا کرنے میں قطعاً یہ نہیں کیا کہ جدت پسند طبقہ کی طرح قرآن کریم کی دور از کار تاویلات کی ہوں۔ اور ان کے ذہنی و قلبی رجحانات کی رعایت کر کے حقیقت کو ان سے چھپایا ہو۔ یا دین کو محض ایک آئیڈیل کی حیثیت سے پیش کر کے عبادات، شعائر الٰہی کو

بے معنی قرار دیا ہو۔ نعوذ باللہ من ذالک بلکہ کیا صرف یہ کہ قرآن کریم کی تفسیر خود قرآن سے اور اس کی عملی مثال اسوۂ رسول اللہ سے ان کے سامنے رکھدی۔ اور اس کے بعد بتادیا کہ کوئی نظریہ یا قول خواہ زمانہ جدید سے متعلق ہو یا قدیم سے، جو اس کسوٹی پر پورا نہ اترے وہ کبھی حقیقت ثابتہ نہیں ہوسکتا حقیقت صرف یہی ہے اور یہی یقین ہے۔ چنانچہ اس کے نتائج بڑے اطمینان بخش ظاہر ہوئے۔ یہ میرا ذاتی تجربہ ہے اور ایک ایسے احول کا تجربہ ہے جسے کیسر "یورپ زدہ" ماحول کہنا چاہئیے اور جس کے ہاتھوں مولوی صاحبان اس درجہ نالاں ہیں۔ اور یہی تجربہ ہے جو ان سطور کے لکھنے کا محرک ہوا۔ یہ وہ بصیرت ہے جو مجھے قرآن سے حاصل ہوئی ہے۔ اور اگر میں اپنے فہم قرآن میں غلطی کرتا ہوں تو میں اس کی اصلاح کے لیے بھی ہر وقت تیار رہوں بشرطیکہ وہ غلطی قرآن ہی سے ثابت کی جائے (د) ان الھدی ھدی اللہ و فیھا بصائر للناس و ھدی و رحمۃ لقوم یوقنون۔

# مقاصد قرآن

از مولانا سید صبغۃ اللہ حسینی بختیاری فاضل دیوبند استاذ جامعۂ دارالسلام عمرآباد

قرآن مجید کے نازل ہونے کا اہم مقصد یہ ہے کہ انسانوں کی دینی و دنیوی زندگی کی پوری اصلاح کی جائے اور ان کی، فرادواقوام کو بھلائی کے ایسے طریقے تبلائے جائیں جن سے صحیح انسانی برادری پیدا ہو۔ اور انسانی عقلیں اپنے کمال کے مرتبوں پر فائز ہوکر نفس و روح میں صفائی اور اخلاقی پاکیزگی پیدا کریں۔

اس جلیل القدر مقصد کے حاصل کرنے کے لیے جو اصول مقرر کیے گئے ہیں ان میں مختلف پہلوؤں سے کام لیا گیا ہے جو نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہایت ضروری ہیں اسی لیے بعض اُن امور کو جو زیادہ اہم نہ تھے صرف ایک دفعہ بیان کردینا کافی سمجھا۔ اور جو اپنی اہمیت اور افادیت کے لحاظ سے نہایت عمدہ اور قوی تھے ان کو ذہن نشین کرانے کے لیے بار بار بیان کرکے متنبہ کیا گیا ہے کہ انسانی دنیا کو اس کی سخت ضرورت تھی تاکہ دلوں سے وہ تمام بےکار باتیں، سارے مزعومہ خیالات اور خرافات نکل جائیں جو آباواجداد سے دماغوں میں راسخ چلے آرہے ہیں اور وہ تمام بری عادتیں اور خراب خصلتیں جن کی آلودگیوں سے انسانی روح کو دقت ہو رہی تھی ان سب کو نکال کر ان کی بجائے ایسی اچھی باتوں اور عمدہ علوم و معارف کا بیج انسانی دلوں میں بو دیا جائے جس کے برگ و بار سے خود وہ بھی لطف اندوز ہوں اور دوسروں کو بھی اس سے حلاوت حاصل ہو سکے۔ بعض مقاصد ایسے بھی تھے جن کا نفع فوری حاصل ہونے والا نہ تھا بلکہ آئندہ چل کر ان سے فائدہ پانے کی امید ہو سکتی تھی اور چند چیزیں ایسی

بھی تھیں جو ایک ہی وقت میں کسی طرح پوری نہیں ہو سکتی تھیں بلکہ بہ تدریجی رفتار سے اپنے درجۂ کمال پر پہنچنے والی تھیں اور پھر ان میں جو صراحت کے قابل نہ تھیں ان کی طرف صرف اشارہ کر دینا کافی تھا اسی لیے تفصیل کو چھوڑ کر اجمال سے کام لیا گیا۔ بہر حال قرآن نے اپنی پیش کردہ ہدایات میں ان طریقوں کو ملحوظ رکھا ہے کیونکہ یہی ایک ایسی آسمانی کتاب ہے جس میں تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت کا بھی ذمہ لیا گیا ہے۔ ان دونوں پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے ایک ایک حقیقت کو ذہن نشین کرانے کے لیے جو عجیب و غریب طریقہ اختیار کیا گیا اس کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے اغراض میں شمار کیا گیا ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُبِينٍ (سورۂ جمعہ رکوع ۱)

وہی (خدائے قدوس) ہے جس نے مکہ کے اُمیوں میں انہیں میں کا ایک رسول مبعوث فرمایا (جو) ان کو اس (خدائے قدوس) کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے۔ اور ان کو پاک و صاف کر دیتا ہے اور ان کو کتاب (الٰہی) اور حکمت و عقلمندی سکھاتا ہے اور وہ (لوگ) اس سے پیشتر صریح گمراہی میں پڑے تھے

ہم یہاں قرآن مجید کے وہ اصول بیان کرنا چاہتے ہیں جن کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تمام روئے زمین پر بسنے والے انسانوں کے واسطے قیامت تک کے لیے لائے ہیں۔ آپ کے تشریف لانے سے پہلے خدا کی طرف سے جتنی کتابیں نازل کی گئیں اور جتنے انبیاء مبعوث ہوئے ان سب کی تعلیمات کا خاص نچوڑ اور ان کے احکام کی حکمتوں اور مصلحتوں کا پورا خلاصہ ان اصول میں آگیا ہے اور جو خدا کی آخری کتاب ان اصول و کلیات کی حامل ہے اس کو انسانی دست برد سے ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا گیا۔

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ (سورہ حجر ۱:) بیشک ہم ہی نے قرآن نازل کیا ہے اور بے شک ہم ہی

اس کی حفاظت و نگہبانی کرنے والے ہیں۔

اور اس کی حفاظت و صیانت کا بھی معقول کافی طور پر بندوبست کر دیا گیا ہے۔

لَا یَاْتِیْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَ مِنْ خَلْفِهٖ تَنْزِیْلٌ مِّنْ حَكِیْمٍ حَمِیْدٍ
(حٰم سجدہ رکوع ۵)

اس میں باطل نہ دخل پائے گا: اس کے آگے سے نہ اس کے پیچھے سے، یہ قرآن حکیم حمید کی طرف سے نازل کیا ہوا ہے۔

غرض ہر طرح سے اس کی ذمہ داری کا وعدہ فرمایا گیا، اور درحقیقت یہی کتاب برحق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر روشن دلیل ہے کہ وہ آپ پر خدائے تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی ہے: نہ یہ کہ اس کو خود آپ ہی تصنیف کر رہے ہیں کیونکہ جو شخص کمسن ہی سے باپ کے سایہ سے محروم ہو چکا ہو اور ایک ایسی قوم کے ماحول میں پیدا ہوا ہو جو وحشت، جہالت، بربریت، قتل، غارت گری اور لوٹ مار میں اپنی آپ نظیر ہو اور وہ بھی ایک ایسے شہر میں جہاں خدائی تعلیم کا کوئی چرچا نہ رہا ہو۔ پھر کیونکر ہو سکتا تھا کہ وہ شخص دنیا کے سامنے خود اپنی قابلیت سے ایسی جامع کتاب پیش کر دے جس کے مقاصد اس قدر رفیع و اعلیٰ ہوں کہ اہل عالم کے لیے ترقیات کی راہیں کھولنے والے ہوں۔ پس یہ منہ بولتی کتاب خود اس کے فرستادۂ الٰہی اور رسول ہونے کی سب سے بڑی شہادت ہے۔

**اصلاح دینی کے تین ارکان** دین اسلام کے تین بنیادی رکن ہیں جن کو لے کر تمام انبیاء و مرسلین دنیا میں آئے اور دنیا والوں کی نیک بختی و سعادت مندی اور کامیابی اس سے تعلق رکھتی ہے کہ وہ انھیں تین چیزوں کو نہایت مستعدی کے ساتھ مضبوط تھامے رہیں۔ خدائے تعالیٰ نے ان "ارکان ثلاثہ" کو ایک عمومی ضابطہ کے طور پر پیش فرمایا ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا

بیشک جو لوگ مسلمان ہوئے اور جو یہودی ہوئے اور

وَالنَّصَارٰى وَالصَّابِئِينَ مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۔

(بقرہ رکوع )

نصاریٰ اور صابیہ جو ان میں سے ایمان لایا اللہ پر اور قیامت کے دن پر اور نیک کام کیے تو ان لوگوں کے لیے ان کا ثواب ان کے پروردگار کے پاس ہے اور ان پر کچھ خوف نہیں، اور نہ وہ غمگین ہوں گے

یہی حقیقت کو دوسرے مقام پر یوں دہرایا ہے ۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالصَّابِئُونَ وَالنَّصَارٰى مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۔

(مائدہ رکوع ۱۰)

بے شک جو مسلمان اور یہودی ہیں اور نیز صابی اور نصاریٰ، جو کوئی ایمان لائے اللہ پر اور قیامت کے دن پر اور نیک عمل کرے، نہ ان لوگوں کو ڈر ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے ۔

یہاں پروردگار عالم نے صرف تین باتیں بتلائی ہیں۔ پہلی اللہ پر ایمان لانا۔ دوسری مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہو کر قیامت میں اپنے اعمال کی جزا و سزا پانے پر یقین کرنا۔ تیسری نیک عملی کے ساتھ زندگی بسر کرنا۔

اب ہم ان میں سے ہر ایک پر ایک سیر حاصل بحث کرنا مناسب سمجھتے ہیں تاکہ ان میں سے ایک ایک کی پوری حقیقت واضح ہو جائے اور اسلام کے اصول کی فطریت و حقانیت ثابت ہو جائے۔

رکن اول ایمان باللہ ان تینوں میں سب سے پہلا اور مقدم رکن اللہ کی ذات وصفات پر ایمان لانا اور اس کی وحدانیت کا اقرار کرنا ہے اور یہی وہ نظریہ ہے جس میں تمام دنیا کے مذاہب بھٹک گئے قومیں گمراہ ہو کر تباہی و بربادی کے عمیق غاروں میں گر پڑیں یہاں تک کہ وہ قومیں جو خداوندی

پیغام کی مخاطب ہوئیں اور جنہیں ابدی سعادت حاصل کرنے کے لیے روشن احکام و قوانین دیئے گئے تھے وہ بھی قعر ذلت میں پڑ گئیں۔ خصوصاً یہودیوں نے تو یہاں تک غضب ڈھایا کہ خدا تعالیٰ کو انسان کی طرح قرار دے دیا کہ وہ بھی کام کر کے آدمیوں کی مانند تھک جاتا ہے اور کبھی وہ اپنے کیئے پر بھی شرمندہ ہوتا ہے اور یہ بھی یہودیوں کا زعم باطل ہے کہ کبھی کبھی انسانوں کی شکل میں خدا ظاہر ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ انسانی شکل میں آیا اور یعقوب علیہ السلام سے کشتی لڑ کر ان کو پچھاڑ نہ سکا آخر کار مجبور ہو کر برکت عطا کر دی۔

نصاریٰ نے بھی قسطنطین کے عہد میں پرانی بت پرستیوں کو نئے سرے سے شروع کر دیا اور خدا کی زمین کو شرک کی گندگی سے ناپاک کر ڈالا اور ان کی بدتمیزی اس درجہ بڑھ گئی کہ بت پرست قوموں کے ہیکلوں کی طرح خود بھی کنیسے بنا لیے جن میں ہر قسم کے مجسمے تصویریں مورتیاں بنا کر رکھ دیں اور اس کا سنگ بنیاد تثلیث، کفارہ، اور صلیب کے عقیدہ کو قرار دیا جو اصل میں اجمالی طور پر ہندوستان کے ہندوؤں سے لیا گیا تھا مگر تفصیل کے موقع پر "اقانیم ثلاثہ" کے غیر عقلی مفہوم میں ڈھل گیا۔

درحقیقت یہ ایک خیالی فلسفہ ہے جس کو عقل کبھی نہیں مان سکتی صرف علمائی حکایتوں کے بل بوتے پر اس کو رواج دیا جا رہا ہے اور نہ صرف یورپ کے ممالک میں بلکہ تمام دنیا میں سونے چاندی کی نہریں بہائی جا رہی ہیں۔ بے دریغ سرمایہ لٹایا جا رہا ہے تاکہ اس غیر معقول عقیدہ کو تسلیم کرایا جائے۔ حالانکہ یہ وہ عقائد و خیالات ہیں جن کو کسی دلیل و حجت سے تسلیم نہیں کرایا جا سکتا۔

پس قرآن عزیز نے اس شرک پرستی کی بنیادوں کو کھوکھلا کر ڈالا اور اس کا ذہنی قلعہ مسمار کر دیا تاکہ عقلی دلائل سے خدائے تعالیٰ کی ذات و صفات کا عرفان حاصل ہو اور توحید الٰہی صحیح و نقیہ پر معلوم ہو جائے۔ اس سلسلہ میں جس قدر مخالفوں کے شکوک و شبہات تھے ان کو رفع کیا گیا ہے عقلی تجربی اور خطابی حجتوں سے مختلف عبارتوں میں نہایت دلکش مثالیں دے کر عقیدہ توحید کو انسانی دماغوں میں جزو دیا گیا ہے چونکہ یہ دین کا سب سے اہم رکن اور اسلام کی اولین بنیاد

اس لیے خدائے قدوس کی اس آخری کتاب نے اس زبردست مسئلہ کو بار بار ذکر کیا ہے اور خدائے عزوجل کی ذات وصفات کی یکتائی اور عبادت واستعانت کے لحاظ اس کی یگانگی صاف اور غیر مشتبہ لفظوں میں بتلادی اور اس اعتقاد کو راسخ کر دیا گیا کہ کائنات عالم میں جتنی چیزیں موجود ہیں وہ تمام اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہونے میں برابر ہیں اور خدا کے سوا کوئی نہیں جو کسی کو نفع یا نقصان پہنچانے کی قدرت رکھتا ہو۔ خود انسان اپنی ذات کو بھی کوئی فائدہ پہنچا نہیں سکتا مگر محض ان اسباب وذرائع سے جو خدائے تعالیٰ نے اپنی مشیت ازلی سے مسخر کر دئے ہیں۔

غرض کہ خداوند عالم کی توحید بلحاظ اس کی ربوبیت کے یہ ہے کہ پیدا کرنے اور تمام مخلوق کی تدبیر کرنے کے اعتبار سے اس کو یکتا سمجھا جائے اور توحید کی اس قسم کو قرآن حکیم میں بار بار بیان کیا گیا ہے تاکہ عرب کے مشرکین پر حجت قائم ہو جائے جو خدائے برتر کے سوا دوسرے باطل معبودوں کی پرستش کرتے تھے اور ان معبودوں کو خدا کی بارگاہ میں اپنا سفارشی اور حمایتی جانتے تھے اور رنج وراحت کے موقعوں پر ان کی طرف رجوع کرتے تھے۔ ان کا یہ اعتقاداً سباب ومسببات کے طریق پر نہ تھا بلکہ ان کو وہ حقیقی حاجت روا مشکل کشا جان کر ایسا کیا کرتے تھے اور اپنی تکلیفوں میں انھیں کو پکارتے انھیں کی دہائی دیتے۔ اسی گمراہی کی وجہ سے قرآن مجید نے "دعا" کو سینکڑوں مرتبہ پیش کیا ہے کیونکہ "دعا" ہی عبادت الٰہی کی روح ہے۔ بلکہ عین عبادت اسی کو کہنا درست ہے۔ اس کے علاوہ جتنی عبادتیں ہیں وہ سب اسی سے نکلی ہوئی ہیں۔ لہذا یہ حکم دیا گیا ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہر رنج وراحت میں پکارا جائے اور غیر اللہ کو پکارنے کی مطلق ممانعت کر دی گئی۔

الحاصل الٰہی بیان کردہ اصول میں توحید کے اثبات کے طریقے، شرک کے باطل کرنے کی دلیلیں ہیں اور اس مقصد کے لیے ایسی ایسی تمثیلیں دی گئی ہیں جن سے توحید وشرک دونوں کا صحیح نقشہ انسان کے دل میں بیٹھ جاتا ہے۔ اور یہ امر بالکل روشن ہو جاتا ہے کہ خدائے بزرگ وبرتر کے سوا کوئی

نہیں جس کو پکارنا فائدہ پہونچائے اور وہ ہماری پکار کا جواب دے سکے۔ اور جتنی مخلوقات ہیں وہ سب اسی کی فرماں بردار ہیں' اس کا حکم بجا لاتی ہیں۔ ان میں جو سب سے افضل ہیں (یعنی انبیاء کرام اور فرشتے) وہ بھی اسی کی عبادت میں لگے ہوئے ہیں، اسی کو پکارتے اور اسی کی رحمت کے امید وار رہتے ہیں اور اسی کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔ ان میں سے کسی میں بھی یہ طاقت نہیں کہ کسی کی حاجت روائی یا فریاد رسی کر سکیں' حتیٰ کہ اذن الٰہی کے بغیر کسی کی سفارش تک کر سکیں۔ جو لوگ مخلوقات میں سے کسی مخلوق کو' عام اس سے کہ وہ ملائکہ ہوں یا انبیاء یا اولیاء' اپنی حاجتوں کے لیے پکارتے ہیں یا ان کے آگے سر نیاز خم کرتے ہیں، قیامت کے روز ان کے وہ معبود ہی خود ان سے صاف بے زاری کا اعلان کر دیں گے اور اس بات کا بھی اعلان کر دیں گے کہ ہم نے ہرگز ان کو ایسا کرنے کے لیے نہیں کہا تھا یہی وہ چیز ہے جس کی تفصیل و تشریح اللہ کی سچی کتاب جا بجا کرتی ہے۔ اس نے اللہ کی ذات وصفات پر ایمان لانے کے لیے قدرت کی مختلف نشانیاں پیش کی ہیں۔ جو عقیدۂ توحید کے لیے بمنزلہ غذا کے ہیں اور ان روشن نشانیوں پر غور کرنے والے کمال کے مرتبوں پر پہنچ جاتے ہیں۔ خدا کی صحیح معرفت ان کو حاصل ہو جاتی ہے اور خدا کی محبت ان کے دلوں میں اس کے عیوب و نقائص سے منزہ ہونے کی وجہ سے راسخ ہو جاتی ہے اور ان کے ذہن "اسماء حسنیٰ" کے ذکر سے لذت اندوز ہوتے ہیں یہی سبب ہے جس کے باعث جگہ جگہ احکام شرعی اور قدرتی مظاہر کا ذکر کرنے کے بعد مناسب مواقع پر صفات الٰہی کا قرآن میں تذکرہ کیا گیا ہے کہیں اپنے خلق و تدبیر کی صفت بیان کی تو کہیں حکمت و قدرت اور مشیت کا ذکر فرمایا اور کبھی اپنے حلم و علم کی شان تبلائی اور اس امر کی پوری تاکید کر دی کہ ہر حالت میں خدائے قدیر و توانا سے اپنا رشتہ عبودیت وابستہ رکھیں۔

قرآن عزیز میں توحید کو ایسے دل نشین پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے کہ اس سے انسانی ذہن وجد کرنے لگتی ہیں۔ اور اس کی تاثیر سے معرفت کے بلند مراتب پر پہنچ جاتی ہیں چنانچہ ابتدائے سو

حدید میں توحید باری کو نہایت مدلل طریقہ پر پیش فرمایا ہے۔

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْاَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيْهَا وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ يُوْلِجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ وَهُوَ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (سورہ حدید رکوع ۱)

جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ اللہ کی پاکیزگی (اپنی زبان حال وقال سے) بیان کر رہا ہے اور وہ زبردست حکمت والا ہے آسمان وزمین کی بادشاہت اسی کے لیے ہے، اور وہی زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے، وہی سب سے پہلا وہی سب سے پچھلا، اور وہی ظاہر اور وہی پوشیدہ، اور وہی ہر چیز کی واقفیت رکھنے والا، اور وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا، پھر عرش پر مستوی ہوا، جو کچھ زمین میں گھستا ہے اور جو کچھ آسمانوں سے نیچے اترتا ہے، اور جو کچھ اوپر چڑھتا ہے (ان سب کو) جانتا ہے، تم جہاں کہیں رہو وہ تمہارے ساتھ ساتھ ہے، اور تم جو کچھ عمل کر رہے ہو اللہ تعالیٰ اس سے واقف ہے، زمین وآسمان کا وہی بادشاہ ہے، اور سب چیزیں اسی کی طرف لوٹتی ہیں، وہی رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کر دیتا ہے، اور وہی دلوں کے بھیدوں کو جانتا ہے۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے یہ بات بتلائی ہے کہ کائنات کی ہر ایک چیز اس کی پاکیزگی

اور تقدیس بیان کر رہی ہے۔ اور اس کی تسبیح کرنے والے ان گنت ہیں تمام فرشتے، زمین پر بسنے والے انسان، اور دنیا کے سارے جانور، درندے، چرندے، پرندے، اور سمندر کی تہ میں رہنے والی آبی مخلوقات، غرض بر و بحر میں کوئی نہیں جو اس کی تسبیح و تہلیل سے غفلت برتے اور اس کی یاد سے بے خبر ہو جائے۔ اگر سننے والوں کے پاس سننے کے ذرائع نہ ہوں، نہ ہوا کریں۔ اس سے یہ کیسے سمجھ لیا جاتا ہے کہ جب ہماری سمجھ میں نہیں آتا تو فی الواقع بھی ایسا نہیں ہے۔ حالانکہ ابھی کتنے ایسے فطرت کے نوامیس ہوں گے جو انسان کی معلومات سے دور ہیں اور اس کی دست برد سے خارج ہیں۔

بہر کیف اس امر کو واضح کرنے کے بعد فرمایا جاتا ہے کہ اے شرک کرنے والو! تم نے کیونکر اس ہستی کے لیے ایسی باتیں تجویز کر رکھی ہیں جو سراپا عیب ہیں اور اس واجب الوجود کی ذات کے کسی طرح لائق و سزاوار نہیں ہو سکتیں، بھلا کیونکر ممکن ہے کہ اس کے لیے بیٹے اور بیٹیاں ہوں" اور یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اس کے کارخانۂ قضا و قدر میں دوسرے شریک ہو جائیں۔ تم نے تو یہاں تک غضب ڈھایا کہ کسی نے خدائے تعالیٰ کو انسان ہی کا ہم شکل بنا دیا! اور کوئی یہ ماننے لگا کہ خدا دنیا میں انسانوں کی صورت میں یا جانوروں کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔ بعض مذاہب عالم میں خدا کو آسمان و زمین بنانے کی وجہ سے تھکا ہوا بتایا گیا ہے اور بعض گمراہ تو یہی سمجھتے ہیں کہ خداوند عالم کی ذات تک رسائی ناممکن ہے جب تک اس کے اور بندوں کے درمیان ایسے وسیلے نہ ہوں جو اس تک پہونچا سکیں۔ الغرض ان تمام خیالات باطلہ کو صرف ایک لفظ تسبیح سے اڑا دیا گیا کہ اس کی ذات اقدس تمام واہی تباہی باتوں سے پاک ہے اور اس کی پاکی پر کائنات کا ذرہ ذرہ اپنی زبان حال سے گواہی دینے میں مصروف ہے پھر اپنی قدرت کے کمال پر نہایت سادہ پیرایہ میں چند دلیلیں ذکر فرمائی ہیں :-

۱۔ **هُوَ العزیز الحکیم** میں باری تعالیٰ کی تنزیہ ہے یعنی اس کو ہر قسم کی برائیوں اور

عیوب سے مبرا ثابت کیا گیا ہے۔ اس مقصد کے لیے دو باتوں کی ضرورت تھی، ایک تو یہ کہ جس کی تنزیہ کی جا رہی ہے اس میں قدرت انتہائی ہو اور کوئی نقصان اس کے ارد گرد بھی نہ آسکے۔ اسی ایک بات میں سینکڑوں امور آ گئے، بیوی بچوں سے پاک ہونا جسمانی خواہشوں اور نفسانی آلایشوں سے پاک ہونا، کیونکہ جو وہ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتا ہے تو اس کو دوسرے مدد کرنے والوں یا کسی قسم کے آلات و وسائل کی کیا ضرورت پڑی ہے؟ دوسری بات یہ ہے کہ قادر ہونے کے ساتھ ہی حکمت سے بھی متصف ہو تا کہ اشیاء عالم میں ان کے مناسب تدبیروں سے کام لے، اس لیے کہ اگر حکمت نہ ہوگی تو اتنی بڑی کائنات کے بے حد و حساب معاملات کی تدبیر کرنا کسی طرح ممکن نہ ہوگا۔ پھر ہر چیز کی حقیقت کا علم کلی بھی ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ بے خبری کے ساتھ تدبیر صحیح غیر ممکن ہے۔ اسی واقفیت کا نام "حکمت" ہے اور انھیں دو چیزوں کو العزیز اور الحکیم کے الفاظ سے ظاہر کیا گیا ہے۔

۲۔ اب رہی یہ چیز کہ یہ دونوں باتیں اس کی ذات میں موجود بھی ہیں یا نہیں اس کے لیے اپنے مالک ہونے کا تذکرہ فرمایا ہے جس سے مخلوقات میں اس کا متصرف ہونا واضح ہو گیا۔

۳۔ یہ کہ اس کے قبضہ میں ساری دنیا کی باگ ڈور ہے۔ وہی ساری مخلوقات کو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے اگرچہ دنیا کے عالم اسباب ہونے کی وجہ سے مرنا جینا طبعی اسباب کی طرف بظاہر منسوب کر دیا جاتا ہے لیکن جتنی اشیاء موجود ہیں ان کا موجود ہونا اور نہ ہونا سب کی انتہا اسی کی طرف ہو جاتی ہے۔ اگر ذرا سی بھی عقل ہو تو یہ فطری بات فوری سمجھ میں آجائے گی اور کہنا پڑے گا کہ وہی ہستی مارتی اور جلاتی ہے جس کے قبضۂ قدرت میں دنیا کا پیدا کرنا ہے۔ ایسی ہستی کی بادشاہت میں کسی کو دم مارنے کی کیا مجال ہو سکتی ہے؟ قرآن عزیز کی بلاغت اس جگہ نہایت درجہ قابل لحاظ ہے "یحیی ویمیت" کہہ کر یہ جتلا دیا کہ تم روز کے روز اپنی نظروں کے سامنے اس کا

یعنی مشاہدہ کر رہے ہو۔

۴۔ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔ یعنی اس کی قدرت کاملہ کے احاطہ سے کوئی چیز باہر نہیں، ہر ایک پر اس کو پوری دسترس حاصل ہے۔

اس کے بعد ایسی چار صفات ذکر فرمائی گئی ہیں جن سے یہ مضمون بدرجۂ اتم واضح ہو جاتا ہے اور ایک انصاف پسند کے لیے کوئی حیلہ باقی نہیں رہتا۔

۵۔ "هُوَ الْاَوَّلُ" وہی سب سے پہلے ہے، اس سے پہلے کوئی نہیں کیونکہ کائنات کا ایجاد کرنے والا وہی ہے اور اپنی ذات وصفات کے اعتبار سے وہی قدیم ہے، اس کے سوائے جو کچھ بھی ہے پہلے نہ تھا۔ اس کے پیدا کرنے کے بعد ہی عالم وجود میں جلوہ گر ہوا۔

۶۔ هو الآخر یعنی اسی طرح وہ آخر بھی ہے سب کے فنا ہو جانے کے بعد بھی رہے گا اور اس کی ہمیشگی وابدیت کی کوئی حد وغایت نہیں ہے۔

۷۔ الظاهر والباطن۔ وہی سب پر غالب اور بلند وبرتر ہے اور موجودات عالم میں اس کی تجلیاں ایسی ظاہر ہو رہی ہیں کہ غور وفکر سے کام لینے اور دیکھنے بھالنے سے ضرور اس تک پہنچنے کے راستے مل جاتے ہیں اور اس بارگاہ اقدس تک رسائی ہو جاتی ہے۔ اس کا وجود ایسا ظاہر ہے کہ کوئی اس کی طرح ظاہر نہیں۔ حقیقت میں نگاہوں سے چاروں طرف نظر ڈالو تو آفاق وانفس میں اسی کی جلوہ فرمائیاں بکھوگے، یہ اور بات ہے کہ تمہاری نظروں کی کوتاہی اور تمہاری نگاہوں کی تنگ دامنی، اس کے حسن وجمال کی رعنائیوں کو نہ پا سکے، لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ اتنا ہی انسانی عقل وخرد کی رسائی سے دور، مادی آنکھوں سے چھپا ہوا اور اوجھل ہے کہ نہ کوئی انسان اس کو دیکھ سکے اور نہ اس کی کنہ وحقیقت تک پہنچ سکے۔ گر با ایں ہمہ وہ ہر چیز پر اس طرح احاطہ کیے ہوئے ہے کہ فرش سے عرش تک اس کی نشانیاں، قدرت وحکمت کی نیرنگیاں اپنی پوری نمود ونمائش کے ساتھ

رونق افروز اور بہجت افزا ہیں، یہ سب کچھ "الظاهر والباطن" کی تشریح تھی آگے چل کر "وهو بکل شيء عليم" کہا ہے جس سے الحکیم کی حقیقت بھی بالکل واضح ہوگئی گویا کہ یہ اسی کا تتمہ تھا۔

ان دلائل کے بعد چند ایسے حقائق پیش کیے جاتے ہیں جن سے گزرے ہوئے اور آنے والے زمانے میں پروردگار عالم کی قدرت وحکمت کا کمال ظاہر ہوتا ہے۔ چنانچہ "هو الذي خلق السموٰت والارض" میں یہ تبلانے کے بعد کہ آسمان وزمین کو پیدا کیا یہ بھی جتلایا جاتا ہے کہ وہ "ثم استویٰ علی العرش" یعنی اس کا قبضہ واقتدار اس طرح پر ہے کہ اس کے احاطہ سے کائنات کا کوئی ذرہ خارج نہیں ہے "یغشی اللیل والنهار" سے اسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور کہیں "یدبر الامر" سے تعبیر فرمایا ہے۔

عام طور پر دنیا کا دستور ہے کہ بادشاہوں کی تخت نشینی ہوتی ہے تو اس کی ایک تو ظاہری صورت ہوتی ہے اور ایک معنوی غرض وغایت، یعنی سلطنت کے تمام امور پر اس طرح قبضہ کر لینا کہ کوئی فرمان شاہی سے سرتابی نہ کرسکے۔

پھر اس کے بعد اپنی صفات جلیلہ میں سے علم، احاطہ اور حکمت کا اظہار "یعلم ما یلج فی الارض وما یخرج منها وما ینزل من السماء وما یعرج فیها وهو معکم اینما کنتم والله بما تعملون بصیر" سے فرمایا جا رہا ہے کہ وہ اُن تمام چیزوں کو جانتا ہے جو زمین کے اندر گھس جاتی ہیں مثلاً پانی، تخم ریزی، دفینے خزینے، اور مردوں کی لاشیں۔ یا جو زمین سے نکل آتی ہیں جیسے سبزیاں، غلے، درخت اور معدنیات میں سے لوہا، پیتل، سونا، چاندی یا جو آسمان سے نازل ہوتی ہیں خواہ بارش ہو یا رحمت الٰہی، یا رحمت کے فرشتے ہوں یا عذاب کے اسی طرح وہ اُن چیزوں کو بھی جانتا ہے جو نیچے سے اوپر کو چڑھتی ہیں خواہ ملائکہ ہوں یا بندگان خاص کی وہ روحیں جو اپنے بدن کی کثیف چادریں اتار کر ملاء اعلیٰ سے جا ملتی ہیں،

یا وہ لطیف بخارات ہوں جو زمین سے اوپر کو چڑھتے ہیں اور بادل بن کر برستے ہیں۔ انہیں چیزوں پر کیا موقوف ہے وہ تو ہر حال میں تمہارے ساتھ ہی لگا ہوا ہے۔ خواہ تم کہیں ہو اور وہی تمہارے اچھے برے اعمال سے باخبر ہے۔

پھر سابق مضمون کو ایک دوسرے پیرایہ بیان میں پیش کیا گیا ہے۔ لہ ملک السموٰت والارض، یعنی کائنات علوی وسفلی کی تمام چیزیں اس کی مملوک اور تابع فرمان ہونے کے اعتبار سے اسی کی عالمگیر قدرت کے ماتحت ہیں اور جتنے امور ہیں خواہ حسی ہوں یا معنوی، روحانی ہوں یا مادی سب کے اسباب کی انتہا اسی کی بارگاہ قدس تک ہوتی ہے اور ان سب کا حقیقی سبب الاسباب وہی ہے۔

غرض کہ ساری کائنات و مافیہا کا مرکز اصلی اسی کی ذات مبارک ہے جس کی طرف لوٹنا یقینی ہے اگر اس میں تمہیں کچھ شک و شبہ ہو تو روزانہ گردش لیل و نہار کو دیکھ لو خود بخود یہ باتیں سمجھ میں آجائیں گی۔ ان تمام امور کی بوجہ اتم صراحت و وضاحت کر دینے کے بعد حقیقی اور اصلی مقصد کی طرف دعوت دی جاتی ہے۔ آمنوا باللہ ورسولہ۔

اسی طرز پر سورۂ حشر کے اخیر میں توحید الٰہی کے مسئلہ پر نہایت موزوں طور پر عجیب انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔

| | |
|---|---|
| هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلَامُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ سُبْحَانَ اللّٰهِ | وہی خدا ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، غیب شہادت کا جاننے والا بڑا ہی مہربان، بہت ہی رحمت والا، وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ بادشاہ پاک ذات، سلامتی والا، امن دینے والا، نگہبان، زبردست، دباؤ والا، کبریائی |

عَمَّا يُشْرِكُوْنَ هُوَ اللهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ
الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى يُسَبِّحُ
لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ
الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (سورہ حشر ۴)

والا۔ اللہ پاک ہے ان چیزوں جنھیں وہ اس کے ساتھ
شریک کر رہے ہیں، وہی اللہ پیدا کرنے والا صورت
بنانے والا ہے۔ اسی کے لیے اسمار حسنیٰ ہیں اسی کی تسبیح میں معروف
ہیں وہ جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں اور وہی غالب حکمت والا ہے

ان آیتوں میں خدائے عزّ وجل نے اپنی ذات وصفات کا ذکر فرمایا ہے جس سے اس کی عظمت وکبریائی اور اس کے جلال وجبروت کی شان انسانی دماغ میں کچھ اس طرح سما جاتی ہے کہ وہ کسی دوسری طرف متوجہ ہی ہونے نہیں پاتا یعنی وہی خدائے برحق معبود حقیقی ہے جس کے سوائے کوئی نہیں جو عبادت کے لائق ہو سکے وہی آسمانوں کا پیدا کرنے والا، زمین کو فرش کی طرح بچھا دینے والا، و جتنی بھی آسمان و زمین کی چیزیں ہیں سب کا پیدا کرنے والا ہے۔ صفات کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے کہ وہ ہر چھپی ہوئی اور ہر کھلی ہوئی بات کا جاننے والا ہے۔ یہاں لفظ "الغیب" استعمال کیا گیا ہے جو اپنی معنوی حیثیت سے نہایت وسیع اور جامع ہے، نہ صرف وہ جو انسان کے حواسِ خمسہ سے غائب ہے بلکہ جو فرشتوں کی نگاہوں سے غائب ہے وہ بھی غیب ہے۔ ملاء اعلیٰ اور عالم قدس انسان کے اعتبار سے غیب ہے۔ اسی طرح اور بہت سے عالم ہیں جو انسان سے اوپر والی مخلوق کے لحاظ سے بھی غیب ہیں۔ غرض یہ ہے کہ ہر ایک چیز اس کے تحت داخل ہو جاتی ہے کیونکہ بے شمار چیزیں ہیں جو فرشتوں سے بھی دور ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ کے علم ازلی سے کوئی ذرہ خارج نہیں غیب کے مراتب اضافی ونسبی حیثیت سے سیکڑوں نکلتے چلے جائیں گے، اور یہ یاد رکھنا چاہیے کہ غیب کہا گیا ہے وہ مخلوقات کی نسبت سے ہے ورنہ اس کیلئے تو ساری کائنات و رکائنات کا ذرہ ذرہ شہادت ہی شہادت ہے اور اس کے ہاں سب کچھ عیاں ہے کوئی اس سے پوشیدہ نہیں۔

الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ یہ دونوں لفظ رحمت سے نکلے ہوئے ہیں اور دونوں مبالغہ کے

صیغے ہیں لیکن دونوں میں تھوڑا سا فرق ہے جس کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں ذکر فرما دیا ہے" یارحمٰن الدنیا ورحیم الاخرہ" اے دنیا کے رحمٰن اور آخرت کے رحیم! اس جگہ رحمان کی اضافت دنیا کی طرف کی گئی ہے اور رحیم کی آخرت کی طرف، کیونکہ دنیا کی بڑی بڑی نعمتیں اور لذتیں بھی آخرت کے مقابلے میں ہیچ ہیں غرض رحمٰن میں کمیت کے اعتبار سے اور رحیم میں کیفیت کے اعتبار سے رحمت کا مبالغہ ہے۔

اور رحمت کے وہ معنی جو ہماری سمجھ میں آتے ہیں یہ ہیں کہ وہ ایک باطنی جذبہ ہے جو کسی کے دل میں پیدا ہوتا ہے اور اسی کے پیدا ہونے کے سبب ایک انسان دوسرے انسان پر احسان کرتا ہے ظاہر ہے کہ یہ معنی تو خدائے تعالیٰ کی ذات پر اطلاق نہیں کیے جا سکتے۔ پس خدا کے لیے جب رحمت کا لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے رحمت کا نتیجہ اور اثر مراد ہوتا ہے یعنی احسان کرنا۔

"الملک" وہ ہے جو اپنی ذات و صفات میں تمام موجودات سے بے پروائی و بے نیازی پوری پوری رکھتا ہو اور تمام موجودات اپنے وجود و بقا کے لحاظ سے اس کی سراپا احتیاج و نیاز بنی ہوئی ہوں۔

جب انسان کو اس صفت الٰہی کا ادراک حاصل ہوجاتا ہے کہ حقیقی بادشاہ صرف خدائے تعالیٰ ہی ہے تو انسان اُسی کی درگاہ احدیت کا ہو رہتا ہے۔ اسی کی طاعت و فرمانبرداری کرنے لگتا ہے، اور ہر دوسری چیز سے بے نیاز ہوکر اپنی حاجتوں اور ضرورتوں میں اسی کا دروازۂ رحمت کھٹکھٹاتا ہے۔ اس کے سوا کسی دوسرے کے آگے التجائیں پیش نہیں کرتا۔ پھر جو انسان اس صفت خداوندی کا مظہر بن جائے اور اس کے رنگ میں اپنے ظاہر و باطن قلب و قالب کو رنگ لے تو وہ ساری قوتوں پر غلبہ و تسلط حاصل کرکے ان کو فطرت سلیمہ کے تابع کر لیتا ہے۔

"القدوس" یعنی بے حد پاک اور ہر نقص و عیب سے بری، ہر قسم کے وہم و گمان.

اور خیالات سے بالاتر اور انسانی ادراک کے طائر فکر و نظر سے بلند انسان پر اس صفت ربانی کا جب پرتو پڑتا ہے تو وہ بھی اپنے احاطۂ احساس اور حیطۂ تخیل سے بالکل الگ ہو جاتا ہے یہاں تک کہ اس کا علم، علوم الٰہیہ سے کچھ ایسا وابستہ ہو جاتا ہے کہ کسی حال میں اس کا سررشتہ ہاتھ سے نہیں چھوٹنے پاتا اور اس کی قوت ارادی اس درجہ پاکیزہ ہو جاتی ہے کہ نفسانی خواہشات و جذبات بھی اس کے تابع ہو کر مرضی الٰہی کے تحت ظاہر ہونے لگتے ہیں۔

"السلام" وہ ہر اس چیز سے جو عیوب و نقصانات کے قبیل سے ہو بالکل بری اور سالم ہے اور دوسروں کو سلامتی دینے والا ہے۔ وہ دنیا میں بھی اپنی آغوش رحمت میں آنے والوں کو سلامتی بخشتا ہے۔ اور آخرت میں بھی دارالسلام یعنی سلامتی کے گھر میں داخل فرمائے گا۔ اس صفت الٰہیہ سے جو متعلق ہو جائے وہ ہر قسم کی باطنی برائیوں سے محفوظ ہوگا اور حسد و بغض، کینہ اور ہر طرح کی خباثت علمی و عملی بہیمیت کے آثار سے پاک و صاف ہو کر صاحب قلب سلیم ہو جائے گا اور تقرب الٰہی کا بلند مرتبہ حاصل کرے گا۔

"المومن" وہ ذات ہے جس نے دنیا و آخرت میں ہر تکلیف و مصیبت سے بچنے کے لیے مختلف ذرائع و اسباب مہیا فرمائے ہیں۔ مثلاً دنیا کی زندگی کے لیے جسمانی امن و حفاظت کا انتظام کیا ہے وہ مواد پیدا کیا ہے جو زندگی کا سامان بہم پہنچانے کے لیے ضروری ہے۔ وہ قوتیں دی ہیں جن کے ذریعہ سے اس مواد کو استعمال کیا جا سکتا ہے۔ وہ طریقے سکھائے ہیں جن سے مادیات کو مسخر کیا جا سکتا ہے۔ اور ان سے اپنے فائدے کے لیے کام لیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح اس نے روحانی امن و امان کے واسطے بھی اپنے پیغامبر مبعوث فرمائے، ان پر کتابیں نازل کیں جن میں انسانی ضروریات اور مصالح کی پوری پوری رعایت ملحوظ رکھی گئی تاکہ معادی و معاشی ہر قسم کے مقاصد کے لیے دلیل راہ ہوں اب انسان کا فرض یہ ہے کہ وہ اس صفت کا مظہر بن کر دنیا و آخرت میں مامون ہو جائے۔

المہیمن۔ انسانی اعمال کی پوری حفاظت ونگرانی کرنے والا اور ان کے سامان رزق
وضروریات زندگی کی نگہداشت کرنے والا۔ جب خدائے تعالیٰ کی یہ صفت ہے تو انسان کو چاہیے کہ
اپنی تمام خداداد فطری قوتوں کی نگرانی کرنے والا بن جائے کہ کوئی قوت فطری عدم استعمال کی وجہ سے
ضائع نہ ہونے پائے یا کوئی قوت بے محل صرف ہو کر حد اسراف کو نہ پہنچ جائے۔ غرض اپنے قویٰ کا
کی حفاظت ونگہبانی انسان کو اس صفت کا مظہر بنا دیتی ہے۔

"العزیز"۔ عزیز ایک ایسی صفت ہے جس میں تین باتیں پائی جاتی ہیں پہلی یہ کہ جس کی صفت
ہے اس کی نظیر کم ہو۔ دوسری یہ کہ اس کی ذات سے سب کی حاجتیں متعلق ہوں، تیسری یہ کہ اس
تک پہنچنا بہت دشوار ہو۔ یہ تینوں امور باری تعالیٰ میں پورے طور پر پائے جاتے ہیں، اس کی نظیر
کم ہونا تو کیا بالکل ہے ہی نہیں، اور کائنات کی ہر شئے اپنے موجود ہونے اور باقی رہنے میں اسی کی
محتاج ہے، اور اس کی عنایت کے بغیر اس کی بارگاہ عالی تک رسائی ہو نہیں سکتی۔ پس جس شخص کے
دل ودماغ میں "عزیز" کی عزت رچ جائے گی وہ پھر کسی غیر اللہ سے عزت طلبی کا خواہاں نہ ہوگا۔
اور ضرور ہے کہ وہ عزت وسربلندی کے مرتبہ پر فائز ہو جائے اور شان "مالک الملک تؤتی
الملک من تشاء وتنزع الملک ممن تشاء" کا ظہور ہو۔ بہرکیف عزت یا تو خدا کے لیے ہے یا اس
کے دیئے ہوئے کے لیے ہے، "للہ العزۃ ولرسولہ وللمومنین"۔

"الجبار"۔ جبار جبر سے مشتق ہے۔ یہ اس ذات کی صفت ہے جس کا جبر وقہر تو ہر ایک پر ہو سکتا
ہے مگر کسی کا جبر اس پر نہیں ہو سکتا اور کوئی نہیں جو اس کی قدرت وارادہ سے باہر ہو یا اس کے قبضہ
سے نکل سکے "لا یسئل عما یفعل وھم یسئلون"۔

اوست سلطاں ہر چہ خواہد آں کند عالمے را در دمے ویراں کند

انسانوں میں سے جباریت کا مظہر وہ ہو سکتا ہے جو سب کا اس طرح متبوع بن جائے کہ اس کی

اور خیالات سے بالاتر اور انسانی ادراک کے طائر فکر و نظر سے بلند تر انسان پر اس صفت ربانی کا جب پرتو پڑتا ہے تو وہ یکسر اپنے احاطۂ احساس اور حیطۂ تخیل سے بالکل الگ ہو جاتا ہے یہاں تک کہ اس کا علم بعلوم الٰہیہ سے کچھ ایسا وابستہ ہو جاتا ہے کہ کسی حال میں اس کا سر رشتہ ہاتھ سے نہیں چھوٹنے پاتا اور اس کی قوت امادی اس درجہ پاکیزہ ہو جاتی ہے کہ نفسانی خواہشات و جذبات بھی اس کے تابع ہو کر مرضیٔ الٰہی کے تحت ظاہر ہونے لگتے ہیں۔

"السلام" وہ ہر اس چیز سے جو عیوب و نقصانات کے قبیل سے ہو بالکل بری اور سالم ہے اور دوسروں کو سلامتی دینے والا ہے۔ وہ دنیا میں بھی اپنی آغوش رحمت میں آنے والوں کو سلامتی بخشتا ہے۔ اور آخرت میں بھی دارالسلام یعنی سلامتی کے گھر میں داخل فرمائے گا۔ اس صفت الٰہیہ سے جو متعلق ہو جائے وہ ہر قسم کی باطنی برائیوں سے محفوظ ہوگا اور حسد و بغض، کینہ اور ہر طرح کی خباثت علمی و عملی و بہیمیت کے آثار سے پاک و صاف ہو کر صاحب قلب سلیم ہو جائے گا اور تقرب الٰہی کا بلند مرتبہ حاصل کرے گا۔

"المومن" وہ ذات ہے جس نے دنیا و آخرت میں ہر تکلیف و مصیبت سے بچنے کے لیے مختلف ذرائع و اسباب مہیا فرمائے ہیں۔ مثلاً دنیا کی زندگی کے لیے جسمانی امن و حفاظت کا انتظام کیا ہے وہ مواد پیدا کیا ہے جو زندگی کا سامان بہم پہنچانے کے لیے ضروری ہے وہ قوتیں دی ہیں جن کے ذریعہ سے اس مواد کو استعمال کیا جا سکتا ہے۔ وہ طریقے سکھائے ہیں جن سے مادیات کو مسخر کیا جا سکتا ہے۔ اور ان سے اپنے فائدے کے لیے کام لیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح اس نے روحانی امن و امان کے واسطے بھی اپنے پیغامبر مبعوث فرمائے، ان پر کتابیں نازل کیں جن میں انسانی ضروریات اور مصالح کی پوری پوری رعایت ملحوظ رکھی گئی تاکہ معادی و معاشی ہر قسم کے مقاصد کے لیے دلیل راہ ہوں۔ اب انسان کا فرض یہ ہے کہ وہ اس صفت کا مظہر بن کر دنیا و آخرت میں مامون ہو جائے۔

المھیمن۔ انسانی اعمال کی پوری حفاظت ونگرانی کرنے والا اور ان کے سامان رزق وضروریات زندگی کی نگہداشت کرنے والا۔ جب خدائے تعالیٰ کی یہ صفت ہے تو انسان کو چاہیے کہ اپنی تمام خداداد فطری قوتوں کی نگرانی کرنے والا بن جائے کہ کوئی قوت فطری عدم استعمال کی وجہ سے ضائع نہ ہونے پائے یا کوئی قوت بے محل صرف ہو کر حد اسراف کو نہ پہنچ جائے۔ غرض اپنے قوائے کی حفاظت ونگہبانی انسان کو اس صفت کا مظہر بنا دیتی ہے۔

اُلعزیز۔ عزیز ایک ایسی صفت ہے جس میں تین باتیں پائی جاتی ہیں پہلی یہ کہ جس کی یہ صفت ہے اس کی نظیر کم ہو۔ دوسری یہ کہ اس کی ذات سے سب کی حاجتیں متعلق ہوں، تیسری یہ کہ اس تک پہنچنا بہت دشوار ہو۔ یہ تینوں امور باری تعالیٰ میں پورے طور پر پائے جاتے ہیں، اس کی نظیر کم ہونا تو کیا بالکل ہے ہی نہیں، اور کائنات کی ہر شئے اپنے موجود ہونے اور باقی رہنے میں اسی کی محتاج ہے، اور اس کی عنایت کے بغیر اس کی بارگاہ عالی تک رسائی ہو نہیں سکتی۔ پس جس شخص کے دل ودماغ میں "عزیز" کی عزت رچ جائے گی وہ پھر کسی غیر اللہ سے عزت طلبی کا خواہاں نہ ہوگا۔ اور ضرور ہے کہ وہ عزت وسربلندی کے مرتبہ پر فائز ہو جائے اور شان "مالك الملك تؤتی الملك من تشاء وتنزع الملك ممن تشاء کا ظہور ہو۔ بہرکیف عزت یا تو خدا کے لیے ہے یا اس کے دیے ہوئے کے لیے ہے، "لله العزة ولرسوله وللمؤمنين"۔

الجبار۔ جبار جبر سے مشتق ہے۔ یہ اس ذات کی صفت ہے جس کا جبر وقہر تو ہر ایک پر ہو سکتا ہے مگر کسی کا جبر اس پر نہیں ہو سکتا اور کوئی نہیں جو اس کی قدرت وارادہ سے باہر ہو یا اس کے قبضہ سے نکل سکے "لا یسئل عما یفعل وھم یسئلون"۔

او دست سلطاں ہر چہ خواہد آں کند عالمے را در دمے ویراں کند

انسانوں میں سے جباریت کا مظہر وہ ہو سکتا ہے جو سب کا اس طرح متبوع بن جائے کہ اس کا

اتباع کرنا ہر ایک کے لیئے جبری طور پر لازمی ہو اور اس میں تاثر کی صفت نہ ہو بلکہ تاثیر رکھتا ہو کہ جو اُس کو دیکھے متاثر ہو جائے، یہ خاص کیفیت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارکہ میں پائی جاتی ہے کہ آپ تمام دنیا والوں کے لیے حقیقی متبوع بنا کر بھیجے گئے ہیں اور آپ ہی کو ساری اولاد آدم کی سیادت کا فخر حاصل ہے۔ اور جن لوگوں نے آپ کو دیکھا وہ اس قدر متاثر ہوئے کہ اپنی جان اور اپنا مال آپ کی محبت و رفاقت پہ ہیچ سمجھا اور سب کچھ آپ کی خاطر چھوڑنا گوارا کرلیا۔ تاریخ اسلام شاہد ہے کہ صحابۂ کرام کی حالت ایسی ہی تھی۔

"المُتَکَبِّرُ" شان تکبر و کبریائی کے لائق وہی ذات اقدس ہو سکتی ہے جس کے مقابلہ میں کائنات عالم کی ہر چیز حقیر ہو۔ اور کوئی اس کے سامنے اپنی بڑائی نہ جتلا سکے بلکہ سب اس کے آگے عاجز و درماندہ و محتاج و نیاز مند ہوں۔ اور ظاہر ہے کہ خداوند تعالیٰ کے سوائے کسی کے لیے تکبر درست نہیں ہو سکتا یہی وجہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو شخص اللہ کے آگے تواضع و انکساری اختیار کرے گا اس کو اللہ تعالیٰ فرو سرفراز و سربلند فرمائے گا۔ اور جو کبریائی اختیار کرے گا وہ ذلیل وخوار ہوگا۔

"الخالق' البارئ' المصوّر" خلق' برار اور تصویر یہ تینوں صفات قریب قریب ایک ہی مفہوم ادا کر رہی ہیں مگر ذرا فرق بھی ہے" خلق" پیدا کرنے سے پہلے اندازہ کر لینے کو کہتے ہیں "براء" مطلقاً پیدا کرنے پر بولا جاتا ہے۔ اور" تصویر" صورت دینے کو کہتے ہیں ما اللہ تعالیٰ نے یہ تینوں درجے کائنات کو ایک ہی وقت میں طے کرا دیے ہیں۔ گر رتبہ کے لحاظ سے ایک دوسرے پر مقدم ہے

"الحکیم" حکمت کے معنی کسی بہترین چیز کو بہترین علم کے ذریعہ پہچان لینے کے ہیں اور یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ خداوند قدوس کی کنہ اور اس کی ذات کوئی نہیں جان سکتا پس یہی چیز بہترین ہے اور حکیم علی الاطلاق اس کے سوائے کوئی نہیں ہو سکتا۔ اس کے سوا اگر کسی پر یہ لفظ بولا جائے گا تو اس

معنی میں ہوگا کہ اس پر اس صفت الٰہیہ کا پرتو پڑا ہے۔ اسی لیے جب انسان خداوندی علم و حکمت کا مظہر بن جاتا ہے تو اس پر بھی فیضان آلٰہی ہونے لگتا ہے اور وہ "مَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا" کا مصداق بن جاتا ہے اور یہی مطلب ہے "عَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا" کا کہ فطرت آدم میں جو علوم حکمت کے خزانے فاطر کائنات نے ودیعت رکھے ہیں، وہی اپنے اپنے وقت پر بروئے کار آرہے ہیں۔ تو گویا اسی کی ذات تمام حکمتوں کا سرچشمہ ہے۔

چونکہ گذشتہ آیتوں میں بہت سے اسماء حسنیٰ آگئے تھے اس لیے ان کی کسی قدر تشریح کردینی ضروری تھی نیز اس لیے بھی ایسا کیا گیا کہ وحدت صفات کے مسئلہ میں بہت غلطیاں کی گئی ہیں اور درحقیقت یہی سے غلطی کا نقطۂ آغاز ہے کیونکہ گمراہ قوموں نے ہر کام اور ہر صفت کے لحاظ سے ایک ایک معبود قرار دے رکھا تھا حالانکہ ان صفات متعددہ کا ایک ہی ذات میں اجتماع ہے۔

غرض قرآن مجید نے نہ صرف توحید ذاتی کو بیان کیا ہے بلکہ صفات و افعال کے لحاظ سے بھی مسئلۂ توحید کی وضاحت کردی ہے۔ اور وحدت صفات باری کی گتھی کو بالکل سلجھا کر رکھدیا ہے۔ باقی

# تقلید و اتباع

از افادات علامہ ابن القیم رحمۃ اللہ

تقلید کی تین قسمیں ہیں۔ ایک قسم کی تقلید حرام ہے۔ دوسری واجب ہے۔ اور تیسری جائز ہے مگر واجب نہیں۔

تقلید حرام کی بھی تین قسمیں ہیں۔

ایک یہ کہ بزرگوں سے جو طریقہ چلا آتا ہو، انسان اسی کی پیروی کیے چلا جائے اور سرے سے اس بات کی تحقیق ہی نہ کرے کہ خدا اور رسول کا حکم کیا ہے۔

دوسرے یہ کہ انسان کسی ایسے شخص کی تقلید کرے جس کے متعلق وہ نہ جانتا ہو کہ آیا وہ اس قابل بھی ہے یا نہیں کہ اس کی بات مانی جائے۔

تیسرے یہ کہ انسان کسی شخص کی تقلید کا ایسا پابند ہو کہ جب اس کے قول کے خلاف دلیل و حجت قائم ہو جائے تب بھی وہ اسی کی پیروی پر جما رہے۔ اس تیسری قسم کے مقلد اور پہلی قسم کے مقلد میں فرق یہ ہے کہ پہلا شخص تو علم نہیں رکھتا اس لیے تقلید کرتا ہے، اور یہ علم رکھتا ہے، حجت اس پر ظاہر ہو جاتی ہے، پھر بھی تقلید کی بندش سے نہیں نکلتا۔ اس لحاظ سے یہ زیادہ لائق مذمت ہے۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنی کتاب پاک میں متعدد مقامات پر ان تینوں قسم کی تقلیدوں کی برائی بیان فرمائی ہے، چنانچہ ارشاد ہے۔

وَاِذَا قِیْلَ لَھُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَیْہِ — اور جب ان سے کہا گیا کہ پیروی کرو اس حکم کی جو خدا نے نازل کیا ہے تو انہوں نے جواب دیا کہ ہم تو

| | |
|---|---|
| اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ (البقرہ: ۲۱) | اسی طریقہ کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ اگر ان کے باپ دادا کچھ نہ جانتے ہوں اور طریقۂ ہدایت پر نہ ہوں تب بھی کیا وہ انہی کی پیروی کئے جائیں گے؟ |
| وَكَذٰلِكَ مَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِىْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَاۤ اِنَّا وَجَدْنَاۤ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ قٰلَ اَوَلَوْ جِئْتُكُمْ بِاَهْدٰى مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَيْهِ اٰبَآءَكُمْ (الزخرف: ۲) | اور ایسا ہی ہوتا رہا ہے کہ جب ہم نے تم سے پہلے کسی بستی میں کوئی ڈرانے والا بھیجا تو اس بستی کے خوش حال لوگوں نے یہی کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقہ پر پایا اور ہم انہی کے قدم بہ قدم چلے جارہے ہیں۔ اور پیغمبر نے ان سے کہا کہ اگر میں تمہارے باپ دادا کے طریقہ سے بہتر طریقہ تمہیں بتاؤں تو کیا پھر بھی تم انہی کی پیروی کیے چلے جاؤگے؟ |
| وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا (المائدہ: ۱۴) | اور جب کبھی ان سے کہا گیا کہ آؤ اس چیز کی طرف جو خدا نے اتاری ہے اور آؤ رسول کی طرف تو انہوں نے یہی کہا کہ ہمارے لیے وہ طریقہ کافی ہے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ |

اس مضمون کی دوسری آیات بھی قرآن میں بکثرت وارد ہوئی ہیں جن میں ایسے لوگوں کی مذمت کی گئی ہے جو تقلید اسلاف پر قناعت کر لیتے ہیں اور خدا کی نازل کی ہوئی ہدایت کی طرف توجہ نہیں کرتے۔[1]

[1] اگر کوئی یہ کہے کہ ان آیات میں تو ان لوگوں کی مذمت کی گئی ہے جو اپنے گمراہ اور کافر اسلاف کی پیروی کرتے تھے، پھر تم نے کس طرح ان آیات کو ایسے لوگوں پر چسپاں کر دیا جو علماء مہتدین کی پیروی کرتے ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے خود حکم دیا ہے کہ جو کچھ تمہیں معلوم ہو اسے اہل علم سے پوچھو۔ فَاسْئَلُوْۤا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اصل تقلید کی اس نوعیت کو برا ٹھیرایا ہے کہ انسان خدا کی

پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَلَا تَقْفُ مَا لَیْسَ لَکَ بِہٖ عِلْمٌ اور یہ ظاہر ہے کہ تقلید علم نہیں ہے جیسا کہ اہل علم بالاتفاق کہتے ہیں۔

ایک دوسری جگہ ارشاد ہے۔

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْیَ بِغَیْرِ الْحَقِّ وَاَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ یُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (الاعراف: ۴)

کہو کہ میرے پروردگار نے تو حرام کیا ہے بے حیائی کے کاموں کو خواہ وہ کھلے ہوں یا چھپے اور گناہ کو اور ناروا زیادتی کرنے کو اور اس بات کو کہ تم خدا کے ساتھ کسی ایسی چیز کو شریک ٹھیراؤ جس کے لیے اس نے کوئی دلیل نہیں اتاری اور یہ کہ تم خدا کے بارے میں کوئی ایسی بات کہو جس کا تمہیں علم نہیں۔

اور ایک جگہ فرمایا:۔

اِتَّبِعُوْا مَا اُنْزِلَ اِلَیْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِیَآءَ (الاعراف ۱)

پیروی کرو اس ہدایت کی جو تمہاری طرف تمہارے پروردگار سے نازل ہوئی ہے اور اس کے سوا اپنے بنائے ہوئے پیشواؤں کی پیروی نہ کرو۔

اس آیت میں صرف خدا کی نازل کردہ ہدایت کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے اور مقلد کا حال یہ ہے کہ وہ جانتا ہی نہیں کہ جس چیز کی پیروی وہ کر رہا ہے وہ خدا کی طرف سے ہے یا نہیں۔ بلکہ ایک قسم کا تقلد

---

تکملہ حاشیہ صہ ۲۰۷ نازل کی ہوئی ہدایت سے بے پروا ہو کر انسانوں کی پیروی کرنے لگے۔ تقلید کی یہی نوعیت ہے جس کے مذموم اور حرام ہونے پر سلف صالح اور ائمہ اربعہ کا اتفاق ہے۔ رہی یہ تقلید کہ کوئی شخص اللہ کی نازل کردہ ہدایت کی اتباع کی کوشش کرے اور اسکے احکام کو سمجھنے میں ایسے لوگوں کی طرف رجوع کرے جو اس سے زیادہ علم رکھتے ہوں تو ایسی تقلید مذموم نہیں ہے جیسا کہ آگے چل کر ہم تقلید واجب اور تقلید جائز کی بحث میں بیان کریں گے۔

تو ایسا ہے کہ جب دلیل و حجت سے اس پر یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اس کے پیشوا کا قول خدا کی نازل کردہ ہدایت کے خلاف ہے تب بھی وہ اس کی پیروی سے باز نہیں آتا پس یہ کھلا ہوا اتباع غیر منزل ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

| | |
|---|---|
| فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ کُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَیْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِیْلًا (النساء: ۹) | پھر اگر تمہارے درمیان کسی چیز میں اختلاف ہو جائے تو اس میں خدا اور رسول کے حکم کی طرف رجوع کرو اگر تم اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتے ہو یہی طریقہ بہتر ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی اچھا ہے۔ |

اس آیت میں ہم کو اللہ اور اس کے رسول کے سوا کسی اور کی طرف رجوع کرنے سے منع کیا گیا ہے اس سے بھی تقلید کا ابطال ہوتا ہے۔

پھر فرمایا:۔

| | |
|---|---|
| اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوْا وَلَمَّا یَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِیْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَلَمْ یَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلَا رَسُوْلِهٖ وَلَا الْمُؤْمِنِیْنَ وَلِیْجَةً (التوبہ: ۲) | کیا تم نے یہ گمان کیا ہے کہ تم چھوڑ دیے جاؤ گے حالانکہ اللہ نے ابھی تک آزما کر نہیں دیکھا کہ تم میں سے کون ہیں جنہوں نے جہاد کیا اور اللہ اور اس کے رسول اور جماعت مومنین کے سوا کسی غیر کو اپنا معتمد علیہ نہیں بنایا۔ |

اور ظاہر ہے کہ اس سے بڑھکر ولیجہ[1] اور کیا ہوگا کہ کوئی شخص کسی کو اللہ اور اس کے رسول اور تمام امت کے کلام پر مختارِ کل بنا دے، اور ان سب پر اس کو مقدم ٹھیرائے، اور کتاب اللہ سنت رسول اجماع امت سب کو اُس کے قول پر پیش کرے، پھر ان میں سے جو کچھ اس کے قول کے موافق ہو اس کو اس بنا پر قبول کرے کہ وہ اس کے موافق ہے، اور جو اس کے قول کے خلاف ہو اسے رد کرنے کے لیے حیلے تلاش کرے، دلیلیں ڈھونڈے، اور کسی نہ کسی بہانے سے اس کو رد کرکے ہی چھوڑے۔ اگر یہ بھی ولیجہ نہیں

[1] ولیجہ اس کو کہتے ہیں جس کو انسان اپنا معتمد علیہ بنائے۔ 

تو ہم نہیں جانتے کہ پھر وحیہ اور کیا چیز ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

يَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوهُهُمْ فِي النَّارِ يَقُولُونَ يَا لَيْتَنَا أَطَعْنَا اللَّهَ وَأَطَعْنَا الرَّسُولَا ۝ وَقَالُوا رَبَّنَا إِنَّا أَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَاءَنَا فَأَضَلُّونَا السَّبِيلَا ۝ (الاحزاب: ۸)

جس دن آگ میں ان کے چہروں کو الٹ پلٹ کیا جائے گا تو وہ کہیں گے کہ اے کاش ہم اطاعت کرتے اللہ کی اور اطاعت کرتے رسول کی اور وہ کہیں گے کہ پروردگارا ہم نے اپنے سرداروں اور اپنے بڑے لوگوں کی اطاعت کی اور انہوں نے ہم کو گمراہ کر دیا۔

یہ آیت بھی تقلید کا بطلان کرتی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس میں تو ایسے لوگوں کی مذمت ہے جو گمراہ کرنے والوں کی تقلید کریں پھر تم نے اسے ان لوگوں پر کیوں چسپاں کر دیا جو راہ راست کی طرف ہدایت کرنے والوں کی تقلید کرتے ہیں؟ تو ہم کہیں گے کہ اس کا جواب خود سوال ہی میں موجود ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ ہدایت اس کے سوا کچھ نہیں جسے اللہ نے نازل کیا اور اس کے رسول نے بیان فرمایا۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ کسی شخص کے ہادی اور مہتدی ہونے کا صحیح علم اسی کو ہو سکتا ہے جو خود ہدایت کا علم رکھتا ہو۔ اب اگر کوئی شخص یہ علم رکھتے ہوئے کسی کو ہادی و مہتدی جانتا ہے اور اس کی پیروی کرتا ہے تو وہ مقلد ہی نہیں ہے۔ اور اگر وہ اس علم سے بہرہ ور نہیں تو اسے یہ معلوم ہی کیونکر ہوا کہ کون راہ راست کی طرف ہدایت کرتا ہے اور کون راہ کج کی طرف۔ وہ تو خود اپنے اقرار کے بموجب جاہل اور گمراہ ہے۔ کتاب و سنت کے علم سے ناواقف ہو کر وہ جس کی بھی پیروی کرے گا اندھی پیروی کرے گا۔ اس کا رہبر جدھر جدھر جائیگا وہ بھی اندھوں کی طرح اس کے پیچھے چلا جائے گا۔ خواہ وہ سیدھے راستہ پر جائے یا غلط رستہ پر۔

مقلدین کہتے ہیں کہ دین کے معاملات میں جن ائمہ کی ہم تقلید کرتے ہیں ان کے ہدایت پر ہونے کا تم خود اقرار کرتے ہو، پھر جب وہ ہدایت پر ہیں تو ان کی تقلید کرنے والے بھی قطعاً ہدایت پر ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ تمہارا ان کے پیچھے آنکھیں بند کرکے چلنا خود ان کے اپنے طریقے کے بھی تو قطعاً خلاف ہے ان کا طریقہ یہ تھا کہ وہ حجت کا اتباع کرتے تھے اور اندھی پیروی سے روکتے تھے، جیسا کہ ہم آگے چل کر خود انہیں کے اقوال سے ثابت کریں گے۔ پس جو شخص حجت کو ترک کرتا ہے اور اس چیز کا ارتکاب کرتا ہے جس سے خود انہوں نے اور ان سے پہلے اللہ اور اس کے رسول نے منع کیا ہے، وہ یقیناً ان کے طریقہ پر نہیں ہے بلکہ ان کا مخالف ہے۔ ان کے طریقہ پر تو وہی شخص ہے جو حجت کا اتباع کرے اور دلیل کے آگے سر جھکائے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی انسان کو کتاب وسنت پر مختار نہ ٹھیرائے۔

یہیں سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ جو شخص تقلید اور اتباع کو ایک چیز قرار دیتا ہے وہ غلط فہمی میں مبتلا ہے یا قصداً تلبیس کرتا ہے۔ تقلید در اصل اتباع سے مختلف چیز ہے۔ خود اللہ اور اس کے رسول نے ان دونوں کے درمیان فرق کیا ہے اور اہل علم نے ہمیشہ اس فرق کو ویسا ہی ملحوظ رکھا ہے جیسا کہ ان دونوں کی حقیقتوں میں فرق ہے۔ اتباع کے معنی یہ ہیں کہ تم نے جس شخص کو اپنا پیشوا ٹھیرایا ہے اس کے طریقہ پر چلو اور جو کچھ وہ کرتا تھا وہی تم کرو۔ علامہ ابن عبدالبر نے اپنی کتاب جامع بیان العلم میں ایک مستقل باب اس موضوع پر لکھا ہے جس کا عنوان ہے۔ فساد التقلید ونفیہ والفرق بینہ وبین الاتباع۔ اس میں انہوں نے تقلید اور اتباع کے فرق پر خوب بحث کی ہے۔ لکھتے ہیں:

> "اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی کتاب میں ایک سے زیادہ مقامات پر تقلید کی مذمت کی ہے مثلاً فرمایا۔ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ[1] حضرت حذیفہ ؓ وغیرہ دوسرے بزرگوں سے مروی ہے کہ اس آیت میں احبار اور رہبان کو خدا بنا لینے سے مراد یہ نہیں ہے کہ وہ لوگ خدا کو چھوڑ کر ان کی عبادت کرنے لگے تھے، بلکہ مراد

۱؎ انہوں نے اپنے احبار (علماء) اور رہبان (مشائخ) کو خدا کے بجائے اپنا رب بنا لیا۔

یہ ہے کہ انہوں نے خدا کی کتاب اور اس کے احکام سے بے پرواہی اختیار کی اور اپنے احبار اور رہبان پر اتنا اعتماد کر لیا کہ جس چیز کو انہوں نے حلال ٹھیرا دیا اسے حلال اور جس کو حرام ٹھیرا دیا اسے حرام سمجھنے لگے۔ عدی بن حاتم کی روایت ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جب حاضر ہوا تو میرے گلے میں صلیب لٹکی ہوئی تھی حضور نے فرمایا اے عدی اس کو پھینک دے یہ بت ہے۔ حضور اس وقت سورۂ براۃ تلاوت فرما رہے تھے۔ پڑھتے پڑھتے جب آپ اس آیت پر پہنچے اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ تو میں نے عرض کیا، یا رسول اللہ ہم نے تو ان کو خدا نہیں بنایا۔ حضور نے فرمایا "ضرور بنایا ہے۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ خدا نے جسے حرام ٹھیرایا اسے تمہارے احبار و رہبان حلال ٹھیرا دیتے ہیں اور تم اسے حلال مان لیتے ہو، اور خدا نے جسے حلال ٹھیرایا اسے وہ حرام کر دیتے ہیں اور تم اس کو حرام سمجھ لیتے ہو؟" میں نے عرض کیا یہ تو صحیح ہے۔ آپ نے فرمایا "بس یہی ان کی عبادت اور بندگی ہے۔"[۵۱] ابوالبختری نے اس آیت کی تفسیر میں کہا ہے کہ اگر ان کے احبار اور رہبان ان سے کہتے کہ تم خدا کو چھوڑ کر ہماری عبادت کرو تو وہ ان کی اطاعت نہ کرتے۔ مگر جب انہوں نے خدا کے حلال کیے ہوئے کو حرام اور اس کے حرام ٹھیرائے ہوئے کو حلال قرار دیا تو وہ اس باب میں ان کی اطاعت پر راضی ہو گئے یہی چیز ربوبیت ہے۔ وکیع نے سفیان اور اعمش سے اور انہوں نے حبیب بن ابی ثابت سے اور انہوں نے ابوالبختری سے نقل کیا ہے کہ حضرت حذیفہ سے اس آیت پر سوال کیا گیا کہ نصاریٰ اپنے احبار اور رہبان کی عبادت کب کرتے تھے؟ انہوں نے جواب دیا کہ عبادت تو نہیں کرتے تھے، مگر ان کے حلال کو حلال اور ان کے حرام کو حرام ضرور مانتے تھے۔

---

۵۱ یہ حدیث مسند امام احمد اور ترمذی میں تفصیل کے ساتھ آئی ہے۔ ۲ ۹

"پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ قٰلَ اَوَلَوْ جِئْتُكُمْ بِاَهْدٰى مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَيْهِ اٰبَآءَكُمْ۔ اس طرح جب باپ دادا کی تقلید نے ان کو ہدایت قبول کرنے سے روک دیا تو انہوں نے رسولوں سے صاف کہہ دیا کہ اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۔ ہم اس پیام کو نہیں مانتے جسے تم لائے ہو۔ ایسے ہی لوگوں کے حق میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا وَرَاَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ وَقَالَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ (البقرہ ۲۰)

وہ ایسا دن ہوگا کہ جن کی پیروی کی گئی ہے وہ اپنے پیروؤں سے براءت ظاہر کریں گے اور اپنی آنکھوں سے عذاب دیکھ لیں گے اور ان کے درمیان سب تعلقات ٹوٹ جائیں گے اور پیروی کرنے والے کہیں گے کہ کاش ہم کو ایک موقع اور ملتا تو ہم ان سے اسی طرح تبرّی کرتے جس طرح انہوں نے ہم سے تبرّی کی ہے۔ یوں اللہ ان کے اعمال ان کے سامنے لائیگا اور وہ سیکر حسرت بن جائیں گے۔

پھر اللہ تعالیٰ اہل کفر کی مذمت کرتے ہوئے فرماتا ہے۔

مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ قَالُوْا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ ۔ (انبیاء : ۵)

ابراہیم نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا کہ یہ کیسی مورتیں ہیں جن کے تم گرویدہ ہو رہے ہو؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ان کی پرستش کرتے پایا ہے۔

اور دوسری جگہ ارشاد ہے :-

| | |
|---|---|
| وَقَالُوا رَبَّنَآ إِنَّآ أَطَعْنَا سَادَتَنَا وَ كُبَرَآءَنَا فَأَضَلُّونَا السَّبِيلَا (الاحزاب) | اور انہوں نے کہا کہ خدایا ہم نے اپنے سرداروں اور اپنے بڑوں کی اطاعت کی تھی اور انہی نے ہم کو گمراہ کیا |

اس قسم کی آیات قرآن میں بہت ہیں جن میں باپ دادا اور سرداران قوم کی تقلید کو بُرا کہا گیا ہے۔ علمائے تقلید کے ابطال میں انہی آیات سے استدلال کرتے ہیں اور اس امر کا لحاظ نہیں کرتے کہ یہ آیات جن لوگوں کے حق میں آئی ہیں وہ کافر تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دراصل جو چیز مذمت کے قابل ہے اور جس کی مذمت قرآن میں کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ انسان خدا کی دی ہوئی روشنی سے آنکھیں بند کر کے کسی کے پیچھے ہو لے اور کچھ نہ دیکھے کہ وہ کدھر جا رہا ہے حتیٰ کہ اگر اس کا پیشوا کفر کرے تو یہ بھی کافر ہو جائے۔ اور اگر وہ گناہ کرے تو یہ بھی گناہ کرنے لگے اور اگر وہ کسی مسئلہ میں خطا کرے تو یہ بھی اس خطا میں گرفتار ہو جائے۔ اسی اندھی تقلید کے اعتبار سے کفار کی تقلید کرنے والوں اور اہل ایمان کی تقلید کرنیوالوں کے درمیان مشابہت واقع ہوتی ہے دونوں میں مدارج کا فرق ضرور ہے، ایک زیادہ بُری ہے اور دوسری کم، لیکن نوعیت دونوں کی ایک ہی ہے، اور دونوں جگہ یہی چیز بنائے فساد ہے۔ کفار جو کفر کے خطرے میں مبتلا ہوئے تو اسی وجہ سے ہوئے کہ انہوں نے خدا کی ہدایت سے بے پروا ہو کر اپنے آپ کو انسانوں کے حوالے کر دیا اور آنکھیں بند کر کے اُن کے پیچھے چلنے لگے نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے رہبر جوں جوں خدائی ہدایت سے ہٹتے گئے، یہ بھی ان کے ساتھ ساتھ ہٹتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ جب انہوں نے کفر کی حد میں قدم رکھا تو یہ بھی ان کے پیچھے پیچھے اُسی حد میں پہنچ گئے۔ پس جو لوگ خود آنکھیں کھول کر خدائی ہدایت کو نہیں دیکھتے، اور بالکل دوسرے انسانوں پر اعتماد کر لیتے ہیں۔ وہ دراصل اپنے آپ کو اُسی خطرے میں ڈالتے ہیں جس میں پچھلی اُمتیں

مبتلا ہو کر گمراہ ہو چکی ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًا بَعْدَ اِذْ هَدٰىهُمْ حَتّٰى يُبَيِّنَ لَهُمْ مَّا يَتَّقُوْنَ "اللہ کسی قوم کو ہدایت دینے کے بعد کبھی گمراہی میں نہیں ڈالتا جب تک کہ انہیں واضح طور پر یہ نہ بتادے کہ انہیں کس چیز سے بچنا چاہیے۔"

آگے چل کر علامہ ابن عبد البر لکھتے ہیں:-

"جب مذکورہ بالا دلائل سے تقلید کا بطلان واضح ہوگیا تو لازم آیا کہ ان اصول کو تسلیم کیا جائے جنہیں تسلیم کرنا واجب ہے۔ وہ اصول کیا ہیں؟ اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت، اور جو کچھ ان دونوں سے استدلال کرکے ماخوذ ہو۔"

اس کے بعد علامہ نے وہ حدیث نقل کی ہے جسے کثیر بن عبداللہ بن عمرو بن عوف نے اپنے باپ سے اور انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ارشاد سنا ہے:-

| | |
|---|---|
| انی لا اخاف علی امتی من بعدی الا اعمال ثلثۃ۔ قالوا وما ھی یا رسول اللہ۔ قال اخاف علیھم من زلۃ العالم ومن حکم جائر ومن ھوی متبع۔ | میں اپنے بعد اپنی امت کے لیے تین چیزوں سے ڈرتا ہوں وہ بس تین ہی اعمال ہیں لوگوں نے پوچھا وہ کیا ہیں یا رسول اللہ؟ آپ نے فرمایا میں ڈرتا ہوں عالم کی لغزش سے اور ظالم کے حکم سے اور ہوائے نفس کی پیروی سے۔ |

اور اسی اسناد سے یہ روایت بھی منقول ہے کہ حضور نے فرمایا:-

| | |
|---|---|
| ترکت فیکما امرین لن تضلوا ما تمسکتم بھما کتاب اللہ وسنۃ رسولہ۔ | میں نے تمہارے درمیان دو چیزیں ایسی چھوڑی ہیں کہ اگر تم ان کو تھامے رہو تو کبھی گمراہ نہ ہوگے۔ اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت |

مصنفین اہل السنۃ نے عموماً ابطال تقلید کے ساتھ عالم کی لغزش کا ضرور ذکر کیا ہے کیونکہ تقلید کا فساد اسی سے واضح ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ رسول کے سوا کوئی انسان بھی معصوم نہیں خواہ وہ کتنے ہی بڑے درجہ کا انسان ہو۔ اور جب وہ معصوم نہیں تو ضرور ہے کہ اس سے کہیں نہ کہیں لغزش سرزد ہو۔ اسی بنا پر یہ جائز نہیں کہ اس کے قول کو بلا دلیل و حجت تسلیم کیا جائے اور اس کی بات کو وہ درجہ دیا جائے جو معصوم کی بات کو دینا چاہیے۔ یہی چیز ہے جس کی مذمت تمام علماء نے کی ہے اور اسے حرام ٹھیرایا ہے اور اس کے مرتکبین کی مذمت کی ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ مقلدین جن فتنوں اور بلاؤں میں مبتلا ہوتے ہیں ان کی جڑ یہی ہے۔ وہ ایک عالم کی تقلید اُن چیزوں میں بھی کرتے ہیں جن میں اس سے لغزش ہوئی ہے اور اُن چیزوں میں بھی جن میں اس سے لغزش نہیں ہوئی۔ صحیح اور غلط کے درمیان وہ تمیز کرنے کی کوشش ہی نہیں کرتے، بلکہ تمیز کرنے کی ضرورت بھی نہیں سمجھتے ...... نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے دین کو خطا کے ساتھ لیتے ہیں، اور ناگزیر طور پر اُسی غلطی میں مبتلا ہوجاتے ہیں جس میں یہود و نصاریٰ مبتلا ہوئے، یعنی اللہ کے حلال کیے ہوئے کو حرام اور اس کے حرام ٹھیرائے ہوئے کو حلال کر لینا اور اُن چیزوں کو مشروع بنا لینا جن کو خدا نے مشروع نہیں کیا۔ جب کوئی شخص کسی غیر معصوم انسان کی تقلید اپنے اوپر لازم کرے گا اور بلا دلیل و حجت اس کی پیروی کرے گا تو لا محالہ یہ صورت ضرور پیش آئے گی اور کوئی چیز اس کو پیش آنے سے نہ روک سکیگی۔

بیہقی وغیرہ نے انہی کثیر بن عبداللہ بن عمرو سے مرفوعاً یہ روایت نقل کی ہے کہ اتقوا زلۃ العالم وانتظروا فیئتہ۔ (عالم کی لغزش سے بچو اور غلطی سے اس کے رجوع کا انتظار کرو) نیز بیہقی ہی نے دوسری حدیث مسعود بن سعد سے نقل کی ہے جسے یزید بن ابی زیاد نے مجاہد سے اور انہوں نے ابن عمر سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ انّ اشد ما اتخوف علیٰ امتی ثلاثۃ میں اپنی امت کے حق میں سب سے زیادہ جن چیزوں سے

زلة عالم وجدال منافق بالقرآن ودنیا تقطع اعناقکم۔ ڈرتا ہوں وہ تین ہیں۔ عالم کی لغزش اور منافق کا قرآن سے استدلال اور وہ دنیا جو تمہاری گردنیں کاٹنے لگے۔

اور یہ ظاہر ہے کہ عالم کی لغزش سے خوف کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ لوگ اس لغزش میں اس کی تقلید کرنے لگیں گے اور وہ بہت سے لوگوں کو غلطی میں مبتلا کردے گی۔ اگر تقلید کا خوف نہ ہوتا تو کسی عالم کی لغزش میں امت کے لیے خوف کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔

شعبی کی روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا "دنیا کو بگاڑنے والی تین چیزیں ہیں۔ گمراہ کرنے والے سردار۔ اور منافق کا قرآن سے استدلال اور عالم کی لغزش۔

بیہقی نے ایک اور حدیث نقل کی ہے جس کو حماد بن زید نے مثنیٰ بن سعید سے اور انہوں نے ابو العالیہ سے نقل کیا ہے کہ ابن عباس نے فرمایا پیروی کرنے والوں کے لیے عالم کی لغزشوں میں بڑا خطرہ ہے پوچھا گیا وہ کیا؟ انہوں نے جواب دیا کہ عالم ایک بات اپنی رائے سے بیان کر دیتا ہے پھر اس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ارشاد پہنچ جاتا ہے جس کی بنا پر وہ اپنی پہلی رائے سے رجوع کر لیتا ہے۔ مگر پیروی کرنے والا اس کے پہلے قول ہی کا اتباع کیے چلا جاتا ہے۔

تمیم الداری کا قول ہے کہ عالم کی لغزش سے بچو۔ پوچھا گیا اس میں ڈرنے کی کیا چیز ہے؟ انہوں نے کہا یہ کہ عالم لغزش کرے اور لوگ اس کے پیچھے چل پڑیں، اس لیے کہ بسا اوقات عالم کو خود اپنی غلطی پر تنبہ ہو جاتا ہے اور وہ اس سے رجوع کر لیتا ہے مگر لوگ اسی غلطی پر قائم رہتے ہیں۔

شعبہ نے عمرو بن مرہ سے اور انہوں نے عبداللہ بن سلمہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت معاذ بن جبل نے ایک مرتبہ تقریر کرتے ہوئے فرمایا "اے قوم عرب! تم تین خرابیوں کا کیا علاج کرو گے، ایک وہ دنیا جو تمہاری گردنیں کاٹنے لگے، دوسرے منافق کا قرآن سے استدلال

تیسرے عالم کی لغزش ؟" لوگ خاموش رہے۔ حضرت معاذ نے پھر فرمایا عالم کی لغزش کا علاج یہ ہے کہ کوئی عالم اگر ہدایت پر بھی ہو تب بھی اندھے بن کر اپنے دین کو بالکل اس کے ہاتھ میں نہ دو۔ اور اگر وہ غلطی میں پڑا ہوا ہو تو اس کے مقابلہ میں تمل کو ہاتھ سے نہ دو کیونکہ مومن ایک دفعہ فتنہ میں پڑ جاتا ہے، پھر اس سے توجہ کر لیتا ہے۔ رہا قرآن تو وہ ایک منارہ ہے جیسے راستوں میں منارے ہوتے ہیں کہ وہ کسی سے مخفی نہیں ہوتے پس جو بات تم کو قرآن سے معلوم ہو جائے اس کو کسی سے نہ پوچھو اور جس میں تمہیں شک ہو اسے جاننے والے سے پوچھ لو۔ رہی دنیا تو فلاح وہی پا سکتا ہے جسے خدا کی طرف سے قناعت کی توفیق مل جائے۔ ورنہ حریص کی پیاس تو کبھی دنیا سے بجھ نہیں سکتی

اسی کے قریب قریب حضرت سلمان فارسی کا قول بھی ہے جسے ابو البختری نے روایت کیا ہے۔ اور ابن عبد البرؒ کا بیان ہے کہ حکماء نے عالم کی لغزش کو کشتی کے ٹوٹنے سے تشبیہ دی ہے۔ اس لیے کہ کشتی جب ڈوبتی ہے تو اس کے ساتھ ایک خلقت کی خلقت ڈوب جاتی ہے۔ اس قول کو نقل کرنے کے بعد ابن عبد البر کہتے ہیں کہ جب یہ صحیح اور ثابت ہے کہ عالم سے خطا اور لغزش سرزد ہوتی ہے تو معلوم ہوا کہ کسی شخص کے لیے کسی انسان کے قول پر فتویٰ دینا یا اس کی رائے پر چلنا جائز نہیں تاوقتیکہ اس کو یہ نہ معلوم ہو کہ اس کا قول کس حجت پر مبنی ہے۔ ایک دوسرے بزرگ کا قول ہے کہ جس طرح قاضی تین قسم کے ہیں، اور ان میں سے دو ناری اور ایک جنتی ہے، اسی طرح مفتی بھی تین قسم کے ہیں اور ان میں سے دو ناری ہیں اور صرف ایک جنتی ہے۔ قاضی اور مفتی میں فرق اتنا ہے کہ قاضی پر اس کے فیصلے کا الزام آتا ہے اور مفتی پر نہیں آتا۔

ابو زرعہ عبد الرحمٰن بن عمر بصری نے ابو مسہر سے اور انہوں نے سعید بن عبد العزیز سے اور انہوں نے اسماعیل بن عبید اللہ سے اور انہوں نے سائب بن یزید بن اخت نمر سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا تم لوگوں کی باتیں بہت بُری اور تمہارا کلام

بہت خراب ہے تم آپس میں باتیں کرتے ہو تو کہتے ہو فلاں کا قول یہ ہے اور فلاں یہ کہتا ہے مگر کتاب اللہ کا ذکر کہیں نہیں آتا تم میں سے جو کھڑا ہونا چاہتا ہے وہ کتاب اللہ کو لیکر اٹھے ورنہ بیٹھا رہے"۔ دیکھو! حضرت عمر یہ بات اس زمانہ کے لوگوں سے کہہ رہے ہیں جو تاریخ میں بہترین دور سمجھا جاتا ہے۔ اگر آج وہ دیکھتے کہ لوگ کس طرح کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کو چھوڑ کر عمر و زید کی باتیں کرتے ہیں تو نہ معلوم وہ کیا فرماتے

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے کمیل بن زیاد النخعی سے جو کچھ فرمایا تھا وہ بھی قابل غور ہے۔ یہ حدیث اہل علم میں اس قدر مشہور رہے کہ اس کی اسناد نقل کرنے کی بھی ضرورت نہیں آپ نے فرمایا اے کمیل! یہ دل گویا ظروف ہیں، اور ان میں بہترین ظرف وہ ہے جس میں بھلائی کے لیے زیادہ گنجائش ہو۔ لوگ تین طرح کے ہیں۔ ایک عالم ربانی دوسرا وہ متعلم جو نجات کے راستہ پر چلتا ہو تیسرے حشرات الارض جو ہر شور مچانے والے کے پیچھے چل پڑیں اور ہر بلند بانگ کے گرد جمع ہو جائیں۔ وہ نہ کبھی نور علم سے روشنی حاصل کرتے ہیں اور نہ کبھی کسی مضبوط بنیاد پر قائم ہوتے ہیں۔ پھر اپنے سینہ کی طرف اشارہ کرکے فرمایا آہ! اس میں جو علم ہے کاش مجھے اس کے لینے والے ملتے۔ مگر افسوس کہ مجھے یا تو وہ لوگ ملتے ہیں جو سمجھ تو رکھتے ہیں لیکن دین کو دنیا کے لیے آلہ بنانے والے اور اللہ کی کتاب پر حجتوں سے دست درازی کرنے والے اور اللہ کی نعمتوں کو اس کی نافرمانی میں استعمال کرنے والے ہیں۔ یا پھر ایسے لوگ ملتے ہیں جو حق کے پرستار تو ہیں مگر بصیرت نہیں رکھتے۔ شک پہلا موقع پاتے ہی ان کے دلوں میں گھس جاتا ہے۔ وہ نہیں سمجھ سکتے کہ حق کہاں ہے۔ جب بولتے ہیں تو غلط بولتے ہیں۔ اور جب غلطی کرتے ہیں تو اپنی غلطی پر متنبہ نہیں ہوتے۔ وہ ان چیزوں میں مشغول رہتے ہیں جن کی حقیقت کو وہ نہیں جانتے۔ ایسے لوگ ایک فتنہ ہیں۔ سب سے بڑی بھلائی یہ ہے کہ اللہ کسی کو اپنے دین کی سمجھ عطا کرے اور انسان کے لیے بدترین جہالت یہ ہے کہ وہ اپنے دین کو نہ سمجھے۔

ابو البختری حضرت علی سے روایت کرتے ہیں کہ خبردار لوگوں کے طریقہ کو اپنے لیے سنت نہ بناؤ۔ ایک شخص اہل جنت کا سا عمل کرتا ہے پھر وہ یکایک پلٹ جاتا ہے اور اہل دوزخ کے سے اعمال کرنے لگتا ہے اور اسی حال پر مر جاتا ہے۔ ایک دوسرا شخص اہل دوزخ کا سا عمل کرتا ہے، پھر اللہ اس کا دل پھیر دیتا ہے اور وہ اہل جنت کے سے عمل کرنے لگتا ہے، یہاں تک کہ اسی راہ میں اسے موت آتی ہے۔

ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ تم میں سے کوئی شخص اپنا دین کسی دوسرے شخص کے قبضہ میں نہ دے دے کہ اگر وہ مومن ہوا تو یہ بھی مومن ہوا اور اگر وہ کافر ہوا تو یہ بھی کافر ہو گیا۔ غلطی میں کسی کی بھی پیروی نہ کرنی چاہیے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا اہل علم گذر جائیں گے پھر لوگ جاہلوں کو اپنا سردار بنالیں گے اور وہ بغیر علم کے فتوے دینے لگیں گے خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کر دیں گے۔

یونس بن عبد الاعلیٰ اپنے استاد سفیان بن عیینہ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت ربیعہ سر جھکائے ہوئے رو رہے تھے۔ پوچھا گیا کہ رونے کا سبب کیا ہے۔ فرمایا ظاہر میں ریا ہے۔ اور باطن میں شہوات ہیں علماء کے سامنے لوگوں کا حال بچوں کا سا ہو گیا ہے جس چیز کو وہ حرام ٹھیرا دیتے ہیں وہ حرام ہو جاتی ہے اور جسے مشروع قرار دیتے ہیں وہ مشروع بن جاتی ہے۔

عبد اللہ بن المعتمر کہتے ہیں کہ حیوان منقاد اور انسان مقلد میں کوئی فرق نہیں۔ پھر وہ ابن وہب سے ایک حدیث نقل کرتے ہیں جس کو انہوں نے سعید بن ابی ایوب سے اور انہوں نے بکر بن عمر سے اور انہوں نے عمرو بن ابی نعیمہ سے اور انہوں نے مسلم بن یسار سے اور انہوں نے ابو ہریرہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس کسی نے میری طرف سے ایسی بات بیان کی جو میں نے نہیں کہی ہے وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں ڈھونڈھ لے۔ اور اگر کوئی اپنے بھائی سے مشورہ لے اور وہ اس کو بے ٹھکانے

بوجھے رائے دے دے تو گویا اس نے اپنے بھائی سے خیانت کی۔ اور اگر کوئی بغیر ثبوت کے فتویٰ دیدے تو جو لوگ اس کے فتوے سے غلطی سے مبتلا ہوں گے ان کا وبال اسی فتویٰ دینے والے پر ہوگا۔

یہ حدیث اس بات پر دلیل ہے کہ تقلیداً فتویٰ دینا حرام ہے۔ اس لیے کہ اس قسم کا فتویٰ بے ثبوت ہی ہے۔ ثبوت کے معنی بالاتفاق یہ قرار دیئے گئے ہیں کہ ایسی حجت جس سے حکم ثابت ہوتا ہو۔ پس جب کہ انسان کا قول حجت ہی نہیں ہے تو اس کی بنیاد پر جو فتویٰ ہوگا وہ بے ثبوت نہیں تو اور کیا ہوا۔

ابو عبد اللہ بن خواز منداد البصری المالکی نے لکھا ہے کہ اصطلاح شرعی میں تقلید کے معنی ہیں کسی شخص کے قول کی طرف رجوع کرنا بغیر اس کے کہ اس کی حجت معلوم کی جائے۔ یہ شریعت میں ممنوع ہے۔ اور اتباع کے معنی ہیں کسی شخص کی حجت کو قبول کرکے اس کے قول کی پیروی کرنا۔ یہ فعل شرعاً جائز ہے۔ ایک دوسری جگہ یہی بزرگ لکھتے ہیں کہ جب تم نے کسی شخص کے قول کی پیروی اختیار کی بغیر اس کے کہ کوئی دلیل ایسی ہو جس کی بنا پر تم اس کی بات مان رہے ہو تو تم اس کے مقلد ہوئے اور اللہ کے دین میں ایسی تقلید درست نہیں اور اگر تم کسی شخص کی دلیل سے مطمئن ہو کر اس کے قول کی پیروی کرو تو یہ اتباع ہے، اور اتباع شریعت میں درست ہے۔

محمد بن حارث نے سحنون بن سعید کے حالات میں خود سحنون سے یہ روایت نقل کی ہے کہ امام مالک اور عبد العزیز بن ابی سلمہ اور محمد بن ابراہیم بن دینار وغیرہم اکثر ابن ہرمز کے پاس جایا کرتے تھے ابن ہرمز کا طریقہ یہ تھا کہ جب مالک اور عبد العزیز کچھ پوچھتے تو وہ اس کا جواب دیدیتے اور جب ابن دینار اور ان کے ساتھی کچھ پوچھتے تو وہ جواب نہ دیتے۔ ایک روز ابن دینار نے ان سے شکایت کی۔ انہوں نے جواب دیا کہ بھتیجے میں بڈھا آدمی ہوں۔ مجھے ڈر ہے کہ جس طرح میرے جسم میں انحطاط پیدا ہوگیا ہے ممکن ہے کہ میری عقل میں بھی ہوگیا ہو۔ مالک اور عبد العزیز عالم اور فقیہ ہیں میں سمجھتا ہوں کہ مجھ سے جو بات سنیں گے وہ اگر حق ہوگی تو قبول کریں گے اور اگر غلط ہوگی تو رد کر دیں گے۔

تم لوگوں سے مجھے اندیشہ ہے کہ جو کچھ میں کہوں گا اسے مانتے چلے جاؤ گے اس واقعہ کو نقل کرکے ابن حارث لکھتے ہیں کہ یہ ہے اہل حق کا طریقہ۔ نہ یہ کہ انسان جو کچھ ہذیان بکے اسے چاہے کہ لوگ اس طرح قبول کریں جیسے قرآن نازل ہو رہا ہے۔

تمام بزرگان سلف اور ائمۂ اربعہ کا یہی طریقہ تھا کہ وہ لوگوں کو خود اپنی تقلید سے منع کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ہماری بات کو دلیل و حجت کے بغیر تسلیم نہ کرو۔

امام شافعی فرماتے ہیں کہ جو شخص علم کو حجت کے بغیر لیتا ہے اس کی مثال رات کے اندھیرے میں لکڑیاں چننے والے کی سی ہے کہ وہ لکڑیوں کو بغیر دیکھے بھالے اٹھاتا جاتا ہے اور اسے خبر نہیں کہ ان میں کہاں کوئی سانپ چھپا ہوا ہے جو اسے ڈس لے گا۔

ابوداؤد نے لکھا ہے کہ میں نے ایک مرتبہ امام احمد سے کہا اوزاعی تو مالک سے مقدم ہیں انہوں نے جواب دیا کہ "تم اپنے دین کو ان میں سے کسی کے بھی حوالہ نہ کرو۔ جو کچھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب سے ثابت ہو جائے اس کو قبول کر لو۔ ان کے بعد تابعین کے اقوال میں تمہیں اختیار ہے جسے چاہو قبول کرو اور جسے چاہو رد کر دو۔

امام احمد نے تقلید اور اتباع میں فرق کیا ہے۔ ابوداؤد ان کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ اتباع یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب سے جو کچھ ثابت ہو اس کی پیروی کی جائے۔ بعد کے کسی شخص کا قول حجت نہیں ہے۔ نیز وہ فرماتے ہیں کہ تم نہ میری تقلید کرو نہ مالک کی نہ ثوری کی نہ اوزاعی کی بلکہ جہاں سے ہم نے لیا ہے۔ وہیں سے تم بھی لو۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ انسان کی ناسمجھی کی دلیل ہے کہ وہ اپنے دین کو اشخاص کے ہاتھ میں دیدے۔

بشر بن ولید نے امام ابو یوسف کا یہ قول نقل کیا ہے کہ کسی شخص کے لیے ہمارے قول کا اتباع جائز نہیں تاوقتیکہ وہ یہ نہ جان لے کہ ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں کس بنا پر کہہ رہے ہیں۔

## رسائل و مسائل

# نماز اور خطبۂ جمعہ کی زبان

## (۲)

**۲۔ خطبۂ جمعہ کی زبان** اب ہم سوال کے دوسرے حصہ کی طرف رجوع کرتے ہیں جو خطبۂ جمعہ کی زبان سے تعلق رکھتا ہے۔ اس مسئلہ میں یہ ایک عام غلطی ہے کہ خطبہ کی زبان کے سوال کو نماز کی زبان کے سوال سے مربوط کر دیا جاتا ہے اور اس سے بڑا خلط مبحث واقع ہوتا ہے۔ لہذا پہلے ہم اسی امر کی توضیح کریں گے کہ نماز اور خطبہ کی حیثیتوں میں کیا فرق ہے۔

**خطبہ جزء صلاۃ نہیں** بعض لوگوں کا خیال ہے کہ خطبہ نماز جمعہ کا جزء ہے۔ اس کی دلیل وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ ظہر کی چار رکعتوں میں سے دو رکعتیں خطبہ ہی کے لیے کم کی گئی ہیں، جیسا کہ احادیث میں حضرت عمر اور حضرت عائشہ سے منقول ہے کہ انما قصرت الجمعۃ لاجل الخطبۃ اس بنا پر وہ کہتے ہیں کہ خطبہ بحکم نماز کی دو رکعتوں کا قائم مقام ہے لہذا اس کی حیثیت بھی وہی ہے جو نماز کی ہے۔ اور جب نماز غیر عربی میں پڑھنا درست نہیں تو خطبہ بھی غیر عربی میں پڑھنا درست نہیں۔

لیکن یہ محض ایک سطحی رائے ہے۔ دونوں کے احکام کی تفصیلات پر نظر ڈالنے سے صاف معلوم ہوجاتا ہے کہ جو امور نماز کے لیے شرط ہیں وہ خطبہ کے لیے شرط نہیں ہیں۔ نماز کے لیے طہارت شرط ہے، مگر خطبہ کے لیے شرط نہیں، حتیٰ کہ اگر سہواً حالت جنابت میں بھی خطبہ پڑھ دیا ہو تو اعادہ کی ضرورت نہیں۔ نماز کے لیے قبلہ رخ ہونا ضروری ہے۔ مگر خطبۂ جمعہ کے لیے نہ صرف یہ کہ استقبال قبلہ ضروری نہیں بلکہ قبلہ کی طرف پشت کرکے مقتدیوں کی طرف رخ کرنے کا حکم ہے۔ نماز میں گفتگو کرنے سے فساد واقع ہوجاتا ہے۔ مگر خطبہ میں کلام

کیا جا سکتا ہے اور خود نبی اکرم اور صحابۂ کرام سے یہ فعل ثابت ہے جیسا کہ آگے چل کر ہم بیان کریں گے۔ نماز کے لیے وقت بھی شرط ہے لیکن خطبہ اگر وقت سے پہلے شروع کر دیا جائے تو کوئی حرج نہیں۔ نماز جمعہ میں حنفیہ کے نزدیک کم از کم تین آدمیوں کا ہونا ضروری ہے لیکن خطبہ میں اگر امام کے سوا صرف ایک آدمی ہو تب بھی کافی ہے۔ نماز جمعہ اگر فاسد ہو جائے تو اس کا اعادہ کیا جائے گا لیکن خطبہ کا اعادہ نہیں کیا جائے گا۔ یہ سب امور اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ خطبہ نماز جمعہ کا جزو نہیں ہے چنانچہ علامہ سرخسی لکھتے ہیں۔

| | |
|---|---|
| قال بعض مشائخنا الخطبة تقوم مقام رکعتین ولهذا لا تجوز الا بعد دخول الوقت والاصح انها لا تقوم مقام شطر الصلوٰة۔ (المبسوط ۸ کتاب الجمعہ) | ہمارے بعض مشائخ کہتے ہیں کہ خطبہ چونکہ دو رکعتوں کا قائم مقام ہے اس لیے ظہر کا وقت شروع ہونے سے پہلے خطبہ پڑھنا جائز نہیں۔ مگر صحیح یہ ہے کہ خطبہ کی حیثیت نماز کے ایک حصہ کی نہیں ہے۔ |

اور شرح العنایہ علی الھدایہ میں ہے۔

| | |
|---|---|
| انما لیست برکن لان رکن الشیٔ ما یقوم به ذالک الشیٔ وصلوٰة الجمعة لا تقوم بالخطبة وانما تقوم بارکانها فکانت شرطاً۔ | خطبہ رکن نماز نہیں ہے کیونکہ کسی چیز کا رکن تو وہ ہوتا ہے جس سے وہ چیز قائم ہوتی ہو اور نماز جمعہ خطبہ سے قائم نہیں ہوتی بلکہ اپنے ارکان سے ہوتی ہے لہٰذا خطبہ رکن نہیں بلکہ شرط ہے۔ |

<u>نماز اور خطبے کے مقاصد کا فرق</u> اس میں شک نہیں کہ خطبہ بھی نماز کی طرح ایک عبادت ہے لیکن دونوں کے مقاصد مختلف ہیں۔ نماز سے جو کچھ مقصود ہے وہ بغیر اس کے بھی حاصل ہو سکتا ہے کہ انسان اُن عبارات کو سمجھے جن کو وہ نماز میں پڑھتا ہے۔ اس لیے کہ اُس کا خدا کی فرض کی ہوئی عبادت کو فرض سمجھنا اور نماز کا وقت آنے پر ادائے فرض کے لیے اٹھنا، اور اس کا اہتمام کرنا، پھر پوری شرائط اور تمام ارکان

کے ساتھ نماز کو اس طرح ادا کرنا کہ گویا اسے اس امر کا شعور ہے کہ خدا اس کی خفی سے خفی باتوں کو سن رہا ہے اور یہ کہ اگر وہ نماز میں کوئی چیز بھی کم کرے گا تو خدا کو اس کا علم ہو جائے گا، پھر اس کا یہ سمجھنا کہ یہ رکوع و سجود، و قیام و قعود جو کچھ بھی میں کر رہا ہوں صرف خدا کے لیے ہے اور خدا کے سوا کسی کی عبادت گذار نہیں ہوں، یہ سب امور اس مقصد کی تحصیل کے لیے بالکل کافی ہیں جس کے لیے نماز فرض کی گئی ہے۔ لیکن خطبہ جس غرض کے لیے مقرر کیا گیا ہے وہ بغیر اس کے حاصل نہیں ہوتی کہ سامعین اس کو سمجھیں، اس لیے کہ خطبہ کا مقصد محض خدا کی یاد اور ذات حق کی طرف رجوع و خشیت اور انابت ہی نہیں ہے، بلکہ احکام دین کی تبلیغ و تعلیم اور وعظ و تذکیر بھی ہے۔ اور یہ مقصد حاصل ہی نہیں ہو سکتا جب تک کہ لوگ ان احکام اور مواعظ کو سمجھیں نہیں جو خطبہ میں بیان کئے جاتے ہیں۔

**خطبہ کا مقصد** بعض لوگ اس امر سے انکار کرتے ہیں کہ خطبہ کا مقصد تبلیغ احکام اور وعظ و تذکیر ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے خطبہ کو ذکر اللہ سے تعبیر کیا ہے۔ (فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ) لہٰذا خطبہ بھی ویسی ہی ایک عبادت ہے جیسی کہ نماز ہے اور اس کے لیے بھی یہ ضروری نہیں کہ لوگ اس کو سمجھیں۔ اس کی تائید میں وہ امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کا یہ قول پیش کرتے ہیں کہ خطبہ کی شرط پوری کرنے کے لیے صرف اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کافی ہے اور عرف عام میں جس چیز کو خطبہ سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ نماز جمعہ کے لیے شرط نہیں ہے۔ نیز وہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے اس واقعے سے استدلال کرتے ہیں کہ جب آپ خلیفہ ہوئے اور خطبہ دینے کے لیے اٹھے تو آپ پر مجمع کا رعب طاری ہو گیا۔ اور آپ صرف الحمد للہ کہہ کر بیٹھ گئے اور صحابۂ کرام کی جماعت نے اس پر کوئی اعتراض نہ کیا۔

لیکن یہ استدلال متعدد وجوہ سے غلط ہے۔

اولاً یہ یقینی نہیں کہ آیۂ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ میں ذکر اللہ سے مراد خطبۂ جمعہ ہے۔ ذکر سے مراد نماز بھی ہو سکتی ہے، بلکہ قرآن میں اکثر اس لفظ سے نماز ہی مراد لی گئی ہے۔ مفسرین اور فقہ

میں یہ امر مختلف فیہ ہے کہ آیا ذکر سے مراد صرف خطبہ ہے یا صرف نماز یا نماز اور خطبہ دونوںؕ۔ مگر آیت کے سیاق پر غور کرنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ذکر کو نماز کے معنی میں لینا زیادہ درست ہے، کیونکہ پہلے اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ فرمایا پھر اس کی جزا یہ بیان کی کہ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ۔ اس سے معلوم ہوا کہ اصل میں ذکر سے مراد نماز ہی ہے، اور خطبہ محض ضمناً ذکر میں شامل ہو جاتا ہے۔ ورنہ اگر ذکر سے مراد صرف خطبہ ہوتا تو اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ وَالصَّلٰوۃِ فرمایا جاتا۔

ثانیاً اگر ذکر اللہ کو نماز کے معنی میں نہ لیا جائے بلکہ یاد خدا کے معنی میں لیا جائے تو یہ کس دلیل سے ثابت ہوا کہ خدا کی یاد صرف عربی زبان ہی میں ہونی چاہیے؟ اللہ کے ذکر کو عربی زبان تک محدود کرنا تو عقل اور نقل دونوں کے خلاف ہے۔ قرآن اور حدیث میں کہیں بھی یہ نہیں کہا گیا کہ خدا کو یاد کرنا ہو تو صرف عربی میں کرو۔ چنانچہ اسی بنا پر امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ الذکر المفید للتعظیم یحصل بخدای بزرگ ست کما یحصل بقولہ اللہ اکبر۔ اور امام محمد ان کی تائید میں کہتے ہیں۔ الذکر یحصل بکل لسان۔

ثالثاً خطبہ کی شرط پوری کرنے کے لیے اگر حنفیہ نے محض حمد و ثنا کو کافی سمجھا ہے تو اس کے معنی یہ کب ہیں کہ خطبہ کا جو مقصد ہے وہ بس حمد و ثنا ہی سے حاصل ہو جاتا ہے اور اس کے سوا دوسری چیزیں محض زوائد ہیں جن کی کوئی اہمیت نہیں[۲]۔ حنفیہ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ نماز جمعہ کے لیے جماعت کی شرط صرف

---

[۱] علامہ ابن ہمام کہتے ہیں: فاسعوا الی ذکر اللہ فالظاہر ان المراد بالذکر الصلوٰۃ ویجوز کون المراد بہ الخطبۃ (فتح القدیر)۔ صاحب روح المعانی لکھتے ہیں: والمراد بذکر اللہ الخطبۃ والصلوٰۃ وستظہر ان المراد بہ الصلوٰۃ وجوز کون المراد بہ الخطبۃ۔ سعید بن المسیب کے نزدیک ذکر سے مراد موعظۃ الامام ہے (احکام القرآن للجصاص)۔ علامہ ابوبکر جصاص کی رائے یہ ہے کہ ذکر سے مراد صرف خطبہ ہے۔ ویدل علی ان المراد بالذکر ھٰھنا ھو الخطبۃ لان الخطبۃ ھی التی تلی النداء وقد امر بالسعی الیہ فدل علی ان المراد الخطبۃ۔

[۲] حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے واقعہ سے جو استدلال کیا جاتا ہے وہ درست نہیں۔ اول تو اس واقعہ میں خود اس کی تصریح ہے کہ حضرت عثمان نے قصداً ایسا نہیں کیا تھا، بلکہ مجمع سے مرعوب ہو جانے کی وجہ سے آپ کی قوت گویائی جواب

بقیہ حاشیہ بر صفحہ ۶۷

تین آدمیوں سے پوری ہو جاتی ہے۔ کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ جمعہ کی اقامت سے جو مقصد ہے وہ بس اسی مختصر سی جماعت سے حاصل ہو جاتا ہے؟ اور جماعت کثیرہ کا فراہم ہونا کوئی اہمیت نہیں رکھتا؟ رابعاً خود اکابر حنفیہ ہی نے یہ تصریح کی ہے کہ خطبہ سے مقصود ذکر اور موعظت ہے۔ چنانچہ ہدایہ میں ہے ولو خطب قاعداً او علیٰ غیر طہارۃ جاز لحصول المقصود۔ علامہ ابن ہمام مقصود کی شرح کرتے ہیں وهو الذکر والموعظة۔ حنفیہ ہی پر کیا موقوف ہے متقدمین سب کے سب خطبہ کا مقصد یہی سمجھتے تھے اور اسی بنا پر ان کی زبان میں اکثر خطبہ کے لیے "موعظۃ الامام" کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ علامہ ابن حجر فتح الباری میں ایک حدیث کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

ومن حکمة استقبالهم للامام التهيؤ لسماع کلامه وسلوك الادب معه في استماع کلامه فاذا استقبله بوجهه واقبل عليه بجسده وبقلبه وحضور ذهنه کان ادعیٰ لتفهيم موعظته وموافقته فيما شرع له القيام لاجله۔ (ج ۲ ص ۲۰۳)

حاضرین کو امام کی طرف رخ کرکے بیٹھنے کی جو ہدایت کی گئی اس کی حکمت یہ ہے کہ وہ اس کے کلام کو سننے کے لیے تیار ہوں اور کلام کی سماعت میں اس کے ساتھ ادب کو ملحوظ رکھیں جب سننے والا اپنا چہرہ اس کی طرف رکھے گا اور اپنے جسم و قلب کے ساتھ اس کی جانب متوجہ ہوگا اور حضور ذہن کے ساتھ سنے گا تو امام کی موعظت اچھی طرح اس کی سمجھ میں آئے گی

اور یہ اس مقصد کے لیے مددگار ہوگا جس کے لیے امام کو کھڑے ہو کر خطبہ دینے کا حکم دیا گیا ہے۔

خامساً یہ امر غور طلب ہے کہ اگر خطبہ کا طریقہ جاری کرنے سے شارع کا مقصد محض اللہ کا ذکر ہی کرنا ہوتا تو کیا اس کے لیے نماز کافی نہ تھی، حالانکہ وہ اس مقصد کو بدرجۂ اتم پورا کرتی ہے۔ آخر کیا وجہ

لہ تکملہ حاشیہ ص ۲۲۶ دے گئی تھی اس لیے آپ نے مجبوراً خطبہ مختصر کر دیا۔ دوسرے یہ بھی غلط ہے کہ آنجناب نے صرف حمد و ثنا پر اکتفا کی تھی۔ دراصل واقعہ یہ ہے کہ جب آپ نے دیکھا کہ قوت گویائی جواب دے رہی ہے تو صرف اتنا کہہ کر بیٹھ گئے کہ ان ابابکر و عمر کانا یعدان لهذا المقام مقالا وانتم الی امام فعال احوج منکم الی امام قوال وستاتیکم الخطب بعد واستغفر الله لی ولکم۔

کہ نماز جیسی کامل و اکمل عبادت کو مختصر کرکے اس کے وقت کا ایک حصہ خطبہ کو دیا گیا اور اس کو جمعہ کی شرائط میں داخل کیا گیا۔

سا بناناز جمعہ کے لیے خطبہ کا اشتراط جس چیز سے فقہاء نے نکالا ہے وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا متواتر عمل ہے چونکہ آنحضرت اور آپ کے خلفاء اور صحابہ کرام نے کبھی جمعہ بغیر خطبہ کے نہیں پڑھا اس لیے یہ حکم مستنبط کیا گیا کہ جمعہ کے لیے خطبہ شرط ہے۔ بالکل اسی طرح آپ کے اور صحابہ کرام کے متواتر عمل سے ہم کو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ خطبہ محض حمد و ثنا ہی پر مشتمل نہ ہوتا تھا، بلکہ اس میں شریعت کے احکام بیان ہوتے تھے، اخلاق و اعمال کی اصلاح کے لیے نصیحتیں ہوتی تھیں، قومی اور شخصی معاملات پر توجہ کی جاتی تھی، حتیٰ کہ عین خطبہ ہی کی حالت میں امام کسی خاص شخص کی کوئی غلطی دیکھتا تو اس کی اصلاح کرتا، کسی مصیبت زدہ کو دیکھتا تو اس کی مدد کے لیے لوگوں کو توجہ دلاتا، عوام میں سے کسی کو کوئی شکایت ہوتی تو وہ امام کے سامنے اسے پیش کرتا، اور امام اس کی طرف متوجہ ہوتا۔ جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین نے کوئی جمعہ بغیر خطبہ کے نہیں پڑھا اسی طرح آپ نے اور آپ کے صحابہ نے کوئی خطبہ ایسا بھی نہیں پڑھا جو مذکورۂ بالا خصوصیات سے عاری ہو۔

**چند خطبِ ماثورہ**

اس مطلب کی توضیح کے لیے ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چند خطبات یہاں نقل کرتے ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ شارع کی نگاہ میں خطبۂ جمعہ کی دراصل کیا حیثیت تھی۔

عن عبید بن السباق مرسلاً قال رسول اللہ صلعم فی جمعۃ من الجمع یا معشر المسلمین ان ھذا یوم جعلہ اللہُ عیداً فاغتسلوا ومن کان عندہٗ طیب فلا یضرُّہٗ ان یمس منہ وعلیکم بالسواک۔ (موطا، ابن ماجہ)

عبید بن السباق سے مرسلاً مروی ہے کہ حضور نے ایک مرتبہ جمعہ کے خطبہ میں فرمایا اے مسلمانو! اس دن کو اللہ نے عید مقرر کیا ہے۔ لہٰذا تم آج کے دن غسل کیا کرو اور جس کے پاس خوشبو موجود ہو وہ اگر استعمال کرے تو کیا نقصان ہے۔ اور دیکھو مسواک ضرور کرو۔

ابو سعید خدری سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضور نے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا کہ مجھے تمہارے حق میں سب سے زیادہ جس چیز کا خوف ہے وہ زمین کی برکات ہیں۔ کسی نے پوچھا یا رسول اللہ زمین کی برکات سے کیا مراد ہے؟ حضور نے جواب دیا دنیا کی زینت و شوکت۔ اس پر ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا برائی سے بھی بھلائی آتی ہے؟ حضور سن کر خاموش ہو گئے یہاں تک کہ لوگوں نے گمان کیا کہ کوئی چیز آپ پر اتر رہی ہے۔ پھر آپ نے اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھا اور فرمایا وہ سائل کہاں ہے۔ اس شخص نے کہا میں ہوں۔ آپ نے فرمایا بھلائی صرف بھلائی ہی سے آتی ہے۔ اس دنیا کا مال بہت خوش نما اور شیریں ہے فصل بہار میں جب یہ خوب پھلتی ہے تو اسے پیٹ بھر کر کھانے والا جانور بدہضمی سے مرجاتا ہے یا مرنے کے قریب جا لگتا ہے۔ البتہ وہ جانور بچ جاتا ہے جس نے دیکھا کہ کھاتے کھاتے کوکھیں پھیل گئی ہیں تو کھانا چھوڑ دیا، دھوپ میں چلا پھرا، کچھ جگالی کی، کچھ پیشاب اور پاخانہ کی راہ سے نکالا اور جب پیٹ خالی ہو گیا تب دوبارہ کھانے کی طرف متوجہ ہوا۔ اس مال کو جو شخص حق کی راہ سے لیگا اور حق کی راہ میں نکال دے گا اس کے لیے تو یہ بہترین مددگار ہے۔ اور جو حق کے بغیر لے گا۔ اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جو کھاتا چلا جائے اور شکم سیر نہ ہو۔ (بخاری کتاب الرقاق و کتاب الزکوٰۃ)۔

عمرو بن تغلب کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضور کے پاس کچھ مال آیا تھا جس کو آپ نے بعض لوگوں میں بانٹ دیا۔ اور بعض کو چھوڑ دیا۔ بعد میں آپ کو معلوم ہوا کہ جن لوگوں کو چھوڑ دیا گیا ہے انھیں رنج ہے۔ اس کے متعلق آپ نے خطبہ میں فرمایا کہ میں ایک شخص کو دیتا ہوں اور دوسرے کو جس کو میں نہیں دیتا وہ مجھے اس سے زیادہ محبوب ہوتا ہے جس کو میں دیتا ہوں۔ ایک جماعت کو دیتا ہوں جبکہ ان کے دلوں میں بے تابی اور بے چینی دیکھتا ہوں۔ اور ایک جماعت کو اس بے نیازی اور نیکی کے حوالے کر دیتا ہوں جو اللہ نے ان کے دلوں میں پیدا کی ہے۔ (بخاری)

مشہور حدیث ہے کہ ایک شخص نماز جمعہ میں حاضر ہوا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دے رہے تھے

آپ نے پکار کر اس سے پوچھا اے شخص! کیا تو نماز پڑھ چکا ہے؟ اس نے عرض کیا نہیں۔ آپ نے فرمایا تو اٹھ اور نماز پڑھ۔ دراصل یہ شخص پھٹے حالوں تھا۔ آپ کا مقصد یہ تھا کہ لوگ اس کی بد حالی کو دیکھ لیں۔ جب وہ نماز پڑھ چکا تو آپ نے لوگوں کو صدقہ کی ترغیب دلائی۔ اس حدیث کے اطراف قریب قریب تمام صحاح اور سنن اور مسانید میں آئے ہیں۔ امام احمد نے جو حدیث نقل کی ہے اس میں خود حضور کے یہ الفاظ منقول ہیں کہ "یہ شخص جب مسجد میں داخل ہوا تو میں نے دیکھا کہ بہت شکستہ حال ہے اس لیے میں نے اسے حکم دیا کہ دو رکعت نماز پڑھے میں چاہتا تھا کہ کوئی شخص اس کی حالت دیکھے اور اس کو کچھ صدقہ دیدے۔"

ایک اور حدیث میں ہے کہ حضور خطبہ دے رہے تھے۔ دیکھا کہ ایک شخص لوگوں کے اوپر سے پھاندتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے۔ آپ نے پکار کر فرمایا بیٹھ جاؤ، تم نے لوگوں کو تکلیف دی (ابوداؤد، نسائی)

حضرت انس کی روایت ہے کہ ایک روز حضور خطبہ دے رہے تھے اور قحط سالی کا زمانہ تھا ایک شخص نے فریاد کی کہ یا رسول اللہ جانور مر گئے اور بال بچے فاقہ کر رہے ہیں۔ اللہ سے دعا فرمائیے کہ بارش ہو جائے۔ آپ نے اسی وقت ہاتھ اٹھا کر دعا فرمائی خدا کے فضل سے بارش شروع ہو گئی اور دوسرے جمعہ تک لگاتار جاری رہی۔ پھر دوسرے جمعہ کو آپ خطبہ دینے کھڑے ہوئے تو وہی شخص پھر اٹھا اور بولا کہ یا رسول اللہ مکان گر گئے اور مال و اسباب تباہ ہو رہے ہیں۔ خدا سے دعا فرمائیے۔ آپ نے پھر دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔

مشہور واقعہ ہے کہ ایک دفعہ حضرت عمر خطبہ دے رہے تھے۔ اتنے میں حضرت عثمان تشریف لائے حضرت عمر نے فرمایا لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ ندائے جمعہ کے بعد نماز کے لیے آنے میں دیر کرتے ہیں۔ پھر حضرت عثمان کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا یہ کونسا وقت ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ میں کام میں لگا ہوا تھا اذان کی آواز سنی تو گھر جانے کے بجائے وضو کر کے سیدھا یہاں چلا آ رہا ہوں۔ حضرت عمر نے یہ سن کر

فرمایا خوب! تاخیر تو تھی ہی۔ اب معلوم ہوا کہ آپ صرف وضو ہی پر اکتفا کر آئے ہیں۔ تم جانتے ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جمعہ کے روز غسل کرنے کا حکم دیا ہے۔ (بخاری، موطا، مسلم)

یہ اُن کثیر التعداد خطبوں میں سے چند ہیں جو معتبر روایات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام سے منقول ہیں اور ان کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جمعہ کا خطبہ جن کے عمل متواتر کی بدولت مشروع سمجھا گیا ہے ان کے اس خطبہ کے معنی محض ذکر اللہ کے نہ تھے بلکہ وہ اس سے تبلیغ، تعلیم، اصلاح، ہدایت اور بہت سے قومی وشخصی معاملات کی انجام دہی کا کام لیتے تھے۔ دراصل یہ چیز اس لیے شروع نہیں کی گئی تھی کہ لوگ ہفتہ میں ایک بار نماز سے پہلے رسمی طور پر کسی قسم کی ایک چیز سن لیں جیسی مسیحی گرجاؤں میں وعظ (سرمن) کے نام سے سنائی جاتی ہے۔ بلکہ اس کو مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کا ایک متحرک اور کارفرما پرزہ بنایا گیا تھا، اور اس کا مقصد یہ تھا کہ ہفتہ میں ایک مرتبہ لازمی طور پر تمام مسلمانوں کو جمع کرکے اللہ کے احکام سنائے جائیں، دین کی تعلیمات ان کے ذہن نشین کی جائیں۔ ان کی جماعت میں یا ان کے افراد میں جو کچھ خرابیاں رونما ہوں ان کی اصلاح کی جائے، اور قومی فلاح وبہبود کے کاموں کی طرف انہیں توجہ دلائی جائے۔

**نماز اور خطبہ کا ایک اور فرق** نماز اور خطبۂ جمعہ کے درمیان ایک فرق اور بھی ہے، اور وہ یہ ہے کہ نماز میں جتنی چیزیں پڑھی جاتی ہیں وہ سب لفظاً لفظاً معین کر دی گئی ہیں۔ جو شخص عربی نہ جانتا ہو وہ تھوڑا سا وقت صرف کرکے بآسانی ان کا ترجمہ یاد کر سکتا ہے، یا ان کے مفہومات ذہن نشین کر سکتا ہے پس نماز کے عربی زبان میں ہونے سے درحقیقت اس امر کا بھی کوئی خوف نہیں ہے کہ عربی نہ جاننے والے ان عبارات کے معنوی فوائد سے بالکل ہی محروم رہ جائیں گے جنھیں نماز میں وہ پڑھتے ہیں۔ بخلاف اس کے خطبۂ جمعہ کے لیے کوئی عبارت مقرر نہیں۔ ہر جمعہ کو ایک نیا خطبہ ہوتا ہے اور اس کا ترجمہ پہلے سے یاد کر لینا

یا اس کا مفہوم ذہن نشین کر کے آنا لوگوں کے لیے کسی طرح ممکن نہیں۔ پس خطبہ کے لیے عربی زبان کو لازم کر دینے کا نتیجہ قطعاً یہی ہے کہ غیر عربی داں لوگوں کے حق میں وہ محض ایک بے معنی چیز اور ایک بے جان مذہبی رسم بن کر رہ جائے اور شارع کے وہ تمام مقاصد فوت ہو جائیں جن کے لیے اس نے جمعہ کا خطبہ مشروع کیا ہے۔ ایک معمولی عقل کا انسان بھی یہ سمجھ سکتا ہے کہ ترکی بولنے والوں کے سامنے سنسکرت میں تقریر کرنا اور فارسی زبان والوں کو جرمن زبان میں خطاب کرنا محض ایک مہمل حرکت ہے پھر شارع حکیم سے متعلق یہ کیونکر گمان کیا جا سکتا ہے کہ وہ احکام دین کی تفہیم اور مکارم اخلاق کی تعلیم کے لیے کسی ایسی زبان میں وعظ کرنے کا حکم دیگا جس کو سامعین سمجھتے ہی نہ ہوں۔

خلاصۂ مباحث گذشتہ | یہاں تک جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس سے تین باتیں واضح ہو جاتی ہیں:۔

ایک یہ کہ خطبہ نماز کا جز نہیں ہے، لہٰذا نماز کے لیے عربیت کے واجب ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ خطبہ کے لیے بھی عربیت واجب ہو۔

دوسرے یہ کہ خطبہ کو مشروع کرنے سے شارع کے پیش نظر جس قدر مقاصد ہیں وہ سب کے سب ایسی حالت میں فوت ہو جاتے ہیں جب کہ خطبہ کسی ایسی زبان میں پڑھا جائے جس کو سامعین نہ سمجھتے ہوں بخلاف اس کے نماز جن مقاصد کیلیے شارع نے فرض کی ہے ان میں سے کوئی اہم مقصد مصلیوں کے عدم فہم سے فوت نہیں ہوتا۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھیے کہ عدم فہم سے نماز میں تو محض ایک جزئی سا نقصان آتا ہے مگر خطبہ میں اس سے کلی نقصان واقع ہو جاتا ہے۔

تیسرے یہ کہ نماز میں عدم فہم سے جو ایک جزئی سا نقصان واقع ہوتا ہے وہ بھی بآسانی رفع کیا جا سکتا ہے لیکن خطبہ میں اس سے جو کلی نقصان واقع ہوتا ہے اسے رفع کرنے کی کوئی سبیل نہیں۔

مانعین خطبۂ عربیہ کے دلائل | اب ہم کو یہ دیکھنا چاہیے کہ آیا خطبۂ غیر عربیہ کے جواز میں کوئی امر شرعی تو مانع نہیں ہے؟ اس سلسلہ میں جب ہم قرآن اور سنت کا جائزہ لیتے ہیں تو ہم کو کہیں صراحۃً کیا معنی کنایۃً بھی کوئی حکم ایسا نہیں ملتا کہ خطبہ کے لیے عربی زبان ضروری ہے۔ جو لوگ عربیت کے لزوم پر

قرار دیتے ہیں انہوں نے بھی کوئی آیت یا حدیث پیش نہیں کی ہے، بلکہ ان کا استدلال یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ اور سلف صالح نے ہمیشہ عربی زبان ہی میں خطبہ پڑھا ہے اور کبھی خطبہ کے لیے عربی کے سوا دوسری زبان استعمال نہیں کی۔ وہ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مجالس میں کبھی کبھی غیر عرب بھی موجود ہوتے تھے مگر کسی روایت میں نہیں آیا کہ آپ نے ان کی تفہیم کے لیے غیر عربی میں خطبہ دیا ہو یا عجمی زبانیں جاننے والے صحابہ میں سے کسی کو ان کی تفہیم پر مامور کیا ہو۔ حضور کے بعد صحابہ رضی اللہ عنہم سب سے بڑھ کر تبلیغ دین و تذکیر و ارشاد کا جذبہ رکھتے تھے، اور ان کے عہد میں بکثرت عجمی ممالک بھی فتح ہو چکے تھے جن کے باشندے عربی نہ سمجھتے تھے۔ مگر ان بزرگوں نے بھی عربی کے سوا کسی دوسری زبان میں خطبہ جاری نہیں کیا۔ اسی بنا پر متقدمین اور متاخرین میں سے ایک گروہ کثیر نے یہ رائے قائم کی ہے کہ صحت خطبہ اور ادائے سنت کے لیے خطبہ کا عربی میں ہونا شرط ہے۔ صرف ایک امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ ہیں جو غیر عربی خطبہ کو مطلقاً جائز رکھتے ہیں۔ ان کے سوا سلف میں اور کوئی نہیں جو اس کے جواز کا قائل ہو[1]۔

استدلال مذکور پر تنقیدی نظر ہمارے نزدیک اس استدلال میں متعدد اصولی غلطیاں ہیں۔ جو لوگ یہ استدلال پیش کرتے ہیں ان کی اولین غلطی یہ ہے کہ وہ شرعی عمل اور عادی و طبعی عمل میں فرق نہیں کرتے جس کی طرف ہم نے اپنے چوتھے مقدمہ میں اشارہ کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان عربی تھی، آپ کے مخاطب بھی عرب تھے یا ایسے عجمی تھے جو عربی جانتے تھے۔ اگر آپ ان کے سامنے عربی میں خطبہ نہ دیتے تو اور کس زبان میں دیتے۔ پس عربی کا اہل عرب کے سامنے عربی میں تقریر کرنا ایک طبعی فعل ہے۔ اس کو حجت شرعی بنانا کسی طرح درست نہیں۔

---

[1] امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ کے متعلق بعض روایات میں آیا ہے کہ وہ خطبہ کے مسئلہ میں امام اعظم سے متفق ہیں اور بعض روایات میں یہ ہے کہ وہ صرف اس شخص کے لیے غیر عربی خطبہ کو جائز رکھتے ہیں جو عربی زبان میں خطبہ دینے پر قادر نہ ہو۔

اگر آپ نے یہ فرمایا ہوتا کہ خطبہ عربی میں دیا کرو اور کوئی دوسری زبان اس غرض کیلئے استعمال کرو تو بلاشبہ یہ ارشاد حجت شرعی ہوتا، لیکن جب کہ آپ نے ایسا نہیں فرمایا تو خطبۂ عربیہ کو محض اس بنا پر "سنت" قرار نہیں دیا جاسکتا کہ حضور نے ہمیشہ عربی میں خطبہ دیا ہے۔ اس طرح کے طبعی اور عادی افعال کو شرعی اصطلاح میں سنت قرار دینے کے تو یہ معنی ہوں گے کہ عربی زبان میں گفتگو کرنے کو بھی مسنون ٹھیرایا جائے، کیونکہ حضور نے تمام عمر اسی زبان میں کلام فرمایا ہے، اور غیر عربی میں گفتگو کرنا آپ سے ثابت نہیں۔ اس کے جواب میں اگر کوئی یہ کہے کہ آپ کا عربی میں نماز پڑھنا بھی تو ایک طبعی فعل تھا پھر تم اس کو کس بنا پر شرعی فعل قرار دیتے ہو۔ تو اس کے جواب میں ہم کہیں گے کہ نماز کے لیے عربیت کا وجوب محض اس بنا پر نہیں ہے کہ حضور نے ہمیشہ عربی میں نماز پڑھی ہے۔ بلکہ اس طبعی عمل کے تحت چونکہ متعدد مصالح شرعیہ بھی موجود ہیں جن کو ہم پہلے بیان کرچکے ہیں اس لیے عربی زبان میں نماز ادا کرنا واجب قرار پایا ہے۔ بخلاف اس کے عربی نہ جاننے والے لوگوں کے سامنے عربی میں خطبہ دینا کسی مصلحت شرعی کا حامل نہیں بلکہ اس سے شریعت کے مقاصد الٹے فوت ہوجاتے ہیں، لہٰذا اس کو محض اس بنا پر لازم قرار نہیں دیا جاسکتا کہ رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے عربی جاننے والے لوگوں کے سامنے ہمیشہ عربی میں خطبہ دیا ہے۔

استدلال مذکور کی دوسری غلطی یہ ہے کہ اس میں زمانی حالات سے قطع نظر کرلیا گیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں جو عجمی الاصل لوگ مجالس جمعہ میں حاضر ہوتے تھے وہ زیادہ تر وہی تھے جو عربی زبان سے واقف تھے، اور اگر بالفرض ان میں کوئی اِکا دُکا شخص ایسا ہو بھی جو [illegible] سے ناواقف ہو تو ظاہر ہے کہ عربی بولنے والوں کے کثیر التعداد گروہ کو چھوڑ کر اس ایک شخص [illegible] کی خاطر خطبہ کی زبان نہیں بدلی جاسکتی تھی۔ پھر عہد نبوی کے بعد جب صحابہ کرام [illegible] ممالک میں پہنچے تو ان کی حیثیت ایک حاکم قوم کی تھی۔ ان کے

سیاسی طاقت تھی، وہ غالب تھے مغلوب نہ تھے۔ وہ دوسروں کو سمجھانے کے حاجتمند نہ تھے بلکہ دوسرے خود ان سے سمجھنے کے حاجتمند تھے۔ ان کے اندر اتنا بل ہوتا تھا کہ اپنی زبان کو دوسرے ملکوں میں پھیلا دیں، اور درحقیقت انہوں نے بخارا سے لے کر اسپین تک اسے پھیلا کر ہی چھوڑا۔ حتیٰ کہ ان کے فتح کردہ اکثر و بیشتر ممالک کی اصلی زبانیں عربی زبان کے مقابلہ میں قریب قریب فنا ہو گئیں۔ پھر ان کو کیا ضرورت تھی کہ اپنی زبان کو چھوڑ کر مفتوح قوموں کی زبانوں میں خطبے دیتے۔ لیکن آج وہ حالت نہیں ہے۔ مدتیں ہوئیں کہ عربیت کا غلبہ ختم ہو چکا ہے۔ دنیائے اسلام کے بیشتر ممالک میں اب صدیوں سے عربی زبان کا چرچا نہیں اور سیاسی و علمی ضعف کی بنا پر روز بروز کم ہوتا جا رہا ہے۔ عربیت کے پاس اب وہ طاقت ہی نہیں ہے جس سے وہ پھیلے اور زبانوں پر چھا جائے۔ اس کمزوری کی حالت میں اس طرز عمل پر اصرار کرنا کیونکر درست ہو سکتا ہے جو صحابۂ کرام اور ان کے قریب العہد لوگوں نے غلبہ و طاقت کے عہد میں اختیار کیا تھا۔

تیسری غلطی یہ ہے کہ سلف صالح نے جو رائے حالات کے اثر سے قائم کی تھی اس کو شرعی معمول بہ اجماع کی حیثیت دی جا رہی ہے۔ جیسا کہ ہم اوپر عرض کر چکے ہیں صدر اول کے تمام اکابر فاتح قوم کے لوگ تھے۔ اگرچہ اسلام نے ان کو وطنی اور نسلی اور لسانی عصبیتوں سے پاک ضرور کر دیا تھا، مگر یہ کیونکر ممکن تھا کہ ان کے اندر وہ کیفیات پیدا نہ ہوتیں جو طبعاً ہر فاتح قوم میں پیدا ہوتی ہیں۔ ان کا مفتوح قوموں کی زبانوں سے نفرت کرنا اور اپنے آپ کو ان کی بولیوں سے بچانا، اور ان کے اندر اپنی زبان پھیلانے کی کوشش کرنا ایک طبعی امر تھا اور غلبہ و طاقت کی فطرت ہی اس کی مقتضی تھی کہ یہ بات ان میں پیدا ہو۔ اس پر مزید یہ کہ ان کی زبان قرآن اور سنت کی زبان تھی۔ اسلام کا سارا سرمایہ اسی زبان میں تھا۔ اسلام کی اصلی اسپرٹ کا تحفظ خالص عربیت کے تحفظ ہی پر موقوف تھا۔ اس چیز نے ان کے اندر زبان کی حد تک عربیت کا تعصب اور بھی زیادہ پیدا کر دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اکابر سلف کسی حال میں بھی عجمی زبان بولنے کو پسند نہ کرتے تھے حتیٰ کہ عجمی الفاظ

کا استعمال بھی ان کو گوارا نہ تھا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ لا تتعلموا رطانة الاعاجم "عجمیوں کی بولی نہ سیکھو"۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے سامنے ایک مرتبہ نوروز کا ہدیہ پیش کیا گیا۔ آپ نے دریافت فرمایا کیا ہے۔ عرض کیا گیا، آج نوروز ہے۔ آپ نوروز کا لفظ سن کر چیں بجبیں ہو گئے۔ محمد بن سعد بن ابی وقاص نے ایک جماعت کو فارسی بولتے سنا تو کہنے لگے ما بال المجوسية بعد۔ امام احمد سے پوچھا گیا کہ عجمی زبان میں دعا کرنا کیسا ہے۔ فرمانے لگے لسان سوء "بری زبان ہے"۔ امام مالک فرمایا کرتے تھے کہ عجمی زبان میں دعا نہ مانگو۔ امام شافعی عربی زبان کے سوا ہر دوسری زبان میں بات چیت کرنے کو مکروہ قرار دیتے تھے۔ یہی حال اس زمانہ کے اکثر فقہاء کا تھا۔ وہ عجمی زبانوں کے استعمال کو عموماً اور دعا و ذکر میں اس کے استعمال کو خصوصاً برا سمجھتے تھے۔ ان بزرگوں کے اس طرز عمل پر اگر آپ غور کریں گے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ دراصل یہ کسی شرعی بنیاد پر نہ تھا بلکہ ایک بڑی حد تک اس طرز عمل کی بنا فطری اسباب پر تھی، اور حالات کی طاقت نے ان کو ایسا کرنے پر مجبور کیا تھا۔ ورنہ یہ بالکل ظاہر ہے کہ اسلام کو وطنی اور لسانی عصبیت سے کوئی علاقہ نہیں۔ وہ کسی خاص قوم کا مذہب نہیں ہے۔ نہ وہ اس لیے آیا ہے کہ کسی خاص زبان کی حمایت کرے اور ایک ہی زبان بولنے والوں کا دین بن کر رہ جائے۔

بزرگان سلف نے عجمی زبانوں کی کراہت اور ان سے اجتناب اور دینی و دنیوی اغراض کے لیے ان کے استعمال کی ممانعت پر جو زور دیا تھا اس کا ایک سبب اور بھی تھا۔ صدر اول کی تاریخ پر آپ نظر ڈالیں گے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ اس زمانہ میں عرب کے سوا دوسری قومیں عموماً غیر مسلم تھیں، اور اسلام زیادہ تر عربی قوم ہی میں تھا۔ اس صورت حال نے عربیت کو اسلام کا اور عجمیت کو کفر کا ہم معنی بنا دیا تھا۔ عجمی قوموں کے جو افراد اسلام لاتے تھے ان کا رشتہ ملت کفر سے توڑنے اور ملت اسلام میں ان کو جذب کرنے کے لیے ناگزیر تھا کہ ان کو عربیت کے رنگ میں رنگنے کی کوشش کی جاتی، اور ان کی

معاشرت، لباس، آداب و اطوار، بول چال ہر چیز کو بدل ڈالا جاتا، کیونکہ باطنی تغیر کی تکمیل خارجی تغیر کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ اگر ان کو محض مسلمان بنا کر چھوڑ دیا جاتا اور تمدنی، لسانی، ادبی حیثیت سے وہ بدستور کافر قوم کا جزو بنے رہتے تو کفر کے سمندر میں اسلام کے یہ چھوٹے چھوٹے جزیرے پیدا ہونے کے ساتھ ہی فنا بھی ہونے لگتے۔ یہ حالت ایک طویل مدت تک رہی۔ اس کے بعد جب دوسرے ممالک کی بڑی بڑی قومیں مسلمان ہو گئیں تو عربیت اور اسلام کا وہ ترادف جو ابتدائی صدیوں میں تھا، باقی نہ رہا۔ اب ترکی، فارسی، اردو اور دوسری مسلمان قوموں کی زبانیں کفار کی زبانیں نہیں بلکہ مسلمانوں کی زبانیں ہیں۔ اب عربی لباس اور عربی طرز معاشرت بھی لازمی طور پر شعار اسلام نہیں۔ ہندوستان میں مسلمانوں کا جو عام لباس ہے وہ بھی اسی طرح شعار اسلام ہے جس طرح عربی لباس ہے۔ علیٰ ہذا القیاس دوسرے اسلامی ممالک میں بھی جس لباس اور جس طرز معاشرت سے مسلمان غیر مسلموں کے مقابلہ میں ممیز ہوتے ہیں وہ یقیناً اسلامی شعار ہی ہے۔ پس اب حالات کے بدل جانے کے باوجود فقہائے اسلام کا عربیت پر اس طرح زور دینا درست نہیں جس طرح صدر اول کے فقہاء بالکل مختلف حالات میں زور دیتے تھے۔ ہمارے نزدیک متاخرین کی ایک یہ اصولی غلطی ہے کہ وہ متقدمین کے زمانے اور ان کے حالات کو نہیں دیکھتے اور آنکھیں بند کر کے ان کے اقوال سے استناد کرنے لگتے ہیں۔

**ایک اور دلیل** خطبۂ عربیہ کے لزوم پر ایک دلیل یہ بھی پیش کی جاتی ہے کہ خدا کا کلام اور اسلام کے تمام احکام زبان عربی میں ہیں اور ہر مسلمان پر عربی سے واقف ہونا لازم ہے۔ اگر لوگ عربی کی تحصیل میں غفلت کرتے ہیں اور عربی نہیں سمجھتے تو یہ ان کا قصور ہے۔ ان کی خاطر خطبہ کی زبان بدلنا کیا ضرور!

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے لیے عربی زبان سے واقف ہونا نہایت ضروری ہے۔ اس کے بغیر انہیں اپنے دین کی سمجھ حاصل نہیں ہو سکتی۔ اور ان میں گمراہیوں کے پھیلنے کا ایک بڑا سبب یہی ہے کہ علم دین کے اصل ماخذ تک ان کی رسائی نہیں۔ ہم نے بارہا اس ضرورت کا اظہار کیا ہے اور ہماری قطعی رائے یہ ہے کہ مسلمانوں کی تعلیم میں عربی

زبان کو لازمی طور پر شامل ہونا چاہیے لیکن "ہے" اور "چاہیے" میں بہت فرق ہے۔ جو کچھ ہونا چاہیے اس کے لیے ضرور کوشش کیجیے۔ مگر جو کچھ فی الواقع ہے اس سے آنکھیں بند نہ کیجیے۔ شریعت نے آپ کو یہ تعلیم نہیں دی ہے کہ بس "چاہیے" کے پیچھے پڑے رہیے اور واقعات کی پروا نہ کیجیے۔ آپ کے حالات تو یہ ہیں کہ آپ مسلمانوں کے لیے عربی زبان تو درکنار دین کی ابتدائی تعلیم بھی لازمی نہیں کرا سکتے اور اس پر آپ کے تحکم کی یہ کیفیت ہے کہ مسلمان اگر عربی نہیں سمجھتے تو آپ فرماتے ہیں کہ ہمیں اس کی پروا نہیں، ہم تو عربی ہی میں خطبہ سنائیں گے۔ کیا عربی خطبہ پڑھنے کے اصرار کا یہ نتیجہ نکلنے کی کوئی امید ہے کہ مسلمان محض اس کو سمجھنے کے لیے عربی زبان سیکھنے پر مجبور ہو جائیں؟

تیسری دلیل | تیسری دلیل جو پیش کی جاتی ہے وہ نسبتہً زیادہ وزنی ہے۔ یعنی یہ کہ عربی زبان کے سوا دوسری زبانوں میں خطبے جاری ہونے سے اسلام میں لسانی قومیتوں کی بنا پڑنے کا خوف ہے۔ جمعہ تو تمام مسلمانوں کو بلا لحاظ نسل و زبان و وطن ایک جگہ جمع کرنا چاہتا ہے مگر غیر عربی خطبے ان کو چھانٹ دیگا اور مختلف زبانیں بولنے والوں کے جمعے الگ الگ کر دیگا۔ یہ خطرہ یقیناً اہمیت رکھتا ہے مگر اس کا علاج کچھ زیادہ دشوار نہیں۔ ہونا یہ چاہیے کہ خطبہ کا ایک حصہ تو لازماً عربی زبان میں ہو، اور اسے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے آل و اصحاب پر صلاۃ و سلام، اور آیات قرآنی کی تلاوت کے لیے مخصوص کر دیا جائے۔ اس کے بعد دوسرا حصہ جس میں احکام اور مواعظ اور ضروریات زمانہ کے لحاظ سے اسلامی تعلیمات ہوں، ایسی زبان میں ہونا چاہیے جس کو حاضرین یا ان کی اکثریت سمجھتی ہو، اور اس غرض کے لیے بھی زیادہ تر ان زبانوں کو ترجیح دی جانی چاہیے جو بین الاقوامی حیثیت رکھتی ہوں، مثلاً ہندوستان میں صوبہ وار زبانوں اور مقامی بولیوں کے بجائے زیادہ تر اردو زبان کا خطبہ ہونا چاہیے کیونکہ اسے قریب قریب ہر صوبہ کے مسلمان سمجھتے ہیں۔ البتہ دور دراز کے گوشوں میں جہاں اردو سمجھنے والے کم ہیں مقامی زبانوں کو خطبہ کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے لیکن جہاں مسلمانوں کا بین الاقوامی اجتماع ہو وہاں عربی کے سوا کسی دوسری زبان میں خطبہ نہ ہونا چاہیے۔

عملی مشکلات | یہاں تک جو کچھ ہم نے عرض کیا ہے وہ صرف شرعی مسئلہ سے متعلق تھا، یعنی قانون کی حد تک ہمارے

نزدیک غیر عربی خطبہ میں کوئی حکمِ شرعی مانع نہیں ہے اور جو لوگ اس کو ناجائز یا مکروہ تحریمی یا خلافِ سنت قرار دیتے ہیں وہ ہماری رائے میں غلطی کرتے ہیں لیکن اس مسئلہ کا ایک اور پہلو بھی ہے اور وہ احکام سے نہیں بلکہ ان کے نفاذ کی عملی صورت سے تعلق رکھتا ہے۔

عام فہم زبان میں خطبہ ہونے کی ضرورت جس بنا پر ظاہر کی جاتی ہے وہ تو یہی ہے کہ لوگ جب اس کو سمجھیں گے تو فائدہ اٹھائیں گے گویا اصل مقصود سمجھنا نہیں بلکہ فائدہ اٹھانا ہے لیکن اگر صورت یہ ہو کہ بجائے فائدہ کے الٹا نقصان ہونے لگے، تو ایسی صورت میں غالباً ہر صاحبِ عقل یہی کہے گا کہ ایسے سمجھنے سے نہ سمجھنا بہتر ہے۔ اب ذرا اپنی قوم کی حالت کا جائزہ لیجیے۔ آپ کے ہاں امامت کا معیار حد سے زیادہ پست ہو چکا ہے۔ جو منصب مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں سب سے زیادہ اہم تھا وہ اب سب سے زیادہ غیر اہم ہے۔ جس منصب کیلئے بہتر سے بہتر آدمی منتخب کرنے کا حکم تھا۔ اب اس کے لیے بدتر آدمی چھانٹا جاتا ہے۔ مسلمانوں کے ذہن میں اب امام کا تصور یہ ہے کہ جو شخص دنیا کے کسی اور کام کا نہ ہو اس کو مسجد کا امام ہونا چاہیے۔ دس پانچ روپیہ تنخواہ اور دونوں وقت کی روٹی مقرر کر دی اور کسی نیم خواندہ ملا کو رکھ لیا۔ یہ گویا مسجد کی امامت کا انتظام ہو گیا۔ امامت کو اس درجہ پست کر دینے کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری مسجدیں، وہی مسجدیں جنہوں نے کبھی ہماری قوم کے قصرِ فلک بوس کی تعمیر کی تھی، آج ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہیں جو بے علم، تنگ نظر، پست حوصلہ اور دنی الاخلاق ہیں کیا آپ ان لوگوں سے امید رکھتے ہیں کہ یہ اردو میں خطبے دے کر آپ کی دینی و دنیوی رہنمائی کر سکیں گے۔

اس گروہ کو چھوڑ کر اگر آپ نے جمعہ کی امامت کے لیے کسی دوسرے گروہ کا انتخاب کرنا چاہا تو لامحالہ اس کے لیے آپ کو علماء ہی کے طبقہ کی طرف رجوع کرنا ہوگا اور باستثناء چند اس طبقہ کے سوادِ اعظم کا جو حال ہے اسے بیان کرنا گویا اپنی ٹانگ کھولنا اور آپ ہی لاجوں مرنا ہے۔ ان حضرات کو اگر آپ نے عام فہم زبان میں من مانے خطبے دینے کا موقع دیا تو یقین جانیے کہ آئے دن مسجدوں میں سر پھٹول ہوگی، اس لیے کہ ان میں کا ہر شخص اپنا ایک الگ مشرب رکھتا ہے اور اپنے مشرب میں وہ اتنا سخت ہے کہ دوسرے مشرب والوں کے ساتھ کسی قسم کی رعایت کرنا اس کے نزدیک گناہ سے کم نہیں۔ پھر اللہ نے اس کی زبان میں ایک ڈنک رکھ دیا ہے جس سے دلوں کو زخمی کیے بغیر وہ کوئی

بات نہیں کر سکتا۔ وہ جس ماحول سے تعلیم و تربیت پاکر آتا ہے اور جس ماحول میں زندگی بسر کرتا ہے وہاں دین کے مہمات اور قوم کے مصالح کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ تمام دلچسپیاں سمٹ کر چند چھوٹی چھوٹی نزاعی باتوں میں جمع ہو گئی ہیں اس لیے لامحالہ وہ جب زبان کھولے گا انہی مسائل پر گھومے گا اور نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ کے گھر میں گالم گلوچ اور جوتی پیزار ہوگی، اور آخرکار ہر مشرب کے مسلمان اپنے جمعے الگ الگ قائم کرنے لگیں گے۔ یہ تو مذہبی ذہنیت رکھنے والوں کا حال ہوا۔ رہے نئے تعلیم یافتہ حضرات جو ان مسائل سے دلچسپی نہیں رکھتے، تو ان پر ایک دوسری مصیبت نازل ہوگی۔ وہ ہر جمعہ کو رسول اللہ کے منبر پر سے وہ وہ جھوٹی روایتیں اور لاطائل کہانیاں اور احکام اسلامی کی غلط تعبیریں سنیں گے کہ جن کو سن کر غیر مسلموں کا مسلمان ہونا تو درکنار ذی ہوش مسلمانوں کا مسلمان رہنا بھی مشکل ہے۔

خطبۂ غیر عربیہ کے اجراء سے پہلے آپ کو ان خرابیوں کا کوئی علاج سوچنا چاہیے۔ میری رائے میں ان کا علاج صرف یہی ہو سکتا ہے کہ اہل علم کی کوئی معتدل جماعت خطبات جمعہ کی تیاری کا کام اپنے ہاتھ میں لے اور ایسے خطبے لکھے جو نزاعی مسائل سے پاک ہوں اور مسلمانوں میں صحیح دینی روح پھونکنے والے ہوں پھر ہندوستان میں ہر جگہ صحیح الخیال اور با اثر لوگ کوشش کریں کہ اسی مرکزی جماعت کے تیار کیے ہوئے خطبے نماز جمعہ میں پڑھے جائیں۔ اگر ایسی کوئی تنظیم ہو جائے (جس کی امید کم ہی نظر آتی ہے) تو خطبۂ غیر عربیہ کے اجرا میں میری تحقیق کی حد تک کوئی امر شرعی مانع نہیں ہے لیکن اگر یہ تنظیم نہ ہو سکے تو مصلحت کا اقتضا یہی ہے کہ عربی کے انہی پرانے خطبوں کو چلنے دیا جائے جن سے کوئی مفید نہیں تو مضر نتیجہ بھی برآمد نہیں ہوتا۔ البتہ اگر کہیں خوش قسمتی سے کوئی موزوں خطیب میسر آجائے اور وہ اس خدمت کو باحسن وجوہ انجام دے سکے تو اس سے فائدہ اٹھانے میں دریغ بھی نہ کرنا چاہیے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# اشارات

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ (الاعراف۔۱)

پیروی کرو اس ہدایت کی جو تمہاری طرف خدا کے پاس سے نازل کی گئی ہے۔ خدا کو چھوڑ کر دوسرے سرپرستوں کی پیروی نہ کرنے لگو۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ (آل عمران۔۴)

اے نبی کہدو کہ اگر تم خدا کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو خدا تمکو دوست بنائے گا اور تمہیں بخش دیگا۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُو اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا (الاحزاب ۳)

تمہارے لیے یقیناً اللہ کے رسول میں عمل کا اچھا نمونہ موجود ہے جو کوئی اللہ کی رحمت کا امیدوار ہو اور روز آخرت کے آنے کی توقع رکھتا ہو اس کے لیے تو پیروی کا صحیح نمونہ وہی ہے)

جو لوگ قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہیں یا جنہوں نے کبھی قرآن پڑھا ہے۔ ان کی نظر سے اس کتاب پاک میں یہ آیات ضرور گذری ہوں گی۔ بہت سوں کو ان کے معانی سے بھی واقفیت ہوگی۔ خصوصاً آخری آیت سے تو کوئی وعظ اور کوئی اصلاحی خطبہ خالی نہیں ہوتا۔ مگر آج ضرورت محسوس ہو رہی ہے کہ ایک بار پھر یہ آیات نظروں کے سامنے لائی جائیں، کیونکہ ایسا گمان ہوتا ہے کہ شاید ساری مسلمان قوم ان آیات کو بھول گئی ہے۔

---

مجملاً ہر مسلمان اس بات کو جانتا اور مانتا ہے کہ بحیثیت مسلمان ہونے کے ہم کو قرآن اور اسوۂ رسول ہی کا اتباع کرنا چاہیے۔ اور ہمارے لیے ہدایت انہی دونوں چیزوں میں ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ ہدایت جس کے اتباع کا حکم اس قطعیت کے ساتھ تم کو دیا گیا ہے آیا اس کا دائرہ صرف طہارت اور استنجا، اور عبادات اور (باصطلاح زمانۂ حال) "مذہبی" معاملات ہی تک محدود ہے یا تمہاری زندگی کے چھوٹے اور بڑے، دینی اور دنیوی، قومی اور ملکی تمام معاملات پر حاوی ہے؟ نیز یہ ہدایت صرف اس زمانہ اور اس ملک کے لیے تھی جس میں قرآن نازل ہوا تھا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تھے یا درحقیقت یہ زمانی و مکانی قیود سے مبرا ہے اور اس میں ہر زمانے اور ہر ملک کے مسلمانوں کے لیے ویسی ہی سچی اور صحیح رہنمائی موجود ہے جیسی ساڑھے تیرہ سو برس پہلے کے عربوں کے لیے تھی؟ اگر پہلی بات ہے، تب تو نعوذ باللہ قرآن کا یہ مطالبہ ہی غلط ہے کہ سب رہنماؤں کو چھوڑ کر صرف اُسی کی پیروی کی جائے، اور تمام دنیا کے طریقوں کو ترک کرکے صرف اس ایک شخص کے اسوہ کا اتباع کیا جائے جو ہمارے پاس قرآن لایا تھا۔ اس صورت میں تو اتباع کرنے کے بجائے تم کو اپنے ایمان ہی پر نظر ثانی کرنی پڑے گی۔ لیکن اگر بات دوسری ہے، تو یہ کیا ماجرا ہے کہ تم وضو اور غسل کے مسائل میں، نکاح اور طلاق کے معاملات میں، ترکے اور وراثت کے مقدمات میں تو اُس سرچشمۂ ہدایت کی طرف رجوع کرتے ہو، مگر جن مسائل کے حل پر تمہاری قوم کی زندگی و موت کا مدار ہے، ان میں نہیں دیکھتے کہ قرآن تمہیں کونسا راستہ دکھاتا ہے، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کس طرف تمہاری رہنمائی کرتی ہے۔

ہندوستان میں ہر طرف ایک بےچینی نظر آتی ہے۔ ساری مسلمان قوم پر ایک پریشانی چھائی ہوئی ہے۔ مستقبل کا سوال ایک درشنی ہنڈی کی طرح مسلمان کے سامنے آن کھڑا ہوا ہے اور تقاضا کر رہا ہے کہ یا تو میرا معاملہ صاف کردو یا دیوالہ نکالو۔ لیکن اس قوم کا حال کیا ہے؟ جس کا جدھر منہ اٹھ رہا ہے چلا جا رہا ہے اور جس کے ذہن میں جو بات آ رہی ہے کہہ رہا ہے اور لکھ رہا ہے۔ کوئی مارکس اور لینن کے اسوے کو

دانتوں سے پکڑے ہوئے ہٹلر اور مسولینی کی سنت پر عمل کر رہا ہے کوئی گاندھی اور جواہر لال کے پیچھے چلا جا رہا ہے کوئی فرائض کی پرانی فہرست میں ایک نئے فرض کا اضافہ کر رہا ہے۔ کسی پر نشستوں اور ملازمتوں کے فی صدی تناسب کا بھوت سوار ہے۔ کوئی حرکت اور عمل کا پجاری بنا ہوا ہے اور ہانکے پکارے کہہ رہا ہے کہ اگر پشاور کی گاڑی نہیں چلتی تو راس کماری ہی کی طرف جانے والی گاڑی پر سوار ہو جاؤ، اس لیے کہ منزل مقصود کوئی نہیں، حرکت ہی فی نفسہ مقصود ہے۔ غرض ہر شخص جو کچھ بول سکتا ہے ایک نئی تجویز قوم کو سنا دیتا ہے۔ اور ہر شخص جو کچھ لکھ سکتا ہے ایک ماہرانہ و مبصرانہ مقالہ لکھ کر شائع کر دیتا ہے۔ مگر اس تمام شور و شغب اور اس پورے ہنگامے میں کسی کو بھی یہ یاد نہیں آتا کہ ہمارے پاس قرآن نامی بھی کوئی کتاب ہے جس نے زندگی کے ہر مسئلہ میں ہماری رہنمائی کا ذمہ لے رکھا ہے، اور ہم سے کبھی یہ بھی کہا گیا تھا کہ زندگی کے ہر معاملے میں تمہارے لیے ایک عملی نمونہ موجود ہے۔

---

مسلمانوں کو مختلف راستوں کی طرف بلایا جا رہا ہے۔ ہر راستہ کی طرف بلانے والوں میں بڑے بڑے مقدس علماء ہیں۔ بڑے بڑے نامور لیڈر ہیں۔ بڑے بڑے زبان آور خطیب اور ماہر فن انشا پرداز ہیں۔ ہر داعی کے سر پر ایسے لوگ کھڑے ہیں جن کی آزمودہ کاری مسلّم، قومی خدمات ناقابل انکار، اور سیاسی مہارت و بصیرت معروف و مشہور ہے۔ ہر رہنما بڑی قابلیت کے ساتھ اپنے اپنے راستے کے نشیب و فراز دکھا رہا ہے اور دوسرے راستوں کے خدشات بیان کر رہا ہے۔ یہ سب کچھ بہت قابل قدر ہے۔ مگر مسلمان کی فطرت کہتی ہے کہ ایتونی شیئًا مِن کتاب اللہ وَسنۃ رسولہ حتیٰ اقول۔ میرے سامنے شخصیتوں کو نہ لاؤ۔ کوئی شخص خواہ کتنا ہی بڑا آدمی ہو، عالم و فاضل ہو، مفسر قرآن ہو، معلم حدیث ہو، ماہر سیاست ہو، عمل اور قربانی کا نمونہ ہو، اس کی حرمت میرے سر اور آنکھوں پر، مگر جو ہدایت وہ دے رہا ہے، اگر وہ اس کے اپنے ذہن کی پیداوار ہے تو میرے لیے لائق اتباع نہیں۔ ہاں اگر وہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ

اس سے کوئی دلیل اپنے پاس رکھتا ہے تو شخصی عظمت کی آمیزش سے الگ کر کے اس کو اور صرف اس کو سامنے لاؤ، اس لیے کہ وہی لائق اتباع ہے، اسی میں سچی ہدایت ہے اور اسی کی پیروی میں صلاح و نجات ہے۔ اس کے بتائے ہوئے راستے میں خواہ کتنے ہی خدشات ہوں، کتنی ہی دشواریاں اور کتنے ہی نقصانات ہوں، آخری اور دیرپا اور یقینی کامیابی اسی کے ذریعہ سے حاصل ہو سکتی ہے۔

---

آئیے آج اسی نقطۂ نظر سے قرآن اور سیرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر غور کریں کہ ہمارے اس وقت کے قومی مسائل میں اس کے اندر کیا ہدایت ہے۔ کچھ پروا نہیں اگر کوئی اس کو دقیانوسیت اور رجعت پسندی کہہ کر ناک بھوں چڑھائے۔ حالات جدید سہی، مسائل وقتی سہی، جغرافی ماحول مختلف سہی، مگر جس ہدایت کی طرف ہم رجوع کر رہے ہیں، ہمارا ایمان ہے کہ وہ ہر زمانے میں جدید ہے، ہر دور میں وقتی ہے، اور ہر جغرافی ماحول میں مقامی ہے۔

---

ہمیں سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت آپ کے وطن کی سیاسی حالت کیا تھی اور اس حالت میں آپ نے کیا طرز عمل اختیار کیا۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ اس وقت عرب ہر طرف امپیریلیسٹ طاقتوں سے گھرا ہوا تھا اور خود ملک کے اندر ہمسایہ قوموں کا امپیریلزم نفوذ کر چکا تھا۔ آپ کی پیدائش سے چند ہی روز پہلے حبشی فوجیں یلغار کرتی ہوئی خاص اس شہر تک پہنچ گئی تھیں جس میں آپ پیدا ہوئے۔ عرب کا سب سے زیادہ زرخیز صوبہ یمن، پہلے حبشیوں کے اور پھر ایرانیوں کے تسلط میں جا چکا تھا۔ عرب کے جنوبی اور مشرقی سواحل ایرانیوں کے زیر اثر تھے۔ عراق عرب کا علاقہ نجد کے حدود تک ایرانیوں کے اثر میں تھا۔ شمال میں عقبہ و معان تک بلکہ تبوک تک سلطنت روم کے اثرات پہونچے ہوئے تھے۔ دونوں ہمسایہ سلطنتیں عرب کے قبائل کو اپنی اغراض

کے لیے ایک دوسرے سے لڑا تی تھیں اور اندرون عرب میں اپنے اثرات پھیلا رہی تھیں۔ متعدد مرتبہ قسطنطنیہ کا قیصر مکہ کی چھوٹی سی ریاست کے معاملات میں مداخلت کر چکا تھا۔ عربی قوم کو ہر ملک گیر طاقت اپنے قبضہ میں لانا چاہتی تھی، کیونکہ اس قوم کا ملک بنجر تھا، مگر قوم بنجر نہ تھی۔ جہانگیری کے لیے بہترین سپاہی اس سے فراہم ہو سکتے تھے۔

ان حالات میں جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو آپ نے کیا کیا؟ اگرچہ آپ کو اپنے وطن اور اپنی قوم سے فطری محبت تھی، اور آپ سے بڑھ کر حریت پسند کوئی نہ تھا، مگر آپ نے ایک قوم پرست (Natiønalist) یا وطن پرست (Patriot) کی حیثیت اختیار نہ کی بلکہ ایک حق پرست اور خدا پرست کی حیثیت اختیار کی۔ آپ کی نگاہ میں مقدم کام یہ نہ تھا کہ اپنے اہل وطن کی قوت کو مجتمع کر کے اجنبی استیلاء کی جڑیں خاک وطن سے اکھاڑ پھینکیں بلکہ ہر دوسرے کام سے مقدم یہی تھا کہ حق پرستوں کا ایک جتھا بنائیں اور اس کے اندر ایک ایسی طاقت پیدا کر دیں کہ وہ صرف عرب میں نہیں بلکہ خود روم و ایران میں بھی ظلم و عدوان کے استیلاء کا خاتمہ کر دے۔ آنحضرت کے اہل وطن آپ کے بہترین اوصاف سے واقف تھے۔ انہوں نے عرب کی بادشاہی کا تاج آپ کے سامنے پیش کیا تھا اس شرط پر کہ آپ اپنے اس جتھے کی توسیع و تنظیم سے باز آ جائیں۔ اگر آپ وطن پرست ہوتے تو خدمتِ وطن کا اس سے بہتر موقع اور کونسا ہو سکتا تھا۔ مگر آپ نے اس تاج کو ٹھکرا دیا، اور اسی کام میں لگے رہے جس کے بار آور ہونے کی کم از کم اس وقت کوئی شخص امید نہ کر سکتا تھا۔ اس وقت آپ کی جمعیت دس بارہ آدمیوں سے زیادہ نہ تھی۔ تمام ملک میں کوئی قبیلہ اور کوئی گروہ آپ کا ساتھی نہ تھا بلکہ سب مخالف اور سخت مخالف تھے۔ ظاہر اسباب کے لحاظ سے کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ اسکیم کب کامیاب ہو گی جس کو آپ لے کر اٹھے تھے۔ اس بات کا ہر وقت امکان تھا کہ واقعہ فیل کی طرح کا کوئی دوسرا واقعہ پھر پیش آ جائے اور حجاز بھی یمن اور ارض غسان

کی طرح اجنبی حکومت کا غلام بن جائے۔ مگر آپ نے ہر حال میں یہی ضروری سمجھا کہ پہلے حق پرستوں کی جمعیت کو بڑھائیں اور مضبوط کریں، پھر جیسی صورت حال ہو اس کے مطابق ملکیوں اور غیر ملکیوں کے ساتھ کوئی معاملہ کریں۔

---

اس کی کیا وجہ تھی؟ کیا آپ "کمیونلسٹ" تھے؟ کیا آپ نعوذ باللہ اپنے وطن کے غدار تھے؟ کیا خاکم بدہن آپ غیر ملکی امپیریلزم کے ایجنٹ تھے؟ ہرگز نہیں۔ تاریخ کے ناقابل انکار حقائق گواہ ہیں کہ کسی فرزند وطن نے اپنے وطن کو اتنی سربلندی عطا نہیں کی جتنی محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی بدولت عرب کو نصیب ہوئی۔ اور تاریخ ہی اس بات پر بھی گواہ ہے کہ کسی داعی دین نے غیر مذہب والوں کے ساتھ اتنے تحمل، اتنی فیاضی، اتنی رواداری اور اتنی فراخ حوصلگی کا برتاؤ نہیں کیا۔ پھر یہ بھی دنیا کو معلوم ہے کہ اللہ کے رسول نے کبھی روٹیوں کی تقسیم اور منافع کے بٹوارے کا سوال ہی نہیں اٹھایا۔ آپ نے نہ کبھی مکی زندگی میں اس بنیاد پر مصالحت کی کہ ریاست قریش کے دار الندوہ اور جنگی و سیاسی عہدوں میں مسلمانوں کی اتنی نمائندگی ہو، اور نہ مدنی زندگی میں اس مسئلہ کو مدار صلح قرار دیا کہ یہود کے معاشی وسائل میں مسلمانوں کا اتنا حصہ ہو۔

اب غور کیجیے کہ جب وہاں کمیونلزم تھا نہ وطن دشمنی تھی نہ اعدائے وطن سے سازباز تھا، تو پھر کونسی چیز تھی جس کی بنا پر آپ نے عرب کی سیاسی نجات اور تمدنی و معاشی ترقی پر اپنی بہترین قوتوں اور قابلیتوں کو صرف کرنے سے انکار کیا اور ہر کام سے پہلے خدا کا نام لینے والوں کی ایک طاقتور جمعیت بنانا اور زمین میں اس کا دبدبہ قائم کرنا ضروری سمجھا؟ اس کا جواب ایک اور صرف ایک ہی ہو سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نصب العین وطن پرستوں کے نصب العین سے بالکل مختلف تھا۔ اس نصب العین کی راہ میں باہر کے قیصر و کسریٰ اور گھر کے ابوجہل و ابولہب دونوں یکساں سد راہ تھے۔ اس نصب العین کو

حاصل کرنے کے لیے ناگزیر تھا کہ واقعات کی رفتار اور ملک کے مستقبل اور آئندہ کے امکانی خدشات سب کی طرف سے بے پروا ہو کر ایک ایسی جماعت کو منظم کیا جائے جو باطل کے غلبہ کو کسی صورت میں قائم نہ رہنے دے اور اپنی طاقت سے زمین میں ایسی حالت قائم کر دے جس میں خدا پرستانہ تہذیب امن کے ساتھ پھل پھول سکے حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ۔

وہی نصب العین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمان قوم کو دے گئے ہیں۔ مسلمان قوم ایک قوم ہی اس بنیاد پر بنی ہے کہ یہ نصب العین اس کے تمام افراد کا مشترک اور واحد نصب العین ہے۔ اس نصب العین کو سلب کر لیجیے پھر مسلمان قوم کسی قوم کا نام نہیں ہے۔ یہاں عرب اور عجم کی کوئی خصوصیت نہیں، زمان و مکان کا کوئی سوال نہیں۔ مسلمان اگر مسلمان ہے تو ہر حال میں یہی اس کا نصب العین ہے۔

---

اب ایک دوسری نظر اسی کتاب ہدایت اور اسی سیرت پاک پر ڈالیے۔

یہ جتھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم کیا تھا، اس کی بنیاد کسی مادر وطن کی فرزندی کسی نسل کے انتساب کسی سیاسی و معاشی مفاد کے اشتراک پر نہ تھی، بلکہ ایک مخصوص عقیدے اور ایک مخصوص طرز عمل پر تھی۔ اس کو جوڑنے والی طاقت خدا کی محبت اور بندگی تھی نہ کہ اغراض کی محبت اور مادی مقاصد کی بندگی۔ اس کی طرف لوگوں کو بلانے والا نعرہ اذان کا نعرہ تھا نہ کہ وطنیت کا نعرہ۔ اس کے اجزا کو سمیٹ کر ایک بنیان مرصوص بنانے والی چیز ایک ان دیکھے خدا کی عبادت تھی نہ کہ کوئی محسوس مرئی علامت۔ اس کو حرکت میں لانے والی چیز رضائے الٰہی کی طلب تھی نہ کہ منافع مادی کی طلب۔ اس میں عمل کی گرمی پھونکنے والی قوت اعلائے کلمۃ اللہ کی خواہش تھی نہ کہ نسل و وطن کو سربلند کرنے کی تمنا۔ اس قوم کے نفسیات دنیا سے نرالے ہیں۔ جو چیزیں دوسروں کو جمع کرنے والی ہیں وہ اس قوم کو منتشر کر دینے والی ہیں۔ جو صدائیں اپنے اندر دوسروں

کے لیے غیر معمولی کشش رکھتی ہیں وہ اس قوم کے دل میں الٹی نفرت پیدا کر دیتی ہیں جن مرئی علامتوں پر دوسرے گرویدہ ہوتے ہیں یہ ان کے لیے کوئی جذبۂ عقیدت اپنے اندر نہیں پاتے جن چیزوں میں دوسروں کو گرما دینے کی طاقت ہے وہ ان کے دلوں میں الٹی سردی پیدا کر دینے کا اثر رکھتی ہیں، جو چیزیں دوسروں کو عمل پر ابھارنے والی ہیں وہی ان کو میدان عمل سے دور بھگانے والی ہیں۔ ہمارے قرآن کو اٹھا کر دیکھ جاؤ۔ پوری سیرت نبوی پر نظر ڈال لو۔ خلافت راشدہ کے دور سے اس زمانہ تک کی اسلامی تاریخ پڑھ لو تم کو معلوم ہو جائیگا کہ اسلام کی فطرت کیا ہے اور مسلمان قوم کا مزاج کس قسم کا ہے جو قوم اس سوال پر صدیوں سے جھگڑ رہی ہے کہ نبی پر سلام بھیجتے وقت بھی کھڑا ہونا چاہیے یا نہیں کیا تم توقع رکھتے ہو کہ وہ "بندے ماترم" کا گیت سننے کے لیے تعظیماً کھڑی ہوگی؟ جس قوم کے دل میں مرئیات سے عقیدت کے بجائے سخت نفرت بٹھائی گئی ہے کیا تمہیں امید ہے کہ وہ کسی جھنڈے کو سر جھکا کر سلامی دے گی؟ جو قوم تیرہ سو برس تک خدا کے نام پر بلائی جاتی رہی ہے کیا تم سمجھتے ہو کہ اب وہ بھارت ماتا کے نام پر پروانہ وار دوڑتی چلی آئے گی؟ جس قوم کے دل میں عمل کی گرمی پیدا کرنے والا داعیہ اب تک محض اعلائے کلمۃ اللہ کا داعیہ رہا ہے کیا تمہارا گمان ہے کہ اب معدے اور بدن کے مطالبات اس میں حرارت پھونکیں گے، یا کونسلوں کی نشستوں اور ملازمتوں کے تناسب کا سوال اس کے قلب و روح کو گرما دے گا؟ جس قوم کو عقیدے اور عمل کی وحدت پر جمع کیا گیا تھا، کیا تمہارا خیال یہ ہے کہ وہ سیاسی اور معاشی پارٹیوں میں تقسیم ہو کر کوئی طاقتور عملی قوم بن جائے گی؟ تخیل کی بنیادوں پر نظریات کی عمارتیں اٹھانے والے جو چاہیں کہیں۔ مگر جس کسی نے قرآن اور سنت سے اسلام کے مزاج کو سمجھا ہے وہ بادنیٰ تامل یہ رائے قائم کر سکتا ہے کہ مسلمان قوم کی فطرت جب تک بالکل مسخ نہ ہو جائے، وہ نہ تو ان محرکات سے حرکت میں آسکتی ہے اور نہ ان جامعات کے ذریعہ سے جمع ہو سکتی ہے۔ غیر مسلم بلاشبہ ان ذرائع سے جمع ہو جائیں گے اور ان میں حرکت بھی ان محرکات سے پیدا ہو جائے گی کیونکہ ان کو جمع کرنے اور حرکت میں لانے والی کوئی اور چیز نہیں ہے۔ ان کا مذہب

انہیں منتشر کرتا ہے اور صرف وطن کی خاک ہی ان کو جمع کرتی ہے۔ ان کے معتقدات ان کے دلوں کو سرد کرنے والے ہیں۔ ان میں حرارت صرف معدے ہی کی گرمی سے پیدا ہوسکتی ہے لیکن مگر مسلمان جس کو خدا کے نام پر جمع کیا گیا تھا اور جس میں ایمان کی گرمی پہونچی گئی تھی آج تم اس کو ذلیل مادی چیزوں کے نام پر جمع نہیں کر سکتے اور نہ ادنیٰ درجہ کی خواہشات سے اس میں حرارت پیدا کر سکتے ہو۔ اس طریقہ میں اگر تم کو کامیابی نصیب بھی ہوسکتی ہے تو صرف اس وقت جبکہ تم مسلمان کو فطرت اسلام سے ہٹا دو اور اسے بلندیوں سے گرا کر پستیوں میں لے آؤ۔

---

اس کے معنی یہ نہ سمجھو کہ مسلمان وطن کا دشمن ہے۔ ہرگز نہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے وطن کی اصلاح و ترقی کے لیے کیا کچھ نہیں کیا ؟ خلفائے راشدین نے وطن اور ابنائے وطن کی کیا کچھ کم خدمت کی ؟ بعد کے مسلمان جس جس ملک میں گئے کیا انہوں نے اس کو جنت بنا کر نہیں چھوڑا ؟ غیر مسلم قوموں کے ساتھ فیاضانہ معاملہ کرنے میں کیا کبھی کوئی کوتاہی کی گئی ؟ پس اوپر ہم نے جو کچھ کہا ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مسلمان اپنے ملک یا اپنی قوم کے معاشی اور تمدنی مسائل سے بالکل بے پروا ہے۔ بلکہ ہم یہ بات ذہن نشین کرنا چاہتے ہیں کہ مسلمان کی اصلی قوت محرکہ یہ چیزیں نہیں ہیں، اس کی جمعیت ان بنیادوں پر قائم نہیں ہوئی ہے۔ اس میں زندگی کی حرارت پیدا کرنے والی چیز یہ نہیں ہے۔ وہ طاقتور اور منظم ہونے کے بعد ان سب مسائل کو حل کرنے میں حصہ لے سکتا ہے اور دوسروں سے بڑھ کر حصہ لے سکتا ہے، مگر اس کو طاقتور اور منظم بنانے کے ذرائع یہ نہیں ہیں، بلکہ کچھ اور ہیں۔

---

اب ایک قدم اور آگے بڑھیے۔ یہ دیکھیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نئی قوم کن طریقوں سے بنائی تھی اور اس میں کن ذرائع سے وحدت اور قوتِ عمل پیدا کی تھی۔

جس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دعوت لے کر اٹھے تھے تو ساری دنیا میں تنہا آپ ہی ایک مسلم تھے۔ کوئی آپ کا ساتھی اور ہم خیال نہ تھا۔ دنیوی طاقتوں میں سے کوئی طاقت آپ کو حاصل نہ تھی گرد و پیش جو لوگ تھے ان میں خود سری اور انفرادیت انتہا درجہ پر پہنچی ہوئی تھی۔ ان میں سے کوئی کسی کی بات سننے اور اطاعت کرنے پر آمادہ نہ تھا۔ وہ نسل اور قبیلہ کی عصبیت کا تصور بھی نہ کر سکتے تھے۔ ان کے ذہن ان خیالات اور مقاصد سے کوئی دور کا لگاؤ بھی نہ رکھتے تھے جن کی تبلیغ کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اٹھے تھے۔ اس ماحول اور ان حالات میں کونسی طاقت تھی جس سے ایک تنہا انسان بے یار و مددگار اور بے وسیلہ انسان نے لوگوں کو اپنی طرف کھینچا؟ کیا آنحضرت نے عربوں کو یہ لالچ دیا تھا کہ میں تم کو تمام زمین کی حکومت دلواؤنگا؟ رزق کے خزانے دلواؤں گا؟ دشمنوں پر فتح اور غلبہ بخشونگا؟ بیرونی غاصبوں کو نکال باہر کروں گا؟ عرب کو ایک طاقتور سلطنت بنادونگا؟ تمہاری تجارت اور صنعت و حرفت کو ترقی دوں گا، تمہارے وسائل معیشت بڑھاؤنگا اور تمہیں ایک ترقی یافتہ اور غالب قوم بنا کر چھوڑونگا؟ ظاہر ہے کہ ایسا کوئی لالچ آپ نے نہیں دلایا تھا۔ پھر کیا آپ نے امیروں کے مقابلہ میں غریبوں کی اور سرمایہ داروں اور زمینداروں کے مقابلہ میں مزدوروں اور کاشتکاروں کی حمایت کا بیڑا اٹھایا تھا؟ سیرت نبوی گواہ ہے کہ یہ چیز بھی نہ تھی۔ پھر کیا آپ نے کوئی سیاسی، یا تعلیمی یا تمدنی یا معاشی یا فوجی تحریک اٹھائی تھی اور اس کی طرف لوگوں کو کھینچنے کے لیے نفسیاتی حربوں سے کام لیا تھا؟ واقعات شاہد ہیں کہ ان میں سے بھی کوئی چیز نہ تھی۔ پھر غور کیجیے کہ آخر وہ کس چیز کی کشش تھی جس نے عربی اور عجمی، امیر اور غریب، آقا اور غلام سب کو آپ کی طرف کھینچا؟ دنیا جانتی ہے کہ وہ صرف دو چیزیں تھیں۔ ایک قرآن کی تعلیم۔ دوسرے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت۔ لوگوں کے سامنے یہ پیغام پیش کیا گیا تھا کہ لَا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَ لَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّ لَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ ان کو اس بات پر جمع کیا گیا تھا کہ

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِیَآءَ ان کو تعلیم دی گئی تھی کہ اِنَّ صَلٰوتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ ان کے سامنے یہ نصب العین رکھا گیا تھا کہ اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ۔ پھر جس شخص نے ان کو یہ دعوت دی تھی اس کا حال یہ تھا کہ کان خلقه القرآن۔ وہ جو کچھ کہتا تھا سب سے پہلے اور سب سے بڑھ کر خود اس پر عمل کر کے دکھاتا تھا۔ وہ فضیلت اخلاق اور عمل صالح کا مجسمہ تھا، اور اس کی زندگی میں راست بازی و راست روی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

---

یہی دو چیزیں تھیں جنہوں نے ہر طرف سے لوگوں کو کھینچا اور وہ قوم بنادی جس کا نام مسلمان ہے۔ نوع انسانی کے مختلف طبقوں اور گروہوں میں سے جن جن لوگوں کے لیے ان دو چیزوں میں کوئی کشش تھی، وہ اس مرکز کی طرف کھنچتے چلے گئے اور انہی سے مسلمان قوم وجود میں آئی دوسرے الفاظ میں اس حقیقت کو یوں سمجھیے کہ اسلامی جمعیت نام ہی اس جمعیت کا ہے جو قرآن اور سیرت محمدی کی کشش سے وجود میں آئی ہے۔ جہاں زندگی کے وہ اصول اور مقاصد ہوں گے جو قرآن نے پیش کیے ہیں، اور جہاں طرز عمل وہ ہوگا جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا، وہاں "مسلمان" جمع ہو جائیں گے، اور جہاں یہ دونوں چیزیں نہ ہوں گی وہاں ان لوگوں کے لیے قطعاً کوئی کشش نہ ہوگی جو "مسلمان" ہیں۔ اب ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ہماری تحریکات میں بنیادی نقص کونسا ہے جس کی وجہ سے مسلمان کسی تحریک کی طرف بھی فوج در فوج نہیں کھنچتے اور ہر داعی کی آواز بہرے کانوں سے سنتے ہیں۔ ان کی فطرت وہ آواز سننا چاہتی ہے اور وہ طرز عمل دیکھنا چاہتی ہے جس کی کشش نے ان کو ساری دنیا سے الگ ایک قوم بنایا تھا، مگر افسوس کہ نہ وہ آواز کسی طرف سے آتی ہے اور نہ وہ طرز عمل کہیں نظر آتا ہے۔ بلانے والے ان کو ایسے مقاصد کی طرف

بلاتے ہیں جو ان کی زندگی کے اصلی مقاصد نہیں ہیں اور رہنمائی کے لیے اٹھتے ہیں تو وہ جن کی سیرت میں محمد رسول اللہ کی سیرت کی ادنیٰ جھلک تک نظر نہیں آتی جمہور مسلمین بڑی بڑی امیدیں لے کر ہر نئی تحریک کی طرف دوڑتے ہیں مگر مقاصد کی پستیاں اور عمل کی خرابیاں دیکھ کر ان کے دل ٹوٹ جاتے ہیں۔

خیر یہ ایک دوسری داستان ہے۔ اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریق تنظیم پر غور کیجیے کہ مسلمان قوم کی تنظیم اگر ہو سکتی ہے تو اسی طریق پر ہو سکتی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی جمعیت جس ڈھنگ پر بنائی تھی کہ پہلے تو آپ نے انسانی گروہ میں صرف ان لوگوں کو چھانٹ لیا جن کی فطرت میں ایک خالص صداقت اور ایک پاک زندگی کی طرف کھنچنے کی صلاحیت تھی۔ پھر تعلیم و تربیت کے بہترین ذرائع سے کام لے کر ان میں سے ایک ایک فرد کی اصلاح فرمائی، اس کے دل میں زندگی کا ایک بلند مقصد بٹھا دیا۔ اور اس کے کیرکٹر میں اتنی مضبوطی پیدا کی کہ وہ اس مقصد کے لیے جم کر جد و جہد کرے اور کسی فائدہ کا لالچ یا کسی نقصان کا خوف اسے اس مقصد کی راہ سے نہ ہٹا سکے۔ اس کے بعد ان افراد کو ملا کر ایک جماعت بنا دیا تاکہ افراد میں جو کچھ کمزوریاں باقی رہ جائیں، جماعت کی طاقت ان کو دور کرے، اجتماعی ماحول ایسا بن جائے جس میں نیکیاں پرورش پائیں، افراد اپنے مقصد حیات کی تکمیل میں ایک دوسرے کے مددگار ہوں، اور اجتماعی طاقت سے اس کو حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ اس تعمیر کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کوئی ماہر فن انجینیر اینٹوں کے ڈھیر میں سے چھانٹ کر بہترین اینٹیں لے، پھر ان کو اس طرح پکائے کہ ایک ایک اینٹ بجائے خود پختہ ہو جائے۔ پھر ان سب کو نہایت عمدہ سیمنٹ سے جوڑ کر ایک مستحکم عمارت بنا دے۔

اس تنظیم کے بڑے بڑے اصول یہ تھے:۔

جماعت کے تمام افراد کم از کم دین کے جوہر سے واقف ہوں تاکہ وہ کفر و اسلام میں تمیز کر کے اسلام کے طریقہ پر عملی تمسک قائم رکھیں۔

اجتماعی عبادات کے ذریعہ سے افراد میں اخوت، مساوات اور تعاون کی اسپرٹ پیدا کی جائے۔

جماعت کے تمدن و معاشرت میں ایسے امتیازی خصائص اور حدود مقرر کیے جائیں جن سے وہ دوسری قوموں میں خلط ملط نہ ہو سکیں اور باطنی و ظاہری دونوں حیثیتوں سے ایک الگ قوم بنے رہیں اسی لیے تشبہ بالاجانب کی سختی کے ساتھ ممانعت کی گئی

تمام اجتماعی ماحول پر امر بالمعروف و نہی عن المنکر چھایا رہے تاکہ جماعت کے دائرہ میں کوئی انحراف اور کوئی بغاوت پنپنے نہ پاسکے۔

پوری مسلمان قوم ایک انجمن ہو اور ہر مسلمان مرد اور عورت کو مجرد اسلامی حق کی بنا پر اس کی رکنیت کا مساویانہ مرتبہ حاصل ہو نیز تمام انقسامات اور امتیازات کو مٹا دیا جائے جو مسلم اور مسلم میں تفریق کرتے ہوں۔

جماعت کے تمام افراد ایک نصب العین پر متحد ہوں اور اس کے لیے جد و جہد اور قربانی کرنے کا جذبہ ان میں موجود ہو۔ ایک گروہ صرف اسی نصب العین کی خدمت کے لیے وقف رہے اور بقیہ افراد جماعت اپنی معاش کے لیے جد و جہد کرنے کے ساتھ ساتھ پہلے گروہ کی ہر ممکن طریقہ سے مدد کرتے رہیں۔ غرض ہر فرد جماعت کے دل میں یہ خیال بیٹھا ہوا ہو کہ اس کی زندگی محض اس کی اپنی ذات کے لیے نہیں ہے بلکہ اس ایک قومی نصب العین کے لیے ہے۔

---

تنظیم کے یہی اصول تھے جن سے وہ زبردست جماعت پیدا ہوئی جو دیکھتے دیکھتے آدھی دنیا پر چھا گئی۔ اس طرز تنظیم کی رفتار ابتدا میں بہت سست تھی حتی کہ پندرہ برس تک وہ چند سینکڑوں سے زیادہ افراد کو اپنے دائرہ میں نہ لا سکی۔ مگر اس میں یہ قاعدہ نظر رکھا گیا تھا کہ توسیع کے ساتھ ساتھ استحکام بھی ہوتا رہے اس لیے یہ نظام جماعت جتنا پھیلتا گیا اتنا ہی مضبوط ہوتا چلا گیا، یہاں تک کہ جب ایک معتد بہ جماعت اس طریق پر منظم ہو گئی تو وہ اتنی طاقت کے ساتھ اٹھی کہ دنیا کی کوئی چیز اس کے سیل رواں کو نہ روک سکی۔ قرآن مجید میں اسی چھوٹی سی ابتدا پھر تدریجی ترقی پھر غیر معمولی شان و شوکت کے ساتھ اس کے ظہور کو کیسے بلیغ انداز میں بیان کیا گیا ہے: كَزَرْعٍ أَخْرَجَ شَطْأَهُ فَآزَرَهُ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوَىٰ عَلَىٰ سُوقِهِ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ

مسلمان قوم کے مزاج کے ساتھ یہی طرز تنظیم مناسبت رکھتا ہے۔ یہ قوم تو پہلے ہی سے ایک جمعیت ہے۔ اس جمعیت کے اندر کوئی الگ جمعیت کسی نام سے بنانا اور مسلمان اور مسلمان کے درمیان کسی رسم یا کسی ظاہری علامت یا کسی خاص نام یا کسی خاص مسلک سے فرق و امتیاز پیدا کرنا، اور مسلمانوں کو مختلف پارٹیوں میں تقسیم کرکے ان کے اندر جماعتوں اور فرقوں کی عصبیتیں پیدا کرنا یہ دراصل مسلمانوں کو مضبوط کرنا نہیں ہے بلکہ ان کو اور کمزور کرنا ہے۔ یہ تنظیم نہیں تفرقہ پردازی اور گروہ بندی ہے۔ لوگوں نے آنکھیں بند کرکے جمعیت سازی کے یہ طریقے اہل مغرب سے لے لیے ہیں مگر ان کو معلوم نہیں ہے کہ جو چیزیں دوسری قوموں کے مزاج کو موافق آتی ہیں وہ مسلمان قوم کے مزاج کو موافق نہیں آتیں۔ اس قوم کو اگر کوئی چیز راس آسکتی ہے تو وہ ایک ایسی جمہوری تحریک ہے جو پوری قوم کو ایک انجمن سمجھ کر شروع کی جائے اور جس میں ٹھیک ٹھیک اسی نقشہ کو پیش نظر رکھا جائے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نمونہ کے طور پر رکھا تھا۔ اگر کمزور مسالے کو لیکر ریت کی سطح پر ایک بودی سی عمارت کھڑی کر دیں گے اور اس سے قلعے کا کام لینا چاہیں گے تو لامحالہ وہ سیل حوادث کی ایک ٹکر بھی نہ سہہ سکے گی۔

## مقالات

# حدیث نبوی سے شرائع کا استنباط

از افادات حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ

(ماخوذ از حجۃ اللہ البالغہ)

**علوم نبوی کی اقسام** | نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ مروی ہے اور کتب حدیث میں جمع کیا گیا ہے۔ اس کی دو قسمیں ہیں۔

ایک وہ جو تبلیغ رسالت کے سلسلہ میں ہے۔ اسی کے متعلق قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے کہ مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (رسول تم کو جو کچھ دے اسے لو اور جس سے روک دے اس سے رک جاؤ)۔ اس سلسلہ میں بہت سی چیزیں آجاتی ہیں۔ مثلاً آپ نے علوم معاد اور عجائب ملکوت جو کچھ بیان کئے وہ سراسر وحی کی سند پر ہیں اور اجتہاد کا ان میں کوئی دخل نہیں۔ شرعی احکام اور عبادات کے ضوابط اور تمدنی معاملات کے متعلق جو ہدایات آپ نے دیں ان میں سے بعض وحی پر مبنی ہیں اور بعض اجتہاد پر۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اجتہاد بھی بمنزلہ وحی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حضور کو اس بات سے محفوظ کر دیا تھا کہ آپ کسی غلط رائے پر جم جائیں۔ پھر یہ گمان کرنا بھی صحیح نہیں کہ آپ کا اجتہاد منصوص احکام سے استنباط کے طور پر تھا بلکہ صحیح تر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تعلیم و ہدایت سے مقاصد شرع اور قانون تشریع اور اصول تیسیر احکام پر آپ حاوی ہو چکے تھے اس لیے آپ جو کچھ بھی اجتہاد فرماتے تھے وہ اسی الٰہی ہدایت پر مبنی ہوتا تھا۔ اسی سلسلہ میں حکمت اور مصلحت کی وہ باتیں بھی داخل ہیں جو حضور نے بسبیل عموم و اطلاق بیان کی ہیں، اور جن کے لیے آپ نے حدود اور اوقات مقرر نہیں فرمائے ہیں، مثلاً اخلاق صالحہ اور خصائل مذمومہ اور فضائل اعمال اور مناقب عمال وغیرہ۔ ان

بعض وحی پر مبنی ہیں اور بعض اجتہاد پر مگر ان معاملات میں بھی آپکا اجتہاد اس معنی میں نہیں ہے کہ آپ نے دنیوی عقلاء کی طرح غور و خوض کر کے کسی چیز کو اچھا اور کسی کو برا ٹھیرایا ہو، اور اس میں غلطی کا امکان ہو۔ بلکہ وہ اس معنی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے قلب میں مصالح عباد اور قوانین ارتفاق کا علم بھر دیا تھا اور یہی علم اس حکمت و دانائی کا منبع تھا جس سے آپ کلیات اخذ کرتے تھے اور ان سے جزئیات نکالتے تھے۔

دوسری قسم وہ ہے جس کا تعلق تبلیغ رسالت کے سلسلہ سے نہیں ہے۔ اسی کے متعلق حضور نے فرمایا کہ انما انا بشر اذا امرتکم بشیٔ من دینکم فخذوا بہ واذا امرتکم بشیٔ من رأی فانما انا بشر (میں ایک انسان ہوں۔ جب میں تم کو دین کی کسی بات کا حکم دوں تو اس کی پیروی کرو۔ اور جب اپنی رائے سے کوئی بات کہوں تو میری حیثیت ایک انسان ہی کی ہے) اور اس کی طرف حضور کا وہ ارشاد بھی اشارہ کرتا ہے جو آپ نے درخت خرما کو گابھہ لگانے کے سلسلہ میں فرمایا تھا کہ فانی ظننت ظناً ولا تواخذونی بالظن ولکن اذا حدثتکم عن اللہ شیئاً فخذوا بہ فانی لم اکذب علی اللہ (میں نے تو ایک بات اپنے گمان سے کہی تھی اور تم میرے گمان پر گرفت نہ کرو۔ البتہ جب میں کوئی بات خدا کی طرف سے کہوں تو اس کی پیروی کرو کیونکہ میں نے خدا پر کبھی جھوٹ نہیں باندھا) اس دوسری قسم کے علوم میں بہت سی چیزیں ہیں، مثلاً حدیث کے وہ ابواب جو طب سے تعلق رکھتے ہیں، اور آپ کا وہ ارشاد کہ تم فلاں قسم کے گھوڑے استعمال کرو۔ ان چیزوں کی بنا تجربہ پر تھی نہ کہ وحی یا اجتہاد نبوی پر۔ اسی طرح آپ کے وہ افعال جو آپ نے عادت کے طور پر کیے ہیں نہ کہ عبادت کے طور پر، یا اتفاقاً کیے ہیں نہ کہ قصداً، یا وہ باتیں جو آپ نے اسی طریقہ سے بیان کی ہیں جس طریقہ پر آپ کی قوم کے لوگ بیان کیا کرتے تھے۔ مثلاً ام زرع کا قصہ اور خرافہ کا قصہ کہ ان چیزوں کا بھی کوئی تعلق تبلیغ رسالت سے نہیں ہے۔ حضرت زید بن ثابت کے پاس ایک مرتبہ چند لوگ حاضر ہوئے اور انہوں نے فرمائش کی کہ ہمیں رسول اللہ

کی باتیں سنائیے جواب میں حضرت زید نے فرمایا کہ "میں حضور کا پڑوسی تھا۔ جب آپ پر کوئی وحی نازل ہوتی تو آپ مجھے بلا بھیجتے اور میں اس وحی کو لکھ دیتا تھا۔ پھر آپ کی صحبت میں بیٹھ کر جب ہم دنیا کا ذکر کرتے تو آپ بھی ہمارے ساتھ اس ذکر میں شریک ہو جاتے تھے، اور جب ہم آخرت کا ذکر کرتے تو آپ اس میں بھی ہمارے ساتھ حصہ لیتے تھے؛ اور جب ہم کھانے کا ذکر کرتے تو آپ اس میں بھی ہمارا ساتھ دیتے تھے۔ اب کیا میں یہ سب باتیں احادیث رسول کی حیثیت سے تمہارے سامنے بیان کر دوں؟" اس قول میں حضرت زید کی مراد حضور کی ایسی ہی باتوں سے تھی جو آپ بحیثیت ایک انسان کے اپنے گھر میں یا اپنے دوستوں کی صحبت میں کیا کرتے تھے اور جن کا تعلق تبلیغ رسالت سے نہ تھا۔

اسی سلسلہ میں وہ کام بھی آ جاتے ہیں جو حضور نے اپنے عہد کی کسی جزئی مصلحت کی خاطر کیے تھے اور جو تمام امت کے لیے امور لازمہ میں سے نہیں ہیں۔ اس قسم کے کاموں کی حیثیت ایسی ہے جیسے خلیفہ وقت اپنے زمانہ کی ضرورتوں کے لحاظ سے فوجوں کی صف آرائی کے لیے کوئی خاص طریقہ مقرر کرے یا اپنی افواج کے لیے کوئی خاص شعار معین کرے کہ یہ چیزیں بعد والوں کے لئے لازم نہیں ہوتیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسی بنا پر فرمایا تھا کہ "اب ہم کو طواف میں اکڑ کر چلنے کی ضرورت نہیں۔ یہ تو ہم ایک خاص قوم پر اپنی قوت کے اظہار کے لیے کرتے تھے، اور وہ قوم اب ہلاک ہو چکی ہے"۔ مگر بعد میں آپ نے محض اس خوف سے یہ رائے واپس لے لی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کچھ اور مقصد بھی ہو اور وہ ہماری سمجھ میں نہ آیا ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت سے احکام اسی قبیل سے شمار کیے گئے ہیں۔ مثلاً آپ کا یہ ارشاد کہ جو شخص کسی کو جہاد میں قتل کرے اس کے کپڑے اور ہتھیار وغیرہ اسی کو دیئے جائیں۔ یا مثلاً آپ کے خاص فیصلے جو آپ نے خاص معاملات میں فرمائے تھے کہ مقدمات میں انہی کی پیروی لازم نہیں ہے بلکہ ہر مقدمہ کا فیصلہ ثبوت اور شہادت کی بنا پر کرنا ضروری ہے۔ اسی کی طرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قول میں اشارہ

کیا ہے جو آپ نے حضرت علی سے فرمایا تھا کہ "غائب ان سب چیزوں کو نہیں دیکھ سکتا جو حاضر کے پیش نظر ہوتی ہیں"۔

مصالح اور شرائع کا فرق | شارع نے ہم کو دو قسم کے علم دئے ہیں جن کے احکام باہم مختلف اور جن کے مواقع باہم متباین ہیں۔

ایک قسم کا علم وہ ہے جو مصالح اور مفاسد سے تعلق رکھتا ہے یعنی وہ علم جس میں شارع نے ہم کو اخلاق فاضلہ کے اکتساب اور خصائل رذیلہ کے ازالے سے تہذیب نفس کے طریقے بتائے ہیں اور تدبیر منزل اور رزق معاش اور سیاست مدینہ کے متعلق ہدایات دی ہیں۔ اس علم میں تمام تر کلیات اور اصول ہیں کسی چیز کی مقدار معین نہیں کی گئی، نہ کوئی ایسا ضابطہ بنایا گیا ہے جو ہر ایک چیز کی حد معین کرتا ہو، نہ ایسی تفصیلات دی گئی ہیں جن میں ہر جزئیہ دوسرے جزئیہ سے ممیز ہو۔ بلکہ عمومیت کے ساتھ فضائل کی طرف رغبت اور رذائل سے نفرت دلائی گئی ہے، اور کلام اس طرز پر کیا گیا ہے کہ ہر شخص جو زبان سے واقف ہے اس کا مفہوم خود سمجھ سکتا ہے، اور ہر شخص جو نفس مصلحت یا نفس مفسدہ کو جانتا ہے وہ خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ کس موقع پر کیا کس حد تک مطلوب ہے یا قابل حذر ہے۔ مثال کے طور پر کیاست اور شجاعت کی مدح کی گئی اور رفق و محبت کا حکم دیا گیا اور معیشت میں اقتصاد کی ہدایت کی گئی مگر یہ نہیں بتایا گیا کہ ان چیزوں کی حد کیا ہے جس تک پہنچنے کی کوشش کی جائے، اور ان کی عملی صورتیں کون کونسی ہیں جنہیں اختیار کیا جائے، اور ان میں کوتاہیاں کونسی ہیں جن سے پرہیز کیا جائے۔

دراصل شارع کے پیش نظر تین مقاصد ہیں جن کی طرف تمام احکام اور ہدایات کا مرجع ہے:-

۱۔ تہذیب نفس، ان اخلاق و خصائل کے ذریعہ سے جو دنیا اور آخرت میں نافع ہیں۔

۲۔ اعلاء کلمۂ حق اور تمکین شرائع اور اشاعت دین حق۔

۳۔ بندگان خدا کے معاملات کا انتظام اور ان کے طرز عمل کی شائستگی اور ان کو ایک دوسرے کی بھلائی میں مددگار بنانا۔

ہر بھلائی جس پر شارع نے ہمیں ابھارا ہے اور ہر برائی جس سے اس نے ہمیں روکا ہے، اسی حیثیت سے بھلی یا بری ہے کہ وہ ان مقاصد اصلیہ میں سے کسی ایک یا سب کے موافق یا مخالف ہو۔ جو چیز ان کی طرف لے جانے والی ہو وہ بھلی ہے اور شارع چاہتا ہے کہ اس کو اختیار کیا جائے اور جو چیز ان کے حصول میں مانع ہو یا جس سے اندیشہ ہو کہ وہ مانع ہو سکتی ہے، یا جو اپنی فطرت کے اعتبار سے ایسی ہو کہ ان مقاصد سے انسان کو پھیر دینا ہی اس کا خاصہ ہو یا جس کا تعلق عادۃً ان مقاصد کے اضداد ہی سے رہا ہو، وہ شارع کی نگاہ میں بُری ہے، اور وہ چاہتا ہے کہ انسان اس سے بچے۔ اللہ تعالیٰ کی رضا کا تعلق ان مصالح سے اور اس کی ناراضی کا تعلق ان مفاسد سے دائمی ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی بعثت سے پہلے اور بعد یکساں رہا ہے۔ اگر یہ دائمی تعلق نہ ہوتا تو انبیاء علیہم السلام بھیجے ہی نہ جاتے۔ شرائع اور حدود فی نفسہٖ مقصود نہیں ہیں کہ محض ان کے لیے انسان کو مکلف کرنے اور ان پر انسان سے مواخذہ کرنے کی خاطر انبیاء کو مبعوث کیا جاتا۔ دراصل یہ مصالح اور مفاسد چونکہ نفس انسانی کی تہذیب یا تلویث کے موجب تھے اور نوع انسانی کی فلاح یا خسران سے ان کا گہرا تعلق تھا اس لیے اللہ تعالیٰ کا لطف وکرم اس کا مقتضی ہوا کہ ایسے برگزیدہ نفوس بھیجے جو بنی آدم کو ان چیزوں سے خبردار کریں جو ان کے لیے اہمیت رکھتی ہیں، اور ان چیزوں پر مکلف کریں جو ان کے لیے ناگزیر ہیں۔ اور چونکہ یہ مقصد بغیر اس کے حاصل نہیں ہو سکتا تھا کہ لوگوں کے لیے حدود اور شرائع مقرر کیے جائیں اس لیے اللہ کا لطف وکرم پھر اس کا مقتضی ہوا کہ انہی برگزیدہ نفوس کے ذریعہ سے شرائع اور حدود مقرر کرے۔

مصالح اور مفاسد کا یہ علم جو حدود اور شرائع کی جڑ ہے اس میں تمام تر وہ چیزیں ہیں جو معقول المعنیٰ ہیں اور جن کا تعلق بالکلیہ فہم اور تدبر سے ہے۔ ان میں بعض چیزیں تو ایسی ہیں جن کو عام طور پر لوگ آسانی سے سمجھ سکتے ہیں اور بعض ایسی ہیں جن کے فہم کا دروازہ صرف انہی لوگوں پر کھلتا ہے جن کے قلوب پر انبیاء علیہم السلام کے نورِ علم کا فیضان ہوا ہو اور جنہوں نے اصولِ شرع کو ٹھیک ٹھیک سمجھ لیا ہو۔

دوسری قسم کا علم شرائع اور حدود اور فرائض کا علم ہے جس میں مقادیر کی توضیح کی گئی ہے شارع

اس علم میں صاف اور واضح طور پر ہم کو بتاتا ہے کہ بھلائی کے کام کونسے ہیں، کن چیزوں میں بھلائی کی توقع کی جاتی ہے، کونسی علامتیں ہیں جن سے بھلائی پہچانی جاتی ہے۔ انہی چیزوں پر وہ احکام کو دائر کرتا ہے اور لوگوں کو ان کا مکلف ٹھیراتا ہے۔ وہ ارکان اور شروط اور آداب کی تعیین سے خیر و صلاح کی ایک ایک نوع کو منضبط کرتا ہے، اور ہر نوع کے لیے ایک حد مقرر کر دیتا ہے کہ اس کو پورا کرنا تو لامحالہ ضروری ہے اور اس سے زائد عمل کرنا ضروری نہیں مگر پسندیدہ ہے۔ اس طرح تکلیف شرعی کا رخ فی نفسہٖ ان چیزوں کی طرف پھر جاتا ہے جن میں بھلائی کی توقع ہے، اور احکام کا مدار بالذات وہ چیزیں قرار پاتی ہیں جو بھلائی کی علامات ہیں۔

اس نوع کے علم کا مرجع قوانین سیاست ملیہ ہیں اور اس میں مصلحت یا مفسدہ کی توقع پر جتنی چیزوں کو واجب یا ممنوع قرار دیا گیا ہے وہ سب کی سب ایک ضابطہ سے منضبط ہیں، امور محسوسہ میں سے ہیں اور ایسے کھلے اوصاف سے متصف ہیں جن کو خاص و عام سب جان سکتے ہیں۔

ایجاب اور تحریم کے احکام جن اصول اور قوانین پر مبنی ہیں ان کو تو ہم جان سکتے ہیں، اور ان اسباب میں سے بھی بہتیروں کو ہم جانتے ہیں جن کی بنا پر کسی چیز کو واجب اور کسی چیز کو حرام کیا گیا ہے، مگر یہ بات کہ کونسی چیز کس مقدار یا کس تعداد یا کس شکل میں واجب ہے، اور کونسی چیز کس طور پر حرام ہے اس کا تعین عقلی نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر منحصر ہے جو ملاء اعلیٰ میں لکھا ہوا ہے اور ہمارے پاس اس کے معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ بجز نص شارع کے نہیں ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ہم اس قاعدۂ طبعی کو تو جانتے ہیں کہ برف بننے کا سبب پانی کو ٹھنڈک پہنچنا ہے۔ مگر یہ بات کہ اس وقت جو پانی سے بھرا ہوا پیالہ ہمارے سامنے رکھا ہے اس کا پانی برف بن گیا ہے یا نہیں، اس کا علم ہم کو اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ یا تو ہم خود اس کا مشاہدہ نہ کریں یا کسی مشاہدہ کرنے والے سے ہم کو اس کی خبر نہ ملے۔ علیٰ ہٰذا القیاس ہم یہ تو جانتے ہیں کہ زکوٰۃ ادا کرنے کے لیے بہرحال ایک نصاب ہونا چاہیئے،

اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ دو سو درہم اور پانچ وسق کی مقداریں نصاب کے لیے بالکل مناسب ہیں کیونکہ ان کا مالک آسانی کے ساتھ زکوٰۃ ادا کرسکتا ہے، لیکن ہم یہ نہیں جانتے کہ یہی وہ نصاب ہے جو اللہ نے ہمارے لیے مقرر کیا ہے اور اسی پر اللہ کی خوشنودی و ناخوشی کا مدار ہے۔ یہ بات ہم کو صرف نص شارع ہی سے معلوم ہوسکتی ہے۔

علماء کی ایک معتد بہ جماعت اس بات پر متفق ہے کہ مقادیر کے باب میں قیاس جاری نہیں ہوسکتا۔ ان کے نزدیک قیاس کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ کسی مشترک علت کی بنا پر اصل کا حکم فرع میں بھی جاری کردیا جائے۔ مگر یہ جائز نہیں کہ ہم بطور خود کسی مصلحت کے مظنّہ کو علت قرار دے لیں یا کسی چیز کو مناسب دیکھ کر رکن یا شرط ٹھیرا دیں۔ نیز اس پر بھی وہ متفق ہیں کہ محض مصلحت کا موجود ہونا قیاس کے لیے کافی نہیں بلکہ کوئی مضبوط علت ہونی چاہیے جس پر حکم دائر کیا جاچکا ہو۔ مثال کے طور پر کسی ایسے مقیم شخص کو جو کسی حرج میں مبتلا ہو مسافر پر قیاس کرکے نماز اور روزے کی رخصتوں کا مجاز نہیں ٹھیرایا جاسکتا کیونکہ مسافر کو قصر و افطار کی جو اجازت دی گئی ہے اس کی مصلحت اگرچہ دفع حرج ہی ہے، لیکن یہ اس کی علت نہیں ہے بلکہ شارع نے سفر کو اس کی علت قرار دیا ہے۔

ان مسائل میں علماء کے درمیان اجمالاً تو اختلاف نہیں ہے، مگر تفصیل میں اختلاف ہو جاتا ہے، اس لیے کہ اکثر ایسے معاملات پیش آتے ہیں جن میں علت پر مصلحت کا شبہ ہوتا ہے۔ بعض فقہاء کا تو یہ حال ہوا کہ جب قیاس کی گہرائیوں میں گئے تو ان پر [illegible]ت طاری ہوگئی، چنانچہ بعض مقادیر کو انہوں نے بجنسہٖ باقی رکھنے پر اصرار کیا اور ان سے ملتی جلتی دوسری مقادیر اختیار کرنے سے انکار کردیا، اور بعض مقادیر کو دوسری مقادیر سے بدلنے میں ان سے تسامح ہوگیا۔ اس کی مثال یہ ہے کہ انہوں نے کپاس کے لیے پانچ گٹھوں ہی کا نصاب مقرر کیا، اور کشتی کے سفر کو دورانِ سر کا مظنّہ ٹھیرا کر اجازت دے دی کہ اس میں بیٹھ کر نماز پڑھی جائے اور ماء کثیر کے لیے دس ہاتھ سے دس ہاتھ کی مقدار مقرر کی۔

جب کسی معاملہ میں شریعت ہم کو اپنے حکم کی مصلحت سمجھا دے، اور ہم وہی مصلحت کسی دوسرے معاملہ میں موجود پائیں تو بلاشبہ ہم وہی حکم اس دوسرے معاملہ میں بھی جاری کر سکتے ہیں، کیونکہ ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا کا تعلق دراصل اس مصلحت سے ہے، نہ کہ اس خاص معاملہ سے۔ لیکن مقادیر کا مسئلہ اس سے مختلف ہے۔ کیونکہ یہاں رضا کا تعلق خاص انہی مقادیر سے ہے۔ مثال کے طور پر کوئی شخص کسی وقت کی نماز چھوڑ دے تو وہ بہرحال گناہگار ہوگا چاہے وہ اس وقت ذکر الٰہی یا کسی دوسری قسم کی عبادت ہی میں کیوں نہ مشغول رہا ہو۔ اسی طرح جو شخص زکوٰۃ مفروضہ ادا نہ کرے، وہ اگر اس سے بہت زیادہ مال کسی کار خیر میں صرف کر دے تب بھی گناہ سے نہ بچ سکے گا۔ اسی طرح اگر کوئی شخص خلوت میں ریشمی لباس اور سونا پہنے جہاں نہ فقراء کی دل شکنی کا اندیشہ ہے، نہ اس بات کا خوف ہے کہ اس سے دلوں میں دنیا طلبی کی پیاس بڑھ جائے گی، نہ اس امر کا کوئی امکان ہے کہ دوسروں کے مقابلہ میں اس کی شان اور تفوق کا اظہار ہو، تب بھی وہ گناہگار ہی ہوگا۔ اسی طرح اگر کوئی شخص دوا کے طور پر شراب پیے اور اس میں کسی فساد یا ترک صلوٰۃ کا خوف نہ ہو تب بھی گناہ بہرحال اس پر عائد ہوگا، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور ناخوشی نفس ان اشیاء ہی سے وابستہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ غرض اصلی مفاسد کا سدباب اور مصالح کا حصول ہے، لیکن حق تعالیٰ جانتا تھا کہ سیاستِ امت بغیر اس کے ممکن نہیں ہے کہ نفس ان اشیاء ہی کو واجب یا حرام کیا جائے اس لیے اس کی خوشنودی اور ناخوشی انہی کے ساتھ بالذات متعلق ہوئی۔ بخلاف اس کے اگر کوئی شخص ریشم سے بہت زیادہ قیمتی اون کا لباس پہنے یا سونے سے بہت زیادہ قیمتی جواہر کے برتن استعمال کرے، تو وہ فی نفسہ اس فعل سے گناہگار نہ ہوگا، اس لیے کہ اس نے حکم صریح کی خلاف ورزی اور نافرمانی نہیں کی۔ البتہ اگر اس کے فعل میں غریبوں کی دل شکنی، یا اسراف کی تحریص یا تفاخر کا قصد متحقق ہو جائے تو وہ ان مفاسد کی وجہ سے رحمت الٰہی سے دور ہو جائے گا۔

صحابہ کرام اور تابعین رحمہم اللہ کو جہاں کہیں تم ایسا فعل کرتے دیکھو جو مقادیر کی تعیین سے مشابہ

نظر آتا ہو، وہاں سمجھ لو کہ ان کا مقصد دراصل مقادیر کی تعیین نہیں ہے، بلکہ مصلحت کا بیان اور اس کی طرف ترغیب اور مفسدہ کا بیان اور اس سے ترہیب ہے، اور انہوں نے جو خاص صورت کسی حکم کی تجویز کی ہے وہ بطور مثل کے ہے، بخصوصیت کے ساتھ وہی صورت مقصود نہیں ہے بلکہ دراصل معانی مقصود ہیں، اگرچہ بادی النظر میں ایسا ہی محسوس ہوتا ہے کہ صورت کی تعیین مقصود ہے اور جس جگہ خود شرع نے کسی مقدار کو قیمت سے بدل دینا جائز رکھا ہے، جیسے ایک قول کے مطابق زکوٰۃ میں بنت مخاض[1] کے بجائے اس کی قیمت دینے کی اجازت ہے، تو اس کو تسلیم کرتے ہوئے ہم کہتے ہیں کہ یہ بھی ایک طرح کی تعیین مقدار ہی ہے، کیونکہ تعیین مقدار میں ایسا استقصاء نہیں کیا جا سکتا جو دائرۂ عمل کو تنگ کر دینے کا موجب ہو۔ لہٰذا بسا اوقات اس طور پر مقدار متعین کی جاتی ہے کہ اس کا اطلاق بہت سی چیزوں پر ہو سکتا ہو جیسے یہی بنت مخاض کہ کبھی ایک بنت مخاض دوسرے بنت مخاض سے زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔ اور بسا اوقات قیمت سے مقدار کی تعیین کرنے میں فی الجملہ ایک حد معلوم ہوتی ہے، جیسے چوری میں قطع ید کا نصاب ایسی چیز کو قرار دیا گیا جس کی قیمت چوتھائی دینار یا تین درہم ہو

یہ بھی سمجھ لو کہ ایجاب اور تحریم دونوں تقدیر[2] کی قسم سے ہیں، یہ اس لیے کہ بہت سی چیزیں جن میں مصلحت یا مفسدہ نظر آتی ہیں ان کی صورتیں بے شمار ہیں اور ہو سکتی ہیں، لہٰذا شارع نے چند خاص صورتیں ایجاب کے لیے اور چند خاص صورتیں تحریم کے لیے معین کر دیں، کیونکہ وہ ایسی صورتیں تھیں جو ضبط میں آ سکتی تھیں یا لوگوں کو ملل سابقہ میں ان کا حال معلوم تھا، یا ان کی طرف انسانی طبائع زیادہ راغب تھیں۔ اسی وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تراویح کے معاملہ میں عذر فرمایا کہ مجھے خوف ہے کہیں وہ تم پر فرض نہ کر دی جائے اور مسواک کے متعلق فرمایا کہ اگر میری امت پر سختی کا خوف نہ ہوتا تو میں ان کو مسواک کرنے کا حکم دیتا۔

---

[1] اونٹ کا وہ بچہ جو ایک سال سے گذر کر دوسرے سال میں داخل ہو چکا ہو۔

[2] تقدیر سے مراد تعیین مقادیر ہے

پس جب حال یہ ہے تو یہ کسی طرح جائز نہیں کہ جن چیزوں کا حکم منصوص نہیں ہے ان کو منصوص پر قیاس کرکے فرض یا حرام قرار دیا جائے۔ رہا ندب[1] اور کراہت تو اس میں تفصیل ہے۔ ہر وہ مندوب فعل جس کو شارع نے کرنے کا حکم دیا، اور جس کے حکم کی تصریح کی اور جس کی عہد صحابہ و تابعین کے لوگوں نے پابندی کی اس کا حال وہی ہے جو واجب کا حال ہے۔ اور جس مندوب فعل کی محض مصلحت بیان کرنے پر شارع نے اکتفا کیا، یا جس پر خود شارع نے عمل کیا مگر اس کو دوسروں کے لیے سنت نہیں بنایا، نہ اس کی پابندی پر زور دیا تو وہ اسی حالت پر باقی ہے جس پر تشریع سے پہلے تھا۔ اس میں جو کچھ بھی اجر ہے وہ اس مصلحت کے لحاظ سے ہے جو اس کے ساتھ وابستہ ہو، نہ کہ نفس فعل کے اعتبار سے۔ یہی تفصیل مکروہات میں بھی ہے۔ اس مقدمہ کو جب تم اچھی طرح سمجھ لوگے تو تم پر واضح ہو جائیگا کہ بہت سے قیاسی مسائل جن پر لوگ فخر کرتے ہیں، اور جن کی بنا پر وہ متبعین حدیث کو مطعون کرتے ہیں، وہ دراصل خود انہی کے لیے وبال ہیں، مگر وہ نہیں جانتے۔

نبی سے اخذ شرع کی کیفیت | نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے امت نے دو طرح پر شریعت اخذ کی ہے، ایک اخذ ظاہر، دوسرے اخذ بطور دلالت۔

اخذ ظاہر کی دو صورتیں ہیں۔ متواتر اور غیر متواتر۔

متواتر کی پھر دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو لفظاً متواتر ہے، مثلاً قرآن عظیم اور چند احادیث جن میں سے ایک یہ حدیث ہے کہ انکم سترون ربکم کما ترون ھذا القمر لا تضامون فی رؤیتہ[2]

دوسری وہ جو معنیً متواتر ہے جیسے طہارت اور نماز اور زکوٰۃ اور روزے اور حج اور بیوع اور نکاح اور غزوات کے کثیر التعداد احکام جن میں مسلمانوں کے تمام فرقے متفق ہیں۔

---

[1] ندب سے مراد کسی کام کی طرف رغبت دلانا اور اس کے کرنے کی طرف دعوت دینا ہے۔ اور مندوب اس کام کو کہتے ہیں جس کی دعوت دی گئی ہو۔

[2] تم اپنے رب کو اس طرح دیکھو گے جس طرح اس چاند کو دیکھ رہے ہو کہ اسے دیکھنے کے لیے تمہیں ہجوم کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ ہر شخص اپنی اپنی جگہ سے اس کو دیکھ رہا ہے۔

یا غیر متواتر تو اس کے مختلف درجات ہیں۔ اعلیٰ درجہ خبر مستفیض کا ہے، یعنی وہ جس کو کم از کم تین صحابہ نے حضورؐ سے نقل کیا ہو اور اس کے بعد پانچویں طبقہ تک رواۃ کی تعداد برابر بڑھتی چلی جائے اس قسم کی احادیث بکثرت موجود ہیں اور فقہ کے بڑے بڑے مسائل انہی پر مبنی ہیں۔ اس کے بعد ایسی خبر کا درجہ ہے جس کی صحت یا حسن کا فیصلہ اکابر محدثین اور حفاظ حدیث نے بالاتفاق کر دیا ہو۔ پھر ان خبروں کا درجہ ہے جن میں کلام کیا گیا ہو۔ بعض نے قبول کیا ہو اور بعض نے رد کر دیا ہو۔ ان میں سے جس خبر کی تائید پر شواہد موجود ہوں یا جس کی تائید اکثر اہل علم نے کی ہو یا جس کی صحت پر عقل صریح شہادت دیتی ہو اس کا اتباع ضرور کرنا چاہئے۔

اخذ بطور دلالت یہ ہے کہ صحابہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی فعل کرتے دیکھا یا حضورؐ سے کوئی بات سنی۔ پھر اس سے وجوب وغیرہ کا کوئی حکم مستنبط کیا، اور اس استنباط کی بنا پر لوگوں سے کہا فلاں بات واجب ہے اور فلاں جائز۔ پھر تابعین نے صحابہ سے اسی طرح اخذ کیا، اور ان کے بعد تیسرے طبقہ کے لوگوں نے ان کے فتاویٰ اور فیصلوں کو مدون کر دیا۔ اس باب میں جو صحابہ سب سے پیش پیش ہیں وہ حضرات عمرؓ، علیؓ، ابن مسعودؓ اور ابن عباس رضی اللہ عنہم ہیں۔ لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا طریقہ یہ تھا کہ آپ صحابہ سے مشورہ اور بحث کرتے اور کوئی فیصلہ اس وقت تک نہ کرتے تھے جب تک کہ حقیقت بالکل بے نقاب نہ ہو جاتی اور آپ کو صحت کا وثوق حاصل نہ ہو جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے اکثر فیصلوں اور فتووں کو تمام دنیائے اسلام میں قبول کیا گیا اور اسی بنا پر ابراہیم النخعی نے کہا ہے کہ جب حضرت عمرؓ نے وفات پائی تو علم کے دس حصوں میں سے نو حصے چلے گئے، اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ عمرؓ جب کسی طریقہ پر چلتے تو ہم اس کو آسان پاتے تھے۔ بخلاف اس کے حضرت علی رضی اللہ عنہ عموماً مشورہ نہ فرماتے تھے اس لیے آپ کے اکثر فیصلے کوفہ ہی تک محدود رہے اور بہت کم لوگوں نے ان کو لیا۔ [illegible] رضی اللہ عنہ [illegible] رہے اور ان کی ملاقات کے لوگوں نے

زیادہ تر ان کے فیصلے اختیار کیے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اکابر صحابہ کا عہد گذر جانے کے بعد اجتہاد کیا اور بہت سے احکام میں ان سے اختلاف کیا۔ ان کے فتاویٰ کو زیادہ تر اہل مکہ نے لیا جو ان کے شاگرد تھے۔ مگر جمہور اہل اسلام نے ان کے ایسے فتووں کو قبول نہیں کیا جن میں وہ منفرد تھے ان چار بزرگوں کے سوا جو صحابہ تھے وہ دلالت پر تو نظر رکھتے تھے، مگر آداب اور سنن کو رکن اور شرط سے ممیز نہیں کرتے تھے۔ ان میں حضرات ابن عمرؓ عائشہؓ اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہم اور بعض دوسرے صحابہ شامل ہیں۔

تابعین میں سے بھی چند لوگ اس باب میں نمایاں ہیں مثلاً مدینہ میں سعید بن المسیب، مکہ میں عطاء بن رباح، کوفہ میں ابراہیم نخعی، قاضی شریح اور شعبی، بصرہ میں حسن رضی اللہ عنہم۔

ان دونوں طریقوں میں سے ہر ایک میں کچھ نہ کچھ خلل رہتا ہے جس کو دور کرنے کے لیے دوسرے طریقے سے مدد لینی پڑتی ہے، اس لیے کوئی ایک طریقہ دوسرے طریقے سے بے نیاز نہیں ہے۔ اخذ ظاہر میں اس طرح خلل واقع ہوتا ہے کہ مثلاً راوی اصل الفاظ بھول گیا اور جو معنی اس کے ذہن میں محفوظ رہے ان کو اس نے دوسرے الفاظ سے ادا کیا جن سے معنی میں کچھ نہ کچھ تغیر ہو گیا۔ یا مثلاً حکم ایک واقعہ خاص میں تھا، راوی نے سمجھا کہ حکم کلی ہے، یا مثلاً کوئی بات تاکید کے ڈھنگ پر کہی گئی تھی تاکہ لوگ اس کی اہمیت سمجھیں اور اس کا اہتمام کریں، راوی نے سمجھا کہ وجوب یا حرمت کا حکم ہے حالانکہ معاملہ یہ نہ تھا۔ ایسی صورتوں میں صحیح مطلب وہی سمجھتا ہے جو فقیہہ ہو اور اصل واقعہ کی تفصیلات اس کے سامنے ہوں اور قرائن سے حقیقت حال کو سمجھے۔ مثال کے طور پر حدیث میں مزارعت سے منع کیا گیا ہے اور پھلوں کا حسن و قبح ظاہر ہونے سے پہلے ان کی بیع کی ممانعت آئی ہے۔ حضرت زید موقع و محل اور انداز کلام سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اس سے مراد تحریم نہیں ہے بلکہ حضور کا یہ ارشاد مشورہ کے طور پر تھا۔ دوسری طرف اخذ بالدلالت میں بھی مختلف صورتوں سے خلل واقع

ہوتا ہے۔ اس میں صحابہ و تابعین کے قیاسات اور کتاب و سنت سے ان کے استنباط کا بڑا دخل ہے اور ظاہر ہے کہ اجتہاد ہمیشہ صحیح تو نہیں ہوتا۔ پھر ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان کو کوئی حدیث نہیں پہنچی یا اس طور پر پہنچی کہ اس سے احتجاج نہیں کیا جا سکتا، اس لیے انہوں نے اس پر عمل نہ کیا، بعد میں کسی دوسرے صحابی کے ذریعہ سے صحیح بات معلوم ہوئی جیسے جنابت میں تیمم کا مسئلہ ہے کہ اس میں حضرت عمر اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما کو غلط فہمی پیش آئی۔ بہت سے معاملات ایسے بھی ہیں جن میں صحابہ رضی اللہ عنہم نے محض دلالت عقلی کی بنا پر ایک رائے یا اتفاق قائم کر لی تھی حالانکہ شریعت میں ان کی کوئی تصریح نہ تھی اسی کی طرف حضور نے اشارہ فرمایا کہ تم میری سنت کا التزام کرو اور میرے بعد میرے خلفاء راشدین کے طریقہ کی پیروی کرو۔

پس جو شخص اخبار و آثار اور الفاظ حدیث پر وسیع نظر رکھتا ہو وہ ایسی پرخطر راہوں سے بخیریت گذر سکتا ہے جہاں قیاس و اجتہاد کے قدم پھسل جایا کرتے ہیں۔ اسی بنا پر فقیہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ دونوں طریقوں میں درک حاصل کرے اور دونوں مذہبوں میں تبحر پیدا کرے۔ اور شعائر ملت میں بہترین شعار وہ ہے جس پر جمہور رواۃ اور اکثر حاملین علم کا اجماع ہو اور جس میں دونوں طریقوں کا تطابق پایا جاتا ہو۔

# مقاصد قرآن

## (۳)

از جناب مولانا سید صبغۃ اللہ حسینی استاذ جامعہ دار السلام عمر آباد

## دین اسلام کا تیسرا رکن "عمل صالح"

انبیاء کرام کی بعثت کے مقاصد میں سے تیسرا مقصد نیک عملی کی زندگی ہے جس کو قرآن مجید میں بار بار ذکر کیا گیا ہے، اور متعدد سورتوں میں مختلف پیرایہ بیان میں پیش کیا گیا ہے تاکہ اس سلسلہ میں ان تمام امور کی پوری اصلاح کر دی جائے جن کو افراد نوع انسانی نے بگاڑ رکھا ہے اور یہ بھی واضح کر دیا جائے کہ انسان کی شخصی اور اجتماعی فلاح و بہبود کے ساتھ عمل صالح کا کسقدر گہرا تعلق ہے اگر اس چیز کی یاد دہانی کے لیے تکرار و اعادہ کی ضرورت نہ ہوتی تو سورۂ عصر مختصر ہونے کے باوجود عملی اصلاح کے لیے بہت کافی تھی جیسے سورۂ اخلاص باری تعالیٰ کی ذات و صفات اور اس کی توحید و تنزیہہ کے لیے بہت جامع ہے۔ یہ حقیقت میں قرآن عزیز کا اعجاز ہے کہ اس کے مقاصد و اغراض کبھی صرف ایک آیۃ یا چھوٹی سی سورۃ میں سمٹ جاتے ہیں اور کبھی اس قدر تفصیل و اطناب کے ساتھ پیش کیے جاتے ہیں کہ ایک ایک پہلو نمایاں ہو جاتا ہے۔

**عمل صالح کی حقیقت** ایمان باللہ کے لوازم میں درجہ اول پر عمل صالح ہے کیونکہ جب یہ بات دل میں اتر جائیگی کہ اللہ ہی انسان کا اصلی مالک اور حاکم ہے اور اسی کی فرماں برداری فرض عین ہے، اور اسی کی رضا پر فلاح کا اور ناراضی پر خسران کا انحصار ہے تو غیر ممکن ہے کہ کوئی شخص اس کے بتائے ہوئے نیک کاموں سے روگردانی کر جائے اور اس کے منع کیے ہوئے امور سے باز نہ آئے۔ پھر اس کے بعد خود بخود اعمال کی جزا و سزا کا اس کو خیال

پیدا ہو جائیگا اور اللہ تعالیٰ کے عقاب سے خوف اور اس کے ثواب و فضل کی امید ہونے لگے گی۔

اعمال صالحہ کے مفہوم میں نہ صرف وہ تمام عبادتیں داخل ہیں جن کے ذریعہ بارگاہ الٰہی میں تقرب حاصل ہوتا ہے بلکہ وہ تمام بھلائی کے کام بھی اسی دائرے میں آجاتے ہیں جن سے انسانوں کی انفرادی و اجتماعی اصلاح ہوتی ہے اور رفاہ عام کے کام انجام پاتے ہیں مثلاً والدین کے ساتھ احسان، رشتہ داروں سے نیک سلوک اور صلۂ رحمی ہمسایوں کے حقوق کا لحاظ، یتیموں اور بیواؤں کی دیکھ بھال، مسکینوں کی خبرگیری وغیرہ وغیرہ اس سلسلہ میں جو جامع وصایا قرآن عزیز نے کیے ہیں وہ توریت کے "احکام عشرہ" سے کہیں زیادہ جامع اور برتر ہیں چنانچہ سورۂ اسراء کی یہ آیات کریمہ ملاحظہ ہوں جن میں تمام باتیں یکجا بیان کردی گئی ہیں۔

| | |
| --- | --- |
| اعمال صالحہ وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ | اور تمہارے پروردگار نے قطعی حکم دیدیا ہے کہ اسکے سوا کسی کی |
| اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا | عبادت نہ کرو اور ماں باپ سے نیک سلوک کرو اگر تمہارے |
| اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ | سامنے ان میں سے ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو |
| اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْ | ان کو اف نہ کہو اور نہ ان کو جھڑکو بلکہ ان سے ادب کے |
| هُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ۔ وَاخْفِضْ | ساتھ بات کرو۔ ان کے سامنے نرمی کے ساتھ منکسرانہ |
| لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ | انداز سے جھکے رہو اور ان کے لیے یوں دعا کرو کہ خدایا |
| رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا | جس طرح انہوں نے بچپن میں مجھے پالا پوسا ہے اسی طرح ان پر |
| رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِيْ نُفُوْسِكُمْ اِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِيْنَ | تو بھی رحمت فرما۔ تمہارا پروردگار تمہارے مافی الضمیر کو |
| فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِيْنَ غَفُوْرًا ۔ وَاٰتِ | خوب جانتا ہے اگر تم سعادت مند ہو تو وہ توبہ کرنے والوں |
| ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ | کی خطا معاف کردیتا ہے۔ قرابتدار او محتاج اور مسافر کا |
| وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ۔ اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا | حق ادا کرتے رہو اور مال کو بے موقع نہ اڑایا کرو کیونکہ |
| اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ۭ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا | بے موقع دولت اڑانے والے شیاطین کے بھائی ہیں اور |

وَإِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَاءَ رَحْمَةٍ مِّن رَّبِّكَ
تَرْجُوهَا فَقُل لَّهُمْ قَوْلًا مَّيْسُورًا ۝ وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ
مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ
مَلُومًا مَّحْسُورًا ۝ إِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ
لِمَن يَشَاءُ وَيَقْدِرُ ۚ إِنَّهُ كَانَ بِعِبَادِهِ
خَبِيرًا بَصِيرًا ۝ وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ
خَشْيَةَ إِمْلَاقٍ ۖ نَّحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَإِيَّاكُمْ ۚ
إِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْئًا كَبِيرًا ۝ وَلَا تَقْرَبُوا
الزِّنَىٰ ۖ إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَسَاءَ سَبِيلًا ۝
وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا
بِالْحَقِّ ۗ وَمَن قُتِلَ مَظْلُومًا فَقَدْ جَعَلْنَا
لِوَلِيِّهِ سُلْطَانًا فَلَا يُسْرِف فِّي الْقَتْلِ ۖ
إِنَّهُ كَانَ مَنصُورًا ۝ وَلَا تَقْرَبُوا مَالَ
الْيَتِيمِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ حَتَّىٰ يَبْلُغَ أَشُدَّهُ ۚ وَ
أَوْفُوا بِالْعَهْدِ ۖ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا ۝
وَأَوْفُوا الْكَيْلَ إِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوا بِالْقِسْطَاسِ
الْمُسْتَقِيمِ ۚ ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ
تَأْوِيلًا ۝ وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ ۚ
إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ

اور شیطان اپنے پروردگار کا بڑا ناشکرا ہے۔ اگر اپنے
پروردگار کی طرف سے رزق کے آنے کی امید پر تم کو
ان لوگوں (یعنی حق داروں) سے پہلو تہی کرنی پڑے تو ان
نرمی کے ساتھ جواب دے دو۔ تم نہ تو اپنا ہاتھ گردن
ہی سے باندھے رکھو اور نہ بالکل ہی کھول دو کہ حسرت زدہ
و ملامت خوردہ بنے بیٹھے رہو۔ تمہارا پروردگار جس کو
چاہتا ہے زیادہ رزق دیتا ہے اور جس کے لیے چاہتا
ہے تنگی کر دیتا ہے کیونکہ وہ اپنے بندوں کو خوب جانتا ہے
اور دیکھتا ہے۔ تم اپنی اولاد کو ناداری کے اندیشہ سے
قتل مت کرو۔ ہم ان کو بھی رزق دیتے ہیں اور تم کو
بھی بیشک ان کا قتل کرنا بڑا بھاری گناہ ہے۔ اور
زنا کے پاس مت پھٹکو بلاشبہ وہ بے حیائی کی بات ہے
اور بہت ہی برا طریقہ ہے۔ اور جس جان کو اللہ تعالیٰ نے
حرام فرمایا ہے اس کو قتل مت کرو الا یہ کہ حق کی خاطر
ایسا کرنا پڑے، اور جو ناحق قتل کیا جائے ہم نے اس کے
وارث کو (قصاص یا معاف کرنے کا) اختیار دیا ہے
پس اس کو قتل کے بارے میں حد سے تجاوز نہ کرنا
چاہئے یقیناً وہ اس کا مستحق ہے کہ قاتل سے بدلہ لینے
میں اس کی مدد کی جائے، اور یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ

كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا. وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ
مَرَحًا إِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْأَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ
الْجِبَالَ طُولًا. كُلُّ ذَٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهُ
عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوهًا. ذَٰلِكَ مِمَّا أَوْحَىٰ
إِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ وَلَا تَجْعَلْ
مَعَ اللَّهِ إِلَٰهًا آخَرَ فَتُلْقَىٰ فِي جَهَنَّمَ مَلُومًا
مَدْحُورًا. أَفَأَصْفَاكُمْ رَبُّكُمْ بِالْبَنِينَ
وَاتَّخَذَ مِنَ الْمَلَائِكَةِ إِنَاثًا. إِنَّكُمْ . . . . . . . . . . . .
لَتَقُولُونَ قَوْلًا عَظِيمًا ۔ (بنی اسرائیل ۳۴-۴۰) . . . . . . . . . . . .

مگر ایسے طریقہ سے جو تحسن ہے یہاں تک کہ وہ اپنے سن بلوغ کو پہنچ جائے۔ اور عہد کو پورا کرو بے شک عہد کی بازپرس ہوگی۔ اور جب ناپ کر دینا ہو تو پورا پیمانہ دیا کرو اور صحیح ترازو سے تول کر دو۔ کیونکہ یہ اچھی بات ہے اور اس کا انجام بھی اچھا ہے اور جس بات کی تمہیں تحقیق نہ ہو اس کے پیچھے نہ پڑا کرو کیونکہ کان اور آنکھ اور دل ان سب کی بازپرس ہوگی۔ اور زمین پر اتراتے ہوئے نہ چلنا، تو نہ زمین کو پھاڑ سکے گا اور نہ پہاڑوں کی لمبائی کو پہنچ سکے گا۔ ان میں سے ہر ایک کام تمہارے پروردگار کے نزدیک ناپسند ہے۔ یہ باتیں اس حکمت میں سے ہیں جو تیرے رب نے تیری طرف وحی کے ذریعہ بھیجی ہیں۔ اور خدائے برحق کے ساتھ اور کوئی معبود نہ تجویز کر لینا ورنہ تم الزام خوردہ اور راندہ ہو کر دوزخ میں پھینک دیے جاؤ گے۔ کیا تمہارے رب نے تم کو تو بیٹوں کے ساتھ مخصوص کر دیا ہے اور خود اپنے لیے فرشتوں کو بیٹیاں بنا لیا ہے۔ یہ تو تم بہت ہی بڑی نازیبا بات کہتے ہو"۔

ان آیات کریمہ میں سب سے پہلے توحید فی العبادۃ کی تعلیم دی گئی ہے کیونکہ باری تعالیٰ کی وحدانیت کا عقیدہ تمام نیک کاموں کے لیے نقطۂ آغاز کا حکم رکھتا ہے۔ پھر اس کے بعد ماں باپ کے حقوق کا تذکرہ آتا ہے کیونکہ خدائے تعالیٰ کی شان ربوبیت کا عکس اولین والدین کی تربیت و پرورش ہے اور اس لیے بھی کہ حقوق اللہ کے بعد تمام حقوق العباد میں پہلا مرتبہ والدین کے حقوق کا ہے۔ ماں باپ کی خدمت و اطاعت یوں تو ہر وقت چاہیے لیکن بڑھاپے اور کمزوری کے زمانہ میں ان کی خدمت گذاری اور بھی زیادہ

ضروری ہے، کیونکہ اس حالت میں وہ دوسروں کی مدد کے محتاج ہوجاتے ہیں قرآن کہتا ہے کہ جس طرح ماں باپ نے بچپن کے زمانے میں تمہاری پرورش، تربیت اور تعلیم میں محنت و مشقت برداشت کی، تمہاری نگرانی میں مصیبتیں جھیلیں، تم پر اپنا مال صرف کیا اور اپنے عیش و آرام کو قربان کر دیا ٹھیک اسی طرح تمہارا بھی فرض ہے کہ آج ان کے آڑے وقت میں کام آؤ۔ ان کی خدمت کرو، ان کو آرام پہنچاؤ۔ کما ربیانی صغیراً میں اسی حقیقت کو ایک حسین پیرایہ میں پیش کیا گیا ہے۔

دنیا میں جتنے رشتے پیدا ہوتے ہیں وہ سب والدین ہی کے باعث ہوتے ہیں، اس لیے حقوق والدین پر تنبیہ کرنے کے بعد ہدایت فرمائی کہ دوسرے قرابتداروں کا بھی خیال رکھنا چاہیے اور صرف رشتہ داروں تک ہی تمہاری امداد کا دائرہ محدود نہ ہو بلکہ دوسرے محتاج لوگوں کی بھی تمہیں خبر گیری کرنی لازمی ہے۔ مگر ان ہدایات کی پیروی میں کہیں ایسا نہ ہونے پائے کہ تم حدود سے تجاوز کر کے خود اپنی ذات اور اپنے اہل و عیال کے حقوق ضائع کر دو۔ اس لیے تبذیر کی ممانعت کر دی جاتی ہے۔ مال خدا کی دی ہوئی ایک عظیم الشان نعمت ہے اس کو بے محل خرچ کرنا کسی طرح زیبا نہیں اور جو لوگ خداداد دولت کی قدر نہیں کرتے یعنی اس کو رنگ رلیوں اور عیش پرستیوں کی نذر کر دیتے ہیں وہ حقیقت میں شیطان کے بھائی ہیں۔ اس واسطے کہ حضرت حق جل مجدہ کی دی ہوئی نعمت کو جس طرح اس کے موقع پر نہ خرچ کرنا ناشکری ہے اسی طرح بے محل اڑا دینا بھی ناسپاسی ہے اور چونکہ شیطان اپنے پروردگار کا سب سے بڑا ناشکر ہے اس لیے جو کوئی ناشکر ہوا گویا اس کا شیطان سے رشتہ ہو گیا۔

مال اسلام کے نقطۂ نظر سے فی نفسہ اچھی چیز ہے البتہ جتنی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں وہ سب بیجا استعمال سے ہوتی ہیں اس لیے قرآن عزیز نے اس کی اصلاح فرمائی ہے اور جتنی صورتیں مال کے بے جا استعمال کی ہو سکتی تھیں ان کی روک تھام کی ہے۔ چنانچہ ایک صورت تو اس کی یہ ہے کہ انسان مال کو نہ اپنے لیے خرچ کرے اور نہ دوسروں کے لیے بلکہ جمع کرتا رہے، اور دوسری شکل یہ ہے کہ مال کو صرف اپنی خواہشات

نفسانی آرام و آسائش اور ضروریات پر خرچ کرے اور خوب جی کھول کر دولت اڑانے لگے مگر کسی کی ضرورت پر کچھ کام نہ آئے۔ بہرکیف ان دونوں صورتوں کو منع کر دیا گیا ہے پہلی صورت کو "اَلَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ وَالْفِضَّۃَ" میں ذکر کیا گیا ہے اور دوسری صورت کو تبذیر سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ قرآن مجید انسان کو مالیات میں ایسی میانہ روی کی تاکید کرتا ہے جس کے سبب سے توازن نہ بگڑنے پائے کیونکہ تمام اقتصادی تباہیاں اسی سے ظہور میں آتی ہیں اور اس کا آخری نتیجہ اخلاقی تباہیوں کی شکل میں رونما ہوتا ہے اگر مالی معاملات میں افراط و تفریط دور ہو کر توازن قائم ہو جائے تو زندگی کے ہر گوشہ میں سکون و اطمینان پیدا ہو جائے۔

اسی اقتصادی سوال کے سلسلہ میں ایک بہت بڑی برائی کا ذکر کیا گیا ہے جس کو ہر زمانے کے جاہل انسانوں نے معاشی اسباب کی بنا پر اختیار کیا ہے، اور جس کا ظہور ہر جاہلیت میں کسی نہ کسی شکل میں ہوتا رہا یہ برائی قتل اطفال ہے۔ اس کی اصل یہ ہے کہ انسان اولاد کی پیدائش کو اپنے لیے ناقابل برداشت بار سمجھتا ہے اور یہ خیال کرتا ہے کہ بچے پیدا ہوں گے تو ان کو کھلایا کہاں سے جائیگا اور ان کی پرورش کے ذرائع کہاں سے آئیں گے۔ اسی بنیادی تخیل کے تحت جاہلیت قدیمہ کے لوگ یا تو اسقاط حمل کا ارتکاب کرتے تھے، یا بچوں کو پیدا ہونے کے بعد مار ڈالتے تھے۔ اور اسی تخیل کے تحت جاہلیت جدیدہ کے لوگ برتھ کنٹرول (منع حمل یا ضبط ولادت) کے طریقے استعمال کرتے ہیں جن کو ایشیا اور ہندوستان کے مقلدین فرنگ بھی آنکھ بند کر کے قبول کیے جا رہے ہیں حالانکہ انفرادی و اجتماعی مسائل پر اس کی جو زد پڑتی ہے وہ کسی بصیرت والے انسان پر پوشیدہ نہیں ہے، بشرطیکہ فطرت سلیمہ کی روشنی میں نظر تحقیق سے جانچ کر دیکھا جائے اور طریق نظر ذکر دہ نہ ہو جو فرنگیت مآب زندگی کے لوازم و خصائص میں سے ہے۔ قرآن مجید اس گناہ عظیم سے باز رکھنے کی تاکید کرتا ہے اور صریح الفاظ میں اُس معاشی استدلال کی تردید کرتا ہے جس کی بنا پر جہلاء اپنے اس ظلم کو حق بجانب ٹھیرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ مفلسی کے خوف سے اپنی اولاد کو قتل نہ کرو

رزق کے خزانے تو ہمارے قبضہ واختیار میں ہیں تو اس چیز کی تم کیوں خواہ مخواہ فکر کرتے ہو۔ اس مقام پر رزق کی اضافت خاص اپنی ذات کی طرف کرکے یہ جتلا دیا کہ رزق کا مصدر اصلی ذاتِ الٰہی ہے جس کے ادنیٰ فیضان سے بے شمار اسباب رزق و وسائل معیشت چشم زدن میں رونما ہو جا سکتے ہیں پھر اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْأً كَبِيرًا کہہ کر اس کا تمدن انسانی اور عمرانیات کے لیے مضر ہونا واضح کر دیا گیا ہے۔

معیشت کے بعد تمدن کی طرف توجہ کی گئی ہے اور اس سلسلہ میں اس سب سے بڑے گناہ کی ممانعت فرمائی ہے جو تمدن کی جڑ پر حملہ کرتا ہے یعنی زنا۔ انسان اپنی حماقت سے عورت اور مرد کے صنفی تعلق کو محض شہوت رانی اور استلذاذ کا ذریعہ سمجھتا ہے، حالانکہ فطرۃ اللہ کا مقصد اس کے ذریعہ سے توالد و تناسل کا سلسلہ جاری کرنا اور تمدن انسانی کی بنیاد رکھنا ہے۔ زنا چونکہ ان مقاصد کے حصول میں مانع ہے اور مرد و زن کے تعلق کو اس کی اصل فطری منزل مقصود سے پھیر کر دوسرے راستہ پر ڈال دیتی ہے اس لیے اس کو حرام کیا گیا۔ اسی حقیقت کی طرف اِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَّسَآءَ سَبِيلًا میں اشارہ کیا گیا ہے۔

خدائے تعالیٰ نے انسان کو مختلف قوتیں عطا فرمائی ہیں اور انہی قوائے فطریہ میں سے ایک صنفی میلان کی قوت ہے دوسری قوتوں کی طرح اس قوت کو بھی برمحل استعمال کرنے کی نہ صرف اجازت دی گئی ہے بلکہ بعض خصوصی مواقع پر نہایت لازمی قرار دیا گیا ہے۔ اس لیے کہ اس قوت کے استعمال سے مطلقاً روک دینا فطرۃ انسانی پر ظلم ہوتا اور ذات خداوندی ظلم سے بری ہے۔ شریعت کی زبان میں عورت کی قوت منفعلہ اور مرد کی قوۃ فاعلہ کے برمحل اجتماع کا نام "نکاح" ہے جس کو تکمیل ایمان کا ذریعہ بتلایا گیا ہے۔ اور انہی دونوں قوتوں کے بے محل صرف کرنے کا نام "سفاح" اور زنا ہے جس سے متعدد قباحتیں ظاہر ہوتی ہیں:۔

اوّل یہ کہ نسب میں خلط ملط ہو جاتا ہے حالانکہ انساب ہی کے ذریعہ شعوب و قبائل کا وجود ہوتا ہے، انہی کی وجہ سے آپس میں تعارف ہوتا ہے اور تعارف ہی سے تعامل و تعاون ہونے لگتا ہے۔ جو تمدن

اصل ہے اس لیے زنا تمدن کے منافی ہے۔

دوسری یہ کہ جب ایک عورت ایک مرد کے لیے مخصوص نہ ہوگی تو اس سے طرح طرح کے فسادات پیدا ہوں گے اور انسانی تعلقات کی ہمواری و خوشگواری میں فرق آجائے گا۔ یہ کوئی مفروضہ نہیں بلکہ واقعات اس پر شاہد ہیں، چنانچہ آئے دن اخبارات میں اس قسم کی خبریں چھپتی رہتی ہیں کہ فلاں نے اس لیے خودکشی کرلی کہ اس کی محبوبہ سے کسی دوسرے شخص کے ناجائز تعلقات تھے اور فلاں عورت نے محض اس لئے جان دے دی کہ اس کے عاشق نے اس سے نظر پھیر لی ہے کہیں اور سے فریفتگی ہو چکی ہے۔

تیسرے یہ کہ زنا کا مقصد صرف عیش پرستی اور شہوت رانی ہے حالانکہ زوجین کی تخلیق کا مقصد حقیقی یہ ہے کہ دونوں مل کر خانہ داری کے امور ایک دوسرے کے تعاون و تناصر سے انجام دیں، مرد باہر سے کما کر لائے اور عورت دردمندی اور کفایت شعاری سے گھر کا بندوبست کرے اور پھر دونوں کے اشتراک عمل سے اولاد کی تعلیم و تربیت ہوتی رہے۔ یہ سب باتیں اسی وقت ممکن ہوں گی جب کہ عورت کی نگاہ ایک ہی شخص پر جمی ہوئی ہو اور اس کا کسی غیر مرد سے تعلق نہ رہے۔ اسی غرض سے زنا کو حرام کیا گیا ہے۔

چوتھے یہ کہ اگر زنا کو جائز کردیا جائے تو انسانوں اور جانوروں میں کوئی فرق نہ رہے گا اور یہ شرافت انسانی کے بالکل برعکس ہوگی اس لیے نہ صرف زنا کو ممنوع قرار دیا گیا ہے بلکہ اس کے اسباب و دواعی کو بھی منع کر دیا ہے۔

زنا کے بعد دوسرا گناہ جو تمدن انسانی کو سب سے بڑھ کر نقصان پہونچانے والا ہے قتل نفس ہے چنانچہ تحریم زنا کے بعد تحریم قتل کا ذکر فرمایا گیا۔ قرآن عظیم اس کو گناہ عظیم قرار دیتا ہے۔ البتہ چند مواقع مستثنیٰ ہیں (۱) ارتداد یعنی اسلامی احکام و اعمال سے اعتقادی روگردانی کرنا۔ (۲) حکومت اسلامیہ سے بغاوت کرکے امن عامہ میں خلل انداز ہونا (۳) نکاح ہو جانے کے بعد زناکاری کا ارتکاب کرنا۔

(۴) عمداً کسی کو مار ڈالنا۔ (۵) کفار کا مسلمانوں سے جنگ کرنا۔ انہی پانچ استثنائی صورتوں کی طرف "اِلَّا بِالْحَقِّ" کہکر اشارہ فرمایا گیا ہے۔ اگر یہ صورتیں نہ ہوں تو قتل حرام ہے، خصوصاً قتل عمد تو بہت بڑا گناہ ہے جس کی وعید اس قدر شدید الفاظ میں وارد ہوئی ہے کہ:۔

وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا فَجَزَاؤُهُ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيهَا وَغَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهُ وَأَعَدَّ لَهُ عَذَابًا عَظِيمًا۔ (نساء۔ رکوع ۱۳) اور جو شخص کسی مسلمان کو قصداً قتل کر ڈالے گا تو اس کی سزا جہنم ہے ہمیشہ اس میں رہنا ہوگا۔ اور اللہ تعالیٰ اس پر غصہ ہو جائے گا۔ اور اپنی رحمت سے دور کر دے گا اور اس کے لیے عذاب عظیم مہیا کر رکھا ہے۔

اگرچہ یہ ایک شرعی حکم ہے لیکن اس اصل الاصول پر مبنی ہے کہ ایک مومن کو دوسرے مومن کا خیرخواہ ہونا چاہیے اور شان ایمان کا حقیقی مقتضی یہ ہے کہ ایک مومن دوسرے مومن کو ناحق نہ قتل کرے کیونکہ یہ حرکت اس کی قوت ایمانی کے بالکل منافی ہوگی۔

اس آیت کے متعلق محققین علمائے تفسیر کا خیال ہے کہ یہی وہ آخری آیت ہے جو عقاب قتل کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ بعض صحابہ کرام سے یہ بھی منقول ہے کہ اس آیت کریمہ سے چند ماہ پیشتر "اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ" نازل ہو چکی تھی اس لیے آیت مغفرت آیۃ قتل کی مخصص ہے لیکن ذرا غور کرنے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ آیت مغفرت میں "لِمَنْ يَّشَآءُ" کی قید لگا دی گئی ہے جس سے یہ جتلا دینا منظور ہے کہ ہر چیز شرک جیسے سنگین جرم کے اللہ تعالیٰ کی مشیت پر موقوف ہے کہ خود ہی کسی کو اپنی مغفرت سے نوازنا چاہیے تو کوئی اس کا مزاحم نہیں ہو سکتا مگر خداوند تعالیٰ نے اس مشیت سے اس مومن کو خارج کر دیا ہے جو کسی مومن کو عمداً قتل کر دے۔ درحقیقت آیت مغفرت تو ان لوگوں کی ترغیب ایمان کے لئے نازل ہوئی ہے جنہوں نے اسلام سے پہلے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذائیں پہنچائی تھیں۔ چنانچہ انہی لوگوں کے بارہ میں

"اِن یَنْتَھُوْا یُغْفَرْ مَا قَدْ سَلَفَ" بھی نازل ہوئی ہے۔

حضرت عبداللہ ابن عباس جو ترجمان القرآن اور حبر الامتہ ہیں صراحت فرماتے ہیں کہ قاتل عمد کی توبہ مقبول نہیں۔ وہی سورۂ فرقان کی آیت "اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ یُبَدِّلُ اللّٰہُ سَیِّاٰتِھِمْ حَسَنَاتٍ" تو اس میں جو توبہ مذکور ہے وہ دراصل ان گناہوں سے تعلق رکھتی ہے جو ایمان لانے سے پہلے سرزد ہوئے ہوں۔

قاتل سے خون کا بدلہ لینا مقتول کے ولی کا حق قرار دیا گیا ہے۔ مگر اس سلسلہ میں جاہلیت کے دو طریقوں کی اصلاح کردی گئی ہے۔ جاہلیت کا ایک طریقہ یہ تھا کہ مقتول کے ورثا صرف قاتل ہی کے نہیں بلکہ اس کے بھائی بندوں اور اس کی اولاد تک کے دشمن ہوجاتے تھے، وران سے بھی بدلہ لیا کرتے تھے۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ وہ بطور خود بدلہ لے لیا کرتے تھے اور کسی نظام عدل و قانون سے مدد لینے کی ضرورت نہ سمجھتے تھے۔ ان دونوں طریقوں کا نتیجہ فساد کی اشاعت تھا اور ان میں انصاف کی حد سے تجاوز بھی تھا اس لیے قرآن حکیم نے ان دونوں کی ممانعت کردی۔ "فَلَا یُسْرِفْ فِّی الْقَتْلِ" کا مطلب یہ ہے کہ قاتل کے فعل کا بدلہ اس کے کسی عزیز رشتہ دار سے لینا زیادتی ہے، اور "اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا" سے اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ قاتل سے بھی ولی مقتول کو خود بدلہ نہ لینا چاہیے۔ بلکہ یہ کام اسلامی حکومت کا ہے کہ وہ انتقام لینے میں اس کی مدد کرے۔

آگے چل کر یتیموں کے حقوق کی حفاظت پر توجہ فرمائی گئی ہے۔ یہ جو ارشاد ہوا کہ مال یتیم کے قریب بھی نہ پھٹکو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کے مال کو ہاتھ ہی نہ لگایا جائے اور اس کے مال کی نگرانی بھی نہ کی جائے اور اسے یونہی چھوڑ دیا جائے بلکہ اصلی مقصد یہ ہے کہ ایمانداری خیر خواہی اور مصلحت شناسی کے ساتھ تصرف کیا جائے یعنی اس کے مال کو تجارتی کاروبار میں لگا رکھیں جس سے مال بڑھتا رہے اور اگر یتیم کی کفالت، پرداخت اور تعلیم و تربیت میں تمہارے اوقات لگ جاتے ہوں اور تمہیں پیر

کسی دوسرے کام کا موقع نہ رہتا ہو تو اپنی ضرورت کے مطابق اس کے مال میں سے لے سکتے ہو۔ نیت بخیر ہونی چاہیے۔ یتیم کا مال اس خیال سے نہ اڑا دیا جائے کہ بڑا ہو کر اپنا مال ہم سے وصول کرے گا۔ اور جو کوئی یتیم کی نگرانی کرنے والا مفلس و محتاج نہ ہو بلکہ اپنے گھر کا خوش حال اور صاحب ثروت ہو تو اس کو مال یتیم کے لینے سے بچنا چاہیے کہ یہی تقوی و پرہیز گاری ہے۔ پھر جب یتیم سن رشد کو پہنچ جائے تو سرپرست اس کو آزما کر دیکھے کہ اس میں معاملات کی اصلاحیت پیدا ہو گئی یا نہیں اگر اپنی آپ کچھ بحال کر لینے کا سلیقہ پیدا ہو چکا ہو تو مال واپس کر دینا چاہیے چنانچہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔

| | |
|---|---|
| وَابْتَلُوا الْيَتَامَىٰ حَتَّىٰ إِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ فَإِنْ آنَسْتُم مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوا إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ وَلَا تَأْكُلُوهَا إِسْرَافًا وَبِدَارًا أَن يَكْبَرُوا وَمَن كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ وَمَن كَانَ فَقِيرًا فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوفِ۔ (سورہ نساء۔ رکوع ۱)۔ | تم یتیموں کو آزمالیا کرو یہاں تک کہ جب وہ (عمر) نکاح کو پہنچ جائیں اور ان میں ایک گونہ تمیز سمجھو تو ان کے مال ان کے حوالہ کر دو۔ ان کے مال کو ضرورت سے زیادہ خرچ کر کے اور یہ خیال کر کے کہ یہ بڑے ہو کر واپس لے لیں گے مت کھا لو۔ جو شخص مالدار ہو اسے تو یتیم کا مال کھانے سے اپنے آپ کو بچانا چاہیے اور جو شخص فقیر ہو وہ مناسب مقدار کھا سکتا ہے۔ |

مال یتیم کے متعلق ہدایات فرمانے کے بعد عہد کی پابندی کے متعلق تاکیدی حکم دیا جاتا ہے۔ عہد کی چند قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک تو وہ عہد ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کے درمیان ہو، دوسرا وہ جو بندوں کے باہم ہو تیسرا عہد و پیمان وہ ہے جو خود انسان اپنے آپ سے کرے۔ حکم ربانی ان تینوں کی پابندی سے متعلق ہے۔ البتہ وہ عہد و پیمان جو شریعت کے خلاف ہو وہ اس مفہوم ہی میں داخل نہیں ہے اس لیے اس کی پابندی لازم نہیں۔

اس کے بعد معاملات میں سے ایک خاص قسم کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے جو سب سے زیادہ اہمیت

رکھتی ہے یعنی یہ کہ ناپ تول میں کمی نہ کرنی چاہیے بلکہ ٹھیک ٹھیک ناپنا اور تولنا چاہیے۔ اس سے نہ صرف یہ کہ تم کو آخرت میں ثواب ملے گا۔ بلکہ دنیا میں بھی اس کا فائدہ اس طرح محسوس ہوگا کہ تمہاری تجارت فروغ پائے گی، دوکانداری چمک اٹھے گی، لوگ جوق در جوق گاہک بن کر کھنچے چلے آئیں گے اور تمہارا کاروبار خوب ترقی کرجائے گا۔ "ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّأَحْسَنُ تَأْوِيلًا" سے یہ دونوں باتیں مراد ہو سکتی ہیں۔ کیونکہ اسلام دنیا و آخرت دونوں کی برکات سے مستفید ہونے کی تعلیم دیتا ہے۔ تجارتی کاروبار میں خیانت نہ صرف ایک بدترین اخلاقی جرم ہے بلکہ خود کاروبار کے لیے بھی مہلک ہے۔ جس قوم میں یہ عیب پیدا ہو جاتا ہے اس کی ساکھ دنیا سے اٹھ جاتی ہے، اس کی تجارت ملیامیٹ ہو جاتی ہے اور اس پر معاشی تباہی مسلط ہو کر رہتی ہے۔ اسلام ان دونوں بُرے نتائج سے بچانا چاہتا ہے اس لیے اس نے تجارتی اخلاق کی اصلاح پر بڑا زور دیا ہے۔ چنانچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے کہ ایماندار تاجر جنت میں انبیاء و صدیقین و شہداء کے ساتھ ہوگا۔ اسی تعلیم کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی نگاہ میں (Honesty) کی حیثیت محض ایک اچھی پالیسی کی نہیں ہے۔ بلکہ وہ اس کو ایمان کا مترادف سمجھتے ہیں۔ ان کی زبان میں (Honesty) کے لیے "ایمانداری" کا لفظ مستعمل ہوتا ہے (Dishonest) کو وہ بے ایمان کہتے ہیں۔

معاملات میں تمام ترخرابیاں اس سے پیدا ہوتی ہیں کہ انسان بسا اوقات ان ذرائع معلومات پر اعتماد کر لیتا ہے جو درحقیقت بھروسہ کے قابل نہیں ہوتے، اور ان کی بنیاد پر نہ صرف یہ کہ خود غلط رائے قائم کرتا ہے، بلکہ اس غلط رائے کا اظہار دوسروں کے سامنے بھی کر گذرتا ہے۔ اسی سے بدگمانیاں پیدا ہوتی ہیں، تہمتیں لگتی ہیں، غیبتوں کا سلسلہ چلتا ہے، دشمنیاں پیدا ہوتی ہیں، اور خدا جانے کتنے فساد اٹھتے ہیں۔ قرآن عظیم نے "لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ" فرما کر ایک ایسا جامع کلیہ بیان کر دیا کہ اگر انسان اس کی پیروی کرے تو یہ تمام خرابیاں خود بخود دور ہو جائیں۔ "ایسی چیز کے پیچھے نہ پڑو جس کی

تمہیں تحسین نہ ہو، اور یہ سمجھ لو کہ آنکھ، کان، اور دل سب سے پرس ہو گی" اس کے بعد تم دیکھو گے کہ بدگمانی اور بدگوئی اور بد بینی کا بیج ہی مر جائے گا۔

پھر تکبر کی مذمت نہایت بلیغ پیرایہ میں کی جاتی ہے کہ تم زمین پر جو اترا کر چلتے ہو اس سے نہ زمین پھٹ سکتی ہے اور نہ تم پہاڑوں کی اونچائی سے بلند ہو سکتے ہو پھر کیوں نہ تواضع اور انکساری اختیار کرو۔

سورۂ اسرا کی ان آیات کے علاوہ جن کی ہم نے کسی قدر تشریح کر دی ہے بے شمار ایسی آیتیں ہیں جن میں اچھے اعمال اور عمدہ اخلاق و فضائل پر ابھارا گیا ہے اور ان اعمال سے باز رکھا گیا ہے جو دینی، دنیوی، جانی، اور مالی کسی حیثیت سے نقصان رساں ہیں۔ بالخصوص نفسانی خواہشات کی پیروی، شیطانی وساوس کے اتباع اور ائمہ شر کی اطاعت سے بہت سختی کے ساتھ روکا گیا ہے کیونکہ یہی تمام قبائح کی جڑ ہے۔ انہی امور سے احتراز و اجتناب کرنے کا نام "تقویٰ" ہے اور یہ ایک ایسا جامع کلمہ ہے جس کے اندر ہر وہ چیز آجاتی ہے جو انسان کو گندگیوں اور آلودگیوں سے بچانے والی ہو اور دنیا و آخرت دونوں میں اس کو خسران و نامرادی سے محفوظ رکھنے والی ہو۔ اسی لیے تقویٰ کا ذکر کبھی تو دینی احکام کے ذیل میں آتا ہے اور کبھی ازدواجی مسائل کے سلسلہ میں، اور کسی وقت معاشرتی و سیاسی امور کے تحت، کیونکہ اوامر و نواہی کے امتثال کی جڑ یہی ہے۔

قرآن حکیم نے اعمال صالحہ کو بالاجمال اصولی طور پر بیان کیا ہے تفصیل سے کام نہیں لیا تاکہ ازمنہ و امکنہ کے لحاظ سے اس کی فرعی تعبیر درست ہو۔ انہی اعمال صالحہ کے سلسلہ میں وہ عبادتیں بھی آجاتی ہیں جن پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے کیونکہ وہ ایک طرف خدا کے ساتھ بندے کا تعلق مضبوط کرتی ہیں، اور دوسری طرف انسان کے نفس کی اندرونی کثافتوں کو دور کر کے اسے عملاً صالح بنا دیتی ہیں۔

نماز: قرآن عزیز نے اعمال و عبادات میں سب سے زیادہ نماز پر زور دیا ہے اور ایمانیات کے

معہ عملی زندگی میں اسی کا درجہ سب سے مقدم ہے۔ عرب کے مشرکین میں بھی ایک مخصوص طریقہ عبادت کا نام صلوٰۃ تھا جس کا قرآن حکیم نے ان الفاظ میں تذکرہ کیا ہے۔

وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ إِلَّا مُكَاءً وَتَصْدِيَةً (سورۂ انفال۔ رکوع ۴)
بیت اللہ کے پاس ان کی نماز بجز اس کے اور کچھ نہ تھی کہ تالیاں ٹھونکتے اور سیٹیاں بجاتے تھے

لیکن جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو آپ نے نماز کے اس طرز کی اصلاح فرمائی اور اس کی تدریجی طور پر ایک خاص وضع و ہیئت مقرر کر دی اور خصوصیت کے ساتھ اس کی پابندی پر زور دیا کیونکہ اس میں انفرادی و اجتماعی اور مادی و روحانی دونوں قسم کی برکتیں رکھی گئی ہیں اور انسانی اخلاق کی بلندی و برتری کے لیے اس سے بہتر کوئی تشکیل نہیں۔ چنانچہ نماز کی غرض و غایت کو خداوند قدوس نے ان الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے۔

وَأَقِمِ الصَّلَاةَ إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَلَذِكْرُ اللَّهِ أَكْبَرُ۔ (سورۂ عنکبوت۔ رکوع ۵)
اور نماز قائم رکھو (اس لیے کہ) نماز بے شک و شبہ بداخلاقیوں اور برائیوں سے بچاتی ہے اور اللہ کو یاد کرنا بڑی بات ہے۔

قرآن عزیز نے انسانی اخلاق کی اصلاح کے لیے نماز ہی ایک ایسی عبادت مقرر کی ہے جس کے ذریعہ تمام اخلاقی کمزوریاں زائل ہو جاتی ہیں کیونکہ تمام اخلاقی کمزوریاں فحش و منکر سے پیدا ہوتی ہیں اور نماز فحشاء و منکر سے بچاتی ہے۔ فحشاء تمام قبیح کاموں کو کہتے ہیں اور منکر وہ ہے جس کی اسلامی قانون میں مطلق اجازت نہ ہو۔ پس اب ہمیں اس آیۃ کریمہ پر غور کرنا چاہیے کہ نماز فحشاء و منکر سے کیونکر بچاتی ہے۔

نماز حقیقت میں تین چیزوں سے مرکب ہے۔ اخلاص، خدائے تعالیٰ کا خوف، اور قرآن پاک کی تلاوت، پہلی چیز کے ذریعہ انسان کے اندر ایک ایسی حقیقت پیدا ہو جاتی ہے جو اسلامی عبادتوں

کی روح اور اسلامی احکام کا خلاصہ اور لب لباب ہے۔ اسی کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے "احسان" سے تعبیر فرمایا ہے۔ دوسری چیز خوف خدا ہے جس کی وجہ سے انسان کی ہر ایک نقل و حرکت پر محض قانونی حد تک پابندی نہیں رہتی بلکہ اس کے ساتھ یہ صحیح خیال ذہن میں راسخ ہو جاتا ہے کہ کوئی ایسا زبردست حاکم مطلق ہے جو ہماری بدعملیوں اور نافرمانیوں پر ہر وقت خبردار رہتا ہے اور ضرور وہ ہم سے ایک نہ ایک دن سخت بازپرس کرے گا۔ گویا مبدا و معاد کا صحیح تصور اللہ تعالی کی خشیت پیدا ہوتا ہے اور خشیت الٰہی نماز سے۔

تیسری چیز نماز میں تلاوت قرآن ہے جس کے ضمن میں ہر وقت خدا کے احکام اور اوامر و نواہی کان میں پڑتے رہتے ہیں۔ لہٰذا یہ نا ممکن ہے کہ ایک مسلمان کے کان میں خدا کی آواز بار بار پہنچتی رہے اور وہ اس پر بھی اپنی بدعنوانیوں سے باز نہ آئے یہی باعث ہے کہ بعض اہل تفسیر نے اس موقع پر کہا ہے کہ فحشاء و منکر سے باز رکھنا نماز کا فعل نہیں بلکہ اس تلاوت قرآن کا ہے جو نماز میں کی جاتی ہے۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ فحشاء و منکر سے روکنے والی چیز نماز ہی ہے کیونکہ نماز پڑھنے والا نماز کی مشغولیت میں بہت سی برائیوں سے بچ سکتا ہے اگر وہ نماز کو نماز سمجھکر پڑھے اور اس کی جتنی ظاہری و باطنی شرطیں ہیں پورے طور پر بجالائے اور جس قدر اس کے لوازم ہیں ان کے ادا کرنے میں سر مو کوتاہی نہ کرے تو اس کی نماز اس کو فحشاء و منکر سے ضرور بچائے گی اور کامیابی و کامرانی اور فوز و فلاح سے اس کو آشنا کرکے رہیگی چنانچہ باری تعالی کا ارشاد ہوتا ہے

قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ ۔ (مومنون۔ رکوع ۱) یقیناً وہ ایمان والے کامیاب ہو چکے جو اپنی نماز میں خشوع رکھنے والے ہیں۔

اس کے علاوہ انسان کی ساری کمزوریاں اور اس کی اضطراب انگیز کیفیتیں محض جزع و فزع سے پیدا ہوتی ہیں نماز سے اس کی اصلاح ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالی کا فرمان ہے۔

اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا وَاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَائِمُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُوْمِ وَالَّذِيْنَ يُصَدِّقُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ - (سورہ معارج رکوع ۱)

بیشک انسان کم ہمت پیدا کیا گیا ہے جب اس کو تکلیف پہنچتی ہے تو جزع فزع کرنے لگتا ہے اور جب فارغ البالی ہو جاتی ہے تو بخیل بن جاتا ہے مگر وہ نمازی اس سے مستثنیٰ ہیں جو اپنی نماز پر مداومت رکھتے ہیں اور جن کے مال میں مانگنے والوں اور نہ مانگنے والوں کا حق ہے اور جو یوم الدین کی تصدیق کرتے ہیں۔

نماز کے حقائق و اسرار کی مزید وضاحت منظور ہو تو ایک غائر نظر ڈال کر دیکھو کہ نماز کیا چیز ہے؟ نماز حقیقت میں انسان اور اس کے حقیقی مالک اور علی الاطلاق حاکم کے درمیان بندگی کے تعلقات استوار کرتی ہے اور اس میں وہ روحانی و اخلاقی طاقت پیدا کرتی ہے جس کے ذریعہ سے وہ اپنی بہیمی قوتوں کو ملکوتی طاقتوں کے تابع کر سکتا ہے۔ انسانی زندگی میں صحیح نظم و ضبط اور اعتدال اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب کہ اس کی بہیمیت اس کی ملکیت کے تابع رہ کر کام کرے۔ غور کرو ایک انسان دوسرے انسان کی جان و مال اور اس کی عزت پر اسی لیے تو ہاتھ ڈالتا ہے کہ اس کے سرکش نفس امارہ کی بہیمیت اس کو ایسی بری حرکتوں پر ابھارتی ہے۔ اگر بہیمیت دب جائے اور انسانیت اس پر غالب آجائے تو وہ خود ایسی حرکتوں سے رک جائے گا بغیر اس کے کہ خارج میں کوئی طاقت اسے روکنے والی ہو۔ اسی لیے خداوند قدوس نے اسلامی عبادتوں میں ایسی تاثیر رکھدی ہے کہ ان کے ادا کرنے سے ملکوتی اوصاف پیدا ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ جب حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے آیت اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ کی تفسیر پوچھی گئی تو آپ نے فرمایا کہ "واقعی نماز میں خدا کی نافرمانی سے باز رکھنے اور روکنے کی صفت ہے"۔ اور جب حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کی خدمت میں ایک شخص کا حال بیان کیا گیا کہ "وہ نماز بہت پڑھتا رہتا ہے" تو کہنے لگے کہ نماز اس شخص کو فائدہ پہنچاتی ہے

جو نماز کی اطاعت کرتا ہے اور نماز کی اطاعت سے مراد یہ ہے کہ نماز درست طریقہ پر اس کے حقوق ادا کر کے پڑھی جائے۔

ایک مرتبہ حضرت سفیان ثوری سے پوچھا گیا کہ "قالوا یا شعیب اصلوٰتک تامرک" (اے شعیب کیا تمہاری نماز تمہیں حکم کرتی ہے) اس آیت کا مطلب کیا ہے؟ تو سفیان نے صاف کہا کہ ہاں نماز حکم بھی دیتی ہے اور منع بھی کرتی ہے اور جو شخص نماز تو پڑھتا ہے مگر اس کی نماز اس کو اخلاقی برائیوں سے نہ روکتی ہو تو اس کو خدائے قدوس کی بارگاہ میں نزدیکی ہونے کے بجائے دوری اور مہجوری ہی ہوتی ہے۔

اور یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ خداوند عالم نے اسلام کو ساری دنیا کے مذاہب پر برتری عطا فرمائی ہے مگر کسی قوم کا بلند معیار پر پہنچ جانا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ اس کے افراد بلند معیار پر نہ ہوں اور کسی شخص کے لیے بلند مرتبہ پر فائز ہونا اس وقت تک ناممکن ہے جب تک کہ اس کا ذاتی کیریکٹر درست نہ ہو جائے کیونکہ کیریکٹر کی عظمت ہی اس کو ایک اعلیٰ زندگی دلا سکتی ہے اور اس گم گشتہ متاع کی تلاش نماز ہی میں ہو سکتی ہے۔

کاش اس فرنگیت مآب زمانہ کے روشن خیال اس حقیقت کبریٰ کو سمجھ لیں تو ان میں ایک انقلاب ہو جائے اور اپنی تمام گذشتہ رفعتوں اور عظمتوں کے لوٹنے کی صحیح امید کی جا سکے مگر افسوس کہ آج کل ذہنی غلامی کا دور دورہ ہے اور بہت سے مسلمان ہیں جو اپنی روشن خیالی کے زعم باطل میں مبتلا ہیں اور اس بہترین اسلامی عبادت کو جو نہ صرف روحانی بلکہ مادی فوائد پر بھی مشتمل ہے ایک پرانی رسم اور عہد قدیم کی یادگار سمجھتے ہیں۔ اگر ان مسلمانوں میں قرآن عزیز کے پڑھنے اور اس میں غور و فکر کرنے کا جذبہ پیدا ہو جائے تو وہ نماز کی حقیقت اور اس کے اسرار و مصالح پر مطلع ہو کر اپنی کوتاہی کی تلافی کریں گے۔

زکوٰۃ | اسی طرح زکوٰۃ بھی دین اسلامی کے بنیادی اعمال میں سے ہے اور اس کا اجتماعیات سے بہت گہرا تعلق ہے در حقیقت انسان کے اندر سے بخل کی صفت نکالنے والی یہی عبادت ہے کیونکہ جب تک یہ خبیث جذبہ نہ نکل جائے انسان کے اندر عمدہ اخلاق اور اچھے ملکات پیدا نہیں ہوسکتے اور یہی وہ جذبہ ہے جس کی وجہ سے انسان کے دل میں سرمایہ داری کی محبت کچھ اس قدر رچ جاتی ہے کہ وہ پھر نہ بنی نوع انسان کا خیر خواہ ہوسکتا ہے اور نہ دینی و ملی مقاصد کی کچھ وقعت کرتا ہے بلکہ اپنے ہی اغراض کا بندہ بن کر ہر جائز و ناجائز طریقے سے سرمایہ کی فراہمی میں لگ جاتا ہے۔ اسی لیے زکوٰۃ فرض کی گئی ہے کہ ان برائیوں سے انسان کو محفوظ و مصئون رکھا جائے۔ چنانچہ باری تعالیٰ کا ارشاد ہوتا ہے۔

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا۔ (سورہ توبہ رکوع ۱۳) — تم ان کے مال میں سے صدقہ مفروضہ لو جس کے ذریعہ تم ان کو پاک اور صاف کر دو گے۔

نماز اور زکوٰۃ کا قرآن عزیز اتنی مرتبہ بار بار ذکر کرتا ہے کہ ان کا استیعاب دشوار ہے۔ ان دونوں کی حقیقت اور اہمیت ذہن نشین کرانے کے لیے اس قدر مختلف اسالیب بیان اختیار کرنا ضروری تھا مگر بایں ہمہ زکوٰۃ کی تفصیل نہیں کی گئی بلکہ صرف فرضیت پر زور دے کر اس کے اسرار و حکم پر مطلع کر دیا گیا اور ان مقامات کو بیان کر دیا گیا جہاں زکوٰۃ خرچ کی جائے چنانچہ فرمایا جاتا ہے۔

اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعَامِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (سورہ توبہ رکوع ۸) — صدقات مفروضہ صرف فقیروں، اور مسکینوں کا حق ہے اور جو کارکن ان صدقات (کی وصولیابی اور انتظام) پر مقرر ہیں اور وہ لوگ جن کی دلجوئی کرنا ہے، اور غلاموں کو آزاد کرنے میں اور قرضداروں کے قرضہ میں اور اللہ کے راستہ میں اور مسافروں میں۔ یہ حکم اللہ تعالیٰ کی جانب سے مقرر کیا ہوا ہے اور اللہ تعالیٰ علم والا اور حکمت والا ہے۔

اس کی جزئیات کی تشریح قرآن نے نہیں کی بلکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی زندگی اس کے واسطے ایک معیار قرار دی گئی ہے۔ چنانچہ فرمان خداوندی ہوتا ہے۔

لَكُمْ فِي رَسُولِ اللهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ۔ تمہارے لیے اللہ کے رسول میں ایک اچھا نمونہ ہے

بہرکیف زکوۃ ایک زبردست عبادت ہے جس میں بہت سی خوبیاں مضمر ہیں۔ چنانچہ جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ ابن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن کا گورنر بنا کر روانہ کیا تو ان کو چند ہدایات فرمائیں جن میں سے ایک یہ بھی تھی کہ جب تم وہاں پہنچو تو یمن والوں کو سمجھاؤ کہ خداوند تعالیٰ نے ان پر زکوۃ فرض کی ہے جو ان کے سرمایہ داروں سے لی جائے گی اور انہی کے غریبوں پر تقسیم کر دی جائے گی۔

درحقیقت یہی اسلام کا معتدل قانون ہے جس پر عمل کرنے سے سرمایہ دار اور مزدور کی موجودہ کش مکش ختم ہو سکتی ہے اور افراط و تفریط کے ان نظامات کا استیصال ہو سکتا ہے جو کیپٹلزم، کمیونزم اور فاشزم کی صورت میں دنیا کو دھمکیاں دے رہے ہیں۔ (باقی)

# مسلمان اور امامت کبریٰ

از جناب مولوی صدر الدین صاحب مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڈھ

فطرۃ اللہ جو لوگ شریعت حقہ کی فہم و بصیرت میں ادنیٰ درک بھی رکھتے ہیں اور اس کے آئینہ میں اقوام کے فلسفۂ تخریب و تعمیر کا حقیقی عکس دیکھنا چاہتے ہیں ان کے سامنے نَحْنُ اَبْنَاءُ اللّٰہِ وَ اَحِبَّاؤُہٗ کی لغویت پہلے ہی قدم پر ظاہر ہو جاتی ہے۔ ان کو معلوم ہوتا ہے کہ اب تک جتنی قومیں بھی دنیا میں ابھری بگڑی ہیں سب کا سر رشتہ ایک محکم ضابطہ اور ایک بے لچک قانون سے بندھا ہوا ہے۔ اس ضابطہ اور اس قانون کو قرآن فطرۃ اللہ یا سنۃ اللہ کہتا ہے۔ اس کا اعلان ہے کہ دیکھو قدرت کا یہ ناموس ازلی اور غیر متبدل ہے۔ اس کے اصولوں کو مانو اور اس کے اشارہ پر قدم اٹھاؤ تو تم یقیناً خدا کے محبوب بھی ہو اور لاڈلے بھی، پھر اس کی خلافت کا تخت تمہارے پیروں تلے ہوگا اور کائنات کی زمام قیادت تمہارے ہاتھوں میں ہوگی۔ دنیوی نعمتوں اور اخروی سعادتوں کے مستحق تمہیں ہو۔ لیکن اگر تمہاری روحوں نے اس قانون سے بغاوت کی اور تم نے اپنی اہواء و آراء کے سانچے میں نظام عالم کو ڈھالنا چاہا تو پھر نہ تمہارا پیغمبروں کی اولاد ہونا تمہیں بربادی و ملعونیت سے بچا سکتا ہے اور نہ خیر الامم اور افضل العٰلمین ہونا تمہارے حق میں سفارش کر سکتا ہے۔ غرض تم ابھروگے تو اپنی نیک کرداریوں سے اور گروگے تو اپنی بداعمالیوں سے ورنہ قدرت تو بالکل بے نیاز ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ۔ (رعد ۲)

اسی فلسفۂ عروج و زوال کو اصطلاح جدید میں "تنازع للبقاء" "اصلح" کا قانون کہتے ہیں۔ کتاب الٰہی نے اس قانون کو اصل الاصول قرار دیا ہے۔ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جیسی مخلص اطاعت شعار

اور حق آگاہ جماعت اور کونسی ہوئی ہے یا ہو سکتی ہے ؟ انبیاء کرام کے بعد خدا کے نزدیک ان سے بڑھ کر محبوب یا رعایت کا حقدار اور کون ہو سکتا ہے۔ لیکن ان کے لیے بھی خدا کا یہ قانون بے لچک اور غیر متبدل ہی تھا۔

| | |
|---|---|
| يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ | اے ایمان والو تم میں سے جو کوئی اپنے دین سے پھر |
| عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ | گا تو اللہ عنقریب ایک ایسی قوم برپا کر دے گا جو |
| يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ | اسے چاہے گی اور وہ اسے چاہے گا، یہ قوم مومنین کے |
| اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۔ الآیۃ (۵۴ : ۱۲) | لیے نرم اور کافرین کے حق میں سخت ہو گی۔ |

ایک مرتبہ جہاد کے موقع پر بعض ضعفاء القلوب نے جبانت اور بزدلی کا مظاہرہ کیا تو یہ پرعتاب آیۃ نازل ہوئی :-

| | |
|---|---|
| اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا | اگر تم نکلو گے (جہاد کے لیے) تو خدا تم کو دردناک عذاب |
| وَّيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ | دیگا اور تمہارے بدلہ ایک دوسری قوم لائے گا، جبکہ |
| شَيْـًٔا وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (توبہ) | تم کچھ نہ بگاڑ سکو گے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ |

اور آگے بڑھیے، جو دنیا میں خدا کی خاص محبوبیت کا پیکر بن کر آیا، جس کے مقام تقرب تک پہنچنے میں جبرئیل کے بھی پر جلنے لگے جو اپنے رب کے اتنا قریب جا پہونچا تھا کہ اس کی انگلیوں کی ٹھنڈک اپنے سینے پر محسوس کرتا تھا جو معصوم تھا بلکہ سارے معصوموں کا سردار اس کے لیے بھی سنت الٰہی اپنی اسی آن پر وہی کھول کر کہہ دیا گیا کہ۔

| | |
|---|---|
| وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى | یہود و نصاریٰ تم سے ہرگز راضی نہ ہوں گے تاوقتیکہ |
| حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ۭ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ | تم ان کے طریقہ کی پیروی نہ قبول کر لو۔ کہہ دو کہ راہ |
| الْهُدٰى ۭ وَلَىِٕنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَاۗءَهُمْ | ہدایت تو صرف اللہ کی ہدایت ہے ورنہ اگر تم نے |

بَعْدَ الَّذِیْ جَآءَکَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَکَ مِنَ اللّٰہِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّ لَا نَصِیْرٍ۔ (بقرہ)

اہواء کی پیروی کی علم آجانے کے بعد تو پھر (یاد رکھو) خدا کے مقابلہ میں تمہارا کوئی ولی و ناصر نہ ہوسکے گا

قانون الٰہی کے مختلف دفعات میں سے ایک مسلّم اور اٹل دفعہ یہ بھی ہے کہ مشرک خدا کی بخشش کا مستحق کبھی نہیں ہوسکتا۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ۔ یہ ایک قضائے مبرم ہے جس میں کبھی تخلف نہ ہوا ہے نہ ہوگا حتیٰ کہ اگر پیغمبر بھی (نعوذ باللہ) اس جرم کا مرتکب ہوجائے تو اس کے لیے بھی خدائے ذوالجلال کی قہرسامانیاں اتنی ہی بے پناہ ہیں جتنی دوسرے کے لیے بلکہ اس سے دوگنی۔

اِذًا لَّاَذَقْنٰکَ ضِعْفَ الْحَیٰوۃِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَکَ عَلَیْنَا نَصِیْرًا (بنی اسرائیل ۸)

اگر تم نے ایسا کیا تو ہم تم کو ضرور چکھائیں گے دگنی سزا (عذاب کا) زندگی میں اور موت میں پھر تم ہمارے خلاف کوئی مددگار نہ پاؤگے۔

غرض خدا کی سنت ازل سے ایک حال پر ہے اور ابد تک باقی رہے گی۔ منصۂ شہود پر جو جزئی واقعہ بھی پیش آتا ہے سب کا سب اسی جلوۂ حقیقت کا ایک خارجی اور مادی عکس ہوتا ہے جسے نگاہیں آسانی بھانپ سکتی ہیں بشرطیکہ ان میں بینائی ہو۔ آگے جو کچھ ہم کہنا چاہتے ہیں وہ اسی اجمالی حقیقت کی تفصیل ہے۔

**خلافت الٰہی** انسانی شرف و مجد کا راز یہ ہے کہ وہ اللہ کی زمین پر اس کا خلیفہ ہے۔ خلافت الٰہی کا تاج اس کے سر پر ابتدائے آفرینش ہی میں رکھ دیا گیا تاکہ وہ خدا کی اس زمین پر اس کے احکامات کا نفاذ کرے۔ اسی غرض کی تکمیل کے لیے مبشرین اور منذرین کا ایک کثیر التعداد گروہ مختلف زمانوں میں مختلف اقوام و ملل کے اندر آتا رہا ہے۔ جب خدا کی مشیت اور حکمت کسی قوم کو نوازنا چاہتی ہے تو اس کے سر پر اس مقدس تاج کو رکھ دیتی ہے جس سے جمال انسانیت کی شعاعیں چھن چھن کر دنیا سے ظلمات کو مٹاتی

اور انسانی سعادت کی راہیں دکھلاتی ہیں۔ یہ تاج اس قوم کے سر پر اس وقت تک رہتا ہے جب تک اس کے
اندر اس کی اہلیت رہتی ہے لیکن جب اس قوم پر نفس کا تسلط اور شیطان کا استیلا ہو جاتا ہے اور وہ نوامیس
الٰہی کے حدود توڑتی اور اپنی خواہشات نفس میں ڈھلے ہوئے قوانین ان کی جگہ قائم کرتی ہے تو اس کے
سر سے یہ زرین تاج اتار لیا جاتا ہے اور ظلمت و حیرانی کے ہیبت انگیز بیابانوں میں اسے سرگرداں چھوڑ
دیا جاتا ہے۔

**بنی اسرائیل کی معزولی** تاریخ یہود اس حقیقت کا سب سے کامل مظہر ہے، جہاں ہمیں تصویر کے دونوں رخ
حقائق اور واقعات ثابتہ کی روشنی میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ یہ وہ قوم تھی جسے خدا نے تمام دنیا کی
قوموں پر فضیلت دی تھی جس کی تائید و نصرت کے لیے بحر قلزم کی موجیں اور قضائے آسمانی کی بدلیاں
ہمہ تن تیار رہتیں بلکہ خود مرکز فتح و نصرت اور منبع فیض و رحمت ابر بن کر آتا اور ان کے سر پر سایہ
کرتا ہوا چلتا لیکن آخر یہ ساری رحمتیں، یہ تمام نوازشیں یہ سب ناز برداریاں کہاں گئیں اور ان کی
شان محبوبیت کس گوشہ میں جا کر روپوش ہو گئی؟ اس وقت جبکہ ان کے ناز بردار خداوند کے تیور بدل گئے
اس کی پرجلال نگاہوں سے قہرمانیوں کے شعلے نکلنے لگے، اس کے بے پناہ قوتوں والے ہاتھوں نے
ان کے سروں سے خلافت کا تاج چھین لیا یہاں تک کہ اس نے ان سے تبری اور نفرت کا اعلان کر دیا
مغضوب علیہم اور قاسیۃ القلوب ٹھہرا کر ان کے دلوں پر مہر کر دی کہ پھر سعادت اور حقانیت کی نورانی
کرنیں ان کے اندر کبھی نہ گھسیں، ملعون اور مفسد قرار دے کر انہیں ایک مظہر عبرت بنا کے چھوڑ دیا کہ دنیا
ان سے درس عبرت حاصل کرے۔ آخر یہ انقلاب کیسے وجود میں آیا؟ اس کا جواب قرآن تصریحاً
یا کنایۃً قدم قدم پر پیش کرتا جاتا ہے۔ قدرت جب اپنے ان لاڈلوں سے عہد و پیمان مرتب کر رہی تھی
تو اس وقت اس نے اپنے مراحم کی اساس ہی یہ بتلائی تھی، اَوْفُوْا بِعَهْدِیْٓ اُوْفِ
بِعَهْدِكُمْ۔ پھر جب ان وعدہ شکنوں نے میثاق الٰہی کی بے حرمتی کی اور خدا کی شریعت کو اپنی

اہوا کی آماجگاہ بنا کر اسے فراموش ہی کر دیا تو اس نے بھی آنکھیں پھیر لیں۔ نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُم

چنانچہ حضرت موسیٰ نے جب فرعون کے دربار میں توحید کی آواز بلند کر کے بنی اسرائیل کی رہائی کا مطالبہ کیا اور اس کے جواب میں فرعون نے طرح طرح کے انسانیت سوز مظالم ڈھانے شروع کر دیے تو بنی اسرائیل ان مصائب کی تاب نہ لا کر چیخ اٹھے کہ اے موسیٰ تو تو پہلے سے عذاب بنگیا صرف تیری وجہ سے تیرے آنے سے پہلے ہی ہمارے ہزاروں معصوم لخت جگر موت کے آغوش میں سلا دیے گئے اور پھر آج تک ہمارے مصائب کا دروازہ بند نہ ہوا اس وقت آپ نے فرمایا۔

عَسٰی رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِی الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ (اعراف ۱۵) — قریب ہے کہ تمہارا رب تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے اور تمہیں زمین کی خلافت دے دے پھر دیکھے کہ آخر تم کیسا عمل کرتے ہو۔

یعنی جب خلافت اور دنیا کی شہنشاہی کا تصور بھی ان کے ذہن میں نہ آ سکتا تھا اس وقت اس منصب جلیل کی بشارت سنا کر آگاہ کر دیا گیا تھا کہ یہ نعمت تمہیں دے کر تمہارے اعمال کو دیکھا اور تمہاری صلاحیت کار اور اہلیت کو پرکھا جائے گا۔ چنانچہ یہ خداوندی بشارت بھی اسی سنت اللہ کے تحت عالم وجود میں آئی اور اللہ کا یہ کلمۂ حسنیٰ اسی وقت پورا ہوا جب وہ امتحان کی کسوٹی پر پورے اتر گئے۔

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِیْٓ اِسْرَآءِيْلَ بِمَا صَبَرُوْا۔ (اعراف ۱۶) — اور بنی اسرائیل پر تمہارے رب کا نیک وعدہ پورا ہوا بوجہ ان کے صبر کرنے کے۔

سورۂ بقرہ جو کہ اثبات نبوت کی سورۃ ہے اس کا خطاب سراسر یہود سے ہے جس کے اندر ان کی اس شقاوت و ملعونیت کی الم ناک داستان واقعات کی روشنی میں پوری تفصیل کے ساتھ پیش کی گئی ہے اور یہ نتیجہ نکالنے کے بعد کہ تمہاری امت کا یہ کھوکھلا پیکر اس قابل نہیں رہا کہ اسے

نیابت الٰہی کی زرین خلعت پہنائی جائے۔ ایک جدید امامت کی تعمیر کی ضرورت ظاہر کی گئی ہے۔ یہود کے اسباب زوال کا یہ ایک کلی اشارہ ہے۔ آگے چلکر حسب موقع اس کی مزید تشریح کی جائے گی۔

خیر الامم کی بعثت | دین الٰہی کے جس قصر مشید کی بنا وادی غیر ذی زرع میں خلیل اللہ نے ڈالی تھی اس کی تعمیر و تخریب کے نہ معلوم کتنے دور گذرے لیکن مشیت ایزدی کے نزدیک اس کی تکمیل ضروری قرار پاچکی تھی، بالآخر وہ وقت آیا کہ اس ایوان کی آخری اینٹ رکھدی گئی جس کے بعد اس کا کوئی گوشہ ناکمل باقی نہ رہا اور شرائع و ہدایات کا جو سلسلہ حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہوا تھا اس کی تکمیل کا اعلان کر دیا گیا۔ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ الآیۃ یعنی جو آفتاب جمال سینا اور شعیر سے طلوع ہوا تھا وہ بلند ہوکر اپنی پوری تابانیوں اور ضیا گستریوں کے ساتھ فاران کی چوٹیوں پر چمکا۔ خدا نے بیت قدس سے توجہ ہٹاکر بیت حرام کو اپنی تمامی نعمتوں کا مہبط قرار دیا اور پھر یوں ہوا کہ وہ خلعت سعادت جسے بنی اسرائیل کے منحوس پیکر سے اتار لیا گیا تھا کہ اب وہ اس کے اہل نہ رہے تھے، ریگزار عرب کے بدوؤں کو پہنا دیا گیا۔ عزل و نصب کا یہ سلسلہ تو ابتدائے آفرنیش ہی سے چلا آتا تھا۔ اور سنت الٰہی برابر نااہل اور ناکارہ قوم کو ذلت اور لعنت کے حضیض میں ڈھکیلتی اور اس کی جگہ ایک دوسری صالح قوم کو برپا کرکے خلافت کا تاج قدوسیت اس کے سر پر رکھتی رہی ہے لیکن یہ عزل و نصب بعض اعتبارات سے بالکل ہی ممتاز اور انوکھا تھا کیونکہ یہ لمحہ وہ تھا جو تاریخ قیادت کی دو مختلف النوع حقیقتوں کا مرکز اتصال تھا۔ اب تک جو قومیں قدرت کے انتخاب میں آتی رہی تھیں ان کی شریعت بھی محدود تھی اور ان کی سیادت بھی محدود۔ عقل انسانی کا دائرہ اس وقت اتنا وسیع نہیں ہوا تھا کہ اس کی ہدایت کے لیے کسی کمل اور غیر متبدل شریعت کی ضرورت پڑتی اور نہ اس نے اتنی ترقی قوت حاصل کی تھی کہ پورے عالم کی گلہ بانی کے بار کی متحمل ہوسکتی، یا اس کلام الٰہی کی روحانی تجلیات کو اپنے اندر جذب کر سکتی جس کا عکس اگر پہاڑوں پر بھی پڑ جائے تو وہ بھی جلال الٰہی کی تاب نہ لاکر

ریزہ ریزہ، چور چور، پاش پاش ہو جائیں۔ اس لیے قدرت الٰہی اس امانت کبریٰ کے لیے کسی خاص موقع کی منتظر تھی۔ لیکن اب اس کا انتظار ختم ہو چکا تھا یعنی انسانی ادراک و احساس اپنی معراج کمال تک پہونچ چکا تھا۔ لہذا اسے اس کی وہ "امانت کبریٰ" اپنی تمام خصوصیتوں کے ساتھ سپرد کر دی گئی پس تاریخ شریعت کے اس آخری اور عظیم الشان انقلاب کے بارے میں صرف اتنا کہنا کافی نہ ہوگا کہ ارض الٰہی کی خلافت بنی اسرائیل سے منتقل ہو کر بنی اسمٰعیل میں چلی آئی کیونکہ دونوں کی ذمہ داریوں میں بعد المشرقین ہے۔ ناصرہ کا داعی حق صرف بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کو راہ راست پر لانے آیا تھا لیکن عرب کا امیؐ فداہ ابی و امی سارے عالم کو سچائی کا درس دینے اور کھو جانے والی پوری دنیا کو ہدایت کا سبق پڑھانے آیا۔ سو اسی مناسبت سے امت موسٰیؑ اور امت محمدیؐ کی ذمہ داریوں اور ان کے خصائص میں بھی تفریق کرنی پڑے گی کو بنی اسرئیل کے انتخاب اور استخلاف کی غرض و غایت بھی حکومت خداوندی کا قیام اور احقاق حق و ابطال باطل ہی تھا لیکن اس کا دائرۂ عمل محض شام کے اطراف ہی تک محدود تھا۔ بخلاف اس کے امت مرحومہ کا مشن بھی اگرچہ وہی تھا لیکن اس کے لیے زمین کے کسی ایک گوشہ یا رنگ و نسل کے کسی خاص گروہ کی تخصیص نہ تھی بلکہ انکا پیغمبر خاتم الانبیاء تھا ان کی شریعت اکمل الشرائع اور ان کی امت خیر الامم تھی۔ ان کے ہاتھ میں پورے کرۂ ارض کی زمام خلافت دی گئی اور مشرق و مغرب کے ہر گوشہ سے بدی کا استیصال کرنا اور اس کی جگہ نیکی کی تخم ریزی کرنا اس کا واحد مقصد اور واحد نصب العین قرار دیا گیا۔

غرض جس خلافت کی تاسیس عالم روحانیت میں اتنے قیل و قال کے بعد کی گئی تھی وہ ترمیم و تنسیخ کے ہزارہا دور گذرنے کے بعد اپنے اس مرکز کمال تک پہونچ گئی جہاں سے نہ آگے بڑھنے کی گنجائش تھی نہ پیچھے ہٹنے کی یعنی فطرۃ نے اپنے چہرہ سے یکسر نقاب الٹ دی کیونکہ عقل اپنے مرکز ارتقا پر پہنچ کر اس کی جوہر شناس اور راز دار بننے کے قابل ہو چکی تھی اور عدل و قسط جو اس کا جوہر اور

قوام ہے بغیر کسی آمیزش اور بغیر کسی خارجی تاثر و انفعال کے پورے جمال کے ساتھ دنیا کے سامنے چمک اٹھا تھا۔ پس وہ جماعت جس نے اس میزان عدل و قسط کو اپنے ہاتھوں میں لیا، فطرۃً امت وسط بن گئی اور یہی اس کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے کیونکہ شرائع سابقہ مخاطبین کے حالات خارجی اور خصوصیات ذہنی و باطنی کا اعتبار کرتے ہوئے فطرۃ کے جادے سے ذرا منحرف ہوا کرتی تھیں۔ یہود کا ظاہر و باطن چاہتا تھا کہ ان کی شریعت تیغ و دم بنتی لیکن مخاطبین مسیح کے حالات کا تقاضا تھا کہ فروتنی و خاکساری ان کا سرمایہ کمال قرار دی جائے۔ اسی بنا پر آپ اگر غور کریں گے تو پائیں گے کہ ایک میں انتہائی شدت و غلظت ہے اور دوسری سراپا لینت، لیکن رسول عربی کی شریعت اس افراط و تفریط سے بالکل بے داغ اور سراپا عدل و قسط بنکر آئی کیونکہ کوئی شریعت فطرۃ سے سرمو تجاوز کرکے عالمگیر اور ابدی شریعت نہیں بن سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام دین فطرت کہلایا اور امت مسلمہ کو امت وسط کہکر پکارا گیا۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ۔ (بقرہ ۱۷)

چنانچہ ہم نے تم کو ایک معتدل امت بنایا کہ تم لوگوں کے لیے (حق کے) گواہ ہو۔

اس آیت کریمہ میں امۃ وسطاً اور شہداء علی الناس اسی حقیقت کی تشریح ہے جسے ہم اوپر بیان کرچکے ہیں یہ ہے خیر الامم کا مشن اور اس قدر عظیم ہیں اس کی ذمہ داریاں۔

**عربوں کو خلافت کیوں ملی** | بنی اسرائیل کی معزولی اور خیر الامم کی تجویز بعثت کے وقت قدرت کی نگاہیں ہر چہار جانب اٹھیں لیکن جس حسن فطرۃ کی اسے تلاش تھی اس سے ہر ناصیۂ کمال بے نور نظر آیا۔ آخر کار یہ متجسس نگاہیں وحشت کدۂ عرب میں پہنچکر ٹھٹک گئیں اور غور سے دیکھنے کے بعد انہوں نے معلوم کرلیا کہ اگرچہ بظاہر یہ زمین جہل و بربریت کا ہیبت ناک سنگلاخ ہے لیکن اس کی تہ میں وہ خالص جوہر اور صالح مادہ بدرجۂ اتم موجود ہے جو اس تخم کی روئیدگی و بالیدگی کا پوری طرح متکفل ہوسکتا ہے

جس کی تخم ریزی آج قدرت کرنا چاہتی ہے اور جس کی شاخوں کے سایہ کو ہر عربی و عجمی کے سر پر پہنچنا ہے یہ قدرت کا انتخاب تھا جس پر وہ نازاں تھی کیونکہ اسے عواقب کی خبر تھی۔ دنیا فرط حیرت سے اس کا مضحکہ اڑانے لگی آوازے کسنے لگی کیونکہ اس کی کوتاہ نگاہیں اس رمز تک نہ پہنچ سکی تھیں لیکن گنتی کے دن بھی گذرنے پائے تھے کہ غیب کے حجابات ایک ایک کرکے ہٹنے لگے اور جو چیز دنیا کے نزدیک ناممکن الوقوع تھی آنکھوں نے سورج کی روشنی میں اسے موجود ہوتے دیکھا۔

عرب نے دنیا کی سیاست، مذہب، تمدن طرز معاشرت پر ذہنی و فکری حیثیت سے جو اثر ڈالا وہ اس قدر عیاں ہے کہ اسے عیاں کرنے کی ضرورت نہیں لیکن سوال یہ ہے کہ آخر اتنا بڑا عظیم الشان انقلاب اس سرزمین سے کیوں اٹھا؟ یہ مرکز شر و فساد مہبط سعادت کیونکر بن گیا؟ ان بدوؤں کے ہاتھوں سے اونٹوں کی مہار لیکر مشرق و مغرب کی زمام سیادت کس نے دی؟ کیا قدرت کو وہاں کی سرزمین سے کوئی خاص انس تھا؟ کیا یہاں کے باشندے اس کے لاڈلے تھے کہ بغیر کسی استحقاق کے انھیں فرمانروائی عالم کے تخت پر لے جاکر بٹھا دیا؟ عقل سلیم تو اسے ایک لمحہ کے لیے بھی باور کرنے کو تیار نہیں، یہ عالم اسباب ہے جو دینے والے کی راہ میں سب کچھ کھو دیتا ہے وہ سب کچھ پالیتا ہے، جو سر جھکاتا ہے وہی سر بلند ہوتا ہے۔ جو گردن کٹاتا ہے وہی حیات پاتا ہے، یعنی وہی سنت الٰہیہ یہاں بھی کارفرما تھی جس نے بنی اسرائیل کو بے تاج و تخت کیا تھا، اس کا قانون اب بھی ویسا ہی بے لچک تھا جیسے پہلوں کے لیے تھا۔

اسلام کی ابتدائی زندگی پر غور کیجیے، مظلومیت کی کیسی بے نظیر تاریخ ہے یہیں سے قدرت کی حکمت بھی دیکھتے چلیے اور ساتھ ہی اس کا عدل بھی۔ خلافت اسرائیلی اور خلافت عربی دونوں کی تاریخ سامنے رکھیے۔ سنۃ اللہ کا حسن اور زیادہ بے نقاب دکھائی دے گا۔ اس کا قانون یہ ہے کہ بندہ کو ابتلا و آزمائش میں ڈال کر پہلے پرکھ لیا جائے گا پھر حسب لیاقت نعمتوں سے سرفراز کیا جائے گا۔ چنانچہ

مسلمانوں کی بے قراری اور بے تابی کے وقت لسان غیب اس انداز سے بے نیازی کے ساتھ تنبیہ کرتی ہے۔

أَحَسِبَ النَّاسُ أَنْ يُتْرَكُوا أَنْ يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ ۔ (روم ۲)

کیا لوگ یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ محض اُن کے یہ کہہ دینے سے کہ ہم ایمان لائے انھیں چھوڑ دیا جائیگا اور انہیں پرکھا نہ جائے گا۔

غور فرمائیے یہود کی سیادت محدود تھی اور شریعت بھی محدود، بایں وجہ ان کی آزمائشوں کی کمیت اور کیفیت بھی محدود رہی کیونکہ جس سونے کو جتنا کھرا بنانا ہوتا ہے۔ اسی قدر اسے تپایا جاتا ہے امت محمدیہ پر نعم الٰہیہ کا اتمام ہونے والا تھا اسے وہ خلعت سیادت عطا کیا جانے والا تھا جسے دنیا اپنی کہنہ سالی کے باوجود ابتک نہ دیکھ سکی تھی۔ لھذا ضروری تھا کہ فتنوں اور آزمائشوں کا ویسا ہی مہیب سیلاب بھی آتا جسے چشم تصور اب تک نہ دیکھ سکی ہو۔ یہ سیلاب آیا یا نہیں؟ اور اس کے تھپیڑوں میں کوئی انسانی فرد یا گروہ ثابت قدم بھی رہا یا نہیں؟ یہ سوالات وہ ہیں جن کے جوابات تمام دنیا نے ایک ہی دیے ہیں۔ اس کا ثبوت تحت تحیص سے بے نیاز ہو چکا ہے۔ تاریخ اسلام کے ابتدائی اوراق مظلومیت کا ایک عدیم المثال مرقع ہیں۔ بنی اسرائیل کے پورے خانوادہ کے لیے ایک فرعون تھا۔ لیکن یہاں ہر لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہنے والے کے لیے ایک فرعون موجود ہے وہاں ایک فتنہ ہے جسے غرق کرنے کے لیے سمندر کو آنا پڑتا ہے۔ لیکن یہاں انگاروں میں جلائے جا رہے ہیں، چٹانوں سے پیسے جا رہے ہیں، تپتی ہوئی ریت پر لٹائے جا رہے ہیں، سالہا سال تک آب و دانہ پہنچنے کی راہیں مسدود کی جا رہی ہیں۔ لیکن قدرت کی بے نیازی! نہ تو آگ ہی کو الہام ہوتا ہے کہ بردًا و سلامًا بن جائے۔ نہ چٹانوں سے کہا جاتا ہے کہ اپنا وزن روک لیں۔ نہ ریت کی تپش جھلسانے سے باز آتی ہے، نہ آسمان سے من و سلویٰ کا نزول ہوتا ہے، ان تمام باتوں

کے بعد بھی کلمہ گوئی کی تعزیریں ختم نہیں ہوتیں۔ حکم ہوتا ہے گھر چھوڑ دو، مال و جائداد سے دست کش ہو جاؤ، بیوی بچوں کو الوداع کہو، حدود وطن سے باہر نکل جاؤ۔ بالآخر کرنے والے یہ سب کچھ کرتے ہیں۔ لیکن جس زمین پر بھی جاتے ہیں وہ آسمان سے خالی نہیں نکلتی۔ سب کچھ تیاگ دینے کے بعد حکم ہوتا ہے کہ اب اپنی جانیں ہتھیلیوں پر رکھکر آؤ کہ خلافت کے فرائض اب جاکر شروع ہو رہے ہیں۔ ان سے محاربہ کرو جو خدا سے محاربہ کرتے ہیں۔ ان کو قتل کرو جو تم سے مقابلہ کرتے ہیں۔ حکومت الٰہی کے باغیوں کا قلع قمع کرو خواہ وہ تمہارے باپ دادا ہوں یا جگر کے ٹکڑے۔ اگر تم ایک ہو تو ان کے دس سے مقابلہ کرنا پڑے گا۔ آخر کار بڑھنے والے بڑھے۔ انہوں نے یہ نہیں کہا کہ جاؤ تم اور تمہارا خدا لڑیں! انھیں یہ ڈر نہ تھا کہ "قوم جبارین" سے نبٹنے کا حکم ہو رہا ہے۔ انھیں غم تو اس کا ہوتا تھا کہ ہم شہید میں جانے سے کیوں رہے جاتے ہیں۔ اور یہی مقام ہے جہاں انسان جب ارضی (خلافت) وجنت سماوی کا وارث بنتا ہے۔ اس کھرے سودے کی تشریح خدا نے یوں کی ہے۔

| | |
|---|---|
| ان اللہ اشتریٰ من المومنین انفسھم واموالھم بان لھم الجنۃ۔ | خدا نے مومنین سے ان کی جان و مال کو جنت کے بدلے خرید لیا ہے۔ |

اس قدر اطاعت الٰہی میں ڈوب جانے اور اس قدر فدا کار بن جانے کے باوجود بای غیب ان کی ادنیٰ سے ادنیٰ چوک پر بھی اپنی تعزیری کارروائیوں سے باز نہ آتا۔ غزوۂ بدر کے قیدیوں کے معاملہ میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے ایک اجتہادی غلطی کا ارتکاب کیا تو خدائے تہار کی ایسی ڈانٹ پڑی کہ کلیجے دہل گئے۔ غزوۂ اُحد میں میدان مسلمانوں کے ہاتھ رہا لیکن وقتاً قدرت نے جنگ کا پانسہ باین وجہ بدل دیا کہ عقب کے تیراندازوں نے قبل از وقت اپنی جگہ چھوڑ دی۔ اور غنائم پر جھک پڑے۔ غزوۂ حنین میں اسلامی لشکر اپنی جراری کے

باوجود شکست کھا گیا صرف اس بنا پر کہ اس کے جذبۂ توکل علی اللہ کے کمال میں نقص آگیا تھا اور اپنی کثرت پر کسی قدر ناز تھا۔

قرآن کریم کے اکثر و بیشتر احکامات ایسے ہی مواقع پر نازل ہوئے ہیں جب ادھر سے کسی قسم کی چوک ہوئی ہے۔ اس طرح اس نے حکیمانہ اصول تربیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے مومنین کی تطہیر کی اور جب ایک صالح جماعت اللہ والوں کی پیدا ہوگئی جو اللہ کے ہاتھ سے پکڑتے، اللہ ہی کے پیر سے چلتے اور اللہ ہی کی آنکھ سے دیکھتے، جن کا ایمان فتنوں کی بھٹی میں جلکر خالص کندن کی طرح چمکنے لگا تھا، جن کے متعلق خدا نے یہ اقرار کیا کہ میں ان سے راضی ہوا اور وہ مجھ سے راضی ہوئے جن کی مختصر لیکن جامع تعریف یہ تھی کہ کفار کے لیے سخت ہیں، اپنے لوگوں (مومنین) کے لیے نرم رکوع و سجود میں مشغول، رضوان الٰہی کی تلاش میں محو ہیں، غرض قدرت نے جب ہر طرح سے انھیں پرکھ لیا کہ صالحین اور متقین کا گروہ اپنے باطن کا تزکیہ پوری طرح کر چکا ہے اور اب اس قابل ہے کہ ساری دنیا کی تطہیر اور تزکیہ کا بیڑا اٹھائے اس وقت وَلَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ وَلَنُحْيِيَنَّهُ حَيَاةً طَيِّبَةً کا خداوندی وعدہ پورا ہوا کیونکہ ہر نہج سے وہ اس کے مستحق ہو چکے تھے۔ اور قدرت کو کامل یقین ہو چکا تھا کہ اگر ان کو زمین میں تمکن عطا کیا جائے گا تو یہ نماز قائم کریں گے زکوٰۃ دیں گے نیکی کا پرچار کریں گے اور برائی کا استیصال کریں گے اور یہی خلاصہ ہے منشاء خلافت کا۔

**مسلمانوں کی معزولی** اوپر کی سطروں میں بیان کیا جا چکا ہے کہ عالم اسباب کے اندر عزل و نصب کا سررشتہ اسی سنت الٰہیہ کے دامن سے بندھا ہوا ہے جو سب کے ساتھ یکساں رہی ہے۔ صدر اول کے مسلمانوں کو خلافت کا تاج بخشا گیا کیونکہ وہ ہر شرط پر پورے اتر چکے تھے۔ لیکن اس کا مقصد یہ نہ تھا کہ آخری شریعت آجانے کے بعد فطرۃ الٰہی مردہ ہو چکی ہے، یا قدرت اپنے آخری فیصلہ کو نافذ کرکے سو رہی ہے۔ اس نے اس وقت بھی وہی الفاظ دہرائے تھے جو بنی اسرائیل کو سریر خلافت پر بٹھاتے

وقت کہے تھے کہ :-

ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ مِنْ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ۔ (یونس)

پھر ہم نے ان کے بعد زمین پر تم کو خلیفہ بنایا تاکہ دیکھیں کہ تم کس طرح کام کرتے ہو۔

جس قدر زمانہ گذرتا گیا کیف تعملون کی حقیقت واضح ہوتی گئی۔ ان دو لفظوں میں امت مسلمہ کی پوری تاریخ بیان کر دی گئی ہے۔ ان کے اندر اسلامی عروج و زوال کی پوری تفصیل موجود ہے تصویر خیر الامم کا ایک رخ تو وہ ہے جسے پچھلے لفظوں میں دکھایا جا چکا ہے، اور دوسرا رخ یہ ہے جو آج ہماری اور آپ کی نگاہوں کے سامنے بے حجاب نظر آ رہا ہے۔ مسلمانوں کی اس منزل کی ذلت و نکبت اور ان کی پستی و درماندگی پر نظر ڈالتے ہی مجھے صادق و مصدوق کی وہ المناک پیشین گوئی یاد آ گئی جس کی حقانیت پر تاریخ اسلام کا ہر آنے والا لمحہ مہر تصدیق ثبت کرتا جاتا ہے کہ :-

لتتبعن سنن من كان قبلكم ... حتى لو دخلوا جحر ضب لدخلتموه ... اليهود والنصارى؟ قال ... (بخاری)

یقین ہے کہ تم بھی ان سب راستوں پر چلو گے جن پر پچھلی امتیں چل چکی ہیں۔ تم قدم بقدم ان کی پیروی کرو گے حتیٰ کہ اگر وہ کسی گوہ کے بل میں گھسی ہیں تو تم بھی اس میں ضرور گھسو گے۔ لوگوں نے پوچھا ... امتوں سے یہود و نصاریٰ مراد ہیں؟ فرمایا اور کون؟ (باقی)

# تنزیل و تاویل

## تفسیر آیہ مَاکَانَ لِنَبِیٍّ اَنْ یَّکُوْنَ لَہٗ اَسْرٰی

(از جناب مولنا داؤد اکبر صاحب اصلاحی)

ایک استفسار کے جواب میں آیات مَاکَانَ لِنَبِیٍّ اَنْ یَّکُوْنَ لَہٗ اَسْرٰی حَتّٰی یُثْخِنَ فِی الْاَرْضِ تُرِیْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْیَا وَاللّٰہُ یُرِیْدُ الْاٰخِرَۃَ وَاللّٰہُ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ۔ لَوْلَا کِتٰبٌ مِّنَ اللّٰہِ سَبَقَ لَمَسَّکُمْ فِیْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ کی جو تاویل ہم نے رسالہ ترجمان القرآن (بابتہ شوال ۱۳۵۵ھ) میں اختیار کی تھی مولانا ابوالاعلیٰ صاحب کو اس سے اتفاق نہیں چنانچہ مولنا نے آخر میں اپنی تحقیق بھی درج فرمادی ہے، ہم نے مولنا کی تحقیق کو بار بار پڑھا، اور ہر مرتبہ اسی نتیجہ پر پہنچے کہ مولنا کے سامنے ہماری تاویل کے قبول کرنے میں اصلی دقت خطاب کی ہے اس لیے آج ہم قرآن پاک کے طریقہ خطاب سے بحث کریں گے اور اگر ضرورت ہوئی تو مولنا نے ابن عباس اور دیگر مفسرین کی جو تصریح پیش کی ہے اس سے بھی بحث کریں گے۔

مجھے اپنی تاویل پر اصرار نہیں ہے اس لیے اس پر جو کچھ بھی لکھوں گا طالبعلمانہ لکھوں گا اور مقصود تحقیق مسئلہ ہوگا نہ کہ بحث و مناظرہ اس لیے کہ مناظرہ سے آج تک کوئی مسئلہ طے نہیں ہوا ہے۔ مولانا نے خطاب کی حسب ذیل زحمتوں کو پیش کرکے میری تاویل کی تردید فرمائی ہے

(۱) سورۂ انفال کے ساتویں رکوع سے اخیر سورہ تک خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے یا مسلمانوں سے ہوا ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ تریدون الخ اور فیما اخذتم کا خطاب بھی مسلمانوں سے ہی ہو۔

(۲) بالفرض اگر تریدون وغیرہ کا مخاطب کفار یا یہودیوں کو قرار دے دیا جائے تو پھر فکلوا مما غنمتم کا خطاب کس سے ہوگا؟ ایک ہی سلسلۂ کلام میں کہیں مسلمانوں سے خطاب اور کہیں یہود و کفار سے خطاب کلام کو بے معنی کر دیتا ہے۔

(۳) ما بعد کی آیت کے اس ٹکڑے (مما اخذ منکم) سے معلوم ہوتا ہے کہ فیما اخذتم کا خطاب بھی مسلمانوں ہی سے ہوگا۔

ہمارے نزدیک مولانا جن وجوہ کی بنا پر تریدون، مسکم، فیما اخذتم کا خطاب مسلمانوں کی طرف لینے پر مصر ہیں وہ وجوہ قطعاً اس مقام پر موجود نہیں ہیں۔ سب سے بڑی زحمت ہماری تاویل کے لینے میں مولانا محترم کے سامنے یہ ہے کہ ایا اس طرح تبدیلی خطاب اور دخل مقدر ہوتا بھی ہے؟ یہی وہاں جا بجا خطاب میں تبدیلی اور دخل مقدر ٹھیرا لیا۔ ہماری دانست میں ہماری تاویل کے لحاظ سے جو تبدیلی خطاب اور دخل مقدر ماننا پڑتا ہے نہ تو یہ دخل مقدر ہی کی کوئی انوکھی مثال ہے اور نہ تبدیلی خطاب ہی کی۔ بلکہ اس طرح کے تبدیل خطاب اور دخل مقدر کی بیسیوں مثالیں قرآن پاک میں موجود ہیں۔ چند آیات اپنے دعوے کے اثبات کے لیے نقل کرتا ہوں۔

## "امثلۂ تبدیل خطاب"

سورۂ بنی اسرائیل میں ہے:۔

| | |
|---|---|
| اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَ لَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّ اَكْبَرُ تَفْضِيْلًا لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَقْعُدَ مَذْمُوْمًا مَّخْذُوْلًا وَ قَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا اِمَّا يَبْلُغَنَّ | دیکھ ہم نے کیونکر دنیا میں ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے حالانکہ آخرت ہی حقیقی شرافت و بزرگی کا معیار ہے خدا کے ساتھ کسی اور کو اس کا سہیم نہ ٹھیرا ورنہ تم برے ٹھیرو گے اور تیرے رب کا حکم ہے کہ اس کے سوا کسی کو نہ پوجنا اور ماں باپ کے ساتھ |

عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَا اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا
تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا
قَوْلًا كَرِيْمًا.. وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ
الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا
كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِيْ
نُفُوْسِكُمْ اِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِيْنَ فَاِنَّهٗ
لِلْاَوَّابِيْنَ غَفُوْرًا. وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى
حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ
تَبْذِيْرًا. اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْا اِخْوَانَ
الشَّيٰطِيْنِ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا

نیکی کرنا اگر ان میں ایک یا دونوں تیرے سامنے
بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان کی بات میں اف تک کرنا
اور ان کے سامنے نرم دلی سے اطاعت کا
بازو جھکا دینا اور ان کے حق میں یہ دعا مانگنا کہ
پروردگار میرے والدین پر اسی طرح رحم فرما جس طرح
انھوں نے جب میں چھوٹا تھا رحم کیا تھا تمہارا رب
تمہارے دلوں کے راز سے خوب واقف ہے اگر
تم نیک ہو تو وہ توبہ کرنے والوں پر بخشش کرتا ہے؛
اور قرابت دار کو اس کا حق ادا کر، اور غریب اور
مسافر کا حق دے اور فضول خرچی نہ کیا کر، فضول

---

وَاِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَآءَ رَحْمَةٍ مِّنْ
رَّبِّكَ تَرْجُوْهَا فَقُلْ لَّهُمْ قَوْلًا مَّيْسُوْرًا
وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا
تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا
اِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ
اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًا بَصِيْرًا وَلَا تَقْتُلُوْا
اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ
وَاِيَّاكُمْ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا
وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّ

خرچ شیاطین کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے آقا کا
بڑا ہی ناشکر گذار ہے اگر اپنے پروردگار کے فضل
کے انتظار میں جس کی تجھکو امید ہو ان مستحقین میں سے
کسی سے تجھکو منہ موڑنا پڑے تو ان کو نرمی سے سمجھا
دے، اور اپنا ہاتھ نہ اتنا سکیڑ لے کہ گویا گردن میں
بندھا ہے اور نہ اتنا پھیلا ہی دے کہ ہر طرف سے تجھکو
لوگ ملامت کریں اور تو تہی دست ہو جائے تیرا رب
جس کی روزی چاہتا ہے بڑھا دیتا ہے جس کی چاہتا
ہے کم کر دیتا ہے وہ اپنے بندوں کے حال سے خوب

سَاءَ سَبِيلًا وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ
اللّٰهُ إِلَّا بِالْحَقِّ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُومًا
فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهِ سُلْطَانًا فَلَا يُسْرِفْ
فِي الْقَتْلِ إِنَّهُ كَانَ مَنْصُورًا وَلَا تَقْرَبُوا
مَالَ الْيَتِيمِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ حَتَّى يَبْلُغَ
أَشُدَّهُ وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ
كَانَ مَسْئُولًا وَأَوْفُوا الْكَيْلَ إِذَا كِلْتُمْ
وَزِنُوا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيمِ ذَٰلِكَ
خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ
لَكَ بِهِ عِلْمٌ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَ
الْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا
وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا إِنَّكَ لَنْ
تَخْرِقَ الْأَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ
طُولًا كُلُّ ذَٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهُ عِنْدَ رَبِّكَ
مَكْرُوهًا ذَٰلِكَ مِمَّا أَوْحَىٰ إِلَيْكَ
رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ الآیۃ (رکوع ۲-۳-۴)

واقف ہے اور تم افلاس کے ڈر سے اپنے بچوں کو قتل
نہ کرو ہم ہی ان کو اور تم کو دونوں کو روزی دیتے
ہیں ان کا قتل کرنا بڑا ہی جرم ہے اور زنا کے پاس بھی
نہ جانا کہ وہ بے حیائی ہے اور بری راہ ہے اور جس جان کا
مارنا اللہ نے حرام کیا ہے اس کو ناحق قتل نہ کرو اور
جو شخص ظلم سے مارا جائے تو اس کے ولی وارث کو
قصاص کا حق ہم نے دیا ہے تو چاہیئے کہ وہ اس
خون میں زیادتی نہ کرے کیونکہ اس میں اس کی جیت
ہے اور یتیم جب تک اپنی عقل وشعور اور جوانی کو پہنچ
ے اس کے مال وجائداد کے قریب بھی نہ جانا لیکن
اس طریقے سے جا سکتے ہو جو ان کے حق میں بہتر ہو عہد کو
پورا کیا کرو اس کی بازپرس ہوگی اور جب ناپ کر دو
تو پورا ناپ کرو اور جب تول کر دو تو سیدھی ترازو
سے تول کر دو یہ طریقہ اچھا ہے اور اس کا انجام بھی
بہتر ہے اور جس بات کا تجھ کو علم نہ ہو اس کے پیچھے
نہ ہو لے، کیونکہ کان، آنکھ، دل سب سے مواخذہ
ہوگا اور زمین میں اکڑ کر نہ چل کہ تو اس چال سے نہ زمین کو شق کر ڈالے گا اور نہ پہاڑوں کے برابر
اونچا ہو جائے گا۔ ان تمام باتوں کی برائی تیرے پروردگار کے نزدیک ناپسندیدہ ہے۔ یہ تمام احکام
دانشمندی کی ان باتوں میں سے ہیں جو خدا نے تیری طرف وحی کی ہے''۔

اوپر آیات کا جو سلسلہ ہم نے نقل کیا ہے اس پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس میں خطاب کی گونا گون تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ کہیں پیغمبر سے خطاب ہے تو کہیں عام لوگوں سے۔ ان آیات میں ذرا امعان نظر سے کام لیں گے تو خطاب سے متعلق ایک زبردست اصول ہاتھ آئے گا۔ وہ یہ کہ بعض اوقات قرآن مجید ایک بات عام لوگوں سے بواسطہ نبی بحیثیت اس کے کہتا ہے کہ وہ سب کا امام و قائد ہے۔ اس صورت میں ایک ہی سلسلہ کلام میں تبدیلی خطاب کا ہونا لازم ہے۔

پھر سورۂ احزاب کی ابتدائی آیات بغور پڑھیے۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللَّهَ وَلَا تُطِعِ الْكَافِرِينَ وَالْمُنَافِقِينَ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا وَاتَّبِعْ ... مَا يُوحَىٰ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا۔

اے نبی! تقویٰ اختیار کرو اور کافروں اور منافقوں کی باتوں پر کان نہ دھرو اللہ (سب کے احوال سے) واقف ہے اور حکمت والا ہے اور جو کچھ تمہارے پروردگار کی جانب سے وحی کی جاتی ہے اس کی پیروی کرو بیشک خدا تمہارے اعمال سے اچھی طرح واقف ہے۔

ایک دوسری جگہ یوں ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَطَلِّقُوهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَأَحْصُوا الْعِدَّةَ وَاتَّقُوا اللَّهَ رَبَّكُمْ لَا تُخْرِجُوهُنَّ مِن بُيُوتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ۔ (الطلاق: ۱)

اے نبی جب تم عورتوں کو طلاق دو تو انھیں عدت کے شروع میں طلاق دو اور عدت کا شمار کرو اور اللہ سے جو تمہارا پروردگار ہے ڈرتے رہو تم انھیں ان کے گھروں سے نہ نکالو اور نہ وہ خود ہی نکل جائیں

سورۂ ہود میں ہے۔

فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ وَمَن تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا إِنَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ وَلَا

پس تم اور جو لوگ توبہ کرکے تمہارے ساتھ ہوگئے ہیں (دین پر) قائم رہو اور حد اعتدال سے نہ بڑھو۔

| | |
|---|---|
| تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ | خدا کی آنکھیں تمہارے اعمال کو اچھی طرح مشاہدہ کررہی |
| وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا | ہیں؛ اور ان لوگوں کی طرف جنہوں نے ظلم کیا ہے نہ جھکنا |
| تُنْصَرُوْنَ - (رکوع ۱۰) | کہ آگ تم کو آلگے حال یہ ہے کہ خدا کے سوا تمہارا کوئی |
| | مددگار نہیں پھر تم بے یار و مددگار کے ہو گے۔ |

دیکھیے ان سب آیات میں خطاب کی ابتدا نبیؐ سے کی گئی ہے لیکن مراد پوری امت ہے اسی لیے تعدد میں خطاب جمع کے صیغہ سے لایا گیا ہے اس قسم کی بے شمار آیات قرآن پاک میں ہیں لیکن خوف طوالت کی بنا پر چند ہی پر ہم نے اکتفا کیا ہے۔

سورۂ نحل میں ہے۔

| | |
|---|---|
| وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ | اے نبی ہم نے تم سے پہلے تمہاری ہی طرح کے آدمی پیغمبر بنا کر |
| اِلَيْهِمْ فَاسْــَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ | بھیجے تھے دلائل اور صحائف کے ساتھ ان کی طرف |
| بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ | وحی بھیجتے تھے تو اگر تمہیں نہیں معلوم تو اہل کتاب سے |
| لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ | پوچھ لو اور اسی طرح تم پر بھی یہ قرآن ہم نے نازل |
| يَتَفَكَّرُوْنَ (رکوع ۶) | کیا ہے تاکہ جو پیام لوگوں کی طرف بھیجا گیا ہے اس کی |
| | شرح کر دو۔ اور تاکہ وہ بھی سوچیں۔ |

یہ آیات ایک ہی سلسلۂ کلام کی ہیں لیکن ملاحظہ ہو ان میں خطاب کی کیسی تبدیلی ہوتی ہے پہلے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب (من قبلک) التفات ہے۔ پھر عام لوگوں کی طرف (فَاسْــَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ) ہے اس کے بعد پھر آپ ہی کی جانب (وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ) التفات ہے۔

خطاب سے متعلق اب تک جو کچھ کہا گیا، اس سے محض یہ دکھلانا مقصود ہے کہ ایک ہی سلسلہ کلام میں

تبدیل خطاب ہوتی ہے۔ لیکن یاد رہے کہ یہ تبدیلی کلام کے حسن پر کچھ بھی اثر انداز نہیں ہوا کرتی بلکہ اس سے کلام کا حسن اور دوبالا ہوجاتا ہے۔ اس مقام پر تبدیلی خطاب کے فوائد بیان کرنے کی گنجائش نہیں اس لیے ہم اسے نظرانداز کرکے اپنے اس دعوے کے اثبات میں دلائل لائیں گے کہ قرآن پاک میں بے شمار آیات دخل مقدر کے جواب میں واقع ہیں۔ اور نہ معلوم کتنی آیات میں ایسے شبہات واوہام رفع کیے گئے ہیں جو قرآن میں مذکور تک نہیں ہیں پہلے ہم وہ آیات نقل کرتے ہیں جن میں لوگوں کے ایسے اوہام باطلہ کا رد کیا گیا ہے جن کا قرآن میں تذکرہ تک نہیں ہے۔

سورۂ اعراف میں ہے۔

(۱) وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوسَىٰ مِنْ بَعْدِهِ مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَهُ خُوَارٌ أَلَمْ يَرَوْا أَنَّهُ لَا يُكَلِّمُهُمْ وَلَا يَهْدِيهِمْ سَبِيلًا اتَّخَذُوهُ وَكَانُوا ظَالِمِينَ وَلَمَّا سُقِطَ فِي أَيْدِيهِمْ وَرَأَوْا أَنَّهُمْ قَدْ ضَلُّوا قَالُوا لَئِنْ لَمْ يَرْحَمْنَا رَبُّنَا وَيَغْفِرْ لَنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ وَلَمَّا رَجَعَ مُوسَىٰ إِلَىٰ قَوْمِهِ غَضْبَانَ أَسِفًا قَالَ بِئْسَمَا خَلَفْتُمُونِي مِنْ بَعْدِي أَعَجِلْتُمْ أَمْرَ رَبِّكُمْ وَأَلْقَى الْأَلْوَاحَ وَأَخَذَ بِرَأْسِ أَخِيهِ يَجُرُّهُ إِلَيْهِ قَالَ ابْنَ أُمَّ إِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُونِي وَكَادُوا يَقْتُلُونَنِي فَلَا تُشْمِتْ بِيَ الْأَعْدَاءَ

اور موسیٰ کے پیچھے ان کی قوم کے لوگوں نے اپنے زیور کا ایک بچھڑا بنا کھڑا کیا کہ وہ ایک جسم تھا جس میں (بیل کی سی) آواز تھی، اتنا بھی نہ سوچا کہ وہ ان سے کچھ کہہ بھی تو نہیں سکتا، اور نہ ان کو راستہ ہی دکھا سکتا ہے اس کی پرستش میں لگ گئے حالانکہ وہ اپنے اوپر ظلم ڈھا رہے تھے اور جب ان کا کیا ان کے سامنے آیا اور اپنے کو انہوں نے بھٹکا ہوا پایا تو کہنے لگے اگر ہمارا پروردگار ہم پر رحم نہ کرے گا اور ہمارے قصور نہ معاف کرے گا تو ہم یقیناً خاسرین میں سے ثابت ہوں گے اور جب موسیٰ غصہ اور رنج میں بھرا ہوا اپنی قوم کے پاس لوٹ کر آیا تو بولے میرے پیچھے میری غیبت میں تم نے بہت بری حرکت کی،

ولا تجعلنی مع القوم الظالمین۔ کیا تم اپنے پروردگار کے حکم کے منتظر نہ رہکر جلدی کر بیٹھے اور الواح مقدس کو ڈالدیا اور اپنے بھائی (رکوع ۱۸)
کے سر کو پکڑ کر ان کو اپنی طرف کھینچنے لگا۔ اس پر ہارون نے کہا ماں جائے بھائی لوگوں نے مجھکو بے حقیقت سمجھا اور قریب تھا کہ مجھکو ہلاک کر ڈالیں تو دشمنوں کو مجھ پر ہنسنے کا موقع نہ دے، اور مجھکو ظالم لوگوں کے ساتھ مت سان ۔"

مذکورہ بالا آیات میں بیان واقعہ کے ساتھ ساتھ خط کشیدہ الفاظ سے یہودیوں کے اس زعم باطل کی تردید مقصود ہے جو انہوں نے حضرت ہارون کی جانب منسوب کر دیا چنانچہ تورات میں ہے:

اور جب لوگوں نے دیکھا کہ موسیٰ پہاڑ پر سے اترنے میں دیری کرتا ہے تو وہ ہارون کے پاس جمع ہوئے اور اس سے کہا کہ اٹھ ہمارے لیے معبود بنا کہ ہمارے آگے چلیں کیونکہ یہ مرد موسیٰ جو ہمیں مصر کے ملک سے نکال لایا ہم نہیں جانتے کہ اسے کیا ہوا ہارون نے انھیں کہا کہ زیور سونے کے جو تمہاری جوروؤں اور تمہاری بیٹیوں کے کانوں میں ہیں توڑ توڑ کے ہارون کے پاس لائیں اور اس نے ان کے ہاتھوں سے لیا اور ایک بچھڑا ڈھال کر اس کی صورت نکاکی کے ہتیار سے درست کی اور انہوں نے کہا اے اسرائیل یہ تمہارا معبود ہے جو تمہیں مصر کے ملک سے نکال لایا اور جب ہارون نے یہ دیکھا تو اس کے آگے ایک قربان گاہ بنائی اور ہارون نے یہ کہہ کے منادی کی کہ کل خداوند کے لیے عید ہے۔ (خروج باب ۳۲)۔

دیکھیے توراۃ کی مذکورہ بالا آیات کے خط کشیدہ الفاظ میں یہودیوں کی جس حماقت کا قرآن پاک نے جواب دیا ہے اس کا تذکرہ تک قرآن میں نہیں ہے، لیکن حضرت ہارون کی طرف نسبت شرک کا بڑی خوبی کے ساتھ رد کر دیا ہے۔

سورۂ تحریم میں ہے۔

وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرَانَ الَّتِي أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا الآية (رکوع) اور عمران کی بیٹی مریم جس نے اپنی عصمت محفوظ رکھی۔

اس آیت میں احصنت فرجہا کی قید لگا کر قرآن پاک نے حضرت مریم کی عصمت و عفت کی طرف اشارہ کر دیا اور اہل کتاب نے ان کی جانب جو کذب و افترا منسوب کیا تھا اس کے تمام پردوں کو چاک کر کے اصل حقیقت ظاہر کر دی۔ اس باب میں انہوں نے جو جعلسازیاں کی ہیں اُن کی تفصیل معلوم کرنے کے لیے انجیل کا پہلا باب پڑھنا چاہیے۔

سورۂ طٰہٰ میں ہے۔

وَاضْمُمْ يَدَكَ إِلَىٰ جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَيْضَاءَ مِنْ غَيْرِ سُوءٍ آيَةً أُخْرَىٰ (رکوع) اور اپنے ہاتھ کو سکیڑ کر اپنے بدن میں رکھ لو تو بدُن اس کے کہ کسی طرح کا روگ ہو سفید نکلے گا۔ دوسرا معجزہ ہے۔

اس آیت میں خط کشیدہ الفاظ سے یہودیوں کے ایک وہم کی تردید مقصود ہے، توراۃ میں ہے

"پھر خداوند نے اسے کہا کہ تو اپنا ہاتھ اپنی چھاتی پر چھپا کے رکھ چنانچہ اس نے اپنا ہاتھ اپنی چھاتی پر چھپا کے رکھا اور جب اس نے اسے نکالا تو دیکھا کہ اس کا ہاتھ برف کی مانند سفید مبروص تھا۔" (خروج باب ۴)

سورۂ ق میں ہے۔

(۴) وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ وَمَا مَسَّنَا مِنْ لُغُوبٍ (رکوع ۳) اور ہم نے آسمان اور زمین کو اور جو کچھ اس کے درمیان ہے چھ دن میں پیدا کیا اور ہمیں تکان چھو تک نہیں گئی۔

اس آیت میں بھی خط کشیدہ الفاظ سے خدا نے یہودیوں کے ایک زعم باطل کی تردید کی ہے۔

وہ یہ کہ یہودیوں کا خیال تھا کہ خدا کو آسمان و زمین کی تخلیق سے تکان لاحق ہو گئی تھی چنانچہ ساتویں دن اس نے آرام کیا تفصیل معلوم کرنے کے لیے توراۃ کی کتاب پیدائش کے باب دوم کی طرف مراجعت کرنی چاہیے۔

اب تک ہم نے اپنے اس دعوے کے اثبات میں (کہ قرآن پاک میں بے شمار آیات دخل مقدر کے جواب میں واقع ہیں) ایسی آیات نقل کی ہیں جن میں قرآن پاک نے بحیثیت کتب سابقہ کے مہیمن ہونے کے ان کے شبہات و اوہام کا جواب دیا ہے اور جن کا تذکرہ تک قرآن میں نہیں ہے۔ اب ہم وہ آیات نقل کرتے ہیں جو ایسے دخل مقدر کے جواب میں واقع ہیں جو قرآن میں کہیں نہ کہیں مذکور بھی ہے۔

سورۂ لقمان میں ہے۔

| | |
|---|---|
| إِنَّ اللَّهَ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَاذَا تَكْسِبُ غَدًا وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ (لقمان) | بیشک خدا کو قیامت کا علم ہے اور وہی پانی برساتا ہے اور اسے یہ بھی خبر ہے کہ رحموں میں کیا ہے حالانکہ (انسانوں میں سے) کسی کو اس کی خبر نہیں کہ کل کیا کمائے گا اور کسی کو یہ بھی علم نہیں کہ کونسی زمین میں مرے گا یقیناً خدا علیم و خبیر ہے |

مذکورۂ بالا آیت پر غور کریں گے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ آیت کسی نہ کسی دخل مقدر کے جواب میں واقع ہے۔ ہماری دانست میں اس کا دخل مقدر یہ سوال ہے اور یہ ایک ہی جگہ قرآن پاک میں نہیں مذکور ہے بلکہ متعدد جگہ ہے۔

| | |
|---|---|
| وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَٰذَا الْوَعْدُ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ (الانبیاء: ۳) | وہ کہتے ہیں اس وعدہ (قیامت) کا ایفا کب ہے اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو۔ |

یہی آیت بار بار سورۂ یٰسین (رکوع ۳) سبا (رکوع ۳) نمل (۶) اور ملک (۲) میں دہرائی گئی ہے یہ دخل مقدر جن جن صورتوں میں آیا ہے ہر ایک میں کوئی نہ کوئی مناسب حال جواب دیا گیا ہے

لیکن اس کا جو جواب سورۂ لقمان میں مذکور ہے تقریباً وہی سورہ ملک میں بھی ہے۔

| | |
|---|---|
| قُلْ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰہِ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ (رکوع ۲) | کہدے (اس کا) علم تو خدا ہی کو ہے اور میں تو صرف نذیر ہوں۔ |

الشوریٰ میں ہے۔

| | |
|---|---|
| (۲) وَمَا کَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّکَلِّمَہُ اللّٰہُ اِلَّا وَحْیًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ یُرْسِلَ رَسُوْلًا فَیُوْحِیَ بِاِذْنِہٖ مَا یَشَآءُ اِنَّہٗ عَلِیٌّ حَکِیْمٌ۔ (رکوع ۵) | اور کسی کو یہ مجاز نہیں کہ خدا اس سے مکالمہ کرے مگر یہ کہ یا تو وحی کے واسطے سے یا پردہ کی اوٹ سے یا یہ کہ (اس کے پاس) رسول (فرشتہ) بھیج کریں وہ خدا کے اذن سے جو وہ چاہتا ہے وحی کرتا ہے ضرور وہ بہت ہی بلند اور حکمت والا ہے۔ |

مذکورہ بالا آیت اس دخل مقدر کے جواب میں واقع ہے۔

| | |
|---|---|
| وَقَالَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ لَوْلَا یُکَلِّمُنَا اللّٰہُ اَوْ تَاْتِیْنَآ اٰیَۃٌ۔ الآیۃ (البقرۃ:۱۴) | اور وہ لوگ جو نہیں جانتے کہتے ہیں کہ کیوں نہیں خدا ہم سے باتیں کرتا یا کیوں نہیں ہمارے پاس کوئی معجزہ آتا۔ |

سورۂ بقرہ میں ہے۔

| | |
|---|---|
| اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰی وَالصّٰبِئِیْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَھُمْ اَجْرُھُمْ عِنْدَ رَبِّھِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ۔ (رکوع ۸) | بے شک مسلمان یہودی نصاریٰ اور صابی میں سے جس نے یقین کیا خدا اور آخرت کا اور عمل صالح کیا ان کے لیے خدا کے یہاں اجر ہے اور نہ ان کو ڈر ہے اور نہ کسی طرح کا غم۔ |

مذکورہ بالا آیت اہل کتاب کے زعم باطل کی تردید میں واقع ہے اور وہ یہ ہے:-

| | |
|---|---|
| وَقَالُوا لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا | وہ کہتے ہیں نہیں داخل ہوگا جنت میں مگر وہ جو کہ یہودی |
| اَوْ نَصَارٰى تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ قُلْ هَاتُوْا | ہو یا نصرانی یہ ان کے اوہام ہیں کہدے ذرا اپنے اس |
| بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۔ (بقرہ ۱۳) | دعوے پر دلیل تو لاویں۔ |
| وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ | اور یہود و نصاریٰ کہتے ہیں ہم خدا کے بیٹے اور اسکے |
| اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ الاٰیۃ (المائدہ ۳) | محبوب نظر ہیں۔ |

سورۂ انعام میں ہے۔

| | |
|---|---|
| (۴) وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا فِيْ قِرْطَاسٍ | اور اگر تم پر ہم کوئی کاغذ پر لکھا ہوا صحیفہ اتارتے اور |
| فَلَمَسُوْهُ بِاَيْدِيْهِمْ لَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا | یہ لوگ اپنے ہاتھوں سے اسے چھو بھی لیتے تو یہ لوگ |
| اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ۔ (الانعام ۱) | (کفار و معاندین) کہتے کہ یہ تو سحر ہے۔ |

مذکورۂ بالا آیت کا یہ دخل مقدر ہے۔

| | |
|---|---|
| وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ | اور وہ کہتے ہیں کیوں نہیں اس پر کوئی نشان |
| قُلْ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يُّنَزِّلَ اٰيَةً | اتارا جاتا کہدے خدا نشان اتارنے پر قادر ہے |
| وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ (الانعام ۴) | لیکن اکثر لوگ سمجھتے نہیں۔ |

سورۂ طور میں ہے۔

| | |
|---|---|
| (۵) وَاِنْ يَّرَوْا كِسْفًا مِّنَ السَّمَآءِ سَاقِطًا | اور اگر وہ آسمان سے کوئی بادل کا ٹکڑا گرتے ہوئے |
| يَّقُوْلُوْا سَحَابٌ مَّرْكُوْمٌ۔ (رکوع ۲) | دیکھیں تو کہیں گے یہ تو منجمد بادل ہے۔ |

مذکورۂ بالا آیت اس دخل مقدر کے جواب میں واقع ہے۔

| | |
|---|---|
| اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا | یا یہ کہ آسمان سے کوئی بادل کا ٹکڑا گرادو اگر تم اپنے |
| كِسَفًا (۹۲ بنی اسرائیل) | دعوے (رسالت) میں سچے ہو۔ |

ہم نے دخل مقدر کے متعلق جتنی آیات نقل کی ہیں انھیں دو قسموں میں بانٹا جا سکتا ہے ایک وہ جن کا دخل مقدر قرآن پاک میں سرے سے مذکور ہی نہیں بلکہ قرائن اور کتب سابقہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے۔ اور دوسرے وہ جن کا دخل مقدر قرآن میں مذکور ہے لیکن ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ ہم نے مانا کہ مذکورۂ بالا آیات میں سے بعض تو ایسے اعتراض کے جواب میں واقع ہیں جو قرآن پاک میں مذکور تک نہیں اور بعض کے دخل مقدر مذکور ہیں لیکن اس سے یہ کہاں ثابت ہو گیا کہ آیات "مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكُونَ لَهُ أَسْرَىٰ حَتَّىٰ يُثْخِنَ فِي الْأَرْضِ تُرِيدُونَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللَّهُ يُرِيدُ الْآخِرَةَ ۔ لَوْلَا كِتَابٌ مِنَ اللَّهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيمَا أَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ" بھی دخل مقدر کے جواب میں واقع ہیں جب کہ بظاہر یہاں کوئی قرینہ نہیں ہے۔ لیکن ہمیں یقین ہے کہ آیات مستفسر عنہا میں جو دخل مقدر ہم نے ٹھیرایا ہے اس کی تائید قرائن اور نظام سورہ سے بھی ہوتی ہے اس کے لیے زیر بحث آیات کی سورہ پر ان نہجوں سے غور کرنا چاہیے۔ (باقی)۔

## التعلیق الصبیح علیٰ مشکوٰۃ المصابیح۔

تالیف جناب مولانا محمد ادریس صاحب کاندہلوی۔ مشکوٰۃ شریف علم حدیث کی مشہور مستند کتابوں میں سے ہے جس میں صحاح ستہ اور دوسری معتبر کتب حدیث کا عطر نکال کر رکھ دیا گیا ہے۔ فاضل مؤلف نے عربی زبان میں اس کی شرح لکھی ہے جس کے متعلق مولانا انور شاہ صاحب مرحوم و مغفور جیسے علامہ اجل کی شہادت ہے کہ اب تک اس کتاب کی اس سے بہتر شرح نہیں لکھی گئی۔ اس میں پچھلی تمام شرحوں کی خوبیاں جمع کر دی گئی ہیں اور ان پر حسب ذیل خصوصیات کا اضافہ کیا گیا ہے:۔ ۱۔ اسرار شریعت و حقائق و معارف اسلامیہ کے بیان کی طرف خاص توجہ کی ہے۔ ۲۔ ہر باب کی ابتدا میں اس کے مضمون کے لحاظ سے تمام آیات قرآنیہ جمع کر دی گئی ہیں تاکہ حدیث اور قرآن کے درمیان مطابقت واضح ہو جائے۔ ۳۔ صحابہ و تابعین کے مذہب مفصل بیان کیے گئے ہیں اور اختلافی مسائل میں ائمہ اربعہ کے مذاہب پر مفصل بحث کی گئی ہے۔ یہ کتاب فاضل مؤلف نے خود دمشق جا کر چھپوائی ہے۔ کاغذ اور طباعت بہترین ہے چار جلدیں طبع ہو چکی ہیں۔ دو جلدیں عنقریب چھپ کر آنے والی ہیں قیمت سے کلدار عہ عالی علاوہ محصولڈاک دفتر ترجمان القرآن سے طلب فرمائیے

# مطبوعات

**Muslim Thought And Its Source** تالیف جناب سید مظفرالدین صاحب ندوی ایم اے پروفیسر اسلامیہ کالج کلکتہ۔ ضخامت ۱۶۸ صفحات۔ قیمت عہ۔ ملنے کا پتہ:۔ دی گریٹ ایسٹرن لائبریری ۱۵ کالج اسکویر۔ کلکتہ۔

یہ کتاب مغربی مصنفین کے اس دعوے کی تردید میں لکھی گئی ہے کہ مسلمانوں میں فکری نشوونما کی ابتدا یونانی عقلیات کے مطالعہ سے ہوئی اور ان کے تمام معقولات اسی سرچشمے سے ماخوذ تھے۔ مؤلف نے اس ادعائے غلط کا ابطال کرنے کے لیے سب سے پہلے مجملاً یہ ثابت کیا ہے کہ مسلمانوں کو غور و فکر اور تحقیق و تجسس پر ابھارنے والی چیز دراصل حکمت یونان نہیں بلکہ تعلیم قرآن تھی اور اس تعلیم کے اثر سے انہوں نے مسائل حکمت پر اُس وقت سوچنا شروع کر دیا تھا جب یونانی علوم کے متعلق وہ کچھ بھی نہ جانتے تھے۔ اس اجمال کے بعد مؤلف نے تفصیل کا طریق اختیار کیا ہے۔ ابتدائی فکری حرکت نے رفتہ رفتہ مسلمانوں میں جو راہیں اختیار کیں، ان میں سے وہ چار بڑی بڑی راہوں کا انتخاب کرتے ہیں۔ اعتزال، اشعریت، تصوف اور حکمت یعنی فلسفہ و سائنس۔ پھر ان میں سے ہر ایک پر علیحدہ علیحدہ بحث کرتے ہیں۔ پہلے تین مذاہب کے متعلق انہوں نے ثابت کیا ہے کہ ان کی اصل یونانی نہیں بلکہ خالص اسلامی ہے۔ اگرچہ ان مذاہب کے متبعین نے آگے چلکر یونانی اور عجمی علوم سے استفادہ ضرور کیا، لیکن جن مسائل پر انہوں نے بحث کی وہ سب کے سب قرآن کے مطالعہ سے پیدا ہوئے تھے، اور ان کے استدلال کی بنا بھی قرآن ہی پر قائم تھی۔ رہی آخری چیز تو وہ بلاشبہ دوسری قوموں سے مسلمانوں میں آئی مگر مسلمان محض دوسروں کے مترجم اور شارح نہ تھے، جیسا کہ مغربی مصنفین کا گمان ہے، بلکہ انہوں نے عقلیات اور طبیعیات کا جس قدر ورثہ دوسروں سے پایا اس

بہت زیادہ دوسروں کے لیے چھوڑا۔

یہ تمام مباحث جو اس کتاب میں بیان ہوئے ہیں اردو زبان میں اس سے پہلے بارہا آچکے ہیں مگر انگریزی میں شائد اب تک کسی نے ان کو اتنی تفصیل کے ساتھ پیش نہیں کیا تھا۔ اس لحاظ سے یقیناً مؤلف کی خدمت قابل قدر ہے لیکن ضرورت تھی کہ ان مباحث کو مولانا شبلی اور جسٹس امیر علی اور ان کے عہد کے لوگوں نے جہاں چھوڑا تھا، مؤلف اس مقام سے آگے بڑھتے اور زیادہ گہری نظر سے مسلمانوں کے علوم عقلیہ کا مطالعہ کرکے دنیا کو یہ بتلاتے کہ افکار انسانی کے نشو و ارتقا میں دراصل مسلمانوں کا حصہ کتنا اور کیسا ہے، اور وہ خالص اسلامی عنصر کونسا ہے جس نے فکر و نظر کے ہر گوشہ میں اپنا اثر ظاہر کیا۔ ایک مغربی مصنف ( O'leary ) نے اس موضوع پر ایک کتاب Arabic Thought And Its Place In History کے نام سے لکھی ہے، مگر وہ غریب خود فکر اسلامی سے نا آشنا تھا۔ اس لیے وہ اس موضوع کے ساتھ انصاف نہ کرسکا۔ یہ فرض دراصل مسلمانوں ہی کے ذمہ واجب الادا ہے اور اس سے وہی لوگ اچھی طرح سبکدوش ہوسکتے ہیں جنہوں نے علوم قدیمہ اور علوم جدیدہ دونوں کی تعلیم حاصل کی ہے۔

کتاب میں چند باتیں اصلاح طلب بھی ہیں جن پر امید ہے کہ دوسری اشاعت کے موقع پر نظر ثانی کی جائے گی۔

قرآن مجید میں جس چیز کو لفظ "حکمت" سے تعبیر کیا گیا ہے وہ نہ تو انگریزی لفظ ( Rationalism کی ہم معنی ہے اور نہ ( Free thinking کی۔ انیسویں صدی کے مسلمان مصنفوں نے محض اشتراک لفظی سے فائدہ اٹھا کر قرآن کی حکمت کو حکمت بمعنی جدید سے ملا دینے کی کوشش کی تھی، مگر وہ اس وقت کی بات تھی جب ہماری جدید علمی تحریک اپنے عہد طفولیت سے گذر رہی تھی۔ اب نسبتہً بلوغ کا زمانہ ہے اور ہمارے محققین کے لیے یہ مناسب نہیں کہ اپنے استدلال کی عمارت ایسی کمزور بنیادوں پر اٹھائیں۔

اعتزال کے لیے ( Rationalism ) اور اشعریت کے لیے ( Scholasticism ) کی

اصطلاحیں بھی درست نہیں۔ انگریزی پڑھنے والوں کے ذہن ان اصطلاحوں سے جن مفہومات کی طرف منتقل ہوں گے وہ اعتزال اور اشعریت کی خصوصیات سے بڑی حد تک مختلف ہیں۔ فاضل مؤلف نے اعتزال اور اشعریت کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس سے شبہہ ہوتا ہے کہ انہوں نے خود بھی ان دونوں مذاہب کی حقیقت پر اچھی طرح غور نہیں کیا ہے، اور زیادہ تر مولانا شبلی مرحوم کی کتابوں پر اعتماد کر کے ایک رائے قائم کر لی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان سے نہ صرف اصطلاحوں کے استعمال میں غلطی ہوئی ہے، بلکہ ان کے بیان کا پلڑا ہر جگہ اعتزال کی طرف جھک گیا ہے۔ وہ معتزلہ کو "مسلمان مفکرین کا سب سے زیادہ ریشنلسٹ گروہ" سمجھتے ہیں اور ان کے مقابلہ میں اشعریت کو ایک ارتجاعی (Reactionary) تحریک قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ معاملہ اس سے مختلف ہے۔ اعتزال ہمیشہ خام فلسفیت سے پیدا ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ اسلام کے ابتدائی دور میں جو اعتزال رونما ہوا وہ بھی دراصل خام فلسفیت ہی کا نتیجہ تھا۔ جب تک مسلمانوں میں عقلیات کا مطالعہ محض سطحی رہا اور تنقید کا مادہ پیدا نہ ہوا اس وقت تک علم کلام میں اعتزال کا اور فلسفہ و طبیعیات میں حکمائے یونان کے مرعوبیت کا دور دورہ رہا۔ مگر جب چوتھی اور پانچویں صدی میں بلوغ کا عہد آیا اور زیادہ گہری نظر رکھنے والے مفکرین پیدا ہوئے تو انہوں نے کلام اور فلسفہ او منطق پر تنقید شروع کر دی اور ایک ایک کر کے ان غلطیوں کے پردے چاک کرنے شروع کر دیئے جو ابتدائی دور کے متکلمین اور حکما نے کی تھیں۔ اشعریت اس دور تنقید کی محض ایک ابتدائی چیز تھی اس لیئے خام نظر آتی ہے۔ آگے چلکر امام غزالی، امام رازی، علامہ ابن تیمیہ اور دوسرے لوگوں نے جب عقلیات اسلامی کو کمال پر پہونچایا تو اعتزال طبیعی موت مرگیا اور اشعریت کی صورت بدل کر کچھ سے کچھ ہو گئی۔

مؤلف نے ایک طرف تو اعتزال کو "ریشنلزم" کا ہم معنی قرار دیا ہے، اور دوسری طرف یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ "ریشنلزم" کی روح خود صحابہ اور تابعین کے گروہ میں پیدا ہو چکی تھی۔ اس سے ایک شخص یہ دھوکا کھا سکتا ہے کہ صحابۂ کرام اور تابعین میں بھی کچھ لوگ اعتزال کی طرف میلان رکھتے تھے، حالانکہ

یہ بالکل غلط ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ کے متعلق مؤلف نے وثوق کے ساتھ لکھدیا ہے کہ وہ معراج جسمانی کی قائل نہیں حالانکہ یہ کسی معتبر روایت سے ثابت نہیں۔ ابن ہشام نے اس روایت کو محمد بن اسحاق سے لیا ہے اور محمد بن اسحاق نے اپنے ذریعۂ علم کی تصریح نہیں کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مجھ سے خاندان ابوبکر کے کسی شخص نے ایسا کہا تھا۔ مگر ان کا زمانہ حضرت عائشہ سے اس قدر بعید ہے کہ خاندان ابوبکر کے جس شخص نے بھی ان سے یہ روایت بیان کی ہوگی وہ بہرحال ایسا شخص نہ ہوگا جس نے ام المومنین کی صحبت پائی ہو۔ لہٰذا اس کے اور حضرت عائشہ کے درمیان ایک واسطہ اور چھوٹ جاتا ہے۔ پس یہ روایت ایسی ہے جس کا ایک راوی بیچ سے غائب ہے، اور ایک راوی مجہول ہے۔ کیا ایسی کمزور روایت کی بنا پر وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ام المومنین کا یہی مسلک تھا؟ یہ دراصل انیسویں صدی کے معتزلہ کی خصوصیت تھی کہ وہ اپنے مسلک کی تائید میں ہر چھوٹے سے چھوٹے تنکے کا سہارا ڈھونڈتے تھے۔ چنانچہ جب انہوں نے معراج کے متعلق اپنا نظریہ پیش کیا تو یہ روایت ان کے ہاتھ لگی اور انہوں نے بہت غنیمت سمجھ کر اس کو لے لیا۔ مگر جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں، وہ طفولیت کا زمانہ تھا، بچپن کی باتیں اس وقت بنہ جاتی تھیں۔ اب اس دور بلوغ میں ارباب تحقیق کو زیب نہیں دیتا کہ ایسے کمزور سہاروں پر استدلال کی بنیاد اٹھائیں۔

**قانون بین الممالک** - تالیف مولوی محمد حمید اللہ صاحب استاذ جامعۂ عثمانیہ۔ ضخامت ۲۰۰ صفحات۔ قیمت عہ ۴ر ۔ ملنے کا پتہ: مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن۔

یہ کتاب بین الاقوامی قانون یا باصطلاح مؤلف "قانون بین الممالک" پر درسی اغراض کے لیے لکھی گئی ہے۔ مؤلف کا یہ خیال صحیح نہیں کہ اردو کے لیے یہ موضوع بالکل نیا ہے۔ اس سے پہلے بھی ایک شخص بین الاقوامی قانون کے شعبۂ جنگ پر تفصیل کے ساتھ لکھ چکا ہے۔

ہم کو سب سے زیادہ خوشی یہ دیکھ کر ہوی کہ مولف نے اُن توقعات کو پورا کیا ہے جو ایک مسلمان محقق سے وابستہ ہوتی ہیں۔ اہل یورپ نے بین الاقوامی تعلقات کی تہذیب کا سبق مسلمانوں سے حاصل کیا اور ایک نہایت ترقی یافتہ بین الاقوامی قانون مرتب صورت میں ان سے پایا مگر ان کی احسان فراموشی نے اتنی بھی اجازت نہ دی کہ وہ بین الاقوامی تعلقات کے نشو و نما کی تاریخ میں کہیں مسلمانوں کے حصہ کا اشارۃً اعتراف کرتے۔ اب یہ کام ایک مسلمان مصنف ہی کا ہو سکتا تھا کہ وہ اس موضوع پر کچھ لکھتے وقت اسلامی قوانین کو فراموش نہ کرتا۔ چنانچہ ہمیں مسرت ہے کہ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے اپنی کتاب میں اس حقیقت کو اچھی طرح ظاہر کر دیا کہ موجودہ قانون بین الاقوام کے اصلی بانی مسلمان ہیں نہ کہ اہل یورپ، اور یہ کہ مسلمانوں کے پاس بین الاقوامی تعلقات کا ایک مکمل ضابطہ اس وقت موجود تھا جب یورپ میں اس کا تصور بھی پیدا نہ ہوا تھا۔

ایک بات خصوصیت کے ساتھ ہماری نظر میں کھٹکی اور وہ یہ ہے کہ مؤلف نے وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ کا ترجمہ "اور رام راج قائم ہو" کیا ہے۔ کیا "رام" لفظ اللہ کا ترجمہ ہے اور ایک مسلمان یہ ترجمہ کر سکتا ہے؟ اردو کو ہندی سے ملانے کی تحریک سیاسی حیثیت سے خواہ کتنی ہی مناسب ہو مگر اس کو اتنا نہ پھیلائیے کہ خدا اور اللہ کی جگہ "رام" لے لے۔

کتاب میں حیدرآباد کی بین الاقوامی حیثیت پر جو بحث کی گئی ہے وہ بڑی حد تک بے جوڑ محسوس ہوتی ہے۔ بین الاقوامی قانون اس سے بحث نہیں کرتا کہ فلاں ملک کی پوزیشن کیا ہونی چاہیے تھی۔ بلکہ وہ صرف اس امر سے بحث کرتا ہے کہ بین الاقوامی تعلقات میں اس کی پوزیشن فی الواقع کیا ہے۔ مؤلف نے اس بحث میں پڑ کر اپنے حب وطن کا ثبوت تو ضرور دیا ہے، مگر جس فن پر وہ کلام کر رہے ہیں اس کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔

ابن مریم | تالیف جناب خان بہادر حاجی رحیم بخش صاحب ایم اے پنشنر سشن جج۔ ۲۔ فرید کوٹ لاہور۔ ضخامت ۱۶۸ صفحات، قیمت ۸؍ مؤلف سے اوپر کے پتے پر مل سکتی ہے۔

فاضل مؤلف نے اس سوال پر بحث کی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش اور ان کی حیات وممات اور ان کے معجزات کے متعلق جو کچھ قرآن مجید میں بیان ہوا ہے اس کا صحیح مفہوم کیا ہے۔ اس بحث میں انہوں نے قرآن سے باہر کی کسی چیز سے مدد نہیں لی ہے بلکہ صرف قرآن ہی کے الفاظ اور ان کے سیاق وسباق اور آیات کے نظم سے متنازع فیہ آیات کے معانی متعین کیئے ہیں۔ بحث بہت دلچسپ ہے اور ایک اچھے تربیت یافتہ قانونی دماغ سے جس سلجھے ہوئے طرز بیان و انداز استدلال کی ہم توقع رکھتے ہیں وہی اس میں ابتداء سے انتہا تک نمایاں نظر آتا ہے۔ کتاب کی ابتدا میں مولف نے تفسیر و تاویل کے اصول پر بھی کلام کیا ہے جو اگرچہ مختصر ہے مگر فائدے سے خالی نہیں۔

حروف مقطعات کے اشارات وکنایات | تالیف جناب خان بہادر حاجی رحیم بخش صاحب ضخامت ۹۶ صفحات۔ قیمت ۶؍ مؤلف سے مذکورۂ بالا پتہ پر مل سکتی ہے۔

حروف مقطعات کا مسئلہ مفسرین قرآن کے لیے ہمیشہ سے ایک لاینحل مسئلہ رہا ہے۔ خدا اور رسول نے ان کی کوئی تاویل ہم کو نہیں بتائی اور خود ہم اپنی عقل سے اگر کوئی تاویل کریں تو ہمارے پاس یہ اطمینان کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں کہ ہماری تاویل صحیح ہے۔ اسی بنا پر جمہور نے سکوت ہی مناسب سمجھا ہے لیکن بعض مفسرین نے تاویل کی کوشش بھی کی ہے اور اس میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ تاویل کرنے والا اپنی تاویل کی یقینی صحت کا دعویٰ نہ کرے۔

حاجی رحیم بخش صاحب نے اس مختصر میں حروف مقطعات سے معنی نکالنے کا ایک عجیب طریقہ اختیار کیا ہے۔ وہ عربی حروف تہجی کی ترتیب کے اعتبار سے حروف کے اعداد معین کرتے ہیں۔ مثلاً ص چودہواں حرف ہے اس لیے اس کا عدد ۱۴ ہے اور ق اکیسواں حرف ہے اس لئے اس کا عدد ۲۱ ہے۔ پھر جس سورۃ میں مثلاً حرف ص آیا ہے اس کے مضمون پر وہ نگاہ ڈالتے ہیں تو اس میں ایک مخالف اسلام گروہ کے شکست کھانے کی پیشین گوئی ملتی ہے (جُنْدٌ مَّا هُنَالِكَ مَهْزُومٌ) اس کے بعد وہ تاریخ پر نظر ڈالتے

ہیں تو یہ واقعہ ملتا ہے کہ بعثت کے چودہویں سال جنگ بدر پیش آئی جس میں کفار کو شکست نصیب ہوئی۔ ان دونوں حقیقتوں کے درمیان ربط پیدا کر کے وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ سورہ کی ابتدا میں حروف تہجی کے چودہویں حرف یعنی ص کا ذکر کر کے اللہ تعالیٰ نے واقعہ بدر کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ یہی اسلوب انہوں نے تمام حروف مقطعات کے بارے میں اختیار کیا ہے اور ان سے آیندہ واقعات کی پیشین گوئیاں نکالی ہیں۔ ممکن ہے کہ قرآن کے بے شمار اعجازی پہلوؤں میں سے یہ بھی ایک پہلو ہو، مگر جیسا کہ مؤلف کو خود اعتراف ہے، یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اللہ تعالیٰ کی مراد حقیقۃً وہی تھی جو مؤلف نے سمجھی ہے۔

**سلسلۂ تعلیم القرآن** تالیف مولوی محمد عماد الدین صاحب انصاری فاضل دیوبند قیمت حصۂ اول ۴ر حصہ دوم ۴ر ملنے کا پتہ: کتب خانہ انصاریہ، بازار شیخاں جالندھر۔

یہ سلسلہ بچوں اور کم سواد لوگوں تک قرآن کی تعلیم پہنچانے کے لیے لکھا گیا ہے۔ ایک خاص ترتیب کے ساتھ قرآن کی آیات جمع کی گئی ہیں جن سے عقائد اور احکام اور اخلاقی تعلیمات پر تفصیلی روشنی پڑتی ہے۔ ہر آیت کے نیچے عام فہم ترجمہ دیا گیا ہے۔ حاشیہ پر مضامین کی تشریح ہے اور کتاب کے آخر میں لغات قرآن کو حروف تہجی کی ترتیب سے مرتب کر کے ان کے معنی درج کر دئے گئے ہیں۔

**گلدستۂ تعلیم اسلام** تالیف مولوی محمد عماد الدین صاحب قیمت: قاعدہ ۱ر حصہ اول ۴ر حصہ دوم ۵ر حصہ سوم ۴ر، حصہ چہارم ۷ر ملنے کا پتہ وہی جو اوپر مذکور ہوا۔

یہ سلسلہ مسلمان بچوں کی تعلیم کے لیے لکھا گیا ہے۔ قاعدہ تو اسی طرز کا ہے جس پر قدیم قاعدے لکھے گئے ہیں بعد کی کتابوں میں اسلامی عقائد، سیرت نبوی، احوال صحابہ اور احکام فقہیہ کو ایک خاص ترتیب اور تدریج کے ساتھ جمع کیا گیا ہے اور اس امر کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ بچہ جتنا جتنا بڑا ہوتا جائے اس کے سامنے دینی معلومات کی اتنی ہی زیادہ تفصیلات آتی جائیں۔ طریق تعلیم اچھا ہے، مگر زبان میں اصلاح کی ضرورت ہے۔ بچوں کی تعلیم کے لیے جو کتابیں لکھی جائیں ان کی زبان صحیح ہونی چاہیے تاکہ دینی تعلیم کے ساتھ ان کی ادبی تعلیم بھی مکمل ہوتی

**رسول مقبول** تالیف جناب مولانا عتیق احمد صاحب صدیقی مدیر قاسم العلوم ضخامت ۱۴۴ صفحات قیمت
ملنے کا پتہ:- مجلس دار التالیف، دیوبند۔

یہ کتاب بچوں کی تعلیم کے لیے ہے سرکار رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات کو اسباق کی صورت میں بیان کیا گیا ہے اور ہر سبق کے آخر میں اس کا خلاصہ دے کر مشقی سوالات لکھے گئے ہیں، زبان سہل و عام فہم مگر کہیں کہیں پایۂ ادب سے گری ہوئی ہے مثلاً متعدد مقامات پر سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے لیے صیغۂ واحد استعمال کیا گیا ہے (خدیجہ بہت خوش ہوئی"۔ اُن کے دل میں آپ کی قدر و منزلت قائم ہو گئی" وغیرہ) یہ انداز بیان ادب کے خلاف ہے اور خصوصاً بچوں کو تو اس سے محفوظ رکھنا ضروری ہے۔

کتاب میں اور بھی چند مقامات پر اصلاح کی ضرورت محسوس ہوی۔ مثلاً پہلے ہی سبق میں پیغمبر کی ضرورت جس طریق استدلال سے سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے وہ بہت ناقص ہے۔ اس سے ایک بچہ اس غلط فہمی میں پڑ سکتا ہے کہ ہر زمانہ میں ایک نبی کا آنا ضروری ہے اور باب نبوت کو ہمیشہ کھلا رہنا چاہیے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے متعلق لکھا ہے کہ وہ طوفان نوح سے ۳۹۱۳ برس بعد اور پیدائش آدم سے ۵۵۱۶ برس بعد ہوی۔ اول تو اس تفصیل کی ضرورت ہی نہ تھی۔ دوسرے یہ تقویم سر تا سر یہودی روایات پر مبنی ہے جس کا کوئی ثبوت نہ اسلامی روایات میں ملتا ہے اور نہ تاریخی شواہد میں۔ ایسی ظنی اور غیر معتبر چیزوں کو نصاب درس میں بیان کرنے سے کیا فائدہ متصور ہے بچے سمجھتے ہیں کہ یہ اسلامی روایات ہیں پھر بڑے ہو کر جب وہ تاریخ کی تعلیم حاصل کرتے ہیں تو ان کے دلوں میں اسلام کی طرف سے شکوک پیدا ہونے لگتے ہیں۔

سفر شام کے سلسلہ میں بحیرا راہب کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ یہ روایت متعدد حیثیات سے ناقابل اعتبار ہے۔ اور دشمنان اسلام نے اس سے ناجائز فائدہ اٹھا کر نبوت محمدی پر بہت سے شکوک وارد کئے ہیں کیا ضرورت ہے کہ اس قسم کی کمزور روایتیں بچوں کے سامنے بیان کی جائیں اور ان کے اندر دشمنوں کے اعتراضات سے متاثر ہونے کی استعداد پہلے ہی سے پیدا کر دی جائے۔

# مقالات

# مسلمان اور امامت کبریٰ

## (۲)

از جناب مولوی صدر الدین صاحب مدیر الاصلاح سرائمیر

پچھلی صحبت میں صحیح بخاری کی یہ حدیث نقل کی گئی تھی کہ :-

لتتبعن سنن من كان قبلكم حذو النعل بالنعل حتى لو دخلوا جحر ضب لدخلتموه قالوا اليهود والنصارى؟ قالَ فمَن؟

قسم ہے اللہ کی تم پچھلی قوموں کے راستوں پر چلکر قدم بقدم ان کی پیروی کروگے یہاں تک کہ اگر وہ کسی گوہ کے سوراخ میں گھسی ہوں گی تو تم بھی اس میں داخل ہو کر رہوگے لوگوں نے پوچھا کیا ہم یہود و نصاریٰ کی پیروی کریں گے؟ فرمایا پھر اور کون!

یہ عالم الغیب کا الہامانہ فیضان کہیے یا فطرت کی نبض شناسی کا پیغمبرانہ کمال کہ اس نے انسانی طبیعت کے [illegible] اور قوموں اور جماعتوں کے ظاہر و باطن پر مرور زمانہ کے اثرات کا گہرا احساس کرکے جو کچھ اس امت کے بارے میں [illegible] تھا وہ حرف بحرف پورا ہو کر رہا۔ اقوام ضالہ کی داستان مغضوبیت اس کے سامنے تھی ان عوامل کو [illegible] ایک ایک کرکے اسے یاد تھے نیز اس کی حکیمانہ اور دوررس نگاہوں کو انسان ظلوم وجہول کی ساری [illegible] نظر آرہی تھیں جو ان اسباب کو پیدا کرتی اور پروان چڑھاتی ہیں۔ آدمی کے اندر دو ہی قسم کی [illegible] قوائے علمی اور قوائے عملی۔ اس لیے فطرت کی شاہراہ سے تجاوز بھی دو شکلوں میں نمودار ہوا ہے [illegible] اور کج رویوں نے نصاریٰ کی شان عزت ڈبوئی، اور عملی بے اعتدالیاں یہود کو لے ڈوبیں۔ [illegible] کے ان ناقابل فراموش حقائق کو پڑھکر اور یہ دیکھکر کہ زمانہ نبوت کے برکات ختم ہوتے ہی دنیا کے

فتنے ہدایت الٰہی پر کس طرح غالب ہو جاتے ہیں، رسول عربی فداہ ابی و امی نے مسلمانوں کے آیندہ حالات کے متعلق جن خطرات کا اظہار کیا، کیا وہ عین حقیقت کی ترجمانی اور فطرت انسانی کی نبض شناسی نہ تھی؟ اہل کتاب کا وہ کونسا طرز عمل ہے جس کے اتباع میں مسلمانوں نے کوئی کسر اٹھا رکھی ہو؟ اُن کا کونسا نقش قدم ہے جس پر انہوں نے ٹھیک ٹھیک ناپ تول کر اپنے قدم نہ رکھے ہوں؟ ان کی علمی و عملی ضلالتوں کا کونسا شوشہ ہے جس سے ان کا نامۂ اعمال ابھی سیاہ نہیں ہوا ہے؟ قرآن حکیم نے یہودیوں اور عیسائیوں کے اعتقاد و عمل کی گوناگوں خرابیوں اور ان کے اسباب و نتائج کو ایک ایک کر کے بیان کیا ہے۔ ایک تفصیلی نظر اس بیان پر ڈالیے اور اس کے بعد لتتبعن سنن من قبلکم کی صداقت پر غور کیجیے۔

# اہل کتاب کے جرائم

ملی افتراق شریعت الٰہی دنیا والوں کے لیے رحمت بن کے آتی ہے۔ اس کا مقصد امن و سلامتی کی زمین پر سعادت کے علم کو نصب کرنا اور ساری مخلوق الٰہی کو اختلاف و تشتت کے خارزار سے نکال کر وحدت اور مودت کے شیرازہ میں منسلک کرنا ہوتا ہے۔ انسانی طبائع کو جن کی خواہشیں ایک دوسرے سے بالکل جدا گانہ اور بے جوڑ ہوتی ہیں کوئی چیز ایک نقطہ پر جمع نہیں کر سکتی۔ اور جب تمام افراد کا طبعی رجحان ایک نہ ہو دین و آخرت کی کسی کامیابی سے قوم ہمکنار نہیں ہو سکتی۔ شریعت الٰہی اختلافات اور اہوا و آراء کے ہلاکت آفریں مفاسد کا قلع قمع کر کے سب کے سامنے ایک بلند نصب العین اور پاکیزہ قانون حیات پیش کرتی ہے۔ جب کسی قوم کے بھلے دن آتے ہیں، تو وہ اس مرکز پر جمع ہو جاتی ہے۔ اور یہ شریعت یا اس کی پاک اور بلند تعلیم اس جسم کی روح ہوتی ہے۔ لیکن جب امت کا ستارۂ اقبال گردش میں آجاتا ہے اور وہ خدا کی بخشی ہوئی ہدایت کو چھوڑ کر خواہشات نفس کے اتباع کی طرف رجوع کرنے لگتی ہے تو اس روح وحدت میں اضمحلال پیدا ہو جاتا ہے اور پھر وہ وقت آجاتا ہے کہ قوم اپنی شقاوت کی تمام سیڑھیاں طے کر کے سنت الٰہیہ کو مجبور کر دیتی ہے کہ اس روح کو نکال لے اور قوم کے اس ڈھانچے کو ہمیشہ کے لیے مٹی کی تعفن پھیلانے اور حوادث روزگار کے تھپیڑے کھانے کے لیے افتادہ چھوڑ دے۔ اس وقت وہ شریعت جو

پوری امت کے رگ و ریشے میں وحدت کا خمار پیدا کرنے آئی تھی خود ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی ہے اور اس کے پیرو جن کا خدا اور معبود ایک ہوتا ہے جن کا پیغمبر اور ہادی ایک ہوتا ہے جن کی کتاب اور شریعت ایک ہوتی ہے خود شریعت ہی کے نام پر مختلف راہیں اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ کسی قوم کی انتہائی پستی اور بدبختی کی معراج ہے! اہل کتاب کے صحیفۂ زندگی کا سب سے بدتر اور سیاہ ترین داغ یہی ہے۔

مسلمانوں کو تنبیہ کی گئی تھی کہ دیکھو یہ تمہارے پیشروؤں کی تباہی کا سب سے بڑا سبب ہے اس سے ہمیشہ دور رہنا۔

اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَھُمْ وَکَانُوْا شِیَعًا لَّسْتَ مِنْھُمْ فِیْ شَیْءٍ (انعام ۲۰) — جن لوگوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا اور مختلف ٹولیوں میں بٹ گئے تمہارا ان سے کوئی واسطہ نہیں۔

ایک اور دوسرے مقام پر ان تفرقہ پردازوں اور وحدت دینی کے چشمۂ صافی کو اختلاف و تفرق کی کثافتوں سے مکدر کرنے والوں سے تبری کا حکم دیتے ہوئے قرآن حکیم نے اس حقیقت کو اور زیادہ بے نقاب کر دیا ہے کہ فرقہ بندی ضلالت کا گہوارہ، اہوار کی پرستش اور فرمان الٰہی سے عدوان اور کھلی ہوئی بغاوت ہے

.... وَلَا تَکُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ مِنَ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَھُمْ وَکَانُوْا شِیَعًا ۔ کُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَیْھِمْ فَرِحُوْنَ ۔ (روم ۔۴) — اور اے مسلمانو تم مشرکین کی راہ مت چلنا جو اپنے دین میں تفرق پیدا کر کے گروہ گروہ بن گئے اور حال یہ ہے کہ ہر گروہ کے پاس جو کچھ ہے اسی پر وہ فریفتہ ہے۔

دیکھا آپ نے شرک اور تفریق دین کی سرحدیں کس قدر ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہیں؟ قرآنی اسلوب بیان کیا اشارہ کر رہا ہے؟ انہی خوفناک خطرات سے بچانے کے لیے قرآن نے بار بار مسلمانوں کو ایک صراط مستقیم پر چلنے اور حبل اللہ کو ہاتھ سے تھامے رہنے کی دعوت دی تھی وَاَنَّ ھٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْہُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِکُمْ عَنْ سَبِیْلِہٖ ۔

قرآن کی نگاہ میں تو قوم کا معمولی اور غیر ملی اختلاف بھی قوم کی ساکھ مٹا دینے کے لیے کافی ہے۔

**تحریف کتاب** اہل کتاب کا دوسرا سب سے بڑا جرم کتاب الٰہی میں ان کی لفظی اور معنوی تحریف ہے۔ ان کی نفسانی خواہشات ان کے لیے ایک مقدس قربان گاہ ہوتی تھیں جن پر کتاب الٰہی کی آیات نہایت آسانی اور بے دردی کے ساتھ قربان کر دی جاتی تھیں۔ مادی رغائب بحکم خداوندی متغیر ہو سکتا تھا، زخارف دنیوی کے بدلے آیات قرآنی فروخت کی جا سکتی تھیں، ضرورت پیش آنے پر عبارتوں کو الٹا پلٹا جا سکتا تھا، الفاظ کے بالکل اچھوتے معانی بیان کیے جا سکتے تھے، صاف اور سلیس فقروں کی غلط لیکن ضرورت کے مطابق تاویلیں کی جا سکتی تھیں۔ غرض کتاب کیا تھی، علماء کے ہاتھ میں ایک کھلونا تھا کہ اس سے جس طرح چاہتے تھے کھیلتے تھے۔

قرآن مجید میں علماء یہود کے کارناموں کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے:۔

فَبَدَّلَ الَّذِينَ ظَلَمُوا غَيْرَ الَّذِي قِيلَ لَهُمْ الایۃ۔ (بقرہ ۶۵)

پس ظالموں نے خدا کا وہ قول بدل ڈالا جو ان سے کہا گیا تھا۔

دوسری جگہ اور کھول کر ان کی اس شرارت کا حال بیان ہوا ہے:۔

فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَٰذَا مِنْ عِندِ اللَّهِ لِيَشْتَرُوا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا ۖ فَوَيْلٌ لَّهُم مِّمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُم مِّمَّا يَكْسِبُونَ ۔ (بقرہ ۹)

پس خرابی ہے ان لوگوں کے لیے جو کتاب (توراۃ) اپنے ہاتھوں سے اپنی طرف سے گھڑ کر لکھتے ہیں پھر یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے ہے (ایسا کرتے ہیں) تاکہ اس کے بدلہ تھوڑا مال خرید لیں۔ پس افسوس ہے کہ انہوں نے اپنے ہاتھوں سے لکھا اور خرابی ہے ان کے لیے کہ وہ ایسی کمائی کرتے تھے۔

اس طرح کئی مقام پر یہود کی اس ناپاک حرکت کا ذکر آیا ہے کہ وہ الفاظ اور عبارات میں تحریف کیا کرتے تھے يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَن مَّوَاضِعِهِ۔ اس تحریف کے جادو سے وہ دین دنیا دونوں کو اپنا بنانا چاہتے تھے اور فسق و فجور کی ان تمام لعنتوں کے باوجود اپنی محبوبیت کے غرہ میں فردوس کو اپنا حق ملکیت سمجھے بیٹھے تھے کہ ہمارے ہوتے کون اس کا حق دار ہے؟ ہاں ممکن ہے ہم میں سے بعض لوگوں کو گوسالہ پرستی

کسی جرم میں دو چار روز کی سزا ہو جائے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ۪ وَغَرَّهُمْ فِيْ دِيْنِهِمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ۔ (آل عمران ۳)

یہ اس وجہ سے کہ وہ کہتے تھے (یعنی ان کا اعتقاد تھا) کہ ہمیں آگ نہ چھوئے گی مگر چند روز تک اور اپنے دین کے بارے میں انھیں دھوکے میں ڈال رکھا تھا اس چیز نے جو وہ گڑھتے تھے (کتاب میں)

اسی طرح نصاریٰ کے متعلق بھی فرماتا ہے۔

وَمِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰٓى اَخَذْنَا مِيْثَاقَهُمْ فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ (مائدہ ۳)

اور ان لوگوں سے جو اپنے کو نصاریٰ کہتے ہیں ہم نے میثاق لیا تھا لیکن انہوں نے بھلا دیا ایک حصہ اس چیز کا جس کے ذریعہ انھیں تذکیر کی گئی تھی (یعنی کتاب الٰہی)۔

کتمان حق | تحریف کے علاوہ جو کچھ تعلیمات اپنے اصلی رنگ و روپ میں موجود رہ گئی تھیں وہ بھی ان کو ربانیوں کی مصلحت پرستیوں کی بدولت منظر عام پر نہ آسکتی تھیں سورج سے زیادہ صاف اور واضح حق کو نگل جانے میں انھیں باک نہ ہوتا۔ ان کے نزدیک حق و باطل میں کوئی تضاد نہ تھا۔ ہر ایک دوسرے کی جگہ نہایت آسانی سے لے سکتا تھا۔ دل اعتراف حق کے اضطراری جذبات سے مملو ہوتا لیکن زبان اپنی لن ترانیوں کے شور سے باز نہ آتی انھیں بار بار اس شیطانی نفاق پر متنبہ کیا جاتا تھا کہ

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۔ (بقرہ ۵)۔

حق و باطل کو گڈمڈ مت کرو نہ حق کو چھپاؤ درانحالیکہ تم جانتے ہو۔

نبی موعود کا وہ بڑی بے چینی سے انتظار کر رہے تھے لیکن صرف اس حسد کی بنا پر کہ مسیح کی بشارت کا ظہور بنی اسرائیل کے بجائے بنی اسمٰعیل میں کیوں ہوا، بیک جنبش لب میثاق الٰہی کی دھجیاں اڑا کر رکھدیں اور بجائے اس کے کہ اپنی کتاب کی بے شمار پیشین گوئیوں کے مطابق اس رہبر کامل اور ہادی کونین کی دعوت پر سب سے

پہلے لبیک کہتے انہوں نے تکذیب میں سب پر سبقت کی اور پھر حق کو مجروح کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ چھوڑا
قرآن حکیم نے ان کی اس باطل پرستی اور علانیہ حق پوشی پر فرمایا۔

وَاٰمِنُوْا بِمَاۤ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْۤا اَوَّلَ كَافِرٍۭ بِهٖ الایۃ (بقرہ ۲) اور ایمان لاؤ اس چیز پر جو ہم نے آتاری ہے در آں حالیکہ وہ اس کے مطابق ہے جو تمہارے پاس ہے (تورات) اور سب سے پہلے تمہیں اس کا انکار نہ کرو (جبکہ سب سے پہلے تمہیں کو اس پر ایمان لانا چاہیے تھا)۔

انہوں نے صرف اسی زبانی تکذیب پر اکتفا نہ کیا بلکہ اپنی کتاب کی پیشین گوئیوں کو جو رسول عربی کے متعلق تھیں یا تو سرے سے نکال ہی ڈالا یا تحریف کا رنگ دے کر کچھ کا کچھ کر دیا ان کی ساری کوششیں اس بات میں صرف ہونے لگیں کہ کسی طرح سے بھی تورات کا کوئی شوخہ پیغمبر عرب کی تصدیق نہ کر سکے۔ اسی وجہ سے اگر ان کا کوئی فرد تورات کی ایسی آیتیں مسلمانوں کے سامنے پڑھتا جس سے پیغمبر اسلام کی صداقت ثابت ہوتی تھی تو وہ اس کو بری طرح کوستے اور کہتے کہ تم مسلمانوں کو ایسی باتیں کیوں بتا دیتے ہو جو خود ہمارے مقابلہ میں دلیل بن جاتی ہیں۔ وَاِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ قَالُوْۤا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ (بقرہ : ۹)۔

خاتم الانبیاء کی تکذیب کا وہ آغاز بردست اہتمام کرتے تھے لیکن خود ان کے قلوب کیا پکار رہے تھے؟

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ الایۃ (انعام ۲) جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی تھی وہ اس قرآن (یا رسول) کو اسی طرح پہچانتے ہیں جس طرح وہ اپنے بیٹوں کو جانتے پہچانتے ہیں۔

یہ تو قومی اور نسلی حسد کی کارفرمائیاں تھیں کہ آفتاب حق کو چمکتا دیکھتے اور اس پر خاک جھونکنے کی کوشش کرتے دوسری طرف متاع دنیوی کی محبت بھی ان کی شقی روحوں میں بری طرح پیوست ہو چکی تھی۔ صداقت کی غیر معمولی کشش دلوں کو کھینچے تو لیتی تھی پر جب وہ دیکھتے کہ اسلام کی حلقہ بگوشی اختیار کرنا گویا ہوا و نفس

کی قربانی دینا اور آرام وسکون سے ہاتھ دھونا اور سارے عرب وعجم کے خلاف لڑائی مول لینا ہے تو حق کی روشنی چمک کر بجھ جاتی نتیجہ یہ ہوتا کہ چند روزہ راحت کے بدلہ ابدی ذلت اور مصیبت خرید لیتے ان کی اسی تجارت کی طرف اشارہ ہے :۔

| | |
|---|---|
| اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَۃَ بِالْھُدٰی فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُھُمْ وَ مَا کَانُوْا مُھْتَدِیْنَ (سورۃ البقرۃ ۲) | یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے گمراہی کو ہدایت کے بدلہ خریدا ہے لیکن نہ تو ان کی یہ تجارت ہی کچھ نفع بخش ہوئی اور نہ یہ لوگ ٹھیک راہ پر رہے۔ |

ان کے اس تذبذب یعنی اعتراف حق اور حب باطل کی مثال ایسی ہی تھی جیسے موسلا دھار بارش ہو رہی ہو آسمان سے زمین تک تاریکی مسلط ہو بجلی کڑک چمک رہی ہو اس طوفان کے اندر کوئی شخص کبھی تو روشنی دیکھ کر آگے قدم اٹھاتا ہو کبھی ظلمت شب سے مجبور ہو کر کھڑا ہو جاتا ہو کبھی بجلی کی کڑک سے کانوں میں انگلیاں ٹھوس لیتا ہو۔ اسی طرح آسمان شریعت سے جب رحمت محمدیہ کی بارش ہوئی جس کے ساتھ وعدہ بھی تھا وعید بھی تھی، نفس کی ظلمت بھی تھی فطرت کا نور بھی تھا، دنیا کی شکل بھی تھی آخرت کی تصویر بھی تھی تو ان یہودیوں کا باطن ایسی ہی متضاد کیفیات اور تفکرات کی کشمکشوں میں مبتلا تھا۔ کبھی فطری اضطرار کی وجہ سے آگے لپکتے کبھی حب الدنیا اور کراہیت موت دامن پکڑ کر پیچھے کھینچ لیتی۔ خدا نے انھیں سمجھایا کہ حق کو اتنے سستے داموں نہ بیچو، ڈرنا ہو تو مجھ سے ڈرو، دنیا کے کمزور انسانوں سے کیوں مرعوب ہوئے جاتے ہو۔ وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَکُمْ وَلَا تَکُوْنُوْٓا اَوَّلَ کَافِرٍۭ بِہٖ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا وَّاِیَّایَ فَاتَّقُوْنِ ۔

**حب عاجلہ اور کراہیت موت** موت کا خوف اور دنیا کی محبت ساری بربادیوں اور ذلتوں کا گہوارہ ہے

ایک مرتبہ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ ایک زمانہ آئے گا کہ تم کثرت آبادی اور فراوانی اسباب کے باوجود دشمنوں کا لقمۂ تر بن جاؤ گے۔ صحابہؓ نے فرط حیرت سے بخود ہو کر پوچھا وہ کیسے؟ آپ نے فرمایا تم میں

وہن پیدا ہو جائے گا، لوگوں نے پوچھا، وما الوھن؟ وہن کیا چیز ہے آپ نے تبلایا حب الدنیا وکراہیۃ الموت (دنیا کی محبت اور موت سے فرار) چنانچہ یہود کی یہ سب سے بڑی نمایاں خصوصیت تھی جس نے انکو ہر طرح ذلیل وخوار کیا، انکی کتاب حیات کے سرورق ہی پر نہایت موٹے موٹے خطوں میں یہ لکھا ہوا ہے کہ جب ان کے پیغمبر نے حیات ابدی کی انھیں راہ تبلائی اور اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے میدان جہاد میں اترنے کے لیے کہا تو انھوں نے نہایت صفائی سے کہدیا جاؤ تم اور تمہارا خدا دونوں لڑیں ہم یہاں بیٹھ کر نتیجہ کا انتظار کرتے ہیں۔ ان کے نبی نے کہا کہ ارض مقدسہ پر قبضہ کرلو۔ خدا نے اس زمین کا تم سے وعدہ کیا ہے انہوں نے جواب دیا کہ ہم تو وہاں ہرگز نہ جائیں گے، وہاں تو بڑے زبردست لوگ رہتے ہیں۔ اس قسم کی بزدلی کے واقعات سے ان کی تاریخ لبریز ہے۔

جب وادی مکہ سے آفتاب ہدایت کا ظہور ہوا تو یہی زندگی کی محبت ان کی آنکھوں کا حجاب بن گئی! دنیا کا حسن وجمال ان کی آنکھوں میں کھب چکا تھا۔ وہ اس پر مفتون تھے اور کسی بڑی سے بڑی قیمت کے عوض بھی اپنی اس متاع گراں کو بیچنے پر راضی نہ تھے۔ ان کے دل اقرار کر رہے تھے کہ اسلام حق وصداقت کا پیکر اور آسمانی بادشاہت کے قیام کا داعی ہے لیکن صرف یہ چیز انہیں اسلام قبول کرنے سے روک رہی تھی کہ دین ان سے قربانیوں، جان اور مال اور لذات دنیوی، سب کی قربانیوں کا طالب تھا۔ وہ حق کو حق جاننے کے باوجود حب جاہ ومال اور عشق دنیا سے مجبور تھے۔ پھر جب ان کا راس المال ہی خطرہ میں پھنس جاتا تو ان کا حرم وتدبر انھیں ایسی بازی لگانے ہی کیوں دیتا۔

یہ ان کے شیطانی وسوسے تھے جو ان کے بدن کے رگ وریشہ میں خون کی طرح سرایت کیے ہوئے تھے چنانچہ قرآن نے ان کا راز کھولا۔

| | |
|---|---|
| فَتَرَى الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ | پس تم دیکھو گے ان کو جن کے دلوں میں مرض ہے کہ آپس |
| فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ | میں بڑی دوڑ دھوپ کر رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ہمیں یا ان |

فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا عَلٰى مَا اَسَرُّوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ (مائدہ ۸) لانے سے مصائب میں گھر جانے کا خوف ہے۔ پس قریب ہے کہ خدا فتح نازل کرے یا اپنی طرف سے کوئی اور بات۔ اس وقت وہ اپنے اُن وساوس پر نادم ہوں گے جنہیں دل میں چھپاتے ہیں۔

گویا وہ حق سے روگردانی کو اس وجہ سے جائز سمجھتے بلکہ اس پر مصر تھے کہ اس کی راہ مظلومیت اور بے کسی کے کانٹوں سے بھری ہوئی تھی۔ آخر نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ کے عذرات ان "اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَ اَحِبَّآؤُهٗ" کی زبانوں سے کیوں نکلتے تھے؟ اس لیے کہ ان کی نظریں اس خاندان عالم کے حدود سے ماوراجاتی ہی نہ تھیں۔ حیات دنیوی کی آسائشیں ان کو محبوب تھیں اور ان سے دست بردار ہونا ان کے حیطۂ امکان سے باہر تھا۔

وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ۔ (بقرہ ۱۱) ان یہودیوں کو تم دنیا کی زندگی کا سب سے زیادہ حریص پاؤ گے۔

اور اس لیے کہ اسلام کی راہ پھولوں کی سیج نہ تھی یہاں تو پہلے ہی قدم پر دنیا سے منہ موڑ کر موت کو کہ اہل دل کی عین زندگی اور چشمۂ حیات کا گھاٹ ہے دوڑ کر بلانا پڑتا تھا۔ اور وہ اس سے اتنی ہی تیزی کے ساتھ بھاگتے تھے۔ ذیل کی آیت انھیں معاندین حق اور ظالمین فطرت کو مخاطب کر رہی ہے۔

قُلْ اِنَّ الْمَوْتَ الَّذِيْ تَفِرُّوْنَ مِنْهُ فَاِنَّهٗ مُلٰقِيْكُمْ الاٰیۃ (جمعہ ۱) کہدو کہ جس موت سے تم بھاگتے ہو وہ تمہیں پاکر رہے گی۔

گویا ذلت کی موت مرنا اور یوم آخرت کی رسوائیوں کو قبول کرنا آسان تھا لیکن حیات ابدی کے جادہ میں آگے بڑھنا اور رضائے الٰہی کی طرف قدم اٹھانا دشوار بلکہ ناممکن تھا۔

بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبیست

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

**علماء سوء** حدیثوں میں ہے کہ جب کسی امت کے برے دن آتے ہیں تو سب سے پہلے اس کے علماء اور امراء گمراہ اور بدچلن ہو جاتے ہیں۔ پیشوایان ملت امت کا شیرازہ اور حیات قومی کا قوام ہوتے ہیں۔ سو کتنی بڑی بدبختی اور ہلاکی ہے اس قوم کے لیے جس کا شیرازۂ زندگی ہی نفسانیت کے ہاتھوں تار تار ہو چکا ہو۔ اور کس قدر باعث عبرت ہے وہ امت جس کا قوام ملی ہی فاسد اور زہریلا ہو چکا ہو۔

اسرائیلی امت کے احبار اور رہبان کا کیا حال تھا؟ اور یہ امت انھیں کیا سمجھ بیٹھی تھی؟ یہ احبار و رہبان ورثۃ الانبیاء اور شہداء للناس نہ تھے بلکہ خود پیغمبر تھے بلکہ ایک گونہ خدا بن بیٹھے تھے۔ شریعت ان کی زبان وقلم کی پیرو تھی، اشیاء کی حلت وحرمت ان کی آراء ومصالح کی تابع تھی، چاندی سونے کے سکوں پر وہ سماوی فرامین بدل دے سکتے تھے، یعنی وہ شریعت کے تابع نہ تھے بلکہ شریعت خود ان کی تابع تھی اور انھیں کتاب میں نسخ وترمیم اور حذف واضافہ کے حقوق گویا من جانب اللہ حاصل تھے امت انھیں دنیا اور آخرت ہر لحاظ سے مختار کامل سمجھ کر انھیں کو پوجتی تھی۔

اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ — انہوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنے احبار اور رہبان کو معبود بنا لیا۔

اس آیۂ کریمہ کے بارے میں صحابۂ کرام نے آنحضرت صلعم سے استفسار کیا کہ انھوں نے اپنے علماء کو خدا کب بنایا تھا؟ آپ نے فرمایا۔ جس چیز کو وہ حلال کہدیتے اسے حلال سمجھ لیتے اور جس چیز کو حرام کہتے اسے وہ حرام سمجھ لیتے، احکام الٰہی کی انھیں کوئی پروا نہ ہوتی۔

یہ علماء سوء اپنے فرائض کلیتہً فراموش کر بیٹھے تھے، انھیں اپنے نفس کی پوجا سے فرصت ہی نہ ملتی تھی، دنیا کے یہ پرستار تھے اور امت انکی پرستار، روح شریعت ان کے ہاتھوں بری طرح مجروح ہو چکی تھی، تحریف کتاب اور کتمان حق کی مختصر داستان تو آپ اوپر کی سطروں میں پڑھ چکے ہیں بعض فرائض جو اس گروہ سجادہ نشینان رسول کا خاص مشن ہوتے ہیں ان کے بارے میں بھی اس جماعت کا رویہ ابلیس کے

طرزِ عمل سے کچھ مختلف نہ تھا۔

امر بالمعروف ونہی عن المنکر سے اعراض | علماء اور مشائخ کا سب سے اہم فرض امر بالمعروف ونہی عن المنکر ہے مگر اس کے بارے میں یہود کے احبار و رہبان نے جو تفریط برتی اظہر من الشمس ہے۔ ہر امت بجائے خود سچائی کی گواہ ہوتی ہے، شریعت کی روشن شمع اس کے ہاتھوں میں اسی لیے دی جاتی ہے کہ عالم فطرت کے کسی گوشہ میں تاریکی کا نام و نشان باقی نہ رہ جائے۔ ساری دنیا امن کا گہوارہ اور عدل و قسط کی میزان بن جائے، اللہ کی زمین باطل کے شر سے پاک اور نیکی کے خوش آئند پھولوں سے رشک فردوس اور پر بہار بن جائے۔ علماء امت اور خواص کا مقام اس مقصد عظیم کے حصول میں نہایت بلند ہوتا ہے۔ ان کے تارِ نفس کی ہر صدا کو صداقت کا نغمہ ہونا چاہیے۔ وہ لوگوں کے لیے اسوہ ہوتے ہیں، انبیاء کے جانشین اور دین و شریعت کے امین ہوتے ہیں، اس لیے امر بالمعروف کی ذمہ داری ان کے بدن کے روئیں روئیں میں ہوتی ہے اور وہ اس فرض سے ہرگز سبکدوش نہیں ہو سکتے تاوقتیکہ ان کے جسم کے ایک ایک رونگٹے سے اتباع شریعت کی روح نہ ٹپکنے لگے، ان کا باطن جمالِ حقیقت کا آئینہ نہ ہو، ان کی آنکھوں میں مشکوٰۃ نبوت کا پرتو نہ ہو، ان کی پیشانی بجائے خود مصحفِ الٰہی نہ ہو، وہ حق کے مبلغ ہوں لیکن سراپا حق بن کر، تذکیر ان کا شیوہ ہو لیکن مجسم عمل بن کر، ورنہ کھوکھلے سینوں کی نکلی ہوئی صدائیں فضاء بسیط میں گم ہو کر رہ جائیں گی، وہ دنیا کے اندر کوئی انقلاب برپا نہیں کر سکتیں۔ ایسے علماء جن کا باطن عمل کے جوہر سے خالی ہو قدرت کے نزدیک لعنت کے مستحق اور قوم کے لیے عذاب اور تباہی کا پیغام ہوا کرتے ہیں۔ علماء یہود پر جب شقاوت کا عفریت مسلط ہو گیا تو وہ اس فرض کی ادائگی سے علانیہ دست کش ہو گئے، معروف کو منکر اور منکر کو معروف بنا ہوا دیکھتے مگر اس کے خلاف ایک آواز بھی نہ اٹھاتے۔ قرآن حکیم نے ان احبار کو نہایت حقارت آمیز لہجہ میں توبیخ کی ہے۔

لَوْلَا يَنْهَاهُمُ الرَّبَّانِيُّونَ وَالْأَحْبَارُ علماء اور احبار نے انھیں گناہ کی باتیں کہنے اور

مَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَصْنَعُوْنَ (المائدہ ۹) — اور حرام کے مال کھانے سے کیوں نہیں روکا؟ بہت برا ہے جو وہ کرتے تھے۔

لیکن ان کی داستان اسی پر ختم نہیں ہو جاتی کہ انہوں نے لوگوں کو برائی سے روکنا ہی چھوڑ رکھا تھا بلکہ وہ خود اپنے نفس کو بھول بیٹھے تھے اگر کبھی حق پرستی کا دلولہ جوش میں بھی آتا تو غیروں ہی کے لیے۔ خود اس قید و بند سے آزاد تھے۔

اتامرون الناس بالبر وتنسون انفسكم وانتم تتلون الكتاب افلا تعقلون۔ (بقرہ ۵) — کیا تم لوگوں کو تو نیکی کا حکم دیتے ہو اور خود اپنے کو بھول جاتے ہو درانحالیکہ تم کتاب پڑھتے ہو کیا تم (اتنا بھی) نہیں سمجھتے۔

جب ارباب علم و دانش اور خواص امت کا یہ حال ہو جائے تو تا بدیگراں چہ رشد جب مرکز نصح اور سرچشمۂ خیر ہی مفاسد کا ملجا اور پشت پناہ بن جائے تو پھر قوم سکرات موت کا کب تک مقابلہ کر سکتی ہے۔ یہ معصیت افراد کی معصیت نہیں بلکہ قوم و ملت کے لیے لعنت ہے اسی بنا پر حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ ایسے علماء قیامت کے دن سب سے پہلے جہنم میں داخل ہونے والوں میں سے ہیں جن کا قول کچھ رہا ہو اور عمل کچھ۔

احکام شرعی سے بے اعتنائی | تحریف کتاب اور کتمان حق کے ابواب میں بالاختصار یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ احکام آلٰہی کا بیشتر حصہ علمائے دنیا پرست کی ہوسناکیوں اور مصلحت پرستیوں کی نذر ہو چکا تھا اور وہ مقدس قوانین جو دنیا کو مظالم کے شر سے پاک کرنے، یہاں کے عالم پر میزان عدل و قسط قائم کرنے اور انسانی قلوب میں حق و سعادت کی تخم ریزی کرنے کے لیے خدائے احکم الحاکمین کی طرف سے کہ مرکز فہم و تدبر اور سرچشمۂ خیر و انصاف ہے نازل ہوئے تھے ان شقی اور بدکیش رہنماؤں کی بدولت کہ ورثۃ الانبیاء تھے خود نگاہوں سے مستور ہو گئے اور صد افسوس کہ فلاح و نجات کا صافی چشمۂ حیوان ان دجاجلۂ امت کی نفسانی کثافتوں سے

گذر ہو کر دنیا اور دنیا والوں کے لیے پیام حیات کے بجائے دعوت مرگ اور بنائے ظلم و فساد بن گیا۔ اعتقادات سے لے کر اخلاقیات معاملات اور سیاسیات تک، یعنی دینی و دنیوی معاملات کے ایک ایک شعبہ میں احکام آلٰہی کے بجائے احکام طاغوت کا تخت بچھا ہوا تھا۔ جو دو چار شرعی قوانین ان کی دست برد سے محفوظ اور اپنے اصلی رنگ و روپ میں باقی رہ گئے تھے وہ بھی ناآشنائے عمل تھے۔ صحیح مسلم میں ہے کہ آپ نے ایک یہودی کو دیکھا جسے ارتکاب فاحشہ کی پاداش میں منہ سیاہ کر کے کوڑے لگائے جا رہے تھے آپ نے یہودیوں سے پوچھا کیا توراۃ میں زنا کی حد یہی ہے؟ انہوں نے جواب دیا ہاں۔ پھر آپ نے ایک یہودی عالم کو خدا کا واسطہ دیکر دریافت فرمایا تو اس نے کہا اگر آپ خدا کو گواہ ٹھہرا کر نہ پوچھتے تو میں ہرگز نہ بتاتا لیکن اب تو کہنا ہی پڑا۔ بات یہ ہے کہ ہمارے رؤساء اور اشراف قوم میں زنا کی بڑی کثرت ہو گئی، ہم ان کا لحاظ کرنے لگے، جب کوئی رذیل اور چھوٹا آدمی اس جرم کا مرتکب ہوتا تو ہم اصلی حد جاری کر کے اسے سنگسار کرتے اور امرا کو چھوڑ دیتے، بالآخر ہم نے غور و خوض کے بعد ایک متوسط درجہ کی سزا تجویز کی یعنی سنگسار کرنے کے بجائے کوڑے مارنا اور منہ کالا کرنا۔ اب یہی شرعی قانون کی حیثیت سے جاری ہے۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے ایک یہودی کو توراۃ کی عبارت جس میں حد زنا کی تصریح تھی پڑھنے کے لیے حکم دیا تو اس نے آگے پیچھے کی عبارت تو پڑھ دی مگر آیت رجم پر ہاتھ رکھکر چھپا دینا چاہا۔

مخزومی عورت پر جب قضائے اسلامی نے چوری کے بدلہ میں قطع ید کا فیصلہ کیا تو لوگوں کے کہنے کی وجہ سے اُسامہ بن زید نے اس کے حق میں سفارش کی، داعی حق یعنی خلافت آلٰہی کے موسس اور احکام آلٰہی کے مبلغ کا چہرۂ مبارک غصہ سے سرخ ہو گیا۔ آپ نے فرمایا کیا تم حدود اللہ کے بارے میں سفارش کرتے ہو؟ تم سے پہلے کی قومیں اسی وجہ سے عتاب خداوندی کی زد میں آکر ہمیشہ کے لیے ہلاک ہو گئیں کہ جب کوئی بڑا اور امیر شخص چوری کرتا تو اسے چھوڑ دیتے اور اگر کوئی غریب اور معمولی انسان اسی جرم

میں گرفتار ہوتا تو لوگ اس پر حد جاری کر دیتے۔ (صحیح مسلم کتاب الحدود)

احکام شرعی میں اہل کتاب خصوصاً یہودیوں کی جرأت اس حد تک پہنچ چکی تھی۔ وہ اپنی زندگی کا جو قدم اٹھاتے وہ احکام دین اور مشعل ہدایت کی روشنی میں نہیں بلکہ نفس کی ظلمتوں اور دنیا طلبی کی خوفناک تیرگیوں میں اٹھاتے۔ وہ حاملین توراۃ ضرور کہلاتے تھے لیکن ان کے عرصۂ حیات کا ایک ایک گوشہ اس کے جمال مقدس کی تابانیوں سے بے نور تھا۔ آخر کار یہی ہوا کہ انہوں نے انسانی فرائض کے سارے حدود توڑ ڈالے اور بدترین خلائق میں جا ملے۔ ان کی مثال کس قدر عبرت انگیز ہے۔

مَثَلُ الَّذِينَ حُمِّلُوا التَّوْرَاةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ أَسْفَارًا (جمعہ ۱)

جن لوگوں کے سر توراۃ لادی گئی (جن کو دی گئی) پھر انہوں نے اس کو نہ اٹھایا (اس پر کاربند نہ ہوئے) ان کی مثال اس گدھے کی سی ہے جس پر کتابیں لدی ہوئی ہوں

جب انہوں نے اپنا الحاق انعام اور بہائم سے کر لیا تو پھر ایسا کیوں نہ ہوتا کہ خداوندی برکات سے محروم ہو کر رہ جاتے، ذل و مسکنت ان کی پیشانی کا طرۂ امتیاز بنتی، رضائے الٰہی اپنا رخ ان سے پھیر لیتی۔ انہوں نے قانون الٰہی سے بغاوت کی تھی۔ کائنات الٰہی نے ان سے بغاوت کی۔ انہوں نے اللہ کی زمین پر فساد کی گرم بازاری کی، زمین کی ساری نعمتیں ان سے روٹھ گئیں۔ انہوں نے کتاب الٰہی کو پس پشت ڈال دیا قدرت کی لعنتوں کے مستحق اور مغضوب ٹھہرے اور خدا نے صاف کہدیا۔

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَسْتُمْ عَلَىٰ شَيْءٍ حَتَّىٰ تُقِيمُوا التَّوْرَاةَ وَالْإِنْجِيلَ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ الایۃ (مائدہ ۱۰)۔

اے پیغمبر ان سے کہدو کہ اے اہل کتاب تم نہیں ہو کسی چیز پر جب تک کہ توراۃ و انجیل کو قائم نہ کرو نیز اس چیز کو جو تمہارے رب کی جانب سے جو تم پر نازل ہوئی ہے

یعنی تمہارا شرف و مجد بس اقامت کتاب اور حدود الٰہی کی تعلیم ہی تک تھا۔ تم نے اس مبارک سر رشتہ کو ہاتھ سے چھوڑ دیا ہے نتیجہ یہ ہے کہ ہر طرح کی رسوائیاں تمہارے گلے کا طوق بن رہی ہیں۔

اس ورطۂ ہلاکت سے نکلنے اور ذلت و نکبت کے جہنمی حضیض سے نجات پانے کی صرف ایک ہی شکل ہے نفس اور خود پرستی کے ایک ایک بندھن کو کاٹ ڈالو تو امین الٰہیہ کو اپنی زندگی کا دستور العمل بناؤ تمہاری دست کے مٹے ہوئے نقوش پھر ابھر آئیں گے، زمین کی آغوش محبت تمہارے لئے کھل جائے گی اور آسمان کا دست شفقت تمہارے سروں پر ہوگا۔

وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرَاةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَا اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ۔ آیۃ (توبہ)

اور اگر یہ لوگ توراۃ و انجیل کو قائم کرتے اور اس چیز کو جو ان کے پروردگار کی طرف سے اتری ہے تو یقیناً کھاتے وہ اپنے اوپر سے اور اپنے پیروں تلے سے۔

لیکن ان یہود کا حال یہ تھا کہ اپنے خود ساختہ اصول و قوانین کے سامنے نصوص انبیاء اور احکام شرعیہ کو پرکاہ کے برابر وقعت نہ دیتے۔ خدا کا آخری مہیمن کلام جب نازل ہوا اور اس نے باطل کے سارے حجاب اٹھا کر خلافت الٰہی کی از سرنو تاسیس کرنی چاہی اور احکام خداوندی کو ارض الٰہی کے اوپر نافذ کرنا چاہا تو یہ یہود کہا کرتے تھے اگر یہ پیغمبر ہمارے منشا اور مطلب اور ہمارے آئین کے مطابق کہے اور فیصلہ کرے تو اسے مان لو ورنہ ٹھکرا دو۔ وَيَقُوْلُوْنَ اِنْ اُوْتِيْتُمْ هٰذَا فَخُذُوْهُ وَاِنْ لَّمْ تُؤْتَوْهُ فَاحْذَرُوْا۔

یہودیوں سے کہا گیا تھا کہ تمہارے لیے آپس کی خانہ جنگی اور خونریزی اور ایک دوسرے کے خلاف میدان جنگ میں صف آرائی حرام ہے کسی اسرائیلی کو غلام بنانا بھی ان کے لیے جائز نہ تھا لیکن زرپرستی نے جو ان کی قومی فطرت کا خمیر ہے انھیں مجبور کر دیا اور پھر ایسا ہوا کہ علی الاعلان ایک دوسرے کے خلاف لشکر آرائی اور قتل و خونریزی کرنا ان کا محبوب ترین شغلہ بن گیا صرف اس لالچ کی بنا پر کہ جنگ میں ہاتھ آئیں گے تو فدیہ میں بڑی بڑی رقمیں حاصل کریں گے۔ غلام بنا کر رکھنا تو حرام لیکن غنائم اور فدیے حاصل کرنے کے شوق میں فتنہ و فساد اور جنگ و پیکار سب حلال کیونکہ اگر اس حکم کی حرمت بھی برقرار رکھتے

تو پھر نفس کی تشنگی کیسے دور ہو؟ یہ تھی ان شہداء حق کی حقیقت نوازی اور حق پرستی۔ اللہ نے ان مفسدہ پرداز باغیان حق کو مخاطب کرکے کہا۔

| | |
|---|---|
| وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَکُمْ لَا تَسْفِکُوْنَ | اور جب ہم نے تم سے میثاق لیا کہ تم اپنے لوگوں کا خون |
| دِمَاءَکُمْ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَکُمْ مِّنْ | نہ بہانا، اور نہ انھیں گھر دل سے (جنگ کرکے) نکالنا |
| دِیَارِکُمْ ..... اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْکِتٰبِ | ..... کیا تم کتاب کے بعض حصہ پر ایمان لاتے اور |
| وَتَکْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَاءُ مَنْ یَّفْعَلُ | بعض سے اعراض کرتے ہو؟ پس جو شخص تم میں سے ایسا کرے |
| ذٰلِکَ مِنْکُمْ اِلَّا خِزْیٌ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا | اس کے لیے کوئی بدلہ نہیں بجز اس کے کہ دنیا میں رسوائی |
| وَیَوْمَ الْقِیٰمَۃِ یُرَدُّوْنَ اِلٰۤی اَشَدِّ الْعَذَابِ | ہو اور قیامت کے دن ایسے تمام لوگ سخت ترین عذاب |
| وَمَا اللّٰہُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ۔ (بقرہ۔۱۰) | کی طرف لوٹائے جائیں گے۔ اللہ تمہارے اعمال سے غافل نہیں ہے۔ |

یہودیوں کے متعلق قرآن میں متعدد مقامات پر تصریحات موجود ہیں کہ توراۃ کے احکام کو انہوں نے چھوڑ کر حسب خواہش اپنے من گھڑت آئین و قوانین کو نافذ کر رکھا تھا کبھی کبھی وہ پیغمبر اسلام کی طرف معاملات کو فیصل کرانے کے لیے رجوع کرتے تھے، قرآن حکیم نے ان سے پوچھا کہ تم ایک طرف تو توراۃ کے احکام کو ٹھکرا چکے ہو اور انھیں قابل عمل نہیں سمجھتے، دوسری طرف داعی اسلام کو حکم قرار دیتے ہو جو بہرحال احکام خداوندی کے مطابق ہی فیصلہ کریں گے تو کیا تم ان کے فیصلوں کے آگے اپنی سرکش اور خود بین گردنوں کو ڈال دو گے؟

وَکَیْفَ یُحَکِّمُوْنَکَ وَعِنْدَھُمُ التَّوْرٰىۃُ فِیْھَا حُکْمُ اللّٰہِ ثُمَّ یَتَوَلَّوْنَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِکَ وَمَاۤ اُولٰۤئِکَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ۔

حدود و قصاص کے بارے میں انہوں نے دل کھول کر تصرف کیا، احکم الحاکمین کا بے لچک اور مساوی قانون سارے اسرائیلیوں کے لیے ایک تھا لیکن انہوں نے اس مساوات کو ظلم اور خلاف عدل

بنا کر چھوڑا، اور لوگوں کے مراتب کے لحاظ سے قانون میں کمی و بیشی کرنے لگے۔ اللہ کے نزدیک بندوں کی یہ دراز دستیاں کفر، فسق اور ظلم سمجھی جاتی ہیں۔ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُوْنَ۔ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُوْنَ۔ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ۔

اللہ کی حکومت قائم کرنے والے اگر اس طرح اُسے مٹانے پر تل جائیں اور حدود الٰہی کو توڑ کر سطح ارض پر جیت اور طاغوت کی فرمانروائی کا تخت بچھا دیں تو پھر تعجب ہے اگر سنت الہیان کے تاج غرور کو ذلت و مسکنت کے پاؤں سے روندنہ دے اور دنیا کی چند روزہ اور آخرت کی سرمدی رسوائیوں کا دردناک عذاب انہیں نہ دے۔ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ اِلَّا خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا۔ الآیۃ (باقی)

# مقاصد قرآن

از جناب مولانا صبغۃ اللہ حسینی صاحب استاذ جامعہ دارالاسلام عمرآباد

(۴)

روزہ! یہ بھی ارکان اسلام میں سے ایک اہم رکن ہے جس کو اس لیے فرض کیا گیا ہے کہ انسان کے ملکی جذبات نشوونما پاکر اپنے ارتقائی منازل پر پہنچ سکیں اور جس قدر بہیمی اور سفلی میلانات ہیں ان کی قوت توڑ دی جائے تاکہ انسان برائیوں سے محفوظ رہ سکے۔ یہی وہ عبادت ہے جس کے احکام کسی قدر مفصل بیان کیے گئے ہیں اور اس کے فوائد و منافع پر بھی نہایت دل نشین پیرایہ میں روشنی ڈالی گئی ہے چنانچہ روزہ کی فرضیت اور اس کے فلسفہ کو ان الفاظ میں واضح کیا گیا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۔ (سورہ بقرہ۔ رکوع ۲۳)

اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کیے جاتے ہیں جس طرح تم سے پیشتر کے لوگوں پر فرض کیے گئے تھے تاکہ تم تقویٰ اختیار کرو۔

"صوم" کے معنی لغت میں مطلق رک جانے کے آتے ہیں اور شریعت نے اس کو ایک خاص معنی کے لیے استعمال کیا ہے یعنی صبح صادق سے آفتاب کے غروب ہوجانے تک کھانے، پینے اور مباشرت سے رکے رہنا۔ قرآن عزیز ہم کو اس بات کی طرف متوجہ کرتا ہے کہ یہ کوئی نئی عبادت نہیں جو نوع انسانی پر ڈالی جارہی ہے بلکہ پچھلی قوموں اور امتوں پر بھی اس کو لازم قرار دیا گیا تھا۔ خصوصاً عاشورہ کے دن حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کو فرعون کے پنجۂ استبداد سے نجات ملی تو یہودیوں نے اس دن روزہ رکھنا شروع کردیا۔ اسی طرح عیسائیوں میں بھی روزہ رکھنے کا دستور تھا مگر انہوں نے جس طرح

اور اعمال صالحہ کو کفار کے عقیدہ کی بنا پر پس پشت ڈال دیا اسی طرح روزہ سے بے توجہی برتی بہر حال دنیا کے تمام مذاہب وملل اور اقوام میں یہ عبادت رائج تھی گو اس کی نوعیت میں کسی قدر اختلاف تھا۔

"لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ" میں فرضیت صوم کی وجہ اور صوم کی حقیقت کو واضح کر دیا ہے۔ نیز اس کا فلسفہ تبلایا جا رہا ہے کہ اس عبادت کے ذریعہ نہ صرف اشخاص کی روحانی اصلاح ہوتی ہے بلکہ اجتماعی زندگی بھی برائیوں سے پاک اور بھلائیوں سے لبریز ہو جاتی ہے مالداروں کو اس چیز کا اچھی طرح احساس ہو جاتا ہے کہ بھوک اور پیاس میں غریبوں پر کیا گذرتی ہوگی۔ اسی کے باعث شکم سیروں اور فاقہ مستوں کو ایک سطح پر کھڑا کیا گیا ہے جس کے ذریعہ مساوات عمومی کا تخیل عملی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ پھر یہی وہ عبادت ہے جس کی وجہ سے ملکوتی قویٰ میں تقویت اور بہیمی جذبات میں کمزوری پیدا ہو جاتی ہے اور خدا رسی اور خدا ترسی کے احساسات تیز سے تیز تر ہو جاتے ہیں۔ گرمی کا موسم ہے سخت پیاس ہو رہی ہے، تن تنہا روزہ دار بیٹھا ہوا ہے اور مکان میں ٹھنڈا پانی رکھا ہوا ہے مگر وہ نہیں پیتا، روزہ دار کو سخت بھوک لگی ہوئی ہے، بھوک کی وجہ سے جسم میں ضعف بھی محسوس ہو رہا ہے کھانا موجود ہے دیکھنے والا بھی کوئی انسان نہیں مگر وہ نہیں کھاتا۔ دل پسند حسین وجمیل بیوی پاس بیٹھی ہوئی ہے، فریفتگی کے جذبات، محبت کی امنگیں دونوں میں موجزن ہیں لیکن ان سب کی طرف روزہ دار کی خواہش نہیں ہوتی اور وہ احتراز کرتا ہے اس لیے کہ اس کے دل میں اس خدا کی عزت اور اس کے حکم کی حرمت بیٹھ چکی ہے جو اس کی ہر ایک کھلی چھپی حالت کو جانتا ہے اور اس خداوند قدوس کا جلال اس کے دل میں سما گیا ہے جس کے آگے کسی کی کوئی قوت نہیں چل سکتی پھر جب انسان اپنے حقیقی پروردگار کے حکم سے جائز، پاکیزہ اور حلال خواہشوں کو چھوڑ دینے کا اپنے آپ کو خوگر بنائے گا تو اسی خدا کے خوف سے حرام، ناجائز اور ناشائستہ حرکتوں کو چھوڑ دینے کی اس میں زیادہ قوت پیدا ہو جائے گی۔ یہی طاقت ہے، جو روزہ دار کے اندر پیدا کر دینا اسلامی شریعت کا مقصد ہے جیسا کہ حدیث نبوی میں وارد ہوا ہے کہ اگر کوئی روزہ دار جھوٹ بولنا، لغو بکنا اور

بیہودہ کاموں کو نہیں چھوڑتا تو خداوند تعالیٰ کو اس کے کھانا پینا وغیرہ ترک کرنے کی کوئی پرواہ نہیں۔
اسی طرح ایک دوسری حدیث میں آیا ہے کہ جب کوئی شخص روزہ رکھے تو نہ بیہودہ باتیں زبان سے نکالے اور نہ شور و شغب کرے اور اگر کوئی اس کو گالیاں دے تو کہدے میں روزہ دار ہوں یہ کام میرے لیے سزاوار نہیں۔

غرض اس عبادت کے ذریعہ انسان میں ملکات فاضلہ پیدا ہوجاتے ہیں اور وہ اس قابل ہوجاتا ہے کہ خلافت الٰہی کی امانت اس کے سپرد کر دی جائے۔ اب اس میں اس اہم کام کے سنبھالنے کی کافی استعداد پیدا ہو چکی ہے۔

**حج** حج کے معنی لغت میں ارادہ کرنے کے آتے ہیں اور عمرہ کے معنی زیارت کرنے اور آباد کرنے کے ہیں۔ اسلامی شریعت کی اصطلاح میں "حج و عمرہ" ان خاص مراسم و عبادات کی ادائیگی کے لیے سفر کرنے کو کہتے ہیں جو بیت اللہ الحرام سے مخصوص ہیں اور جن کے باعث کعبہ کی آبادی ہوتی ہے۔

اسلام کی ان چار بنیادوں میں سے جس پر قصر اسلامی کی عمارت کھڑی ہے ایک حج بھی ہے یہی وہ خاص عبادت ہے جو سوائے بیت اللہ الحرام کے اور کسی مقام پر ادا نہیں کی جاسکتی۔ بخلاف نماز زکوٰۃ اور روزہ کہ ہر مقام پر اپنے اوقات و شروط کے ساتھ ادا ہوسکتے ہیں۔

اب یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ تمام عبادتیں تو مکانی خصوصیت سے علیحدہ ہیں اور صرف یہی عبادت کیوں ایک مکان مخصوص کے ساتھ مختص کر دی گئی ہے حالانکہ تمام روئے زمین خدائے تعالیٰ ہی نے بنائی ہے؟ بے شک تمام زمین خدا ہی کی ہے اور امت محمدی کے لیے کل روئے زمین کو مسجد بنا دیا گیا ہے لیکن ہر خطۂ زمین میں وہ خصوصیات نہیں ہیں جو اس بقعہ نور سے تعلق رکھتی ہیں یہی وہ مقام مبارک ہے جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خدائے تعالیٰ کے حکم سے خانہ کعبہ کی تعمیر فرمائی اور تمام لوگوں میں اس بات کی منادی کر دی کہ پیادہ یا سواریوں پر ہر طرف سے چلے آئیں۔

وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ یَاْتُوْکَ رِجَالًا وَّعَلٰی کُلِّ ضَامِرٍ یَّاْتِیْنَ مِنْ کُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ (حج ۴) اور تم لوگوں میں حج کا اعلان کر دو۔ لوگ تمہارے پاس پیادہ بھی اور دبلی اونٹنیوں پر سوار بھی چلے آئیں گے جو دور دور دراز راستوں سے پہنچی ہوں گی۔

تمام انبیاء کرام میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو چند خصوصیات حاصل ہیں۔ اول یہ کہ آپ ہی تمام قوموں کے مسلم الثبوت پیغمبر ہیں۔ اور آپ ہی کو تمام دنیا والوں کے لیے امام بنایا گیا ہے اور یہ "امامت کبریٰ" کا جلیل القدر منصب بھی بہت سی آزمائشوں سے کامیاب گذرنے اور بہت سی قربانیاں دینے کے بعد عطا کیا گیا ہے۔ پھر حضرت ابراہیم ہی کا وہ خاندان ہے جس میں صدیوں تک نبوت رہی حتّٰی کہ آپ ہی کے خاندان سے خدا کا آخری پیغمبر پیدا ہوا جس کے ہاتھوں دین کی تکمیل ہوئی اور جس اسلام کی حقیقت کو ابراہیم علیہ السلام نے پیش کیا تھا وہ تمام مدارج ارتقا طے کرتا ہوا دور محمدی میں آکر اپنے شباب پر پہنچ گیا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پوری زندگی پر غور کرنے سے "توحید" اور "اسلام" کی حقیقتیں پوری طرح نمایاں ہو جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جس طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو قرآن عزیز نے "اسوۂ حسنہ" قرار دیا ہے اُسی طرح حضرت ابراہیم کی عملی زندگی کو بھی امت اسلامیہ کے لیے نمونۂ عمل بنایا ہے۔

قَدْ کَانَتْ لَکُمْ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ فِیْٓ اِبْرٰھِیْمَ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ۔ تمہارے لیے ابراہیم اور ان کے ساتھیوں میں ایک نمونہ تھا۔

غرض مکۂ مکرمہ کو حضرت ابراہیم کی ذات سے اور حضرت ابراہیم کو "حقائق اسلامی" سے گہرا تعلق ہے جس کی بنا پر اس عبادت کو خانۂ کعبہ ہی کے ساتھ مخصوص کر دیا گیا ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہجرت فرما کر مدینۂ طیبہ تشریف لانے کے بعد بھی حج فرض نہیں ہوا بلکہ مکۂ معظمہ کے فتح ہو جانے کے بعد ۸ھ میں حج و عمرہ کا حکم دیا گیا اور سب سے پہلا حج ۹ھ میں حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کی قیادت میں کیا گیا۔ پھر اس کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ۱۰ھ

میں اعلان فرمایا کہ میں حج کو جانے والا ہوں تو بے شمار پروانے شمع محمدی کے ارد گرد جمع ہو گئے اور یہی آپ کا پہلا اور آخری حج تھا جس کو "حجۃ الوداع" کہتے ہیں جس میں آپ نے نہایت زبردست خطبہ دیا تھا اور اسی وقت تکمیل دین کی بشارت دی گئی تھی۔

بہرحال حج ایک زبردست اسلامی فریضہ ہے جس کے ادا کرنے کے لیے شوال سے ذوالحجہ تک تک کا زمانہ مقرر کیا ہے۔

اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمَاتٌ (سورہ بقر۔ ۲۵) حج کے چند مہینے مقرر ہیں (شوال، ذی قعدہ، اور ذی الحجہ)

اور حج انہیں لوگوں پر فرض ہے جو استطاعت رکھتے ہوں جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِيْنَ۔ (سورۂ آل عمران رکوع ۱۰) اور لوگوں کے ذمہ اللہ کے واسطے بیت اللہ الحرام کا حج کرنا ہے اس شخص پر جو راستے کی طاقت رکھتا ہے (یعنی زاد و راحلہ پر قادر ہو) اور جو منکر ہو جائے تو اللہ تعالیٰ سب عالم والوں سے بے نیاز ہے۔

اس آیۂ کریمہ میں استطاعت کے ہوتے ہوئے حج نہ کرنے کو "کفر" سے تعبیر کیا ہے جو نہایت شدید وعید ہے آج کل عام طور پر یہ خیال ہو گیا ہے کہ حج کو جانے والوں کے لیے یہ ضروری ہے کہ دنیا کے کاموں سے فارغ ہو جائیں۔ خاندانی معاملات طے ہو جائیں۔ خاندان میں ہونے والی شادیاں ہو چکیں۔ غرض جب دنیا میں کوئی کرنے کا کام باقی نہ رہے، تب خدا کے گھر کا رخ کیا جائے۔ حالانکہ اگر دل میں کچھ بھی خدا کی محبت ہو اور حساب و کتاب کا کچھ بھی خیال ہو تو مسلمان کا فرض ہے کہ جس وقت اس میں سفر کی استطاعت پیدا ہو جائے، وہ سب کاموں سے پہلے کعبہ کا رخ کرے۔ حدیث میں ایسے شخص کے لیے سخت وعیدیں آئی ہیں جو استطاعت رکھ کر بھی حج کو نہیں جاتا۔ چنانچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ جو شخص صحیح سالم ہو اور حج کرنے پر قادر ہو پھر ادا نہ کرے اور مر جائے تو چاہے یہودی ہو کر مر جائے یا

عیسائی ہو کر وہ اسلام کی موت تو نہیں مرتا۔

جس طرح اسلام نے ہر عبادت کے اندر فوائد و اسرار رکھے ہیں اسی طرح حج میں بھی بے شمار فائدے اور انگنت دینی و دنیوی منافع اور مصالح ہیں بلکہ اسلامی عبادتوں میں جس ہیئت اجتماعی کی تشکیل مدنظر ہے اس کی تکمیل یہیں آکر ہوتی ہے۔

یہ ایک مسلّم حقیقت ہے کہ وحدتِ اُمت کا تخیل بغیر اس کے جامۂ عمل نہیں پہن سکتا کہ اس امت کے لیے کوئی مرکز مقرر کیا جائے جہاں اطراف عالم کے مسلمان لازمی طور پر جمع ہوں ایک دوسرے کے حال سے واقف ہوں مل کر ایک خدا کی عبادت کریں، ایک مرکز کے گرد گھومیں اور دل میں شعوری طور پر یا غیر شعوری طور پر یہ نقش تازہ کر کے جائیں کہ ہم ایک خدا کے پرستار ایک قوم ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسا قومی اجتماع کسی ایسے مقام پر نہیں ہو سکتا جہاں اگرچہ مادی تمدن کے لوازم اور اس کے طمطراق کی چیزیں تو سب کچھ موجود ہوں مگر کوئی روحانی وقار نہ ہو اسی لیے اس مبارک مقصد کے لیے "وادی غیر ذی زرع" کو منتخب کیا گیا تاکہ اس اجتماع کا مقام ایک ایسا مقام ہو جس سے اسلام کی بہترین روایات وابستہ ہوں، جس کا ذرہ ذرہ خدا کے نام پر مرنے والوں کی زندگی کا شاہد ہو، جہاں آیاتِ الٰہی ہر طرف چھائی ہوئی ہوں اور کفر و شرک کا نام و نشان تک نہ ہو، جہاں امت مسلمہ کو پوری آزادی حاصل ہو اور کوئی خارجی اثر مسلم اور مسلم کے درمیان حائل نہ ہو۔ ایسی فضا میں جب مسلمان جمع ہوں گے تو وہ اپنے دامن نہ صرف روحانی برکتوں سے بھر کر واپس ہوں گے بلکہ ہر قسم کی دنیوی اور مادی منفعتیں بھی ان کو حاصل ہوں گی اسی کی طرف اشارہ ہے قرآن کی اس آیت میں کہ لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ فِي أَيَّامٍ مَّعْلُومَاتٍ۔

یہی سبب ہے کہ دشمنان اسلام نے "خلافت" کے بعد اگر کسی چیز کو بھانپا ہے تو وہ یہی عبادت ہے آئے دن مختلف غیر اسلامی حکومتوں کی طرف سے اس کے راستے میں رکاوٹیں ڈالی جاتی ہیں کہ

کہیں ایسا نہ ہو جائے کہ غلام مسلمان آزاد مسلمانوں سے دادی بطحا میں ملیں اس لیے کہ جب وہ واپس اپنے اپنے ملک کو لوٹ کر جائیں گے تو ظاہر ہے کہ ان میں آزادی کی تڑپ پیدا ہوگی، اور وہ کسی غیر اسلامی حکومت کا جوا اپنی گردن میں ڈالے رہنے کو ہرگز پسند نہ کریں گے، اور خود آزاد مسلمان قوموں میں بھی ان کے لیے ہمدردی و اعانت کے جذبات پیدا ہوں گے۔

الحاصل اسلامی عبادات پر غور کرنے سے یہ چیز اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن حکیم کا مقصد محض ایک ایسی تعلیم پیش کرنا نہیں ہے جو کبھی شرمندۂ عمل نہ ہوسکے بلکہ وہ ایسی تعلیمات پیش کرتا ہے جو نظری اور عملی دونوں اعتبار سے نوع انسانی کے لیے کامیابی کا اعلیٰ ذریعہ بن جاتی ہیں۔ بخلاف اس کے اگر آپ عیسائیوں کی تعلیم پر ایک سطحی نگاہ ڈالیں تو یہ امر بالکل واضح ہو جائے گا کہ جو طریقہ مسیحیت نے انسانی دنیا کے سامنے پیش کیا ہے وہ خالص خیالی فلسفہ ہے جس کو عملی دنیا سے کوئی علاقہ نہیں ہوسکتا کیونکہ وہ انسانی فطرت کے مقتضیات کے مناسب نہیں ہے۔

مثال کے طور پر مسیحیت دنیا کو تعلیم دیتی ہے کہ دشمنوں سے بھی دوستی اور محبت کرنی چاہیے اور جو شخص برائی سے پیش آئے اس کے ساتھ بھی نیک سلوک کرنا چاہیے۔ اگر کوئی سیدھے رخسار پر طمانچہ مار دے تو دوسرا گال بھی اس کے روبرو پیش کر دیا جائے۔ یہ ایک کھلی بات ہے کہ ایسے احکام پر عمل کرنا بہت شاق گزرتا ہے، کسی خود دار، غیرت پسند انسان سے تو یہ ممکن نہیں، ہاں کوئی ذلت پسند اور دنی الطبع اس کو برداشت کرلے تو کرلے۔ اگر اس پر عمل کر لیا جائے گا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ فتنہ و فساد کا بازار گرم ہو جائیگا اور زبردست لوگ کمزور انسانوں کو اپنے ظلم و جور کا تختۂ مشق بنالیں گے اور اگر اس کو رد کر دیا جائے گا تو مسیحیت کے معتقدین کے پاس کوئی ایسا اخلاقی ضابطہ باقی نہ رہے گا جو دنیوی حکمرانی میں ان کو راہ راست پر قائم رکھے نتیجہ یہ ہوگا کہ مسیح کی بھیڑیں منقلب ہو کر بھیڑیوں کی شکل اختیار کریں گی چنانچہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس وقت دنیا میں سب سے زیادہ کشت و خون اور ظلم و ستم وہی لوگ کر رہے ہیں جو مسیح

اور ان کی تعلیم پر ایمان لانے کے مدعی ہیں۔

اسی لیے دین فطرت نے اپنے احکام و قوانین اور اوامر و نواہی کے اصول و فروع کی بنیاد ہی ایسی حکمتوں اور مصلحتوں پر رکھی ہے جو انسانی فطرت کے عین مطابق ہیں، اور ایسی تکلیف کا انسانوں پر بوجھ نہیں ڈالا جو بشری طاقت کی برداشت سے باہر ہو بلکہ قرآن عزیز نے ان مواقع پر جو ہدایات فرمائی ہیں وہ عدل و انصاف اور مساوات پر مبنی ہیں چنانچہ پروردگار عالم کا ارشاد ہوتا ہے۔

وَجَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَیْهِمْ مِّنْ سَبِیْلٍ - اِنَّمَا السَّبِیْلُ عَلَى الَّذِیْنَ یَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَیَبْغُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ۔ (شوریٰ۔ رکوع ۴)

اور برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے، پھر جو شخص معاف کر دے اور اصلاح کرے تو اس کا ثواب اللہ کے ذمہ ہے بے شک اللہ تعالیٰ ظلم کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا اور جو شخص ظلم کیے جانے کے بعد برابر کا بدلہ لے تو ایسے لوگوں پر کوئی الزام نہیں، الزام تو صرف ان لوگوں پر ہے جو اوروں پر ظلم ڈھاتے ہیں اور ناحق ملک کی زمین پر بغاوت پھیلاتے ہیں، انہیں لوگوں کے لیے دردناک عذاب مقرر ہے اور جو شخص صبر کرے اور معاف کر دے تو بے شک بڑے ہمت کے کاموں میں سے ہوگا۔

غور کیجیے کہ قرآن کریم نے عدل و انصاف کا حکم دیا ہے اور عدل کے مراتب کی تشریح کی ہے اور پھر عقلی مصلحت کا کیسا لحاظ کیا گیا ہے۔ کیا ایسی بہترین اصلاح قرآن کے نازل ہونے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے سے پہلے بھی دنیا میں موجود تھی!

مسیح نے اپنے پیرووں کو تعلیم دی تھی کہ "دنیا چھوڑ دو" مال و دولت کو ٹھوکر مار دو! انہوں نے اللہ والوں کی یہاں تک مذمت فرمائی کہ "سوئی کے ناکہ میں اونٹ کا گھسنا تو ممکن ہو سکتا ہے مگر کسی مالدار کا

اللہ تعالیٰ کی بادشاہت میں داخل ہونا ممکن نہیں"۔

شاید ان دو باتوں کو دیکھ کر کوئی سطحی رائے رکھنے والا یہ سمجھ لے کہ یہ دائمی قانون تھا نہیں بلکہ ایسا نہیں ہے۔ یہ ایک وقتی اور عارضی اصلاح تھی کیونکہ یہودیوں میں سرمایہ پرستی بہت بڑھ چکی تھی اور وہ مال کی محبت میں اس درجہ غلو کر گئے تھے کہ اس کے باعث اخلاق اور عادات و دینی رسوم وعوائد تک میں انہوں نے پہلو تہی کرنی شروع کر دی تھی چونکہ یہودی ایک انتہا پر پہنچ چکے تھے اس لیے مسیح ان کی افراط کو توڑنے کے لیے انہیں دوسری انتہا کی طرف لے گئے۔ مگر اعتدال کا مقام انہوں نے نہیں بتایا۔ یہ کام شریعت محمدی کا تھا کہ اس نے دولت و ثروت کے مقابلہ میں ایک معتدل اور قابل عمل ضابطہ سے دنیا کو روشناس کیا۔ اس نے ایک طرف دولت کمانے کے طریقوں میں امتیاز پیدا کیا اور دوسری طرف دولت صرف کرنے کی صورتوں میں تمیز پیدا کی۔ اگر کوئی شخص حلال طریقے سے کمائے اور جائز راستوں میں صرف کرے تو اس کی دولت خواہ وہ کتنی ہی زیادہ ہو، اس کے لیے لعنت نہیں بلکہ رحمت ہے۔ وہ اس کی وجہ سے آسمانی بادشاہت میں داخل ہونے سے روکا نہ جائے گا بلکہ یہی دولت اس کو آسمانی بادشاہت میں لے جائے گی اور بڑے مرتبے دلوائے گی بخلاف اس کے اگر کوئی شخص حرام طریقہ سے کمائے اور حرام طریقوں میں صرف کرے یا جمع رکھے تو اس کی دولت یقیناً اس کے لیے ہلاکت کی موجب ہوگی۔ یہ ہے وہ عدل جو اسلام نے پیدا کیا اور یہی وہ قانون ہے جو دائمی اور عالمگیر بن سکتا ہے۔

خاتمۂ سخن | دین اسلامی کے تینوں ارکان ایمان باللہ، ایمان بالیوم الآخر اور عمل صالح کے متعلق ہم نے کسی قدر تفصیلی روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے حالانکہ اس کی اور بہت کچھ تفصیل کی جا سکتی ہے۔ اور یہی مشترک حقیقت تمام آسمانی مذاہب میں موجود رہی ہے اور جتنی بھی صداقتیں ہم کو نظر آ رہی ہیں وہ سب اسلام ہی اسلام ہیں البتہ قوموں نے اپنی اصلی اور صحیح تعلیمات کو بھلا دیا تھا "وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ" تو خداوند قدوس نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا اور قرآن عزیز

کو نازل کیا، تاکہ قوموں اور ملتوں کی گمراہیاں تبلائی جائیں، ان کی غلط کاریوں کی اصلاح کی جائے، "وحدت نوع انسانی" اپنی صحیح شکل وصورت میں نمودار ہو کر فطرت کے مطابق فاطر السمٰوات والارض ہی کے آگے سرنیاز خم کرے، اَرْبَابٌ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ کی حکومت نیست ونابود ہو جائے، انسان کے کمال فطری کی تکمیل ہو اور وہ "احسن تقویم" کا پورا پورا مظہر بن جائے۔ وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔

---

# مسلمان اور موجودہ سیاسی جنگ[1]

از جناب خان بہادر نواب محمد ذکاء اللہ خانصاحب ایم۔اے

جناب مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مدیر "ترجمان القرآن" نے اسلامی ہند کے مستقبل اور مسلمانوں کے آج کل کی سیاسی کشمکش میں شرکت کے متعلق ایک نہایت اہم مضمون سپرد قلم کیا ہے جو ترجمان القرآن کی گذشتہ چند اشاعتوں میں قسط وار شائع ہوا ہے۔

فاضل مدیر نے اپنے اس مضمون میں مسئلۂ زیر بحث کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ اس قدر خلوص اور سچے جذبۂ اسلامی سے متاثر ہو کر لکھا ہے کہ اس مضمون سے کلاً یا جزاً اختلاف کرتے ہوئے دل دکھتا ہے، لیکن اگر کسی شخص کو مولانا کی رائے سے مسئلۂ ہذا کی بحث کے کسی جزو سے اختلاف ہو جیسا کہ راقم الحروف کو مولانا کے اکثر تسلیم کردہ قضایا اور ان کے نتائج سے ہے، مگر وہ مولانا کے صحیح جذبہ کا لحاظ کرتے ہوئے اپنی اصلی رائے کا اظہار نہ کرے، تو وہ نہ صرف اظہار حق ہی میں قاصر رہیگا بلکہ مولانا ممدوح کے اس مقصد کے فوت کرنے کا باعث بھی ہوگا جو اس بحث کے چھیڑنے سے ہے یعنی اہل الرائے مسلمانوں کا آزادانہ طور پر تبادلۂ خیالات کرنا اور اس کے ذریعہ سے اپنے لیے کوئی متفقہ لائحۂ عمل تجویز کرنا۔

مگر نفس مضمون پر بحث شروع کرنے سے پہلے میں مولانا کو اس امر کی مبارکباد دینا چاہتا ہوں کہ انہوں نے اپنے بیش قیمت رسالہ میں اس بحث کو چھیڑ کر علماء کرام کی توجہ ان سیاسی مسائل کی طرف دلائی، چنانچہ جریدۂ الفرقان (بریلی) نے بھی مولانا کے اس مضمون کے بڑے حصہ کو ماہ جمادی الاولیٰ

[1] ترجمان القرآن۔ اس مضمون میں جتنے اہم نکات بحث طلب ہیں ان پر ہم نے نمبر لگا دیے ہیں تاکہ ہم کو اپنے جواب میں عبارتیں نقل کرنے کی ضرورت پیش نہ آئے ناظرین ہر نمبر کا جواب ساتھ ساتھ دیکھتے جائیں تاکہ انہیں اس بحث کے سمجھنے میں کوئی الجھن نہ پیش آئے:

کی اشاعت میں ایک موثر نوٹ کے ساتھ نقل کیا ہے۔ امید ہے کہ مولانا کے مضمون کا یکے بعد دیگرے ان اہم دو رسالوں میں شائع ہو جانا ضرور علماء کرام کی توجہ کا باعث ہوگا اور علماء کرام ضروری بحث و تمحیص کے بعد کوئی سیدھا سیدھا طریق کار تجویز فرما دیں گے اور وہ بھی جلد از جلد کیونکہ اب ایک منٹ بلکہ ایک لمحہ کے ضائع کرنے کی بھی مہلت نہیں ہے۔

مضمون مذکور کی نسبت سب سے پہلے جو کچھ میں عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ مضمون اس قدر بلند پایہ اور فاضلانہ ہے کہ اس کو خواص ہی سمجھ سکتے ہیں اور وہی اس سے مستفید ہو سکتے ہیں، عوام کے فہم و ادراک سے وہ بالاتر ہے حالانکہ کسی ایسے مسئلہ کی بابت جو سیاسیات سے متعلق ہو اور جس کی نسبت اس امر کی ضرورت ہے کہ ہر خاص و عام اپنی رائے قائم کرنے کے لیے غور و فکر کرے، اور اس پر عمل کرنے کی کوشش کرے اس بات کی ضرورت تھی کہ بحث عام فہم ہوتی تاکہ عوام اس سے فائدہ اٹھا سکتے۔

اب اصل بحث کی طرف رجوع کرتے ہوئے مجھکو یہ عرض کرنا ہے کہ لائق مضمون نگار نے ایک نہایت فاضلانہ تمہید میں سیاسی کام کرنے کے اکثر ان طریقوں کو غلط اور مسلمانوں کے لیے مضر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے جن پر مسلمانوں کے مختلف گروہ آجکل عمل پیرا ہیں لیکن نہایت طول طویل مباحث کے بعد خود جو طریقہ کار مسلمانوں کے لیے تجویز کیا ہے اگر اس کے سمجھنے میں میں غلطی پر نہیں ہوں تو وہ طریقہ بالکل ہی ناقابل العمل اور غیر ممکن الوقوع معلوم ہوتا ہے، چنانچہ فاضل مضمون نگار تحریر فرماتے ہیں کہ۔

"مذکورۂ بالا حقائق کو پیش نظر رکھکر جب آپ غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ ہمارے لیے اب صرف ایک ہی راستہ باقی ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم ہندوستان کی آزادی کے لیے جنگ میں شریک ہونے سے پہلے اپنی کمزوریوں کو دور کریں اور اپنے اندر وہ طاقت پیدا کریں جس سے ہندوستان کی آزادی کے ساتھ ہی ساتھ مسلمان کی آزادی کا حصول ممکن ہو اس غرض کے لیے ہمکو اپنی قوتیں جن کاموں پر صرف کرنا چاہئیں وہ حسب ذیل ہیں۔"

اس کے بعد مولنا موصوف نے اُن کاموں کو گنایا ہے جن پر جنگ آزادی میں شرکت کرنے سے پہلے ہمکو اپنی قوتیں صرف کرنا چاہئیں اور وہ بالفاظ مولنا مختصراً یہ ہیں:

(۱) مسلمانوں میں ایک وسیع پیمانہ پر اصول اسلام اور قوانین شریعت کا علم پھیلایا جاوے۔

(۲) علم کی اشاعت کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو عملاً بھی احکام اسلام کا تبع بنانے کی کوشش کی جاوے۔

(۳) مسلمانوں کی رائے عامہ کو اس طرح ترتیب دیا جائے کہ وہ غیر اسلامی طریقوں کے رواج کو روکنے پر مستعد ہو جاویں۔

(۴) ہمیں اپنی اجتماعی قوت کو اتنا مضبوط کر لینا چاہیے کہ ہم اپنی جماعت کے غداروں اور منافقوں کا استیصال کر سکیں۔

(۵) ہمیں اس امر کی کوشش کرنی چاہیے کہ مسلمانوں کی قیادت کا منصب ایک ایسی جماعت کے قبضہ میں آجاوے جو ہندوستان کی کامل آزادی کے لیے دوسری ہمسایہ قوموں کے ساتھ اشتراک عمل کرنے پر تو آمادہ ہو مگر اسلامی مفاد کو کسی حال میں قربان کرنے پر آمادہ نہو۔

(۶) مسلمانوں میں ایسا اتحاد عمل پیدا کر دیا جائے کہ وہ سب تن واحد کی طرح ہو جاویں اور ایک مرکزی طاقت کے اشاروں پر حرکت کرنے لگیں۔"

یہ مقاصد بہت اعلیٰ و ارفع ہیں اور ہر مسلمان کو ان کے حصول کی کوشش کرنا چاہیے مگر فاضل مضمون نگار نے یہ نہیں تبلایا کہ ان مقاصد کے حصول کے لیے اندازاً کس قدر مدت درکار ہوگی؟ اور اگر یہ مقاصد ایسے ہیں کہ ان کے حصول کے لیے صدیاں بھی کم ہیں۔ (۱) ۔ تو کیا ہندوستان کی سیاسی جنگ اس وقت تک کے لیے ملتوی رہے گی جبتک مسلمان ان مقاصد کے حصول میں کامیاب نہو جاویں، نیز اس نتیجہ پر پہنچنے میں مولنا سے یہ بات بھی نظر انداز ہو گئی ہے کہ سیاسی یا آزادی کی جنگ کا شروع کرنا

یا کم از کم مسلمانوں کی مرضی پر منحصر نہیں ہے کہ ہم جب چاہیں تب ہی جنگ شروع ہو اور جب تک ہم نہ چاہیں وہ شروع نہ ہو۔ سیاسی یا آزادی کی جنگ تو بہت عرصہ ہوا شروع ہو چکی اور برادران وطن بہت سے معرکے سر بھی کر چکے اور نئے معرکوں کے فتح کرنے کی تیاریوں میں مشغول ہیں۔ پس ایسی صورت میں ہم مسلمان یہ کیسے کہہ سکتے ہیں اور کس منہ سے کہہ سکتے ہیں کہ۔

"بھائیو! ذرا ٹھیرو، ہمیں بھی تیار ہو جانے دو، تب جنگ شروع کرنا"

ہماری ایسی آواز کو کون سن سکتا ہے؟ اور اس پر ایک لمحہ کے لیے بھی کان دھر سکتا ہے؟ (۲)

سیاسی جنگ تو اصل میں ۱۸۸۵ء یا ۱۸۸۶ء میں شروع ہوئی تھی جبکہ کانگریس پہلے پہل عالم وجود میں آئی، سر سید احمد خاں نے مسلمانوں کو کانگریس سے الگ رہنے کا مشورہ دیا اور مسلمانوں کے لیے ایک جداگانہ لائحہ عمل تجویز کیا جس پر مسلمان ۱۹۰۵ء یا ۱۹۰۶ء تک عامل رہے اور اس کے بعد مسلم لیگ وجود میں آئی مگر سیاسی جنگ برابر جاری رہی، یہاں تک کہ ۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم شروع ہو گئی اور جنگ کے دوران ہی میں مسٹر مانٹیگ (Montague) حکومت برطانیہ کی طرف سے بھیجے ہوئے ہندوستان آئے اور انہوں نے حکومت برطانیہ کی طرف سے اعلان کیا کہ "وہ آئندہ ہندوستانیوں کو حکومت میں مزید اختیارات دیے جائیں گے"۔ چنانچہ جنگ کے ختم ہوتے ہی Montague - chamsford Reforms) یا مانٹیگ چمسفرڈ نامی اصلاحات وجود میں آئیں مگر ہندوستانی ان اصلاحات سے مطمئن نہ ہوئے اور نتیجہ یہ ہوا کہ (Non - Cooperation) یا عدم تعاون کی تحریک شروع ہوئی جو ۱۹۲۰ء و ۱۹۲۱ء میں بہت زور پر رہی اس تحریک میں مسلمانوں نے بھی بڑے پیمانہ پر حصہ لیا کیونکہ مسئلہ خلافت کے متعلق دول یورپ نے جو فیصلہ کیا تھا اس سے مسلمانوں میں سخت بے چینی پھیل گئی تھی اس لیے مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کانگریس کی شریک کار بن گئی اور (Non - Cooperation) یا عدم تعاون اور (Civil disobidience) کی تحریک کو دبانے میں گورنمنٹ کی طرف سے جو تعزیری

کارروائیاں عمل میں آئیں اُن کو ہندوؤں کے ساتھ مسلمانوں نے بھی برابر کے درجہ میں برداشت کیا چنانچہ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۲۲ء تک جو مسلمان عدم تعاون کی تحریک کے سلسلہ میں جیل گئے ان کی تعداد ہندوؤں کے مقابلہ میں آبادی کا لحاظ رکھتے ہوئے کسی طرح کم نہ ہو گی۔

۱۹۲۲ء کے بعد بعض ان وجوہ سے جن کی تفصیل یہاں غیر ضروری ہے ہندو مسلمانوں کی راہیں پھر الگ ہونا شروع ہوگئیں اور مسلمان رفتہ رفتہ کانگریس سے علیٰحدہ ہونے لگے۔ چنانچہ ۱۹۳۱ء و ۱۹۳۲ء میں عدم تعاون کی تحریک نے جب دوبارہ زور پکڑا تو اس تحریک میں مسلمانوں کا حصہ نسبتاً بہت کم تھا۔ ۱۹۳۲ء کے آخر تک لارڈ ولنگ ڈن کی گورنمنٹ عدم تعاون اور (Civil disobidience) کی تحریک کو دبانے میں بڑی حد تک کامیاب ہوئی، لیکن کانگریس نے اگرچہ (Civil disobidience) کی تحریک کو اٹھا لیا تاہم اُسنے اپنا پروپگنڈا عوام میں کاشتکاروں اور مزدوروں میں برابر جاری رکھا اور چونکہ یہ پراپگنڈا امن عامہ کے مناقض نہیں تھا اس لیے گورنمنٹ نے بھی اس سے کچھ تعرض نہیں کیا نتیجہ یہ ہوا کہ کانگریس کا اثر عام رائے دہندگان پر بڑھتا گیا ادہر گورنمنٹ برطانیہ نے تینوں گول میز کانفرنس (The Three Round Table Conferences) کی تجاویز کے مطابق گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ آف ۱۹۳۵ء پاس کرا دیا جس کی رو سے صوبہ جات میں کم از کم ہم ہندوستانیوں کو بہت کچھ اختیارات دیدئیے گئے ہیں۔ چونکہ کانگریس نے ۱۹۳۲ء سے مسلسل کاشتکاروں، دستکاروں اور مزدوروں میں اپنا پروپگنڈا جاری رکھا تھا اور اس کے علاوہ کوئی سیاسی پارٹی اپنے منظم طریقہ اور ایسی جد وجہد سے عوام میں کام نہیں کررہی تھی اس لیے گذشتہ انتخابات میں کانگریس کو بہت ہی بڑے پیمانہ پر کامیابی حاصل ہوئی یعنی ہندوستان کے گیارہ صوبوں میں سے پانچ بڑے صوبوں یعنی بہار، ممالک متحدہ آگرہ و اودھ، ممالک متوسط، مدراس اور بمبئی میں کانگریس ہی کو کامیابی ہوئی اور اس وقت ان سب صوبوں میں کانگریس ہی کی وزارت کام کررہی ہے۔

پس جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا تھا کانگریس پارٹی آدھا معرکہ آپ سے پہلے ہی سر کر چکی ہے۔ اب اس کو صرف گورنمنٹ ہند میں اکثریت حاصل کرنے یا نہ کرنے کا معرکہ باقی رہ گیا ہے، اس لیے مسلمانوں کا یا مسلمانوں کے کسی خاص گروہ کا یہ کہنا کہ ہم ابھی جنگ کے لیے تیار نہیں ہیں کوئی معنی نہیں رکھتا۔ ہم جیسے کچھ بھی ہیں اسی حالت میں ہم کو جنگ کرنا ہوگا، اگر ہمارے پاس اس جنگ کے لیے آلات نہیں ہیں تو ہم کو نہتے ہی لڑنا پڑے گا، اگر ہمارے ہتیار پرانے، دقیانوسی اور زنگ آلود ہیں تو انہیں دقیانوسی ہتیاروں کو استعمال کرنا ہوگا، یہ ایک بات ہے کہ دوران جنگ ہی میں ہم اپنے ہتیاروں کو صیقل اور انکا زنگ دور کرتے جاویں یا اور نئے ہتیار تیار کرتے جاویں، اور دراصل ہم کو ضرور ایسا ہی کرنا پڑے گا کیونکہ اس کے سوائے ہمارے لیے کوئی چارہ ہی نہیں ہے اس وقت اس کا بھی موقع نہیں ہے کہ ہم اپنے میں سے کسی خاص گروہ کو اس سیاسی جنگ سے خارج کرنے کی کوشش کریں، اور نہ اس کا موقع ہے کہ پرانے تعلیمیافتہ لوگ نئے تعلیمیافتہ طبقہ کو اس سیاسی جنگ سے یہ کہکر خارج کردیں کہ تم اس کے اہل نہیں ہو اور اس لئے ان کو پرچم آزادی کے تلے کھڑے ہونیکی اجازت نہ دی جائے۔ اور نہ جدید تعلیمیافتہ حضرات کو اس امر کی گنجائش ہوسکتی ہے کہ وہ پرانے تعلیمیافتہ بزرگوں کو اس مدافعانہ جنگ سے خارج کرنے کی کوشش کریں، بلکہ ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ اس وقت سب مسلمان متفق، متحد، یکدل اور یک زبان ہو کر اس مدافعانہ جنگ میں حصہ لیں۔ اور کانھم بنیان مرصوص کا صحیح مصداق بن کر دنیا پر ثابت کردیں کہ مسلمان ابھی زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے، اور نیز یہ کہ دنیا کی کوئی طاقت کوئی قوت اور کوئی تدبیر اس نور الٰہی کو بجھا نہیں سکتی جسکے مسلمان حامل ہیں۔ (۳)

مضمون کے اصل موضوع سے بحث کا جس قدر تعلق تھا وہ یہاں ختم ہوجاتا ہے لیکن فاضل مضمون نگار نے دوران تحریر میں بہت سی وہ ضمنی بحثیں بھی چھیڑ دی ہیں جو مضمون کے اصل

موضوع سے کچھ زیادہ متعلق نہ تھیں؛ اور چونکہ انہیں ضمنی بحثوں کو بہت زیادہ اہمیت دیگئی ہے اور میرے خیال میں یہی ضمنی بحثیں اصل موضوع سے زیادہ حضرات علماء کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کریں گی اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان ضمنی بحثوں کی بابت بھی تھوڑا بہت اظہار خیال کیا جاوے مگر ان ضمنی بحثوں میں ہر ایک بحث کے متعلق تنقید کرنا خالی از طوالت نہو گا۔ تاہم ان میں سے بعض کی بابت کچھ نہ کچھ لکھنا ضروری معلوم ہوتا ہے تاکہ ناظرین کرام کے سامنے تصویر کے ہر دو رخ آجا دیں؛

ان ضمنی بحثوں میں سے جو ضروری ہیں وہ مولنا موصوف کے الفاظ میں حسب ذیل ہیں۔

"سیاسی اقتدار سے محروم ہونے کے بعد جاہ اور عزت کی بھوک پیدا ہوئی اور معاشی وسائل سے محروم ہونے کے بعد روٹی کی بھوک۔ ان دونوں چیزوں کے حصول کا دروازہ صرف ایک ہی رکھا گیا اور وہ مغربی تعلیم کا دروازہ تھا۔ روٹی اور عزت کے بھوکے لاکھوں کی تعداد میں ادھر لپکے۔ وہاں ہاتف غیب نے پکار کر کہا کہ آج روٹی اور عزت مسلمان کے لیے نہیں ہے یہ چیزیں اگر چاہتے ہو تو نامسلمان بن کر آؤ...... مسلمان جب مغربی تعلیم کی طرف گئے تو یہی کچھ سوچ کر گئے۔ زبانوں نے گو ایسا نہیں کہا مگر جذبات وتخیلات تو کچھ ایسے ہی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ کم و بیش نوے فی صدی لوگوں پر اس تعلیم کے نہایت مہلک اثرات مرتب ہوئے...... وہ کچھ نہیں جانتے کہ اسلام کیا ہے؟ اور مسلمان کس کو کہتے ہیں؟ اور اسلام اور غیر اسلام میں کیا چیز مابہ الامتیاز ہے۔ خواہشات نفس کو انہوں نے اپنا معبود بنالیا ہے اور یہ معبود انہیں اس مغربی تہذیب کی طرف لیے جارہا ہے جس نے نفس کی ہر خواہش اور لذت نفس کی ہر طلب کو پورا کرنے کا ذمہ لے رکھا ہے...... وہ اہل فرنگ کی ایک ایک ادا پر جان نثار کرتے ہیں۔ ...... نماز پڑھنا ان کے یہاں معیوب ہے اتنا معیوب کہ جو شخص نماز پڑھتا ہے اُسے

ان کی سوسائٹی میں بنایا جاتا ہے بخلاف اس کے سینما جانا ان کے نزدیک نہ صرف مستحسن بلکہ ایک مہذب انسان کے لیے لوازم حیات میں سے ہے'۔ ان میں اب وہ طبقہ سرعت کے ساتھ بڑھ رہا ہے جو مذہب اور خدا سے اپنی بیزاری کو چھپانے کی بھی ضرورت نہیں سمجھتا اور صاف کہنے لگا ہے کہ ہمیں اسلام سے کوئی تعلق نہیں..... یہ چیز اب تک ہمارے مردوں میں تھی مگر اب عورتوں میں بھی پہنچ رہی ہے ...... ان کو بھی اسلام اور اس کی تہذیب سے بیگانہ اور مغربی تہذیب اور اس کے طور و طریق سے آراستہ کیا جا رہا ہے"۔

المختصر مولنا کے خیال کے مطابق گذشتہ ستر سالہ مغربی تعلیم کے اثر سے مسلمان مسلمان نہیں رہے اور نیز یہ کہ گذشتہ ڈیڑھ صد سالہ غلامی کیوجہ سے مسلمانوں میں جو قومی لی اور اخلاقی کمزوریاں اس دور کی ابتدا میں تھیں ان میں بہت زیادہ اضافہ ہوگیا اور ان کے علاوہ بھی دوسری اور نئی کمزوریاں ان میں پیدا ہوگئیں، خود غرضی انفرادیت، اور نفس پرستی کی وجہ سے قومیت کا احساس مسلمانوں سے مٹتا جا رہا ہے اور ان کی اجتماعی طاقت فنا ہو رہی ہے۔

متذکرہ بالا اقتباسات میں مولانا نے مسلمانوں کی موجودہ حالت کی بابت عموماً اور مغربی تعلیم نیز مغربی تعلیمیافتہ گروہ کی بابت خصوصاً جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے وہ اگرچہ بہت زیادہ مایوس کن ہیں مگر چونکہ خیالات بالکل نیک نیتی پر مبنی ہیں اس لیے کسی کو مولنا سے کسی شکایت کا موقع نہیں ہے اور معمولاً راقم الحروف اس بحث میں پڑنا پسند نہیں کرتا کہ مولنا کے یہ خیالات کہاں تک صحیح ہیں؟ مگر چونکہ علماء کے گروہ کو مغربی تعلیم سے اب تک اجتناب اور مغربی تعلیمیافتہ گروہ کی طرف سے ہمیشہ سوء ظن رہتی رہا ہے اور اب بھی ہے اس لیے خطرہ تھا کہ فاضل مضمون نگار کے یہ خیالات جن کو نہایت ہی قوی اور موثر طریقہ سے ظاہر کیا گیا ہے اور جن کا مختصر سا نمونہ میں نے اوپر کے اقتباسات میں ہدیہ ناظرین کیا ہے علماء کے مغربی تعلیم کی طرف سے اجتناب اور مغربی تعلیمیافتہ گروہ کی طرف سے بدظنی کو کہیں اور زیادہ

نہ بڑھا دیں جس کی وجہ سے علماء کا گروہ نئے تعلیمیافتہ گروہ کے ساتھ موجودہ سیاسی جنگ میں بھی اشتراک عمل پسند نہ کرے حالانکہ ضرورت اس وقت اس بات کی ہے کہ مسلمانوں کا ہر گروہ متفق، متحد، ایک رائے اور یک دل ہو کر موجودہ سیاسی جنگ میں حصہ لے۔ اس بارہ میں جو کچھ میں آئندہ عرض کرنے والا ہوں وہ صرف اسی مقصد کو مدنظر رکھکر عرض کروں گا۔

یہ تسلیم ہے کہ ہم میں خود غرضی و انفرادیت ہے، ہماری اجتماعی طاقت بہت ہی کمزور ہے مگر یہ سب کچھ الفاظ اضافی ہیں۔ ہمکو اپنی کمزوری بمقابلہ دیگر ہمعصر اقوام کے تسلیم ہے مگر یہ تسلیم نہیں ہے کہ ہماری موجودہ حالت اب سے ڈیڑھ صدی پہلے کی حالت سے زبون تر اور زیادہ خراب ہے اور مذکورہ بالا اخلاقی خرابیاں اور سیاسی کمزوریاں پہلے سے بہت زیادہ ہوگئی ہیں۔ اگر کسی قوم کا سیاسی زوال اور محکومیت اس میں اخلاقی خرابیاں پیدا کرنے کو مستلزم ہوتا تو ہندوؤں کو تو محکومیت کی حالت میں اب سے تقریباً ایک ہزار برس گذر گئے مگر ظاہر ہے کہ ان کی موجودہ اخلاقی تعلیمی اور اقتصادی حالت بمقابلہ آج سے ایک ہزار برس پہلے کے بہت اچھی اور بہتر ہے۔ مسلمانوں کی ہی حکومت کے زمانہ میں انہوں نے بہت سی علمی اور ذہنی ترقیاں کیں، عام بت پرستی سے انہیں کے بہت سے گروہوں نے توحید کی طرف رجوع کیا، اور ان کی موجودہ ہر قسم کی ترقی تو کسی تشریح اور توضیح کی محتاج نہیں ہے۔ (۴)

پس مسلمانوں کی بابت بھی یہ کہنا کہ وہ گذشتہ ڈیڑھ صدسالہ عرصہ میں زندگی کے ہر شعبہ میں زوال اور انحطاط ہی کی طرف گئے ہیں راقم الحروف کے نزدیک صحیح نہیں ہے، مسلمانوں نے بھی اس ڈیڑھ صدی میں کچھ نہ کچھ ترقی کی مگر ہندوؤں کے مقابلہ میں بہت کم چنانچہ سلطنت مغلیہ کے انتزاع کے وقت یعنی اٹھارہویں صدی کے وسط میں مسلمانوں کی حالت ہر حیثیت سے اس قدر پست ہو چکی تھی کہ اس سے زیادہ پست حالت کا نقشہ ذہن میں آنا مشکل ہے۔ ۱۷۶۱ء میں مسلمانوں کی سیاسی طاقت نے

بالکل فنا ہونے سے پہلے ایک آخری سنبھالا لیا تھا جبکہ شمالی ہند میں روہیلوں نے بسرکردگی نواب نجیب الدولہ و بامداد احمد شاہ ابدالی مرہٹوں کی متفقہ قوت کو پانی پت کے میدان میں ایک بڑی شکست دی تھی۔ اس کے بعد شمالی ہند میں مسلمانوں کی سیاسی قوت بجائے صفر کے رہ گئی۔ اس زمانہ میں سات سمندر پار سے ایک قوم ہندوستان میں تجارت کی غرض سے آتی ہے اُس کی بہت ہی محدود قوت مغلوں کی اسلامی سلطنت سے ٹکراتی ہے اور آن کی آن میں یہ اسلامی سلطنت پاش پاش ہو جاتی ہے۔ اس دوران انتزاع میں مسلمانوں کا کوئی گروہ خواہ وہ گروہ علماء کا ہو، یا امراء کا، خواص کا ہو یا عوام کا غرض کوئی گروہ بھی ایسا کھڑا نہیں ہوتا جو اس اسلامی سلطنت کو اس انتزاع سے بچا سکے یا بچانے کی کوشش بھی کرے۔ البتہ حضرت مولٰنا شاہ محمد اسمٰعیل صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ نے منروا خیر وقت میں علم جہاد بلند کیا مگر وہ بھی سکھوں کے خلاف۔ انگریزوں کے خلاف نہیں۔

اس وقت کی تاریخ کے مطالعہ سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ اس وقت کے مسلمانوں میں اپنے دین یا اپنی قوم کی حفاظت کا کوئی جذبہ باقی تھا، بلکہ بجائے اس کے کہ مسلمان متفق ہو کر اپنے ملک اپنی قوم، اور اپنے مذہب کی حفاظت کرتے وہ ایک دوسرے کے ساتھ غداری کرتے نظر آتے ہیں۔ بنگال میں میر قاسم اور میر جعفر اور سراج الدولہ ایک دوسرے کے ساتھ غداری کرتے ہیں تو وسط ہند میں شجاع الدولہ انگریزوں کی مدد سے روہیلوں کا استیصال کرتا ہے جس کا نتیجہ خود شجاع الدولہ اور اس کے جانشینوں کے واسطے یہ نکلتا ہے کہ اس برائے نام فتح کے بعد شاہان اودھ کی حیثیت شاہ شطرنج سے زیادہ نہیں رہتی۔

اسی طرح یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ ہماری موجودہ اقتصادی اور تعلیمی حالت آج سے ڈیڑھ سو سال پہلے کی حالت سے ابتر ہے۔ طوائف الملوکی اور آئے دن کی خانہ جنگیوں میں کسی قوم کی اقتصادی حالت کیا خاک درست رہ سکتی ہے؟

علی ہذا یہی کیفیت تعلیمی حالت کی تھی عمومی تعلیم تو بالکل ہی مفقود تھی دینی تعلیم ضرور بعض بزرگوں کے طفیل دینی علم روشنی محل لکھنؤ اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی کے خاندان سے جاری رہی اور حقیقت میں ہم سب مسلمانوں کو ان بزرگوں کا مشکور ہونا چاہیئے، مگر نہیں کے پایہ کی آج موجودہ ہند میں دارالعلوم دیوبند، دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ اور دیگر اسلامی درسگاہیں موجود ہیں۔

پس جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں ہماری موجودہ حالت آج سے ڈیڑھ سو برس پہلے کی حالت سے بدتر نہیں ہے۔ البتہ اس درمیان میں ہم نے اُس سرعت رفتار سے ترقی نہیں کی جسکے ساتھ دوسری ہمسایہ اقوام نے ترقی کی ہے اور کسی قوم کا اپنی ہمسایہ اور ہمعصر اقوام کی رفتار پر ترقی نہ کرنا ہی اس کے تنزل کا مترادف ہے۔

دیگر اقوام ہند کی ترقی کی رفتار کے مطابق ہماری ترقی نہ کرنے کے مختلف اسباب ہیں اول تو ہم جدید تعلیم کی طرف بمقابلہ دیگر اقوام کے دیر سے آئے دوسرے یہ کہ جو سیاسی پالیسی سرسید احمد خاں نے مسلمانوں کے واسطے تجویز کی تھی اور جس پر کم و بیش ۱۹۰۶ء تک مسلمان عامل رہے وہ پالیسی ایسی تھی جس نے مسلمانوں کو اپنے پیروں پر کھڑا ہونا نہیں سکھلایا۔ اس لیے ہم سیاسیات میں دیگر اقوام ہند سے پیچھے رہ گئے اور اب اس کی ضرورت ہے کہ ہم اوروں سے تیز چل کر تلافی مافات کی کوشش کریں۔

علی ہذا یہ تسلیم ہے کہ مغربی تعلیم جس سے علوم اور انکشافات جدیدہ کی تعلیم مراد ہے وہ اپنے متعلمین میں نئے خیالات اور نئے احساسات پیدا کرتی مگر یہ تسلیم نہیں کہ علوم جدیدہ کی تعلیم میں فی نفسہ کوئی ایسی بات ہے کہ وہ ایک مسلمان کو عقائد اسلام سے پھیر دے، وہ علوم جدیدہ کیا ہیں؟ یہی نا! کہ حقائق عالم کی بابت نئے نئے انکشافات، پس یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ مسلمانوں کو ان نئے انکشافات کا علم اُن کے معتقدات سے کیوں برگشتہ کر دیگا؟

کہا جائیگا کہ جس ماحول میں ان نئے انکشافات کی تعلیم دی جاتی ہے وہ ایسا ہے کہ مسلمان طالب علموں کے دینی عقائد کو ایک حد تک متزلزل کر دیتا ہے۔ یہ بات ایک حد تک قابل تسلیم ہے مگر اس کا علاج یہ تو نہیں ہے کہ ہم ان علوم جدیدہ کی تعلیم کو ممنوع قرار دیدیں، اور اپنے گرداگرد ایک حصار کھینچ لیں کہ نئے انکشافات کی روشنی ہم تک پہنچ ہی نہ سکے بلکہ اگر ہم مسلمان اپنے گرداگرد ایک حصن حصین کھینچ لیں تب بھی ہم اپنے آپ کو ان نئے خیالات کے اثر سے محفوظ نہیں رکھ سکتے"۔[۵]

فاضل مضمون نگار کو خود تسلیم ہے کہ علاوہ دیگر مغربی خیالات کے ایک نیا مغربی تخیل جو (Communism) یا اشتراکیت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے ہندوستان میں پھیلتا جا رہا ہے، فاضل مضمون نگار کی رائے سے مجھے اتفاق ہے مگر عام ناظرین کی اطلاع کے لیے میں یہ عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ یہ وہ تخیل ہے کہ جس کے خلاف یورپ کی تمام سرمایہ دار اقوام گذشتہ پندرہ بیس سال سے علم جہاد بلند کئے ہوئے ہیں۔ اور جس تخیل کی ہندوستان میں اشاعت کے خلاف گورنمنٹ آف انڈیا ابتدا ہی سے ایڑی چوٹی کا زور لگائے ہوئے ہے مگر تاہم ہندوستان میں Communism کے تخیل کی اشاعت کو روکا نہ جا سکا۔

لہذا علماء اگر مسلمانوں کو نئے علوم اور نئے خیالات کے اثرات سے (اگر کچھ ہوں) محفوظ رکھنا چاہتے ہیں تو اس کا علاج اگر ہے تو صرف یہی کہ علماء خود اُن اداروں میں ان علوم جدیدہ کو جاری کریں جو ان کے زیر اثر یا زیر اہتمام کام کر رہے ہیں تاکہ ان علوم جدیدہ کی تعلیم ایسے ماحول میں دیجا سکے جس سے متعلمین کے مذہبی عقائد پر کوئی برا اثر نہ پڑسکے۔

یہاں پہونچکر یہ کہا جائے گا کہ عربی مدارس کے ذرائع آمدنی ایسے نہیں ہیں کہ وہ اپنے یہاں علوم جدیدہ کی تعلیم کا انتظام کر سکیں، اور یہ بالکل صحیح ہے لیکن اگر علماء مجھکو معاف فرما دیں تو میں عرض کرونگا کہ اس موجودہ مالی حالت کے سقم کا ذمہ دار ایک حد تک خود علماء کا ہی گروہ ہے، اس لیے

کہ تعلیم دین جو عربی مدارس میں دی جاتی ہے وہ تو لازمی چیز تھی کیونکہ وہی مقصود بالذات ہے، مگر اس کے ساتھ ساتھ اس کی کیا ضرورت تھی کہ طلبہ کا بہت سا وقت منطق اور فلسفہ قدیم کی تعلیم میں صرف کرایا جاوے؟ اور ان کے مقابلہ میں کارآمد علوم جیسے ریاضی، تاریخ، جغرافیہ وغیرہ کی تعلیم سے ان کو محروم رکھا جائے پس اگر ہمارے عربی مدارس دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ مفید دنیوی تعلیم بھی اپنے نصاب میں شامل کر لیتے تو کوئی وجہ نہ تھی کہ مسلمان پبلک عربی مدارس کی مالی امداد کما حقہٗ نہ کرتی۔ اس لیے اگر عربی مدارس کے موجودہ سقم مالی کی بابت یہ عرض کیا جائے تو کچھ بیجا نہ ہوگا کہ ؎

نقص در دوستی ماست کہ او دشمن ماست آن محبت بہ چہ ارزد کہ سرایت نکند

عربی مدارس کی مالی حالت گو عموماً گری ہوئی ہے تاہم کچھ عربی مدارس ایسے ضرور ہیں کہ وہ اپنی مالی حالت کا لحاظ کرتے ہوئے علوم جدیدہ کی تعلیم کی کم از کم ابتدا ضرور کر سکتے ہیں مثلاً دارالعلوم دیوبند یا دارالعلوم ندوہ میری رائے میں ایسے ہی ہیں بشرطیکہ ان کے ارباب حل و عقد اس طرف توجہ کریں۔

لیکن عربی مدارس جب تک اپنے یہاں علوم جدیدہ کی تعلیم کا انتظام نہیں کر سکتے اس وقت تک کے لیے میں ایک دوسری تجویز علماء کرام کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ عربی مدارس کے فارغ التحصیل طلبہ کی ایک معین تعداد نئی تعلیم کے مسلم اداروں میں (مثلاً مسلم یونیورسٹی علی گڑھ یا اسلامیہ کالج لاہور) جدید تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیجے جاویں اور یہ کچھ مشکل امر نہیں ہے کہ نئی تعلیم کے ان مسلم اداروں کے منتظمین سے یہ بات طے کر لی جاوے کہ وہ عربی مدارس کے ان فارغ التحصیل طلبہ کے لیے ایک خاص کلاس کھول دیں جس میں ان کو کم سے کم وقت میں زائد سے زائد علوم جدیدہ کی معلومات حاصل کرنے کا موقع ملے۔ ایسے طلبہ کے لیے وظائف کا انتظام بھی ممکن ہے مگر ابتداءً وظائف اُن کو اس شرط پر دیئے جاویں کہ وہ بعد فراغت کے عربی مدارس میں درس و تدریس کا کام اپنے ذمہ لیں گے۔ نیز یہ کہ نئی تعلیم کے مسلم اداروں کی دینی تعلیم بھی آئندہ انہیں لوگوں کے سپرد کی جائیگی۔

میرے نزدیک یہ تجویز کوئی ناقابل عمل تجویز نہیں ہے۔ اگر فریقین کے ارباب حل و عقد ایک جگہ بیٹھ کر اس تجویز کو عملی جامہ پہنانا چاہیں تو بہت آسانی کے ساتھ وہ ایسا کر سکتے ہیں۔ مگر غالباً یہ سوال ہوگا کہ اس کی ابتدا کون فریق کرے؟ پس اگر علمائے دینی تعلیم کے ان مسلم اداروں کو اس قابل سمجھتے ہوں کہ ان کے یہاں کے فارغ التحصیل طلبا ان اداروں میں جا کر نئی تعلیم حاصل کریں تو اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کی تحریک نئے تعلیمیافتہ گروہ کی طرف سے ہی ہو سکتی ہے۔

مغربی تعلیم کے ساتھ نئے تعلیمیافتہ گروہ کا جو نقشہ مولانا نے کھینچا ہے اور جس کا کچھ نمونہ میں نے اقتباسات متذکرۂ بالا میں پیش کیا ہے اُس کے متعلق صرف یہ عرض ہے کہ ہم میں نقائص بھی ہیں، ہم میں خامیاں بھی ہیں، ہم میں سے بعض کے دلوں میں عقائد مذہبی کی طرف سے شکوک اور شبہات بھی ہیں، ہم سے ارکان اور احکام مذہبی کی پابندی بھی کماحقہٗ نہیں ہوتی ہے جس کی بابت ہم سخت ملامت کے مستوجب ہیں، مگر نئے تعلیمیافتہ گروہ کی جو تصویر مولانا نے کھینچی ہے وہ بہت ہی زیادہ بری اور سیاہ ہے، ہم لوگ بُرے ہیں مگر غالباً اس قدر بُرے نہیں جس قدر کہ ظاہر کئے جاتے ہیں اور اگر بُرے بھی ہیں تب بھی آخر تک تو مسلمان ہی کہلاتے ہیں، جن خامیوں اور برائیوں کا اوپر ذکر ہوا ہے وہ نئے تعلیمیافتہ گروہ میں سب کی سب موجود سہی مگر ان کے ساتھ ہی غالباً کچھ ایسی باتیں بھی ہیں جو ایک حد تک ان برائیوں کی تلافی کرتی ہیں مثلاً یہ کہ وہ ابھی تک قبر پرستی، پیر پرستی، اور شخصیت پرستی کے امراض سے پاک ہیں، اسی طرح وہ ابھی تک مختلف مذہبی گروہوں میں منقسم نہیں ہیں جو ایک دوسرے کی صورت دیکھنے کے بھی روادار نہ ہوں۔ اور جن میں ایک دوسرے کے ساتھ اشتراکِ عمل قریب قریب ناممکن ہو جیسا کہ علماء نے اپنے آپ کو مختلف گروہوں میں تقسیم کر رکھا ہے، ان میں بدعتی اور وہابی کی کوئی تقسیم نہیں ہے، نہ ان میں کا کوئی گروہ کسی دوسرے گروہ کی تکفیر کرتا ہے۔

مغربی تہذیب میں برائیاں بھی ہیں اور بھلائیاں بھی یہ ہماری اہلیت ہے کہ خُذ مَا صَفَا

وَدَعْ مَا كَدِرَ کے زرین اصول پر عمل کرکے ہم بھلائیاں اختیار کریں اور برائیوں سے پرہیز کریں!

نئی تعلیم کے بارہ میں ہمارے اور علماء کے نقطۂ نظر میں جو فرق ہے وہ یہ ہے کہ نئی تعلیم اور جدید سائنٹفک انکشافات ہم کو جو کچھ بھی سکھاتے ہیں ان کا علم حاصل کرنے کے باوجود ہم مسلمان رہنا چاہتے ہیں اور علماء کا گروہ انکشافات جدیدہ اور جدید سائنس سے مسلمانوں کو ناواقف اور جاہل رکھ کر ان کو مسلمان رکھنا چاہتا ہے۔

ہم پر اہل مغرب کے تتبع کا الزام لگایا جاتا ہے مگر فی الحقیقت ہم اہل مغرب کا تتبع نہیں کرتے ہیں بلکہ جو قرضہ آزادی رائے، تفقہ فی الدین، شخصیت پرستی سے اجتناب، محنت اور عمل کی قدر کا آج سے صدیوں پہلے ہم نے اہل مغرب کو دیا تھا اور جس کی مدد سے اہل مغرب نے کلیسائے روم پاپائے اعظم اور نااہل پیشوایان دین کے ظلم و استبداد سے نجات پائی تھی وہ قرضہ مع سود کے اہل مغرب سے ہم وصول کرنا چاہتے ہیں غرض جو سبق آزادی رائے اور تفقہ فی الدین کا ہم نے اہل مغرب کو سکھایا تھا وہی سبق اب ہم ان سے سیکھنا چاہتے ہیں اور علوم و فنون کی جو امانت ہم نے ان کے سپرد کی تھی اس کو اب ہم ان سے واپس لینا چاہتے ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ہماری کھری اور قیمتی امانت کے ساتھ اہل مغرب ہم کو بہت سے تباہ کن اور مضرت رساں مزخرفات مثلاً شراب خواری، قماربازی وغیرہ بھی واپس کرنا چاہتے ہیں اور ہم میں سے بعض ناسمجھ بجائے اپنی اصلی امانت واپس لینے کے ان مزخرفات کو ان سے لے کر خود اپنے آپ کو اور اسلام کو نقصان پہونچاتے ہیں، پس ہماری کوشش یہی ہونا چاہیے کہ ہم اپنی اصلی امانت واپس لیں اور ان خرافات سے پرہیز کریں۔

ہم پر یہ بھی الزام لگایا جاتا ہے کہ ہم اہل مغرب کی ایک ایک ادا پر جان دیتے ہیں۔ اس کی بابت صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ اگرچہ بعض ظاہری باتوں میں ہم اہل مغرب کا تشبہ ضرور کرتے ہیں مگر نئے تعلیمیافتہ گروہ کے دل میں اہل فرنگ سے جو منافرت اور مغائرت ہے وہ اس سے

زیادہ ہے جو پرانے تعلیمیافتہ گروہ کے بزرگوں کو ہے کیونکہ نئے تعلیمیافتہ گروہ کو اس بات کا علم کہ اہل فرنگ نے ایشیا والوں کے ساتھ عموماً اور مسلمانوں کے ساتھ خصوصاً وقتاً فوقتاً کیا کیا زیادتیاں کی ہیں زیادہ تفصیلی طور پر پہلے بھی تھا اور اب بھی ہے۔ چنانچہ جب کبھی اہل فرنگ نے مصر طرابلس یا ٹرکی میں مسلمانوں پر مظالم کیے تو نئے تعلیمیافتہ گروہ ہی نے ابتداءً اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور بعض بعض صورتوں میں ٹرکی اور قسطنطنیہ کو مشن بھیج کر عملی امداد بھی کی اگرچہ یہ امداد بہت ہی تھوڑی ہو اسی طرح ہندوستان میں جو جنگ آزادی چھڑی اس میں نئے تعلیمیافتہ گروہ ہی نے غالباً زیادہ حصہ لیا۔ پس ان واقعات کے با وجود بھی اس الزام پر اصرار کیا جاوے کہ نیا تعلیمیافتہ گروہ اہل مغرب کی مرادا پر جان دیتا ہے تو اس کے جواب میں بجز اس کے اور کیا عرض کیا جا سکتا ہے کہ ہمارے پرانے تعلیمیافتہ بزرگ اپنے قیاس کو ہمارے بیان پر ترجیح دیتے ہیں جو حصول علم کا یقیناً صحیح طریقہ نہیں ہے۔

بہرحال اس بحث کے متعلق میں کچھ اور عرض کرنا نہیں چاہتا اگر بغور دیکھا جائے تو نئے تعلیمیافتہ اور پرانے تعلیمیافتہ اصحاب کی مجموعی تعداد بھی مسلمانوں کی کل آبادی کے مقابلہ میں بمنزلہ آٹے میں نمک کے ہے۔ مسلمانوں کے سیاسی مستقبل کا دارومدار زیادہ تر کاشتکاروں اور مزدوروں کے اُس بے زبان طبقہ کے ہاتھ میں ہے جس نے نہ تو پرانی تعلیم حاصل کی ہے اور نہ نئی اور جو مسلمانوں کی کل آبادی کا ۹/۱۰ حصہ سے زائد ہے اس لیے ہمارا فرض ہے (خواہ ہم نئی تعلیمیافتہ جماعت سے تعلق رکھتے ہوں یا پرانی تعلیم کے حامی ہوں) کہ ہم اس طبقہ کی اصلاح کریں۔ اس طبقہ میں اپنے حقوق سمجھنے کا مادہ پیدا کریں اور ان میں اس قسم کی استعداد پیدا کریں کہ وہ اپنے حق رائے دہندگی کو مسلمانوں کے مفاد کے لیے استعمال کریں، اگر ایسا کرنے میں ہم کامیاب ہو گئے تو سمجھ لیجیے کہ ہم نے بڑی حد تک سیاسی جنگ جیت لی۔ (۶)

مولنا ممدوح فرماتے ہیں کہ "مسلمانوں کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ ہم اپنی تہذیب اور اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے آئینی ضمانتیں لیں گے، ہم دستور اساسی میں ایسے تحفظات رکھوائیں گے جن سے ہمارے حقوق پر آنچ نہ آنے پاوے" لیکن مولنا کے خیال کے مطابق چونکہ ان کی آئینی ضمانتوں کے پیچھے کوئی ( Sanction ) یا ایسی قوت موجود نہ ہوگی جو اکثریت کو ان ضمانتوں پر قائم رہنے کے لیے مجبور کرے اس لیے یہ ضمانتیں بیکار رہوں گی۔ مولنا کا یہ خیال بالکل صحیح ہے مگر آئینی ضمانتوں کے بجائے مولانا کی جو اپنی تجویز ہے اس پر بھی بعینہ یہی اعتراض وارد ہوتا ہے۔ مولنا کی تجویز ہے کہ۔

"مسلمانوں کی حیات قومی برقرار رکھنے کے لیے وہ چیز بالکل ناگزیر ہے جس کو آج کل کی سیاسی اصطلاح میں سلطنت کے اندر سلطنت کہا جاتا ہے۔ ان کی سوسائٹی جن بنیادوں پر قائم ہے وہ استوار ہی نہیں رہ سکتیں جبتک کہ خود ان کی جماعت میں کوئی قوت ضابطہ اور ہیئت حاکمہ موجود نہو۔۔۔۔۔"

فرض کیجیے کہ اکثریت پارٹی مسلمانوں کو "سلطنت در سلطنت" دینے پر رضامند بھی ہوگئی، اور مسلمانوں کی سلطنت در سلطنت باہمی میثاق کی رو سے قائم بھی ہوگئی، اور ان کو اپنی سلطنت در سلطنت میں حدود شرعیہ کے جاری کرنے کا حق حاصل بھی ہوگیا لیکن باین ہمہ مسلمانوں کے پاس کونسی وہ قوت ہوگی جو مسلمانوں کی اس سلطنت در سلطنت کے احکام کا اکثریت پارٹی کی رائے کے خلاف نفاذ کرا سکے؟ مثلاً اکثریت پارٹی فرض کیجیے کہ یہ قانون پاس کرنا چاہتی ہے کہ ہندوستان میں گائے کی قربانی ایک قلم بند کردی جاوے تو مسلمانوں کی یہ سلطنت در سلطنت اکثریت پارٹی کے نفاذ کو کیسے روک سکتی ہے؟

اسی طرح مسلمانوں کی یہ مفروضہ "سلطنت در سلطنت" اپنے یہاں حدود شرعی جاری کرنا

چاہتی ہے۔ پس فرض کرو کہ کوئی مسلمان معاذ اللہ مرتد ہو جائے اور حد شرعی کے مطابق اس کو قتل کر دیا جائے تو اکثریت پارٹی اس کی کیسے اجازت دے سکتی ہے؟ خصوصاً جبکہ مسلمان اپنے اس واجبی حق کے قائم رکھنے پر بجا طور پر اصرار کریں گے کہ وہ غیر مسلموں کو مسلمان بنا دیں۔ اسی طرح مسلمان اگر اپنی سلطنت در سلطنت میں زنا کی حد سنگساری کو جاری کرنا چاہیں اور کوئی مسلمان کسی غیر مسلم عورت سے زنا کا مرتکب ہو۔ یا کوئی غیر مسلم کسی مسلمان عورت سے زنا کا مرتکب ہو تو مسلمانوں کی یہ سلطنت در سلطنت مسلمان مرد اور مسلمان عورت پر تو زنا کی حد جاری کرے گی لیکن کیا اس غیر مسلم مرد اور غیر مسلم عورت کو بلا کسی باز پرس اور سزا کے چھوڑ دے گی؟ (۷)

مولانا نے ایک لفظ "شبہ دار الاسلام" کا بہت ہی اچھا ایجاد کیا ہے۔ مولانا کی خواہش ہے کہ اگر ہم مسلمان دار الاسلام قائم نہیں کر سکتے تو کم از کم شبہ دار الاسلام قائم کرنے کی ضرور کوشش کریں۔ مگر میرا خیال ہے کہ جو نظام حکومت اس وقت قائم ہے، یا آئندہ "سلطنت در سلطنت" یا آئینی ضمانتوں کے ماتحت ہو وہ بھی شبہ دار الاسلام ضرور ہے اور آئندہ بھی ہوگا۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ موجودہ نظام حکومت دار الاسلام نہیں ہے اور دار الحرب بھی نہیں ہے۔ کیونکہ ہمارے علماء دار الحرب کے احکام موجودہ نظام حکومت سے متعلق نہیں کرتے اس لیے جبکہ یہ نظام حکومت نہ دار الاسلام ہوا اور نہ دار الحرب تو ان دونوں کے بین بین کوئی چیز ہوا اور اس کو شبہ دار الاسلام ہی سے تعبیر کرنا زیادہ مناسب ہوگا۔ اور جیسا کہ میں نے اوپر کی چند مثالوں سے واضح کیا ہے کہ ہم اس شبہ دار الاسلام میں کل اسلامی حدود جاری نہیں کر سکتے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ہم اس شبہ دار الاسلام میں مسلم اور غیر مسلم کے مقدمات اور معاملات کے لیے تفقہ فی الدین کر کے کچھ خاص احکام نافذ کر سکیں تاکہ مسلمانوں کو اغیار کی اس اقتصادی غلامی سے نجات ملے جس میں کہ وہ آجکل مبتلا ہیں۔ (۸)

بہرحال یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا اگر جیسا کہ میں نے اوپر واضح کرنے کی کوشش کی ہے مسلمانوں کے حقوق کو بحیثیت ایک اقلیت کے اُن کی "سلطنت درسلطنت" اس سے زیادہ محفوظ نہیں کر سکتی جتنا کہ آئینی ضمانتیں، اور اکثریت پارٹی کا آئینی ضمانتوں کو منظور کرنے پر رضامند ہو جانا بہ نسبت "سلطنت درسلطنت" کی تجویز کے زیادہ آسان ہے۔ (۹)

نیز مولنا ممدوح کی "سلطنت درسلطنت" والی تجویز کے سلسلہ میں یہ امر بھی غور طلب ہے کہ اگر یہ سلطنت درسلطنت والی تجویز غیر مسلم اکثریت مسلمانوں کے لیے منظور کرلے (۱۰) اور اسی کے ساتھ ہندو اکثریت عیسائی، اور سکھ اقلیتوں کے واسطے بھی اس کو ضروری خیال کرے تو ہندوستان میں ایک نہیں بلکہ کم از کم چار "سلطنت درسلطنتیں" ہوں گی (۱۱) اب دیکھنا یہ ہے کہ ہندوستان کی آیندہ حکومت کے لیے کونسا نظام بہتر اور قابل العمل ہے؟ یعنی۔

(۱) وہ نظام حکومت جس میں ایک سے زیادہ سلطنت درسلطنتیں موجود ہوں۔

(۲) یا وہ نظام جس میں حکومت کو اپنے افراد کے مذہب سے کوئی بہرہ کار نہو اور اُس حکومت کے افراد کا ہر فرقہ اور ہر گروہ اپنی زبان اور پرسنل لا کے متعلق آزاد ہو۔

پہلے طریقۂ حکومت میں ہر گروہ کی طرف سے جو لوگ برسرِ اقتدار ہوں گے سو غالبًا وہ ہوں گے جنمیں رواداری کم ہوگی اور ایک دوسرے گروہ سے تنازع اور تصادم پیدا کرنیکا جذبہ زیادہ ہوگا۔

دوسرے طریقہ حکومت کو اگر ہر فریق نیک نیتی سے چلانے کی کوشش کریگا تو غالبًا وہ زیادہ سہولت سے چل سکے گا، بہرحال ہم مسلمانوں کو یہ فیصلہ کرنا ہے کہ ہم ان میں سے کونسا طریقہ اختیار کریں؟ مگر جو بھی کچھ کرنا ہو فورًا کرنا چاہیے۔ اب ایک لمحہ کے انتظار کی بھی گنجائش نہیں ہے۔ یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ یہ دوسرا طریقہ کار اکثریت پارٹی کی صرف آئینی ضمانتوں اور مثیاقوں

پر ہی مبنی ہوگا۔ رہا آئینی ضمانتوں اور میثاقوں کا اکثریت پارٹی کی طرف سے ایفا، سو یہ مسلمانوں کی رائے عامہ، اُن کی یک جہتی اور اتفاق، اور ان کے اپنے واجبی حقوق کی خاطر جان دینے کے لیے تیار رہنے کے جذبہ پر منحصر ہے۔

مسلمان چار صوبوں یعنی پنجاب، سرحد، سندھ، اور بنگال میں اس وقت اکثریت کیحالت میں ہیں اور چونکہ مسلمانوں کی آبادی غیر مسلم اقوام کی بہ نسبت زیادہ بڑھتی ہے اور اس لیے اس کا کوئی اندیشہ نہیں ہے کہ ان چار صوبوں کے مسلمانوں کی اکثریت اقلیت میں تبدیل ہوجاوے گی بلکہ ان کی اکثریت غالباً آئندہ اور زیادہ ہوجاوے گی۔ پس اگر ان چار صوبوں میں مسلمان اپنی اکثریت کی بنا پر اپنے حقوق کی حفاظت کریں گے اور غیر مسلم اقلیتوں کے حقوق کو ناجائز طور پر پامال کرنے کی کوشش نہ کریں گے تو اغلب یہ ہے کہ اُن صوبوں کی اکثریتیں بھی جن میں مسلمان اقلیت کی حالت میں ہیں مسلمانوں کے حقوق کو بیجا طور پر پامال کرنے کی کوشش نہ کرینگی، اگر رواداری کی بنا پر نہیں تو کم از کم مصلحت کی بنا پر ہی۔

ایک سوال البتہ رہ جاتا ہے کہ اگرچہ مسلمان چار صوبوں میں اکثریت کی حالت میں ہیں مگر (Centre) یا مرکزی حکومت میں اب بھی اقلیت کی حالت میں ہیں اور آئندہ بھی رہیں گے پس اگر مرکزی حکومت ایسے قوانین جاری اور نافذ کرنا چاہے جن سے مسلمانوں کے جائز حقوق پامال ہوتے ہوں تو مسلمانوں کے پاس اس کے دفاع کا کوئی ذریعہ نہیں ہے بجز اس کے کہ وہ ایسی کارروائی کے خلاف اپنی متفقہ آواز بلند کریں اور اگر مسلمانوں کی سات کروڑ کی آبادی اپنے واجبی حقوق کے لیے اپنی متفقہ آواز بلند کرے تو کوئی مرکزی حکومت اگرچہ وہ کیسی ہی متعصب ہو مشکل سے مسلمانوں کے ایسے متفقہ احتجاج کو نظر انداز کر سکیگی، لیکن اگر مسلمانوں کے ایسے متفقہ احتجاج کے باوجود کوئی ناعاقبت اندیش مرکزی گورنمنٹ مسلمانوں کے واجبی حقوق کے پامال کرنے پر آمادہ ہی

ہو جاوے تو اس صورت میں مسلمانوں کے لیے سوائے اس کے کوئی اور چارہ نہیں ہے کہ وہ بین الملکی جنگ کے لیے تیار رہیں۔

لیکن یہ سب آئینی ضمانتیں اور مواثیق اسی وقت ہمارے کام آسکتے ہیں جبکہ مسلمانوں کی سات کروڑ آبادی اپنے حقوق کو سمجھے اور ان کی حفاظت کے لیے تن، من اور دہن سے آمادہ ہوجائے (۱۲) اب یہ کام تعلیمیافتہ طبقہ کا ہے (چاہے ہم پرانی تعلیم کے حامی ہوں یا نئی تعلیم کے مؤید یا دونوں کے) کہ ہم عوام میں جائیں، ان کی حالت کے سدھارنے کی کوشش کریں، غرض ہر طرح سے ان کے کام آویں، ان میں عمومی تعلیم جاری کریں، ان کو ان کے حقوق سے آگاہ کریں، اپنی بیجا رعونت کو نکال ڈالیں اور اسلام کے زرین اصول کل مومن اخوۃ پر کاربند ہوں۔

پس اگر ہم اپنے کاشتکار، دستکار، پیشہ ور اور مزدور بھائیوں میں جا کر ان کی خدمت اور ان کی تنظیم کرسکیں گے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ جو متحدہ عزم اور ارادہ مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لال نہرو جیسے لوگوں نے ہندو قوم میں پیدا کر دیا ہے وہ ہم مسلمان اپنے سات کروڑ مسلمان بھائیوں میں پیدا نہ کرسکیں (۱۳) مگر یہ جب ہی ہوسکے گا کہ جب ہم میں کے سربرآوردہ افراد خواہ وہ مسٹر جناح ہوں یا نواب چھتاری، مولانا حسین احمد صاحب مدنی ہوں یا مفتی کفایت اللہ صاحب دیہات میں جاویں، کاشتکاروں کی ٹوٹی پھوٹی چارپائیوں پر بیٹھیں، ان کو یہ محسوس کرادیں کہ یہ بڑے بڑے لوگ ان کے بھائی ہیں، اور جو کچھ یہ کر رہے ہیں وہ ان کی بھلائی اور بہتری کے واسطے ہی کر رہے ہیں، بس صرف یہی ایک طریقہ ہے جس کے ذریعہ سے موجودہ سیاسی جنگ میں مسلمان اپنے وجود کو قائم رکھ سکتے ہیں اسلام اور شعائر اسلام کو ہندوستان میں تباہ ہونے سے بچا سکتے ہیں۔ آخر میں یہ عرض کر دینا بھی ضروری ہے کہ اس موجودہ جنگ میں ہم مسلمانوں کو غیر مسلم اقوام سے خواہ مخواہ معاندانہ اور مخالفانہ طریقہ کار اختیار کرنے کی ضرورت نہیں ہے،

اگر ان میں کا کوئی طبقہ رواداری پر آمادہ ہو تو ہم کو بھی پورے طور پر رواداری کے لیے تیار رہنا چاہیے تاکہ مسلم اور غیر مسلم اقوام مذہبی امور کے علاوہ باقی جملہ سیاسی امور میں متحد و متفق ہو کر ملک اور اہل ملک کی بہبودی اور ترقی کے کاموں میں مصروف رہ سکیں (۱۴)۔

# ملاحظات

از ایڈیٹر

میں نے ترجمان القرآن کی سابق اشاعتوں میں اسلامی ہند کے مستقبل پر جو کچھ لکھا ہے، اس میں حتی الامکان ہر پہلو کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے لیکن اسے میری قدرت بیان کا نقص سمجھیے کہ باوجود انتہائی کوشش کے میں اپنا نقطۂ نظر پوری طرح واضح نہ کر سکا اور اس کے متعلق فاضل مضمون نگار جیسے اعلیٰ تعلیمیافتہ اور فہیم و ذکی اصحاب کو بھی شبہات پیش آئے تاہم اب میں دوبارہ کوشش کروں گا کہ حالات کو جس نظر سے میں دیکھتا ہوں اسی نظر سے دوسروں کو دکھا سکوں اور مستقبل کے متعلق جس رائے کو میں درست سمجھتا ہوں اس کے درست ہونے میں کوئی شبہ باقی نہ رہنے دوں۔ بحث کی تسہیل کے لیے میں نے نواب صاحب کے مضمون میں قابل جواب امور پر نمبر لگا دیے ہیں، اور اب نمبروار جواب عرض کرتا ہوں۔

(۱) فاضل مضمون نگار ایک طرف یہ تسلیم فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کی قومی طاقت کو مضبوط کرنے کے لیے جن تدابیر کو میں ضروری اور ناگزیر قرار دیتا ہوں، وہ "بہت ارفع و اعلیٰ ہیں اور ہر مسلمان کو ان کے حصول کی کوشش کرنی چاہیے"۔ دوسری طرف وہ خود اپنے اس مسئلہ کو محض اس بنا پر رد کر دیتے ہیں کہ یہ تدابیر "بالکل ہی ناقابل عمل اور غیر ممکن الوقوع معلوم ہوتی ہیں" اور "ان کے حصول میں صدیاں بھی کم ہیں"۔ اس سے مجھے شبہ ہوتا ہے کہ غالباً انہوں نے نہ تو ان وجوہ کی اہمیت پر کافی غور فرمایا ہے

جن کی بنا پر میں ان تدابیر کو ناگزیر قرار دے رہا ہوں، اور نہ اس سوال پر زیادہ قوت فکر صرف کی ہے کہ ان تدابیر کو روبکار لانے اور جلد از جلد نتیجہ خیز بنانے کی عملی صورتیں کیا ہیں۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو غالباً وہ نہ تو اس طرح سرسری طور پر میری رائے سے اتفاق فرماتے اور نہ اس طرح سرسری نظر میں اسے ناقابل عمل سمجھ کر رد کر دیتے۔ چونکہ بحث کا اصلی اور اہم ترین نکتہ یہی ہے اس لیے میں چاہتا ہوں کہ صرف نواب صاحب ہی نہیں بلکہ تمام وہ لوگ جو ان کے ہم خیال ہیں، اس کے اصولی اور عملی پہلوؤں پر پوری قوت فکر صرف کریں۔

اس بحث کو اصولی طریق پر طے کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آپ میرے خیالات کا تجزیہ کیجیے اور ایک ایک جزو کے متعلق واضح طور پر فیصلہ کیجیے کہ آیا آپ کو اس سے اتفاق ہے یا نہیں۔

۱۔ میری نگاہ میں ہندوستان کے مسلمانوں کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک مسلمان ہونے کی حیثیت اور دوسری ہندوستانی ہونے کی حیثیت۔ ان میں سے پہلی حیثیت دوسری حیثیت پر مقدم ہے، اس معنی میں کہ اگر بالفرض ان دونوں حیثیتوں میں مصالحت ممکن نہ ہو اور ہمارے سامنے یہ سوال پیش ہو جائے کہ ہم کس حیثیت کو دوسری حیثیت پر قربان کرنے کے لیے تیار ہوں گے، تو ہمارے ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنی مسلمان ہونے کی حیثیت کو برقرار رکھیں اور ہندوستانی ہونے کی حیثیت کو اس پر قربان کر دیں ——— یہ پہلا اور بنیادی مسئلہ ہے جس کے فیصلہ پر دو بالکل مختلف و متضاد مسلکوں میں سے کسی ایک کے انتخاب کا انحصار ہے۔ جو شخص معنی مذکور الصدر میں دوسری حیثیت کو پہلی حیثیت پر مقدم رکھتا ہے، اس کا راستہ میرے راستہ سے بالکل الگ ہے میں اس کو مسلمان سمجھنے سے انکار کرتا ہوں، اس لیے ایک ایسے مسئلہ میں جو صرف مسلمانوں سے تعلق رکھتا ہے، اس کے ساتھ کوئی بحث کرنا نہیں چاہتا میری بحث صرف ان لوگوں سے ہے جو اس بنیادی امر میں مجھ سے متفق ہیں (آگے چل کر میں لفظ مسلمان جہاں کہیں استعمال کروں گا اس سے میری مراد اسی دوسرے گروہ سے ہوگی)۔

۲۔ مسلم ہندوستانیوں کی سیاسی پالیسی کا اصل الاصول میرے نزدیک یہ ہے کہ ان کی مسلم ہونے کی حیثیت اور ہندوستانی ہونے کی حیثیت میں کامل توافق ہو، اس ملک کا سیاسی، معاشی اور تمدنی ارتقا کوئی ایسی راہ اختیار نہ کرنے پائے جس میں ہماری ان دونوں حیثیتوں کا ساتھ ساتھ نبھنا مشکل ہو جائے ــــــ میں نہیں سمجھتا کہ اس سے کسی مسلمان کو اختلاف ہوگا۔ تاہم اگر کسی کو اختلاف ہو تو وہ اپنے اختلاف کے وجوہ بیان کرے۔

۳۔ مذکورہ بالا پالیسی کو موثر اور کامیاب بنانا صرف ہمارے عمل اور ہماری قوت پر منحصر ہے۔ ہمارے غیر مسلم ہم وطن اور غیر مسلم حکمران اگر ہر قسم کے تعصب سے خالی ہوں، اور انتہادرجہ کی نیک نیتی کے ساتھ کام کریں، تب بھی وہ اس توازن اور توافق کو قائم نہیں کر سکتے جس کے قیام پر ہماری مذکورہ بالا دونوں حیثیتوں کے ساتھ ساتھ نبھنے کا انحصار ہے۔ اس لیے کہ وہ زندگی کا اسلامی نقطۂ نظر کہاں سے لائیں گے؟ اصول اسلام کا فہم انہیں کیسے نصیب ہوگا؟ تہذیب اسلامی کی اسپرٹ کو وہ کیونکر سمجھ سکیں گے؟ پس ہر قسم کے فرقہ وارانہ تعصبات سے قطع نظر کر لینے کے بعد بھی یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلامیت اور ہندوستانیت کے جس توازن و توافق پر مسلم ہندوستانی قوم کی زندگی کا مدار ہے وہ اس قوم کی اپنی طاقت اور ... طاقت کے بغیر نہ قائم ہو سکتا ہے، نہ قائم رہ سکتا ہے ــــــ کیا آپ (اور "آپ" سے میری مراد وہ سب لوگ ہیں جنھیں میرے سیاسی مسلک سے اختلاف ہے) اس کو تسلیم کرتے ہیں؟ اگر نہیں تو وجوہ ارشاد ہوں۔ اگر تسلیم ہے تو یہ فرمائیے کہ آیا یہ حقیقت آپ کی نگاہ میں بنیادی اہمیت رکھتی ہے یا اسے آپ ایسی چیز سمجھتے ہیں کہ حاصل ہو تو بہت خوب، اور نہ حاصل ہو تو کچھ پروا نہیں اس کے بغیر ہی آگے بڑھے چلو؟

۴۔ جس طاقت سے اس پالیسی کو موثر اور کامیاب بنایا جا سکتا ہے، میرے نزدیک وہ مسلمانوں میں موجود نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس چند ایسی کمزوریاں جڑ پکڑ گئی ہیں جن کی وجہ سے وہ ہندوستان

کے سیاسی ارتقاء کی رفتار پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتے اس لیے میں کہتا ہوں کہ تمام دوسرے کاموں سے پہلے ہمیں ان کمزوریوں کو دور کرنا چاہیے اور اپنے اندر کم سے کم اتنی طاقت پیدا کر لینی چاہیے کہ ہم اس ملک کے آئندہ نظام حکومت کی تشکیل میں مسلمان ہونے کی حیثیت سے اپنا اثر استعمال کر سکیں۔ اس کے بغیر جنگ آزادی میں شریک ہونا اور نہ ہونا دونوں ہمارے لیے یکساں مہلک ہیں —— آپ فرمائیں کہ اس بیان کے کس حصہ سے آپ کو اختلاف ہے؟ کیا آپ کا یہ خیال ہے کہ مسلمانوں میں وہ کمزوریاں موجود نہیں ہیں جنہیں میں نے تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے؟ یا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کمزوریوں سے وہ نتائج بد پیدا نہیں ہو سکتے جن کے خطرات میں نے ظاہر کیے ہیں؟ کیا آپ کی رائے یہ ہے کہ ہمیں حب وطن یا حب نفس کی خاطر ان خطرات کو گوارا کرنا چاہیے؟ ان میں سے کونسی شق آپ اختیار فرماتے ہیں؟

۵- وہ طاقت جس کی ضرورت میں ثابت کر رہا ہوں میرے نزدیک ان تدابیر کے سوا کسی اور طریقہ سے حاصل نہیں ہو سکتی جنہیں اختصار کے ساتھ میں نے بیان کیا ہے —— اگر آپ کو سرے سے اس کی ضرورت ہی تسلیم نہیں ہے، تب تو میرے نزدیک تدابیر کی بحث لاحاصل ہے۔ البتہ اگر آپ کو اس کی ضرورت کا اتنا ہی شدید احساس ہے جتنا مجھ کو ہے، تو آپ ایک مرتبہ پھر ان تدابیر کا جائزہ لیجیے اور غور فرمائیے کہ ان کے سوا اور کونسی تدبیریں ہو سکتی ہیں جو ہماری کمزوریوں کو دور کر کے ہم کو مسلم ہونے کی حیثیت سے ایک طاقتور جماعت بنانے والی ہوں۔ اس نقطۂ نظر سے جب آپ غور فرمائیں گے تو آپ کو محسوس ہو جائے گا کہ یہ محض چند خوش آئند تجویزیں نہیں ہیں جن کی قدر افزائی کے لیے صرف اتنی سفارش کافی ہو کہ "ہر مسلمان کو ان کے حصول کی کوشش کرنی چاہیے"، بلکہ درحقیقت مسلمانوں کی قومی زندگی کا تحفظ انہی تدابیر پر منحصر ہے اور اب اگر ہم خودکشی نہیں کرنا چاہتے تو ہمیں بہرحال انہیں کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔

یہ تو تھی اصولی بحث۔ اب میں عملی پہلو کی طرف توجہ کرتا ہوں۔ فاضل مضمون نگار نے غالباً

یہ سمجھا ہے کہ میں بالکل ایک آئیڈیل حالت کی طرف مسلمانوں کو لے جانا چاہتا ہوں، اور میرے نزدیک علم و کمال، اتحاد و اتفاق اور نظام اجتماعی کے آخری و انتہائی مرتبہ کا حصول سیاسی جنگ میں حصہ لینے سے پہلے ناگزیر ہے۔ اسی بنا پر انہوں نے اندازہ لگایا کہ یہ کام تو شاید صدیوں میں بھی پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکے گا۔ اگرچہ ایسی ایک آئیڈیل حالت بھی اس سے پہلے ایک صدی کے چوتھائی حصہ میں ہندوستان کے موجودہ حالات سے بدرجہا زیادہ خراب، عرب جاہلیت کے حالات میں پیدا کی جا چکی ہے، لہٰذا اس کو ناممکن الوقوع کہنا درست نہیں۔ لیکن اگر اس کو ناممکن الوقوع تسلیم بھی کر لیا جائے تو میں کہتا ہوں کہ جو کم سے کم طاقت اس وقت ہمیں درکار ہے اس کے لیے صدر اول کے مسلمانوں کی سی انتہائی دین داری اور اجتماعی تنظیم تک پہنچ جانا ضروری نہیں۔ صرف اس قدر کافی ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں میں اسلام کے اصولوں پر ایک ایسی رائے عام تیار کر دی جائے جو غیر مسلم تہذیب کے اثرات کو اپنی جماعت میں پھیلنے سے روک سکتی ہو، جس کے سامنے ایک قومی نصب العین واضح طور پر موجود ہو، جو اپنے نصب العین کے لیے اجتماعی جد و جہد کر سکتی ہو، جس میں اتنا شعور ہو کہ گمراہ کرنے والے رہبروں کو پہچانے اور ان کا اتباع کرنے سے انکار کر دے، اور جس میں اتنی طاقت ہو کہ منافقت اور غداری اس کے دائرہ میں پھل پھول نہ سکے۔ یہ کام نہ غیر ممکن ہے، نہ صدیوں کی مدت چاہتا ہے۔ اگر مسلمان یہ سمجھ لیں کہ اس کے بغیر ہندوستان میں ان کا بحیثیت ایک مسلم قوم کے زندہ رہنا مشکل ہے، اور اگر ان کے نوجوانوں میں سے ایک جماعت سچے جذبہ کے ساتھ اس کام کے لیے جانفشانی اور پیہم عمل پر آمادہ ہو جائے، تو ایک قلیل مدت ہی میں ایسی ایک رائے عام تیار کی جا سکتی ہے لیکن یہ سب کچھ اس وقت ممکن ہے جبکہ ہم سہولت پسندی چھوڑ دیں صحیح طریق کار کی دشواریوں کو دیکھ کر ہمت ہار دینا اور دوسروں کے ہموار کیے ہوئے راستوں کو آسان دیکھ کر ان کی طرف دوڑ جانا ایک ایسی ذہنیت کا نتیجہ ہے جس کے ساتھ دنیا کی کوئی قوم بھی اپنی زندگی کو برقرار نہیں رکھ سکتی۔ اگر

خدانخواستہ یہی ذہنیت ہماری قوم پر غالب ہوگئی ہے اور ہم اس درجۂ تنزل کو پہنچ چکے ہیں کہ اپنے قومی نصب العین کے لیے کوئی اجتماعی جد و جہد کرنا ہمیں غیر ممکن نظر آتا ہے تب تو ہمیں خود اپنی قبر پر فاتحہ پڑھ لینی چاہیے۔

---

۲۔ یہ بات میں نے کبھی نہیں کہی کہ ہندوستان کی سیاسی جنگ اس وقت تک کے لیے ملتوی ہو جانی یا ہو جانی چاہیے جب تک مسلمان ان مقاصد کے حصول میں کامیاب نہ ہولیں پچھلے واقعات اور موجودہ حالات پر نظر کرتے ہوئے اس بات کا تو خیال بھی نہیں کیا جا سکتا کہ ہندوستان کے سیاسی ارتقا کی رفتار ہمارے شریک نہ ہونے سے رک جائے گی۔ میں نے جو کچھ کہا ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ منتشر اور مختلف الخیال افراد کی شکل میں مسلمانوں کا شریک جنگ ہونا فائدہ سے زیادہ نقصان کے امکانات رکھتا ہے، اور یہ نقصان اُس نقصان سے بہت زیادہ ہے جو کچھ مدت تک اس جنگ سے علیحدہ رہنے کی صورت میں پہنچے گا۔ لہٰذا مسلمانوں کو اپنی تمام تر توجہ اس طرف صرف کرنی چاہیے کہ کم سے کم مدت میں اپنے اندر وہ طاقت پیدا کرلیں جو شریک جنگ ہونے کے لیے ضروری ہے۔ اس دوران میں اگر دوسرے ان سے متعرض نہ ہوں تو انھیں بھی دوسروں سے متعرض نہ ہونا چاہیے۔

---

۳۔ یہ ارشاد بالکل بجا ہے کہ اس وقت مسلمانوں کو ایک بنیان مرصوص بننے کی ضرورت ہے۔ لیکن صاحب مضمون کو نہ معلوم میرے کونسے الفاظ سے یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ میں مسلمانوں کو بنیان مرصوص نہیں بنانا چاہتا بلکہ ان کے درمیان پارٹیوں کا اختلاف پیدا کرنا چاہتا ہوں حقیقت یہ ہے کہ کسی قوم کو ایک ٹھوس جماعت صرف اسی طرح بنایا جا سکتا ہے کہ اس کے افراد ایک نصب العین پر متفق ہوں اور اس کے لیے ایک طریق کار اختیار کریں۔ اس غرض کے لیے ہم کو نصب العین اور طریق کار

دونوں کی توضیح کرنی پڑے گی اور جس طرح ہمارا یہ فرض ہوگا کہ قوم کے ان تمام افراد کو اپنے ساتھ ملالیں جو اس نصب العین اور اس طریق کار سے متفق ہوں، اسی طرح ہمارے لیے یہ بھی ناگزیر ہوگا کہ ان افراد کے ساتھ غلظت و شدت برتیں جو اپنی خودسری یا منافقت کی بنا پر اپنی قوم کا ساتھ دینے سے انکار کریں عام اس سے کہ وہ نئے تعلیمافتہ ہوں یا پرانے تعلیمیافتہ یہ بالکل بدیہی بات ہے کہ مختلف مقاصد کے تحت مختلف اور متضاد راستوں کی طرف جانے والے افراد کو کسی طرح جوڑ کر ایک بنیان مرصوص نہیں بنایا جا سکتا۔

اس کے ساتھ ایک اور غلط فہمی بھی ہے جس کو دور کرنا ضروری ہے۔ فاضل مضمون نگار نے غالباً یہ سمجھا ہے کہ ہم جو سیاسی جنگ میں کانگریس کے ساتھ شرکت کرنے سے انکار کر رہے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم تعطل چاہتے ہیں۔ حالانکہ معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے اپنی قوم کی منتشر طاقتوں کو جمع کرنا خود ایک جنگ ہے۔ یہ جنگ اگر ہم شروع کر دیں تو اس کے دوران میں ایک طرف ہمارے زنگ خوردہ ہتھیاروں پر صیقل بھی ہوگا اور دوسری طرف ہماری منتشر طاقت جتنی جتنی مجتمع ہوتی جائے گی ملک کی سیاسی میزان میں ہمارا وزن بڑھتا چلا جائے گا اور اس کے اثرات وہی ہوں گے جو فاضل مضمون نگار کو مطلوب ہیں بخلاف اس کے اگر ہم نے یہ دیکھ کر فلاں جماعت نے اتنے معرکے سر کر لیے ہیں اور فلاں گروہ اتنا طاقتور ہو چکا ہے، مرعوبانہ ذہنیت کے ساتھ کوئی طریق کار اختیار کیا تو یہ مسلمانوں کی زندگی کا ثبوت نہ ہوگا بلکہ ان کی شکست خوردگی کا ثبوت ہوگا۔

۴۔ مسلمانوں کی حالت کو ہندوؤں پر قیاس کرنا میرے نزدیک قیاس مع الفارق ہے۔ ہندو قوم میں وحدت ملی کا کوئی تصور نہ تھا، ان کا سوشل سسٹم ان کو متفرق کرنے والا تھا نہ کہ مجتمع، ان کے اندر ایسی رسمیں رائج تھیں جو گھن کی طرح ان کی قوم کو کھائے جا رہی تھیں، وہ دنیا کی دوسری قوموں سے بالکل الگ تھلگ ہندوستان میں پڑے ہوئے تھے اور اسی کو دنیا سمجھتے تھے۔ اس حالت میں جب وہ

مسلمانوں کے اوپر پھر انگریزوں کے زیر حکومت آئے تو اگرچہ غلامی کے ناگزیر نتائج سے محفوظ نہ رہ سکے، لیکن بحیثیت مجموعی ان کو نقصان سے بہت زیادہ فوائد حاصل ہوئے۔ ان میں وحدت قومی کا ایک تصور پیدا ہو گیا، ان کو اپنے سوشل سسٹم کی بہت سی خرابیوں کا احساس ہوا جس کی بدولت متعدد اصلاحی تحریکیں وجود میں آئیں، اور باہر سے علم و تہذیب کی جو روشنی ان تک پہنچی اس نے ان کے خیالات کی دنیا کو بہت کچھ بدل دیا۔ علاوہ بریں اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ "ہندویت" کی اساس کسی عقیدے اور کسی اجتماعی عمل اور کسی نظام تہذیب پر مبنی نہیں ہے، بلکہ نسل اور سرزبوم کی وحدت پر مبنی ہے، اس لیے بیرونی اثرات سے ان کے قدیم عقائد اور طرز معاشرت اور افکار و اعمال میں خواہ کتنا ہی تغیر ہو جائے ان کی "ہندویت" بہرحال برقرار رہتی ہے۔ اس پر مزید یہ کہ ان کے اپنے مذہب و تمدن میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو ایک ترقی پذیر قومیت کو وجود میں لا سکے۔ لہٰذا مغرب کے عمرانی و سیاسی تصورات ان کے لیے بجائے مضر ہونے کے درحقیقت مفید ہیں۔ یہی چیز ان کے اندر زندگی و حرکت پیدا کر سکتی ہے، اور اسی سے ان میں قومیت کا نشو و نما ہو سکتا ہے۔

مسلمانوں کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ یہ قوم اپنی ایک وحدت اور نہایت طاقتور وحدت رکھتی تھی۔ اس کا سوشل سسٹم غایت درجہ صحیح و سالم تھا۔ جاہلانہ رسوم سے یہ بالکل پاک تھی۔ اس میں ایک اعلیٰ درجہ کی حضارت موجود تھی، اور یہ سب کچھ اسے صرف ایک چیز کی بدولت حاصل ہوا تھا جس کا نام "اسلام" ہے۔ ہندوستان میں دوسری قوموں کے ساتھ جب یہ قوم خلط ملط ہوئی، تو اس کی بلندی تو دوسروں کو پستی سے اٹھانے کی موجب ہوئی۔ مگر دوسروں کی پستی نے خود اس کو بلندی سے گرانا شروع کر دیا۔ اس نے دوسروں سے نسلی و وطنی عصبیت لی، نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی وحدت پارہ پارہ ہونے لگی۔ اس نے دوسروں سے جاہلیت کی رسوم لیں، نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی قومی طاقت کو گھن لگ گیا۔ اس نے اپنے سوشل سسٹم میں دوسروں کے طریقے داخل کر لیے، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ توازن اور اعتدال بگڑتا

چلا گیا جو اس سسٹم کا طرۂ امتیاز تھا۔ اس نے دوسروں کے عقائد و افکار کو بغیر سمجھے بوجھے قبول کرنا شروع کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ یہ اپنے مذہب سے دور ہٹتی چلی گئی، حالانکہ مذہب ہی اس کی قومیت اور اس کے اخلاق، تہذیب اور تمدن کا قوام تھا۔ یہی چیز آخرکار اس قوم کے سیاسی زوال کی باعث ہوئی اور اس نے حکومت کے مقام سے گرا کر اسے غلامی کی لعنت میں مبتلا کر دیا۔ غلامی کے دور میں جو مزید خرابیاں اس قوم میں پیدا ہوئیں، ان کو میں تفصیل کے ساتھ بیان کر چکا ہوں۔ اگر آپ انصاف کی نظر سے دیکھیں گے تو آپ کو تسلیم کرنا پڑیگا کہ مسلمانوں پر مغربی استیلاء کے اثرات اُس کے بالکل برعکس ہوئے ہیں جو آپ کو ہندوؤں میں نظر آتے ہیں۔ ہندوؤں کو اس نے پستی سے اٹھایا اور مسلمانوں کو اور زیادہ پستی میں گرا دیا، اس نے ہمارے اخلاق، عقائد، تہذیب و تمدن، اور نظام معیشت و معاشرت کو جو نقصان پہونچایا وہ ان جزوی فوائد کے مقابلہ میں بدرجہا زیادہ ہے جو مغربی تعلیم و تہذیب سے ہمیں حاصل ہوئے۔

مسلمانوں پر مغربی تہذیب اور مغربی تعلیم کے اثرات کا ذکر میرے مضامین میں محض ایک ضمنی بحث کی حیثیت سے نہیں آیا ہے بلکہ میں قومی امراض کی تشخیص اور ان کی شدت کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے ضروری سمجھتا ہوں کہ منجملہ دوسرے اسباب زوال کے، ان اثرات کا بھی پوری طرح جائزہ لیا جائے۔ فاضل مضمون نگار نے غالباً یہ خیال کیا ہے کہ میں پرانے تعلیم یافتہ گروہ سے تعلق رکھتا ہوں اور اس گروہ کی جانب سے جدید تعلیم یافتہ گروہ پر حملہ کر رہا ہوں، اس لیے میری تحریروں سے ان دونوں گروہوں میں جو اختلافات ہیں وہ اور زیادہ بڑھ جائیں گے، اور تعلیم جدید کے خلاف مسلمانوں کے جذبات میں اور زیادہ شدت پیدا ہو جائے گی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ میرا تعلق ان دونوں گروہوں میں سے کسی کے ساتھ بھی نہیں ہے۔ میں نے جدید تعلیم و تربیت کے نقائص پر جس قدر صاف گوئی کے ساتھ تنقید کی ہے، اسی قدر صاف گوئی کے ساتھ قدیم تعلیم کی کمزوریوں اور پرانے تعلیم یافتہ حضرات کی غلطیوں

بھی متعدد مرتبہ تنقید کر چکا ہوں ہیں ان دونوں گروہوں میں تنافر نہیں بلکہ مصالحت چاہتا ہوں اور مصالحت کی صورت میرے نزدیک یہی ہے کہ ایک گروہ اپنی قدامت پرستی اور جمود کو چھوڑے اور دوسرا گروہ اہل مغرب کی اندھی تقلید سے باز آئے۔

---

(۵) "علوم جدیدہ" اور "جدید تعلیم" کے فرق کو نظر انداز نہ کیجیے۔ میں علوم جدیدہ کی تعلیم کا مخالف نہیں بلکہ شدت کے ساتھ حامی ہوں، اور بارہا اس رائے کا اظہار کر چکا ہوں کہ مسلمانوں کے تنزل کا ایک بڑا سبب ان کا جمود اور ماضی پرستی میں مبتلا ہو جانا اور تحقیق و اجتہاد کے میدان میں دوسری قوموں سے پیچھے رہ جانا ہے۔ لیکن زمین اور آسمان کا فرق ہے "علوم جدیدہ کی تعلیم" اور اس "جدید تعلیم" میں جو ہمارے نوجوانوں کو دی جارہی ہے۔ حقائق فطرت، کے انکشافات، اور آثار فطرت کے مشاہدات اور مسائل عمرانیہ میں فکر انسانی کے اجتہادات فی نفسہ اسلام کے خلاف نہیں ہیں، بلکہ مسلمان کو مسلمان بنانے میں اور زیادہ مدد دیتے ہیں، اور اس کی ترقی کے لیے ان کی حیثیت ناگزیر وسائل کی ہے۔ لیکن جو چیز ان تمام علوم کو اسلام کے خلاف بنا دیتی ہے، اور مسلمان کو کفر و فسق کی طرف لے جاتی ہے وہ، وہ خاص مغربی نقطۂ نظر ہے جو ان تمام علوم کی بنیاد بن گیا ہے، اور وہ خاص طرز تعلیم و تربیت ہے جو ہماری درسگاہوں میں رائج ہے۔ اس مسئلہ پر ترجمان القرآن کی متعدد اشاعتوں میں تفصیل کے ساتھ بحث کی جا چکی ہے۔ اگر فاضل مضمون نگار ان مضامین کو ملاحظہ فرمالیں تو ان کے اکثر شبہات خود دور ہو جائیں گے (خصوصیت کے ساتھ جمادی الاخریٰ، رجب و ذی قعدہ ۵۳ھ، رجب ۵۴ھ، جمادی الاولیٰ ۵۵ھ کے "اشارات" اور جمادی الاخریٰ ۵۵ھ کی اشاعت میں وہ مضمون جو علیگڑھ یونیورسٹی کے نصاب تعلیم پر لکھا گیا ہے، قابل ملاحظہ ہے)۔

---

(۶) درحقیقت یہی کام میرے پیش نظر ہے جس کی طرف نواب صاحب نے اشارہ فرمایا ہے چند صفحات قبل میں نے جس پروگرام کو نواب صاحب ناقابل عمل قرار دے چکے ہیں اس کا اہم ترین حصہ یہی ہے کہ مسلمانوں کے طبقۂ عوام میں اسلام کا کم سے کم ضروری علم پہونچا دیا جائے تاکہ وہ اپنے دین سے واقف ہو جائیں اور ان رسوم جاہلیت سے خود بخود اجتناب کرنے لگیں جو ان کے اندر پھیلی ہوئی ہیں۔ اس کے ساتھ ان کے اندر قومی مفاد کا صحیح شعور پیدا کیا جائے، اور ان کو کم از کم اس حد تک باخبر کر دیا جائے کہ وہ قومی مفاد کی خدمت کرنے والوں اور اسے نقصان پہنچانے والوں کے درمیان امتیاز کر سکیں۔

---

(۷) "سلطنت در سلطنت" ایک مبہم اصطلاح ہے جس کا اطلاق ایک حکومت کے حدود اقتدار میں کسی دوسرے نظام کی قوت و اثر کے مختلف مدارج پر ہوتا ہے۔ اس قوت و اثر کے دائرے کا وسیع یا محدود ہونا دراصل منحصر ہے اس نظام کی مضبوطی اور اس کے حاملوں کی معنوی طاقت کے کم یا زیادہ ہونے پر۔ واقعات کی دنیا میں اقلیت و اکثریت کوئی اہم چیز نہیں ہے۔ اصل چیز نظم اور اجتماعی ارادہ کی طاقت ہے۔ اسی طاقت سے قلیل التعداد انگریز اپنے سے ہزار گنی زیادہ اکثریت پر حکمراں ہیں۔ ایک ڈیماکریٹک نظام حکومت میں بھی اقتدار اکثریت ( Majority Rule ) کے قاعدہ کو ایک منظم اور قوی الارادہ اقلیت بے اثر کر سکتی ہے پس یہ سوال کہ وہ "سلطنت در سلطنت" جو میں تجویز کر رہا ہوں، کن حدود تک وسیع ہوگی، اس حالت میں طے نہیں ہو سکتا جب کہ ہم سرے سے کوئی نظم اور کوئی اجتماعی ارادہ ہی نہیں رکھتے۔ پہلے ہم کو یہ طاقت فراہم کرنی چاہیے پھر ہم جتنی طاقت فراہم کر لیں گے اسی کی نسبت سے "سلطنت در سلطنت" کے حدود وسیع یا محدود ہو جائیں گے

---

(۸) "شبہ دار الاسلام" سے میری مراد ایک ایسا نظام سیاست ہے جو خالص "دار الکفر" کی بہ نسبت

خالص "دارالاسلام" سے زیادہ اقرب ہو۔ ہندوستان کی موجودہ حالت یہ نہیں ہے۔ اس میں مسلمانوں کو بحیثیت ایک قوم کے کسی طرح کی بھی خود اختیاری حاصل نہیں۔ جو برائے نام مذہبی اور تمدنی آزادی ان کو دی گئی ہے وہ غیر مسلم حکمرانوں کی عطا کردہ چیز ہے، جس کے حدود کو کم یا زیادہ کرنا ان کے اپنے اختیار تمیزی پر موقوف ہے۔ ہمارے جن مذہبی احکام کو وہ اپنے اصول کے مطابق درست نہیں سمجھتے ان کے نفاذ کو روک دیتے ہیں، جو مذہبی احکام ان کی مصلحتوں کے خلاف ہیں ان کو بھی نافذ نہیں ہونے دیتے اس کے بعد صرف وہ احکام رہ جاتے ہیں جو ان کی نگاہ میں بے ضرر ہیں۔ اُن کے نفاذ کی وہ ہمیں اجازت دے دیتے ہیں لیکن اس محدود آزادی کے دائرے میں بھی ہم ان کے اقتدار کے بلا واسطہ اثر سے محفوظ نہیں رہتے انہوں نے تعلیم کا جو نظام قائم کیا ہے وہ ہمارے مذہب اور تہذیب کے اصولوں کا مخالف ہے اور اس کے اثر سے ہماری نوجوان نسلوں کا ایک بڑا حصہ اُن مذہبی احکام سے بھی روگردانی کرنے لگتا ہے، جن کی بجا آوری میں ہم آزاد چھوڑ دیے گئے ہیں۔ انہوں نے جو نظام معیشت قائم کیا ہے اُس کی گرفت میں ہم اس قدر بے بس ہو چکے ہیں کہ ہمارے لیے اسلامی اصول معیشت کی پابندی قریب قریب محال ہو گئی ہے اگرچہ ظاہر میں کوئی قانون ایسا نہیں ہے جو ہم کو ان اصولوں کی پابندی سے روکتا ہو۔ اسی طرح ان کا نظام عدل و قانون اور ان کا آئین حکومت ایسا ہے جو ہمارے اخلاق، معاشرت، تمدن، ہر چیز پر بلا واسطہ اثر ڈالتا ہے، اور اس کے مقابلہ میں ہم اس درجہ بے اختیار ہیں کہ اپنی حفاظت کے لیے کوئی کارگر تدبیر عمل میں نہیں لا سکتے۔ ان سب پر مزید یہ کہ غیر مسلم طاقت کا اقتدار بجائے مطلق فی نفسہ ایک زبردست اثر رکھتا ہے۔ جو طاقت کم از کم ظاہر کے اعتبار سے رزق کے خزانوں کی مالک اور عزت و ذلت بخشنے کی مختار نظر آتی ہے، محکوم قوم اس سے تقرب حاصل کرنے کے لیے اپنی وہ بہت سی چیزیں بھی اس کے قدموں میں لا کر ڈال دیتی ہے جنہیں وہ اس سے بجبر نہیں مانگتی۔ ایسی حالت جس ملک کی ہو وہ اگر خالص دارالکفر نہیں تو اس سے اقرب ضرور ہے۔ اس لیے اسے شبہ دارالکفر کہنا

چاہیے نہ کہ شبہ دارالاسلام۔

میں جس چیز کی طرف مسلمانوں کے سیاسی فکر رہنے والے لوگوں کو توجہ دلا رہا ہوں، وہ یہی ہے کہ انہیں اس حالت کو بدلنے کے لیے اپنی قوتوں کو مجتمع کرنا چاہیے۔ اگر اس کو بدلنا ہے تو اس کی تیاری کا یہی وقت ہے۔ انقلابی دور میں ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف انتقال کا عمل جاری ہوتا ہے، اس وقت ہم نسبتہً زیادہ آسانی کے ساتھ آنے والی حالت کی شکل متعین کرنے میں اپنا اختیار استعمال کرسکتے ہیں۔ جب وہ ایک خاص صورت میں ڈھل جائیگی اور پوری طرح مستحکم ہو جائیگی اس وقت ہمارے لیے اپنا اختیار استعمال کرنے کا شاید کوئی موقع باقی نہ رہے گا۔ گذشتہ صدی کے ابتدائی دور میں ہم نے غفلت کی اور اس شبہ دارالکفر کو نہ صرف قائم ہو جانے دیا بلکہ اپنے ہاتھوں سے اس کے قائم ہونے میں مدد دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہم بالکل بے بس ہو کر اس کی گرفت میں جکڑ گئے، اور آج ہر شخص دیکھ رہا ہے کہ ہمارے لیے اس کی بندشوں میں سے کسی چھوٹی سے چھوٹی بندش کو توڑنا بھی کس قدر مشکل ہے۔ اسی سے سبق حاصل کرنا چاہیے کہ اگر ہم نے ہندوستان کے سیاسی انقلاب کو موجودہ رفتار پر جانے دیا اور کوئی ایسی منظم طاقت فراہم نہ کی جس سے ہم اس کی سمت متعین کرنے میں خود اپنا اختیار بھی استعمال کرسکیں، تو نتیجہ یہ ہوگا کہ اس شبہ دارالکفر کی جگہ ایک دوسرا شبہ دارالکفر لے گا، اور اس کے مستحکم ہو جانے کے بعد ہم اس کی گرفت میں بھی اتنے ہی بے بس ہوں گے جتنے اس وقت ہیں۔ یہ ایک ایسی کھلی ہوئی بات ہے جس کو سمجھنے کے لیے کسی گہرے تفکر کی ضرورت نہیں محض عقل عام Common Sense رکھنے والا ایک عامی بھی اس کو سمجھ سکتا ہے، مگر یہ ناساعد حالات کی طاقت کا کرشمہ ہے کہ ایسی واضح بات کو سمجھانے کے لیے بھی دلائل کی ضرورت پیش آ رہی ہے، اور دلائل کے زور سے بھی اس کو دلوں میں اتارنا مشکل ہو رہا ہے۔ جو لوگ پہلے ہندوستانی اور پھر سب کچھ ہیں وہ اگر اسے ماننے سے انکار کریں تو جائے تعجب نہیں، اس لیے کہ ان کی نگاہ میں مسلمانوں کی قومی زندگی کا سوال کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔

ان کا ضمیر تو پہلے ہی یہ فیصلہ کر چکا ہے کہ شبہ دارالکفر ہو یا خالص دارالکفر ہمیں صرف آزاد ہندوستان چاہیے جس میں ہمارے رزق کے خزانے خود ہمارے اپنے ہاتھوں میں ہوں لیکن جو لوگ پہلے مسلمان اور پھر سب کچھ ہیں ان پر مجھے سخت حیرت ہے کہ وہ اس بات کو سمجھنے سے کیوں انکار کرتے ہیں۔

---

(۹) اس سے پہلے میں جو کچھ بیان کر چکا ہوں اس کے بعد مجھے امید ہے کہ فاضل مضمون نگار اپنی اس رائے پر خود نظر ثانی کریں گے۔ آئینی ضمانتیں اور ان پر اکثریت کی رضامندی کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کے بل پر کوئی قوم زندہ رہ سکتی ہو۔ اگر ان ضمانتوں کی پشت پر ہماری اپنی طاقت نہ ہو تو ان کا قائم رہنا یا نہ رہنا بہرحال اکثریت کی رضامندی پر موقوف ہوگا، اور اس کے معنی یہ ہیں کہ ہندوستان کے آئندہ نظام سیاست میں اکثریت کے اقتدار کی وہی حیثیت ہو جو اس وقت انگریزی اقتدار کی ہے، اور اس کے دست قدرت میں ہم ویسے ہی بے بس ہوں جیسے اب ہیں۔

---

(۱۰) اکثریت کے منظور کرنے یا نہ کرنے پر جس "سلطنت در سلطنت" کا مدار ہو وہ اس نام سے موسوم کیے جانے کے قابل ہی نہیں ہو سکتی۔ یہ تو وہ چیز ہے جس کو ایک جماعت کا طاقتور اجتماعی ارادہ قائم کرتا اور قائم رکھتا ہے خواہ کوئی اس پر راضی ہو یا نہ ہو۔

---

(۱۱) میں ربیع الاول ۵۶ھ کی اشاعت میں ان کم سے کم حقوق اور اختیارات کی توضیح کر چکا ہوں جو ہندوستان میں مسلمانوں کی قومی زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہیں "سلطنت در سلطنت" سے میری مراد یہی حقوق اور اختیارات ہیں۔ آپ ایک مرتبہ پھر ان کو غور سے ملاحظہ فرمائیں۔ ان میں کونسی چیز ہے جو مشترک ہندوستانی مفاد کے لیے ہم کو دوسری ہمسایہ اقوام کے ساتھ پورا پورا تعاون کرنے سے

روکتی ہو، یا ایک مشترک وطنی حکومت کے نشو و ارتقا میں مانع ہو؟ اگر ہندوستان کی دوسری قومیں بھی اپنے مخصوص قومی مفاد کے لیے اس قسم کی خود اختیاری (Autonomy) طلب کریں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں، اور ان سب کو ایسی خود اختیاری دینے کے بعد بھی ہندوستان کا مشترک نظام حکومت بخوبی چل سکتا ہے۔

---

(۱۲) یہ وہی چیز ہے جس کی طرف میں توجہ دلا رہا ہوں۔ اسی کے لیے ضرورت ہے کہ مسلمان کسی ایک نصب العین پر متحد ہوں، اپنے قومی مفاد کا ایک واضح اور متعین نقشہ ان کے درمیان متفق علیہ ہو، اور کوئی ایسا نظم ان کی جماعت میں پیدا ہو جائے جس کے تحت وہ اپنے مفاد کے لیے اجتماعی جد و جہد کر سکیں۔ یہی چیز اس وقت مفقود ہے، اور اسی کا فقدان ہماری آواز کو بے اثر بنا رہا ہے۔ اگر ہماری ایک جماعت کسی چیز کو قومی حق قرار دے کر اس کا مطالبہ کرے، اور خود ہماری اپنی قوم کی ایک دوسری جماعت اس کے خلاف اٹھ کھڑی ہو، تو ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں ہم اپنے کسی حق کی بھی حفاظت نہیں کر سکتے اس وقت تو ہماری حالت یہ ہے کہ ہمارے درمیان کوئی چیز بھی متفق علیہ نہیں۔ ایک گروہ کا نصب العین کچھ ہے تو دوسرے گروہ کا کچھ اور۔ ایک گروہ جن امور کو قومی مفاد سے متعلق سمجھتا ہے، دوسرا گروہ کہتا ہے کہ ان کو قومی مفاد سے کوئی تعلق نہیں، اور تیسرا گروہ اس چیز کا نام ہی سن کر "کمیونلزم" کا آوازہ کس دیتا ہے۔ حد یہ ہے کہ ہماری ایک جماعت کونسلوں کے اجلاس یا کانگریس کے اجتماع سے نماز کے لیے اٹھتی ہے اور اس سے دس گنی جماعت بیٹھی رہتی ہے، اور بیٹھنے ہی پر اکتفا نہیں کرتی بلکہ اس کے بعض افراد غیر مسلموں کے مجمع میں نماز پڑھنے والوں کی مذہبی دیوانگی پر طنز کرتے ہیں۔ اب اندازہ کیجیے کہ اس سے بڑھ کر اور کونسی چیز ہماری قوم کی اجتماعی طاقت کو نقصان پہونچانے والی ہو سکتی ہے۔ اور جب حال یہ ہے تو وہ متفقہ آواز آپ لائیں گے ہی کہاں سے جس کے بغیر آپ خود تسلیم کرتے ہیں کہ

کوئی آئینی ضمانت اور کوئی میثاق ہمارے لیے قابل اطمینان نہیں ہے۔

---

(۱۳) یہی کام ہے جس کو میں چاہتا ہوں کہ اسلامی اصول پر انجام دیا جائے۔ چونکہ ہمارے سامنے صرف معاشی اور سیاسی سوال ہی نہیں ہے بلکہ اس سے بڑھ کر اپنی تہذیب کی حفاظت کا بھی سوال ہے، اس لیے ہم کو اپنے جمہور کی تنظیم کرنے میں اسلامی اصول اختیار کرنے چاہئیں ہمارے لیے گاندھی اور جواہر لال کا اسوہ قابل اتباع نہیں، بلکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ ہے جس کی پیروی ہم کو کرنی چاہیے خدا پرستوں کی تنظیم کے جو اصول ساڑھے تیرہ سو برس پہلے استعمال کیے گئے تھے۔ وہ صرف اسی زمانہ کے لیے نہ تھے، بلکہ تمام ازمنہ اور امکنہ کے لیے تھے۔ ان کو عمل میں لانے کے طریقے اور وسائل زمانی و مکانی حالات کے لحاظ سے بدل سکتے ہیں، مگر وہ اصول بجائے خود اٹل ہیں، اور آپ جس ملک اور جس زمانہ میں بھی خدا پرست قوم کی تنظیم کرنا چاہیں گے، آپ کو انہی اصولوں کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ باطل کا اقتدار جب پوری طرح چھایا ہوا ہوتا ہے، اس وقت لوگوں کو شبہ ہونے لگتا ہے کہ ان اصولوں پر عمل درآمد غیر ممکن الوقوع ہے یا اگر ممکن بھی ہے تو اس کے لیے صدیاں درکار ہیں لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ غیر ممکن چیز ہر وقت ممکن ہو سکتی ہے، اور دیکھتے دیکھتے ہوا کا رخ بدل سکتی ہے البتہ اس کے لیے ایک کڑی شرط یہ ہے کہ اس مشین کو صرف وہی اخلاقی طاقت حرکت میں لا سکتی ہے جو سیرت محمدی کے سرچشمہ سے ماخوذ ہو۔ جن لوگوں میں باطل سے مرعوب ہو جانے اور ہر بڑھتی ہوئی طاقت کے آگے سر جھکا دینے کی کمزوری موجود ہو اور جو لوگ اتنی استقامت نہ رکھتے ہوں کہ سخت سے سخت طوفان میں بھی راہ راست پر جمے رہ سکیں، ان کے ہاتھوں سے یہ مشین کبھی حرکت نہیں کر سکتی مسلمانوں کے لیے تنظیم کے کسی نئے پروگرام کی ضرورت نہیں۔ پروگرام تو بنا بنایا موجود ہے۔ کمی صرف ایک ایسے رہنما اور چند ایسے کارکنوں کی ہے جو اپنے مقصد میں اپنے نفس اور ما ہوا النفس کو فنا کر سکتے ہوں، جن کے دل نام و نمود کی بھوک

ذاتی وجاہت کی پیاس، مال و زر کی حرص، اور نفاق و حسد کی آگ سے پاک ہوں، جن میں حق کو سربلند کرنے کا ایسا ارادہ موجود ہو جو کسی حالت میں ٹل نہ سکتا ہو اور جن میں اتنی صلاحیت ہو کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کے طریقہ پر نظم کے ساتھ کام کر سکیں۔

---

(۱۴) اس کے متعلق میں تصریح کر چکا ہوں۔ جمہور اہل اسلام کی قیادت اب ان لوگوں سے چھین لینی چاہیے جو چھوٹے چھوٹے مسائل پر مسلمانوں کو بھڑکا کر ہمسایہ قوموں سے لڑاتے ہیں اور قوم کی قوت کو فضول جھگڑوں میں ضائع کر رہے ہیں۔ اب قیادت و رہنمائی کے لیے ایک ایسی ترقی پسند مسلمان جماعت کو اٹھنا چاہیے جو مشترک ہندوستانی مفاد کے لیے اپنے غیر مسلم ہمسایوں کے ساتھ کھلے دل سے تعاون کرنے پر آمادہ ہو، اور ان معاملات میں کسی قسم کا فرقہ وارانہ تعصب روا نہ رکھے مگر اپنے قومی مفاد کے معاملہ میں (جس کے حدود واضح طور پر مشترک وطنی معاملات سے الگ ہوں) کسی دباؤ، کسی لالچ، کسی پروپیگنڈا کی طاقت سے اس کو مغلوبانہ مصالحت کے لیے راضی نہ کیا جا سکتا ہو۔

---

## رسائل و مسائل

# خطبۂ جمعہ کی زبان

نظام آباد سے ایک صاحب تحریر فرماتے ہیں :-

خطبۂ جمعہ کی زبان کے مسئلہ پر جناب نے جو نقلاً و عقلاً روشنی ڈالی ہے اور حالات زمانہ کے لحاظ سے جو نتائج اخذ فرمائے ہیں اس حد تک تو مجال اختلاف نہیں۔ سچ ہے کہ عربی زبان تو درکنار مسلمان اپنی ابتدائی دینی تعلیم بھی لازمی نہیں کرا سکتے تو خطبۂ عربیہ کا حکم کیا معنی؟ مجبور کے لیے تو حرام کھانے کی بھی اجازت ہے لیکن اس تحقیق میں جناب نے جو اصولی بحث چھیڑ دی ہے وہ محل نظر ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کے عمل کو مصلحت شرعی ہونے کے بجائے ایک طبعی فعل قرار دینے پر جو دلائل اور وجوہ جناب نے تحریر فرمائے ہیں وہ قلب کو مطمئن نہیں کرتے۔ بلاشبہ اسلام کو وطنی اور لسانی عصبیت سے کوئی علاقہ نہیں بلکہ وہ آیا ہی اس لیے ہے کہ گروہ انسانی میں ملکی و نسلی اور لسانی جو غلط تخیلات بنائے تفریق و تقسیم ہیں ان کو مٹا کر مختلف اقوام کی جگہ ایک قومیت کی تعمیر کی جائے۔ اس قومیت کا نام اسلام ہے۔ اِنَّ الدِّینَ عِندَ اللّٰہِ الاِسلَام (۳ : ۲) اور قوم کا نام مسلم رکھا گیا ہُوَ سَمّٰکُمُ المُسلِمِینَ (۲۲ - ۱۰) جس طرح دنیا میں مختلف قومیں آباد ہوئیں اور ہیں اور ہر قوم کی ایک زبان رہی ہے تو فطرۃً اس قوم "مسلم" کی بھی کوئی ایک زبان ہونی چاہیے۔ جو نتائج فطرۃً و لازماً پیدا ہوتے ہیں ان کو عمل کرنے کا حکم نہیں دیا جاتا۔ حکیم یہ نہیں کہیگا کہ تم مرض کو رفع کرو بلکہ ان ہدایتوں پر عمل کرائیگا جن پر عمل کرنے کا نتیجہ صحت ہے۔ حاکم قوم محکوم کی زبان کو بدلدینے کا حکم نہیں دیتی۔ فطرۃً محکوم حاکم قوم کی زبان اختیار کرینگے۔ پھر خالق فطرت ایسا حکم کیوں دیتا اور خالق فطرت کا رسول ایسی ہدایت

کیوں دے جس کا ظہور بطورِ نتیجہ لازمی ہوتا۔ نزولِ قرآن کا مقصد یہی ہے کہ گروہِ انسانی میں حکومتِ الٰہیہ قائم کی جائے حکومت کی زبان عربی ہے حکومت کے کاروبار انجام دینے والوں کی زبان اس کے محکوم کی زبان لازماً وہی ہوگی۔ قرآن عربی ہونے کے متعلق جو آیتیں ہیں وہ ملاحظہ ہوں:۔

| | |
|---|---|
| اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ۔ (۱۲:۲) | ہم نے اس قرآن کو عربی میں اتارا ہے تاکہ تم بخوبی سمجھ سکو |
| فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِيْنَ | ہم نے اس قرآن کو تیری زبان میں آسان کر دیا تاکہ تو اس کے |
| وَتُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا۔ (۱۹:۶۱) | ذریعہ سے پرہیزگاروں کو بشارت دے اور اکھڑ لوگوں کو عذاب سے ڈرائے |
| وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا (۲۰:۶) | اور اس طرح ہم نے اس کو عربی زبان کا قرآن اتارا ہے۔ |
| قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ (۳۹:۲) | قرآن عربی جس میں کوئی پیچیدگی نہیں تاکہ لوگ سمجھ کر خدا سے ڈریں |
| قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ۔ (۴۱:۱) | قرآن عربی ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں۔ |

اگر ان آیتوں کا صرف یہ مطلب ہے کہ رسول اللہ عرب تھے دعوتِ اسلام ابتداءً اہلِ عرب کو دی گئی اس لیے قرآن عربی زبان میں نازل ہوا تو یہ ایسی کیا "حکمت" کی بات تھی جو ایک "حکیم" نے بتائی یہ نہ بھی بتایا جاتا تو بھی یہی سمجھا جاتا۔ قرآن اور رسول اللہ اہلِ عرب ہی کے لیے نہیں تھے تو پھر یہ کوئی قرینہ نہیں کہ ان آیتوں کے مخاطب تو اہلِ عرب تھے اور باقی آیتوں کے مخاطب تمام بنی آدم۔ اگر قرآن اپنے مخاطب کی زبان کے لحاظ سے عربی میں نازل ہوا ہے تو کہا جا سکتا ہے کہ اکثر احکام بھی اہلِ عرب کے طبعی و ملکی حالات کے لحاظ سے نازل ہوئے۔ جیسا کہ بعض کج فہم کہتے ہیں۔ وہ قرآن جو..... تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ، اور مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ہے۔ جو هُدًى لِّلنَّاسِ و ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ہے، کل بنی آدم کے لیے جس کو صراطِ مستقیم کہا جا رہا ہے پھر وہ بنی آدم جن میں بیسوں زبانیں بولی جاتی ہیں ان سب کے لیے قرآن عربی نازل کرنے میں کیا "حکمت" پنہاں ہے۔ وہ خدا جو اپنے رسول کو رَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ اور رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ کا مرتبہ دیکر "معلمِ کتاب و حکمت" بنا کر تمام بنی آدم

کی ہدایت کے لیے بھیجا ہے کیا اس پر قادر نہ تھا کہ اپنے عظیم المرتبت رسول کو کل زبانوں سے واقف کرا دے
احکم الحاکمین کا یہ مقصد نہ تھا کہ اس کا دین ایک ہی زبان جاننے والوں کا دین ہو کر رہ جائے؟

نبی کریم کا عربی زبان میں خطبہ دینا کسی شرعی مصلحت کا حامل نہیں تو غیر عربی زبان جاننے والوں کے
لیے قرآن عربی نازل کرنا اور اس کی اشاعت کے لیے صرف عربی زبان جاننے والوں کو منتخب کرنا کیا
نزول قرآن کے مقصد کو فوت نہیں کرتا؟ بلاشبہ رسول عربی کے مخاطب اہل عرب تھے مجلس نبوی کے
حاضرین میں غیر زبان جاننے والوں کی تعداد کم رہتی تھی مگر نبی کریم نے جو دعوت نامے قیصر روم و
شاہ ایران کو بھیجے تھے وہ کیوں عربی زبان میں بھیجے گئے؟ اگر مصلحت شرعی یہ نہیں ہے کہ دین کی
اشاعت ایک ہی زبان میں ہو تو نبی کریم نے اس کو کیوں ملحوظ نہیں رکھا؟ وہ معلم کتاب حکمت تھا
کوئی فعل جس کا تعلق رسالت سے ہو خالی از حکمت نہ ہونا چاہیے۔ تمام دنیا کے لیے قرآن عربی نازل
کرنا اسی حکمت کو ظاہر کرتا ہے کہ اس دین سے جو قوم پیدا ہوگی اس کے افراد ایک ہی زبان بولنے
والے ہوں۔ یہ بناء تفریق نہیں نتیجہ وحدت ہے۔ خلاف فطرت نہیں عین فطرت ہے۔ دین الٰہی قائم
ہوگا تو یہ مقصد خود بخود پورا ہو جائے گا۔ کسی قوم کو بھی لیجیے افراد قوم کی ایک ہی زبان ہوگی آج
ہندوستان میں جہاں مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں ہندوستانی قومیت کی تعمیر کے لیے وحدت زبان
کی گتھی سلجھائی جا رہی ہے۔ دین اسلام اپنے متبعین میں رشتۂ اخوت قائم کرتا ہے۔ زبان کے اختلاف
سے اجنبیت باقی رہے گی جو منافی اخوت ہے۔ ایک انگریز ایک ہندی ایک عرب ایک ترک ایک جاپانی
ایک چینی یہ چھ مسلمان ایک جگہ جمع ہیں۔ آپس میں تبادلۂ خیالات تو کجا اسلامی طریقہ سے سلام بھی نہیں کر سکتے۔

ایک مقام پر آپ یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ اصلی اسلامی اسپرٹ کا تحفظ خالص عربیت کے تحفظ
پر موقوف تھا۔ اس کے بعد یہ ارشاد کہ سیدنا عمر و سیدنا علی رضی اللہ عنہما میں اسی اسلامی اسپرٹ نے
عربیت کا تعصب اور بھی زیادہ پیدا کر دیا۔ مولانا! غور کرنے کا محتاج ہے۔ وہ لوگ جن کی مثال دنیا

اسلام آج تک نہ پیش کر سکی جو نور و ہدایت علم و عمل سے آراستہ ہو کر عصبیتِ جاہلیت کو مٹانے کے لیے اٹھے تھے ان میں اسلام نے وہی عصبیت پیدا کر دی! حیرت کا مقام ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اصلی اسلامی اسپرٹ کا تحفظ خالص عربیت کے تحفظ پر موقوف تھا اس لیے عربیت کا تعصب نہیں بلکہ اسلام کی عصبیت عربی زبان کے تحفظ کی متقاضی تھی ورنہ جو استدلال جناب نے فرمایا ہے وہ تسلیم کر لیا جائے تو جہادِ اسلامی کے متعلق یہ ..... اعتراض کس قدر وزنی ہو جائے گا کہ چونکہ عرب پہلے سے قتل و غارت گری کے عادی تھے اسلام نے اس جذبہ کو ابھار دیا۔ گویا ان مقدس ہستیوں نے جو جان نثاریاں ہوئیں وہ دینی جذبہ نہیں تھا بلکہ ان کا عادی و طبعی فعل تھا۔ جس طرح عادی و طبعی فعل اور شرعی عمل کا امتیاز مشکل ہے اس سے زیادہ اس فعل کا تعین مشکل ہے جو عادی و طبعی بھی ہو اور مصلحت شرعی کا تقاضا بھی۔

صحابۂ کرام یا ائمۂ سلف نے اگر غیر عربی زبان میں خطبہ نہیں دیا یا عجمیوں کو دعوت اسلام نہیں دی یا غیر عربی زبان میں بات کرنا بھی مکروہ سمجھتے تھے تو وہ عادی و طبعی فعل یا حالات زمانی کا نتیجہ نہیں تھا۔ بلکہ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ کا نتیجہ تھا۔ دین الٰہی ان کے رگ و پے میں جاری و ساری تھا۔ ان کی روح ان کے دل و دماغ احکام الٰہی کے تابع تھے۔ وہ حکومت الٰہیہ کے سچے محکوم تھے جس طرح یہ حکومت ان کو دنیا کی ہر چیز سے زیادہ محبوب تھی اسی طرح حکومت کی زبان (جو عربوں کی نہیں بلکہ خدا کی حکومت تھی) اُن کو دوسری زبانوں سے زیادہ عزیز تھی۔ کہ یہی انسانی فطرت ہے۔ آج جو لوگ حکومت کے شیدائی ہیں فرنگیت میں جذب ہو گئے ہیں ان کا اوڑھنا بچھونا انگریزی زبان ہے حالانکہ ملک معظم نے یا وائسرائے بہادر نے ان کو اپنی زبان بدل دینے کا کوئی حکم نہیں دیا۔

عصبیت لسانی کو مٹانے کا منشا یہ ہے کہ عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت نہیں اسلام سے پہلے بھی جنہیں

بہا متیاز تھی عجمی مسلمان ہونے کے بعد اسی طرح صاحب عزت و توقیر ہیں جیسے عرب اگر وہ عربی سے واقف نہیں تو ان کو کم تر نہ جانو۔ اسلامی قومیت میں جذب اور دین الٰہی میں شامل ہوجانے کے بعد ان کی زبان لازماً وہی ہوجائے گی جو حکومت کی زبان ہے کہ قوم مسلم دراصل حکومت الٰہی کی محکوم ہے۔

جس قوم کے ایمانیات و اعتقادات ایک جس کا مقصد حیات ایک جس کی زندگی کا نصب العین ایک ہو جس کی تعلیمات اخلاقیات معاملات عادات میں یکسانیت ہو اس قوم کی زبان ایک نہ ہونا دین کا مقصد نہیں، تعجب ہے! جس طرح اسلام سے پہلے کعبہ صرف عربوں کا تھا اسلام کے بعد وہ ہر مسلم کا کعبہ ہوگیا۔ اسی طرح اسلام سے پہلے عربی زبان صرف عربوں کی زبان تھی۔ اسلام کے بعد وہ زبان صرف عربوں کی نہیں رہی بلکہ قوم مسلم کی زبان ہے۔

**ترجمان القرآن**۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے مراسلہ نگار نے مسئلۂ زیر بحث پر اصولی طریقے سے غور نہیں کیا ہے، اسی وجہ سے ان کے کلام میں مختلف مباحث ایک دوسرے کے ساتھ ملط ملط ہوگئے ہیں۔ مسئلہ کا ایک پہلو فقہی ہے اور اس نقطۂ نظر سے صرف یہ امر بحث طلب ہے کہ آیا خطبہ کو عربی زبان میں پڑھنا شرعاً ضروری ہے یا نہیں؟ اس سوال کے متعلق کسی صحیح نتیجہ پر پہنچنے کے لیے حسب ذیل امور کی تحقیق ہونی چاہیے: کیا خطبۂ عربیہ کے وجوب پر کوئی نص ہے؟ اگر نص نہیں ہے اور یہ حکم صرف شارع کے عمل سے ماخوذ ہے تو کیا شارع کا یہ عمل سنت کی تعریف میں آتا ہے؟ آیا اصطلاح شرع میں سنت ہر اس عمل کو کہتے ہیں جو شارع نے کیا ہو، یا اس باب میں شرعی عمل اور عادی و طبعی عمل میں کوئی فرق کیا گیا ہے؟ اگر فرق ہے تو شارع کا عربی میں خطبہ دینا کس قسم کا فعل ہے، شرعی یا طبعی؟ مسئلہ کا دوسرا پہلو مصالح سے تعلق رکھتا ہے اور اس کے بارے میں صحیح رائے قائم کرنے کے لیے حسب ذیل امور کا تصفیہ ضروری ہے:- خطبہ کا مقصد کیا ہے؟ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے شارع نے اور صدر اول کے

ائمہ نے جو طریق اختیار کیا تھا اس کی پابندی سے آج بھی وہ مقصد حاصل ہوتا ہے یا نہیں؟ اصول شریعت میں مقصد زیادہ اہمیت رکھتا ہے یا وہ وسیلہ جو اس کو حاصل کرنے کے لیے مقرر ہو گیا ہو؟ اگر مقصد زیادہ اہمیت رکھتا ہے اور کسی خاص صورت حال میں طریقۂ متوارثہ کی پابندی سے وہ فوت ہو رہا ہے اور اس صورت حال کو بدلنے پر ہم قادر نہیں ہیں تو کیا ہم اصول شرع کے تحت طریقۂ متوارثہ میں کوئی تغیر کر سکتے ہیں؟ اگر تغیر کرنے کا حق ہم کو حاصل ہے تو حالات کے لحاظ سے ہمیں کتنا اور کس طرح تغیر کرنا چاہیے؟ یہ ہیں وہ تنقیحات جن کے تصفیہ پر زبان خطبہ کے سوال کا حل منحصر ہے۔ اگر مراسلہ نگار نے ان تنقیحات کو پیش نظر رکھ کر بحث کی ہوتی تو ہم کو یہ معلوم کرنے میں آسانی ہوتی کہ انہیں کن امور میں ہم سے اتفاق ہے اور کن امور میں اختلاف؟ پھر جو امور مختلف فیہ باقی رہ جاتے ان پر مزید بحث کر کے صحیح نتیجہ پر پہنچنے کی کوشش کی جا سکتی تھی۔ لیکن جو طریق بحث انہوں نے اختیار کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل امور تنقیح طلب ان کے سامنے واضح نہیں ہیں بلکہ وہ محض چند ضمنی مباحث میں الجھ کر رہ گئے ہیں۔ بہر حال چونکہ وہ خطبہ کے مسئلہ میں مانعین تغیر کے عام خیالات کی ترجمانی کر رہے ہیں، اس لیے ہم ان کے مضمون کو شائع کر کے اختصار کے ساتھ ان غلط فہمیوں کو رفع کرنے کی کوشش کرتے ہیں جن کی وجہ سے ان کو اور اسی طرز خیال کے دوسرے لوگوں کو اس مسئلہ میں الجھن پیش آتی ہے۔

صاحب مضمون نے زبان کے متعلق جو طریق استدلال اختیار کیا ہے وہ قریب قریب وہی طریق استدلال ہے جس کی بنا پر ایک گروہ اس سے پہلے قرآن مجید کا ترجمہ دوسری زبانوں میں کرنے کی مخالفت کر چکا ہے اور یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ اگر ان مقدمات کو تسلیم کر لیا جائے تو قرآن کا ترجمہ کرنا بھی اسی طرح ناجائز قرار پائے گا جس طرح غیر عربی میں خطبہ دینا ناجائز قرار دیا جاتا ہے۔ آپ کہہ دیجیے کہ عربی زبان اسلام کی سرکاری زبان ہے، جو لوگ اسلام کے محکوم ہیں ان پر اس زبان سے واقف ہونا لازم ہے، اور اگر وہ عربی سے واقفیت پیدا نہیں کرتے تو یہ ان کا قصور ہے۔

لہٰذا ان کو سمجھانے کے لیے قرآن کے مطالب کو ان کی مادری زبان یا بالفاظ دیگر کسی "غیر سرکاری زبان" میں بیان نہیں کیا جائیگا۔ اسی طریقے سے آپ یہ بھی کہہ دیجیے کہ ان کے سامنے اسلامی احکام، اسلامی عقائد، اسلام کی اخلاقی تعلیمات اور دوسری "سرکاری" چیزوں کو بھی صرف سرکاری زبان ہی میں بیان کیا جائیگا ۔ کوئی چیز غیر سرکاری زبان میں نہ بیان ہوگی خواہ وعظ کی صورت میں ہو یا تحریر کی صورت میں۔

فرمائیے! اگر کوئی شخص یہ پوزیشن اختیار کرے تو کیا آپ اس کو قبول کریں گے؟ غالباً نہیں، اس لیے کہ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ موجودہ حالات میں ایسا کرنے سے مسلمانوں کی تقریباً ۸۰ فی صدی آبادی اسلام کے علم سے بالکل بے بہرہ ہو جائیگی۔ اسی بنا پر آپ قرآن حکیم کے ترجمے دوسری زبانوں میں کرنے کو نہ صرف جائز بلکہ ضروری سمجھتے ہیں، اور اسی بنا پر آپ غیر سرکاری زبان میں سرکاری مضامین کی اشاعت کو مواعظ اور تحریروں کی شکل میں نہ صرف گوارا بلکہ پسند کرتے ہیں جب حال یہ ہے تو آخر کیا وجہ ہے کہ یہ تمام بحثیں صرف خطبۂ جمعہ کے مسئلہ میں پیدا ہوتی ہیں؟ مسجد میں اگر کوئی شخص نماز کے بعد یا خطبہ سے پہلے عجمی زبان میں وعظ کہے تو جائز بلکہ مفید اور انہی مضامین کو اگر وہی شخص منبر کی دو سیڑھیوں پر چڑھ کر خطبۂ جمعہ کی حیثیت سے بیان کرنے لگے تو ناجائز بلکہ بدعت! یہ کھلی ہوئی ناہمواری جو آپ کے طرز عمل میں پائی جاتی ہے، اس کو شریعت کی طرف منسوب کرنے سے پہلے اپنے نفس کو ٹٹول کر دیکھیے کہ وہاں کوئی غیر شرعی محرک تو چھپا ہوا نہیں ہے؟ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ عادتِ قدیمہ کی محبت میں مبتلا ہوتے ہیں، اور جب کوئی مجتہد، حالات کے تغیر اور زمانہ کی بدلی ہوئی ضروریات کو محسوس کرکے طریقۂ متوارثہ میں ترمیم کی جرأت کرتا ہے تو وہ محض اس بنا پر اس کی مخالفت کرنے لگتے ہیں کہ اس نے ایک ایسا طریقہ اختیار کیا ہے جس سے ان کے طبائع مانوس نہیں ہیں، مگر جب یہ نیا طریقہ چل پڑتا ہے اور اجنبیت دور ہو جاتی ہے تو لوگ اس کو نہ صرف جائز بلکہ مفید سمجھنے لگتے ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب

نے جب قرآن مجید کا ترجمہ فارسی میں کیا تو اسی بنا پر ان کی مخالفت کی گئی تھی۔ ان سے پہلے ایک دور ایسا بھی گذرا ہے جس میں عربی زبان کے سوا کسی اور زبان میں دعا کرنا، وعظ کہنا اور دینی مسائل پر اظہار خیال کرنا ایک نئی چیز تھی، اور لوگ اس پر معترض ہوتے تھے۔ ٹرکی میں جب پہلی مرتبہ جدید طرز پر فوجوں کو مرتب کرنے اور نئے آلات جنگ کا استعمال رائج کرنے کی کوشش کی گئی تو ایک جماعت نے اس پر سخت اعتراض کیا تھا۔ ان میں سے ہر موقع پر یہی کہا گیا کہ یہ بدعت اور احداث فی الدین ہے مگر آج کوئی نہیں جس کو ان چیزوں پر اعتراض ہو۔ اعتراض تو درکنار آج عامی اور عالم سب ان کو جائز بلکہ مستحسن سمجھتے ہیں۔ اس کی وجہ پر آپ غور کریں گے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اس قسم کے اعتراضات دراصل غیر شرعی محرکات سے پیدا ہوتے ہیں پھر ان کی تائید میں شریعت سے استدلال کرنے کی کوشش کی جاتی ہے

اسلام میں عربی زبان کی حیثیت کے متعلق آپ نے جو کچھ لکھا ہے اس میں صحیح اور غلط دونوں کی آمیزش ہے۔ بالکل درست ہے کہ اسلام سے عربی زبان کا خاص تعلق ہے۔ قرآن عربی میں نازل ہوا ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ اور صحابۂ کرام کی سیرت کے متعلق تمام معلومات عربی میں ہیں۔ اسلام کا صحیح علم حاصل ہونا، جس پر انسان کے مسلمان ہونے کا مدار ہے، عربی زبان کی واقفیت کے بغیر ممکن نہیں۔ امت مسلمہ کی وحدت برقرار رکھنے کے لئے بھی عربی زبان ایک ضروری اور ناگزیر آلہ ہے۔ انہی وجوہ سے ہر زمانہ کے علماء نے عربی کی تعلیم پر زور دیا ہے اور انہی وجوہ سے آج بھی ہر صاحب عقل و فہم مسلمان یہ ضروری سمجھتا ہے کہ مسلمانوں کی تعلیم میں عربی کو بحیثیت ایک ثانوی زبان کے لازمی طور پر شامل ہونا چاہیے۔ یہ تمام باتیں بالکل برحق ہیں اور ان میں اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں لیکن جیسا کہ میں اس سے پہلے عرض کر چکا ہوں "ہے" اور "چاہیے" میں بڑا فرق ہے۔ جو کچھ ہونا چاہیے اس کے لیے کوشش ضرور کیجیے لیکن اگر وہ عالم واقعہ میں نہیں ہے تو اپنے طرز عمل کو واقعات کے مطابق بنانے سے انکار نہ کر دیجیے۔ عقل اور دین دونوں کا اقتضا یہ ہے کہ مقصد کو وسیلہ پر مقدم رکھا جائے۔ ایک وسیلہ اگر زیادہ بہتر ہے،

لیکن اب کارگر نہیں رہا تو دوسرا وسیلہ اختیار کیجیے جو کارگر ہو، اگرچہ بہتر نہ ہو لیکن اگر آپ وسیلہ پر اصرار کر کے اصل مقصد کو کھو دیں گے تو یہ نہ عقلمندی ہے نہ دینداری۔ اب آپ خود غور کیجیے کہ دین کا اصل مقصد کیا ہے؟ آیا یہ ہے کہ عربی زبان کو "سرکاری" اور قومی زبان کی حیثیت سے پھیلایا جائے؟ یا یہ کہ خدا کے بندوں کو اس کی تعلیم اور اس کے احکام سے واقف کرایا جائے؟ ظاہر ہے کہ اصل مقصد دوسری چیز ہے۔ پس جب حال یہ ہے اور ہر شخص اس حقیقت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے کہ غیر عربی ممالک میں دو فیصدی آدمی بھی عربی زبان سمجھنے والے باقی نہ رہے، اور ہم اُس طاقت سے محروم ہو چکے ہیں جس سے صدر اول کے مسلمانوں نے عربی کے علم کو پھیلایا تھا، تو آپ کو سوچنا چاہیے کہ ہمارے لیے صحیح طریق کار کیا ہے؟ یہ کہ مقصد اصلی کو کسی دوسرے ممکن ذریعہ سے حاصل کریں؟ یا یہ کہ قدیم ذریعہ پر اصرار کر کے مقصد کو فوت ہونے دیں؟

آپ نے جن دلائل سے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ "دین کی اشاعت ایک ہی زبان میں ہونی ضروری ہے"، وہ درحقیقت نہایت کمزور ہیں، اور اگر آپ زیادہ غور و فکر سے کام لیں گے تو ان کی کمزوری آپ پر خود ہی واضح ہو جائے گی۔ دین ایک عالمگیر حقیقت ہے۔ انسانی زبانوں میں سے کسی کے ساتھ اس کا مختص بالذات رشتہ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا اصل مقصد دین کو اپنے بندوں تک پہنچانا ہے، اور اس مقصد کے لیے جس طرح وہ ایک انسان کو وسیلہ بناتا ہے اسی طرح ایک زبان کو بھی وسیلہ بناتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے اسی دین کو پہونچانے کے لیے وہ دوسری قوموں کے انسانوں اور دوسری قوموں کی زبانوں کو بھی وسیلہ بنا چکا ہے پس اگر آخری تبلیغ کے موقع پر اس نے عربی قوم اور عربی زبان کو وسیلہ بنایا تو اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں کہ اب صرف عربی زبان ہی سے اسلام کا رشتہ ہو گیا ہے اور دوسری زبانوں کو تبلیغ دین کے لیے استعمال کرنا ناجائز یا مکروہ ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم صریح ہدایت فرما دیتے کہ عربی زبان کے سوا کسی زبان کو تبلیغ دین کے لیے

قیامت تک استعمال نہ کرنا۔ حالانکہ احادیث سے یہ ثابت ہے کہ آپ نے بعض صحابہ کو غیر زبانیں سیکھنے کا حکم دیا تھا۔ اور عہد صحابہ میں حضرت سلمان فارسی جیسے غیر عربی الاصل حضرات عجمیوں کو ان کی اپنی زبانوں میں دین کی تعلیمات سمجھاتے تھے۔ رہی یہ بات کہ قیصر روم و شاہ ایران کو جو دعوت نامے بھیجے گئے تھے وہ عربی میں کیوں بھیجے گئے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کوئی دارالترجمہ نہ تھا۔ صحابہ میں بہت کم لوگ ایسے تھے جو غیر زبانیں جانتے ہوں، اور جو لوگ جانتے تھے وہ بھی ان زبانوں کے ادیب نہ تھے کہ ایک نبی کے شایان شان فصیح و بلیغ خط لکھ سکتے۔ نیز یہ بات حضور کو معلوم تھی کہ جن بادشاہوں کو آپ دعوت نامے لکھ رہے ہیں ان کو ایسے لوگ میسر آسکتے ہیں جو ان خطوط کا صحیح مفہوم انہیں سمجھا سکتے ہیں۔ پس حضور کا عربی میں اسلام کے دعوت نامے بھیجنا دراصل عملی زندگی کے موانع کا نتیجہ تھا، اور اس کی مثال بالکل ایسی ہی تھی جیسے پانی نہ ملنے کی صورت میں آپ نے تیمم کیا اور قیام کی طاقت نہ ہونے کی حالت میں بیٹھ کر نماز پڑھی۔ حالانکہ اگر اللہ چاہتا تو ہر جگہ آپ کے لیے ایک چشمہ پیدا کر سکتا تھا، اور آپ کو بیماری اور ضعف سے محفوظ رکھ سکتا تھا۔ ایسی مثالوں سے یہ نتیجہ نکالنا ہرگز درست نہیں کہ شریعت اپنی تبلیغ کو صرف عربی زبان تک محدود رکھنا چاہتی ہے، اور اس کا منشا یہ ہے کہ جو لوگ اس زبان سے واقف نہ ہوں ان کو ضلالت اور جہالت میں مبتلا رہنے دیا جائے۔

صحابۂ کرام اور ائمۂ متقدمین کی غیر زبانوں سے نفرت اور عربیت پر ان کے اصرار کے متعلق میں نے "تعصب" کا لفظ جو استعمال کیا تھا اس سے آپ غلط فہمی میں پڑ گئے۔ آپ نے یہ سمجھا کہ میں ان کی طرف "عصبیت جاہلیہ" کو منسوب کر رہا ہوں۔ حالانکہ میرا مقصد کچھ اور تھا۔ تعصب محض جاہلیت ہی کا نہیں ہوتا۔ ایک قسم کا تعصب وہ ہے جو ہر انسان کی فطرت میں ہوتا ہے اور جس کو عیب میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ مثال کے طور پر ایک ہندوستانی جب چین جائیگا تو وہاں کی زبان، عادات، خصائل، طرز بود و ماند ہر چیز سے اجنبیت محسوس کرے گا۔ ان پر ناک بھوں چڑھائے گا۔ اور اس کو پسند نہ کرے گا کہ اس کے اہل و عیال

جمعیت اختیار کریں۔ یہ ایک فطری منافرت ہے جو ہر انسان کی طبیعت میں اجنبی چیزوں سے ہوتی ہے صحابۂ کرام بھی بہرحال انسان تھے اور عجمیت سے ان کی نفرت ایک حد تک اس بنا پر بھی تھی۔ اس میں مزید اضافہ اس وجہ سے ہوگیا کہ عجمی اقوام اس وقت سب کی سب کافر تھیں اور ان کے جو افراد مسلمان ہوجاتے تھے ان کو صحابۂ کرام عربیت کے رنگ میں رنگ لینا ضروری سمجھتے تھے تاکہ وہ کفار کی جمعیت سے الگ ہو کر اہل اسلام کی جمعیت میں جذب ہوجائیں۔ نیز صحابۂ کرام یہ بھی پسند نہ کرتے تھے کہ مسلمان (جو اس وقت تک تمام تر عرب ہی تھے) عجمی ممالک میں اہل عجم کی سی بولیاں بولنا اور ان کے سے لباس پہننا شروع کردیں کیونکہ اس طرح کفار کی اکثریت میں ان کے جذب ہوجانے کا اندیشہ تھا۔ پس صحابۂ کرام نے جو طرز عمل اختیار کیا اس کی بنیاد دو وجوہ پر تھی۔ ایک وجہ فطری تھی، اور دوسری وجہ حالات کے اقتضاء سے تعلق رکھتی تھی۔ ان میں سے پہلی وجہ کوئی شرعی حیثیت نہیں رکھتی اس لیے اس کو حجت بنانا درست نہیں۔ رہی دوسری وجہ تو اب وہ حالات باقی نہیں ہیں۔ اردو، فارسی، ترکی، جاوی، اور ایسی ہی دوسری زبانیں بھی عربی کی طرح اب مسلمانوں کی زبانیں ہیں، اور ان سے کسی اسلامی مصلحت کے تحت نفرت و اجتناب کی کوئی وجہ باقی نہیں رہی ہے۔

---

# کیا خطبہ غیر عربیہ واجب ہے؟

مراد آباد سے ایک صاحب لکھتے ہیں:۔

جناب نے خطبۂ غیر عربیہ کی نسبت جو کچھ تحریر فرمایا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ خطبۂ جمعہ غیر عربی میں دیا جانا صرف جائز ہے اور یہ کہ سامعین کی زبان میں دیا جا سکتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی درجہ میں ضروری نہیں ہے کیونکہ جواز کا اطلاق اولویت، عدم اولویت، اباحت حتّٰی کہ کراہت پر بھی کیا جا سکتا ہے چنانچہ اسی کا باعث ہے کہ آخر میں جناب نے جو "عملی مشکلات" تحریر فرمائی ہیں اُن سے متاثر ہو کر اپنی رائے موجودہ طرز عمل کی پسندیدگی اور خطبہ غیر عربیہ کے عدم اجراء کی بہتری کے متعلق صاف طور پر ظاہر فرمائی ہے۔ حالانکہ اگر جناب کے نزدیک یہ کوئی ضروری چیز ہوتی تو ان احتمالی مضرتوں سے متاثر ہو کر ایسا کرنے کے بجائے ان کی اصلاح کے ذرائع پر زور دیا جاتا اور چاہے ان میں کامیابی متوقع ہوتی یا نہ ہوتی بہرحال خطبۂ کو سامعین کی زبان میں دیا جانا ضروری قرار دیا جاتا اس لیے کہ کوئی واجب چیز کسی مصلحت یا مضرت سے متروک العمل نہیں ہو سکتی۔ البتہ وہ جائز چیز جو اولویت یا اباحت وغیرہ کے معنی میں ہو بعض مصالح و مضار کی بناء پر ترک ہو سکتی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جلب منفعت اور دفع مضرت کے جو ذرائع ہوں ان کا اختیار کرنا بھی بجائے خود ضروری ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ جب تک وہ ذرائع حاصل نہ ہوں ہم ایک فرض کو ترک کیے بیٹھے رہیں اور شارع نے جو ہمارے افادہ اور استفادہ کے لیے ہر ہفتہ ایک اجتماع کا موقع پیدا کیا تھا اس کو آئندہ کے لیے بھی ہم اسی طرح ضائع کرتے رہیں جس طرح کہ اب تک کرتے رہے۔

ظاہر ہے کہ خطبۂ جمعہ کم از کم واجب ضرور ہے اور یہ بھی آپ کو مسلّم ہے کہ اس کا مقصد ذکر ارشاد اور

رجوع الی اللہ کے ساتھ وعظ و تذکیر اور احکام دین کی تعلیم و تبلیغ بھی ہے پس جب خطبہ واجب تو اس کے مقاصد کی تحصیل بھی واجب۔ اور یہ اظہر من الشمس ہے کہ اس کے مقاصد کا جزو اعظم بدون سامعین کی زبان اختیار کیے حاصل نہیں ہو سکتا تو بحکم مقدمۃ الواجب واجب اس کا اختیار کرنا بھی واجب ہوگا۔

پس واجب ہوا تو پھر کسی مصلحت او مضرت کی وجہ سے اس کو ترک نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں جن مضرتوں کا وقوع متوقع ہو ان کی اصلاح کے لیے سعی مستقل طور پر ضروری ہے۔

خطبہ غیر عربیہ کے اجرا میں جو سب سے بڑی مضرت آپ نے ظاہر فرمائی ہے وہ مسائل مختلف فیہ کا بیان اور ان کی وجہ سے نزاعات کا رونما ہونا ہے۔ لیکن آپ نے اس کے اور نیز دوسرے مفاسد کے انسداد کی جو تدبیر بیان کی ہے میری رائے میں وہ بھی کافی نہیں ہے اس لیے کہ اول تو بقول آپ کے اس کی امید ہی کم ہے اور میرے نزدیک تو آجکل کے علماء کی طرف سے کسی ایسے کام کا انجام پا جانا گویا کہ خرق عادت ہے۔ تو ایسی حالت میں نہ تو نو من تیل ہوگا اور نہ رادہا ناچیگی پس نتیجہ معلوم کہ وہی تیلی کے بیل کی طرح جہاں تھے وہاں ہی رہیں گے؛

دوسرے یہ کہ فرض کیجیے کہ اہل علم کی کسی معتدل جماعت ہی کے تیار کردہ خطبے جاری کیے اور ان میں نزاعی مسائل سے کوئی تعرض بھی نہیں کیا گیا تاہم وہ خطیب جس کی زبان میں بقول آپ کے اللہ نے ایسا ڈنک رکھدیا ہے جس سے دلوں کو زخمی کیے بغیر وہ کوئی بات نہیں کر سکتا اور جو اپنے مشرب میں اتنا سخت ہے کہ دوسرے مشرب والوں کے ساتھ وہ کوئی رعایت نہیں کر سکتا، وہ اس معتدل جماعت ہی کے تیار کردہ خطبے پڑھنے کے باوجود اپنے مشرب کی تبلیغ اور اس کے خلاف سے تعرض کیے بغیر کیسے رہ سکے گا؟ اول تو کسی مقرر کے نزدیک یہ امر کچھ مشکل نہیں ہے کہ اپنی تقریر کا رخ جدھر چاہے پھیر دے۔ پھر خصوصیت سے مولوی مقرر کو تو ایسا کر لینا بہت ہی سہل ہے، مولوی اپنے مشرب کی تبلیغ کرتا ہے تو قرآن اس کے ہاتھ میں ہوتا ہے، دوسروں کی تردید کرتا ہے تو قرآن

اس کی زبان پر ہوتا ہے، کسی کی مدح کرتا ہے تو قرآن سے اس کا استدلال ہوتا ہے، کسی کو گالیاں دیتا ہے تو قرآن ہی سے اس کا استناد ہوتا ہے، غرض وہ اپنے ہر اس قول و فعل کو جس پر اس کو کسی نہ کسی حد تک اصرار ہے یا کسی وجہ سے اس کو پسند ہے قرآن ہی کی آیات تلاوت کر کے لوگوں کے ذہن نشین کرنا چاہتا ہے، چاہے فی الحقیقت اس کا وہ مسلک شریعت حقہ کی روشنی میں بالکل ہی باطل محض ہو۔ پس ایسی حالت میں وہ کونسی قوت ہے جو اس کو روک سکے؟

اور اگر یہ بھی تسلیم کر لیا جاوے کہ وہ خطیب صرف انہیں مرتب شدہ خطبوں کے مضامین میں اپنی تقریر کو منحصر رکھے اور اس کے علاوہ کسی مضمون پر زبان نہ کھولے تو یہ چیز ایک حد تک پھر خطبہ کے اصل مقصد کو فوت کر دیگی اس لیے کہ اس کے مقاصد میں یہ بھی داخل ہے کہ خطیب حسب ضرورت زمان و مکان کی حالت کے مناسب خطبہ دے ورنہ دق کے مریض کو ہیضہ کا علاج بتلانے کے مرادف ہوگا۔ اور اس صورت مذکورہ میں وہ اگر بالکل نہیں تو من وجہ موجودہ صورت مروجہ کے مشابہ ضرور ہوگا فرق صرف تبدیل لسان کا ہوگا اور مضامین میں وہی تعیین و تقیید رہے گی جواب ہے اور متعدد متعین کیے خطبوں کا بھی اس غرض سے ہونا کہ انہیں سے جو مناسب ہو پڑھ لیا جایا کرے کافی نہوگا کیونکہ ہر جگہ اور ہر وقت کی بعض ضرورتیں مخصوص ہوتی ہیں جو ان مضامین میں نہیں آسکتیں جو عمومی ضرورت کو مد نظر رکھتے ہوئے مرتب کیے گئے ہوں۔

اور اگران تمام امور سے بھی نظر کو منقطع کر لیا جاوے تو ان خطبوں میں کم از کم علیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین الخ من احدث فی امرنا ھذا ما لیس منہ فھو رد۔ وایاکم ومحدثات الامور، کل بدعۃ ضلالۃ۔ اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ و یغفر ما دون ذلک لمن یشاء الخ۔ یا اسی قسم کے دوسرے الفاظ اور مضامین تو ضرور ہی ہوں گے۔ کم از کم کلمۂ شہادت ہونا اور اس میں اشھد ان

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ کا پڑھا جانا تو بالکل یقینی امر ہے۔ پس اس نیش زن مولوی کو تو یہی بہت ہے اگر وہ اپنی سرشت کے مطابق چاہیگا تو اسی کے ضمن میں سب کچھ کہہ سکتا ہے، اپنے مشرب کے اعتبار سے رداً و قبولاً ہر حیثیت سے اس میں گفتگو کو طویل کر سکتا ہے۔

پھر یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ اختلافی مسائل سے مطلقاً روک دینا کیوں ضروری قرار دیا گیا؟ اس میں جو مضرت بیان کی گئی ہے اس کے ممکن الوقوع ہونے سے انکار نہیں ہے لیکن کیا محض ایک محتمل چیز کی خاطر یقینی مضرت اختیار کی جا سکتی ہے؟

یہ ضرور ہے کہ جب تک کوئی خاص ضرورت اور مقامی حیثیت سے ان مسائل کو بیان کرنے کی وقتی مصلحت پیش نہ آوے، بلا وجہ ان مسائل پر لب کشائی نہ کی جائے لیکن جب ضرورت داعی ہو تو پھر ان کی تبلیغ بھی ایسی ہی ضروری ہونی چاہیے جیسی دوسری اصلاحات کی۔

ظاہر ہے کہ فی زمانناً جو زیادہ فسادات اور نزاعات رونما ہوتے ہیں وہ اکثر شرک و بدعت کی مذمت اور ان کی جزئیات کی تفصیل سے واقع ہوتے ہیں اور یہ موضوع مسلمانوں کی اصلاح کے لیے ایسا ضروری ہے کہ بہر حال ناگزیر ہے اور کسی وقت کسی حال میں اس سے تغافل نہیں کیا جا سکتا۔ اگر خطبہ میں اصلاح عقائد، توحید و رسالت کا اصل مفہوم، اعتصام بالسنۃ، اجتناب عن البدعت، شرک کی مذمت اور اس کے اقسام کی تفصیل ہی سے سامعین کو خبردار نہ کیا گیا تو میں نہیں سمجھتا کہ ان مضامین سے زیادہ کونسا وہ موضوع ہے جو مسلمانوں کے دین کی اصلاح سے متعلق ہو،

پس میری رائے میں صرف یہی طریقہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ خطبہ کا وہ حصہ جو تبلیغ احکام سے متعلق ہو لازماً بہر حال زبان سامعین میں ہونا ضروری ہے اور جن مضرتوں کے پیدا ہونے کا امکان ہے۔ ان کا انسداد دوسرے خارجی ذرائع سے کیا جائے مثلاً یہ کہ خطباء کو بذریعہ تحریر و تقریر سمجھا دیا جاوے کہ وہ بلا ضرورت ان مسائل کی تفصیل میں نہ پڑا کریں اور جب ضرورت ہو تو بیشک بیان کریں

مگر طرز بیان تشدد آمیز اور ڈنک مارنے والا نہ ہو۔ صاف اور سیدھے طریقہ سے نرم الفاظ میں مسلک حق کو واضح کیا کریں۔ ذاتیات کے حملوں سے بچتے رہیں۔

آخر اب بھی تو اس قسم کے مولویوں کی تقریروں سے نزاعات ہوتے ہی ہیں اُن کو روکنے کے لیے جو طریقے اختیار کیے جاتے ہیں اُنپر یہاں بھی عمل کیا جا سکتا ہے۔

پھر قابل لحاظ یہ امر بھی ہے کہ اب تو اس قسم کے اختلافات کا اثر عوام پر اس درجہ گہرا ہو چکا ہے کہ اکثر و بیشتر ایک عقیدہ اور خیال کا آدمی دوسرے عقیدہ اور خیال والے کی اقتدا ہی نہیں کرتا اور ہر عقیدہ و خیال کے لوگوں کی نماز جماعت عموماً اور نماز جمعہ خصوصاً الگ الگ ہوتی ہے۔ ایک دوسرے کی اقتدار سے محترز ہے مسجدیں سب کی الگ الگ باعتبار اکثریت کے بنی ہوئی ہیں، پس اپنے اپنے ہم خیال لوگوں اور اپنی اپنی مسجدوں میں جیسی چاہیں تقریر کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں۔ کوئی مانع نہیں ہو سکتا اور اکثر نہیں ہوتا۔

یہ جو کچھ عرض کیا گیا ہے صرف ان دو فرقوں کو ذہن میں لے کر عرض کیا گیا ہے جو عوام کی زبان میں دیوبندی اور بریلوی وہابی اور بدعتی کے ناموں سے مشہور ہیں اس لیے کہ ہندوستان میں انہیں دونوں کی کثرت ہے اور واقعات کے اعتبار سے بھی جہاں جہاں فسادات ہوتے ہیں غالباً ان دونوں کے علاوہ اور فرقوں میں نہیں ہوتے یا مجھکو معلوم نہیں لیکن اگر ہونے ہوں گے تو بہت ہی کم۔ بہرحال اکثریت کے لحاظ سے یہی دونوں زیادہ قابل لحاظ معلوم ہوئے۔ اور جب اکثریت کے لیے میری یہ رائے ہے تو اقلیتوں کے متعلق تو بدرجہ اولیٰ سمجھنی چاہیے۔

رہا موضوعات اور بے اصل قصص کے بیان کا خطرہ تو وہ اس طرح رفع ہو سکتا ہے کہ ہر جگہ کے منتخب باثر لوگ اس امر کا خاص اہتمام کریں کہ امامت جمعہ کے لیے جاہل اور پیشہ ور واعظوں کو ہرگز تجویز نہ کریں حتی الامکان مستند اور ذی فہم علماء کے سپرد یہ کام کیا جائے یا اگر وہ عالم مستند نہ ہو تو مشاہیر

علماء میں سے کوئی صاحب اس کو قابل اعتماد اور اس کے بیان کو قابل سماعت تجویز کردیں۔

پھر علماء کی طرف سے کوئی ایسا رسالہ ان تمام ائمہ کے لیے تالیف کر کے شائع کردیا جائے جس میں واضح طور پر ان مفاسد سے بچنے کے اصول بتلا دئے گئے ہوں۔ مثلاً یہ کہ کوئی روایت حدیثی یا قصۂ تاریخی بدون کامل تحقیق کے نہ بیان کیا کریں، یا یہ کہ فلاں کتاب فلاں ابواب میں فلاں فلاں شرائط سے اس قابل ہے کہ اس کی روایات کو بیان کیا جاسکتا ہے۔ اور فلاں فلاں کتاب ایسی ہے کہ اس سے غیر محقق کو بالکلیہ اجتناب کرنا چاہیے۔ غرض یہ یا اور جو مفید امور ہوں اس رسالہ کے ذریعہ ان سے ان ائمہ جمعہ کو آگاہ کردیا جائے۔ میری رائے میں اس طرح کرنے سے اس مفسدہ کا غالباً بہت بڑا انسداد ہوسکیگا۔

هذا ما عندي والعلم عند الله العليم الخبير

---

**ترجمان القرآن۔** یہ ایک عجیب صورت حال ہے۔ ایک جماعت عجمی زبان کے خطبہ کو مکروہ تحریمی ثابت کرتی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کا فاعل گنہگار ہو۔ دوسری جماعت اسی چیز کو واجب ثابت کرنے کی کوشش کرتی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اس کا تارک گنہگار رہو۔ چیز ایک ہی ہے، مگر اس پر دو بالکل متضاد حکم لگائے جاتے ہیں۔ حالانکہ خدا کی شریعت جن اصولوں پر قائم ہے ان میں کامل یکسانیت ہے، اور ان کی یکسانیت کا اقتضا یہ ہے کہ ہر چیز کے متعلق حکم ایک ہی ہو۔ اس قسم کے متضاد احکام کو دیکھ کر بیچارے ناواقف عوام سخت حیرانی میں پڑ جاتے ہیں کہ آخر ہم کیا کریں۔ ایک کام کرتے ہیں تو گناہگار، نہیں کرتے تو گناہگار۔ کسی کو شبہ ہونے لگتا ہے کہ شاید اس شریعت ہی میں کوئی نقص ہے جس کی بنا پر ایسے متضاد احکام اخذ کیے جاتے ہیں یا کیے جاسکتے ہیں۔ کوئی علماء سے بدگمان ہوجاتا ہے اور انھیں چھوڑ کر خود اپنی ناقص عقل اور ناقص علم سے احکام کی الٹی سیدھی تعبیریں کرنے لگتا ہے۔ کسی کو علوم دینیہ کے متعلق شکوک پیدا ہوجاتے ہیں اور وہ ان مسائل ہی کی جڑ پر کلہاڑی مارنے لگتا ہے جو در حقیقت احکام شرع معلوم کرنے کے لیے ناگزیر ہیں۔ آجکل جو نئے نئے فتنے مسلمانوں میں پیدا ہورہے ہیں ان کی ایک بڑی وجہ بھی ہے۔ افسوس ہے کہ وہ لوگ جو مذہبی معاملات میں

مسلمانوں کے رہنما ہیں۔ ان کو اب تک اس امر کا احساس نہیں ہوا کہ یہ خرابیاں ان کے کس طرز عمل سے پیدا ہو رہی ہیں، اور خود ان کے طرز عمل میں کیا خرابی ہے۔

اصل یہ ہے کہ جن امور کو شارع نے صحیح طور پر فرض یا واجب یا حرام یا ناجائز ٹھیرا دیا ہے صرف وہی ان اصطلاحوں سے موسوم کیے جا سکتے ہیں، اور انہی کے فعل یا ترک پر گناہ یا ثواب کا حکم لگایا جا سکتا ہے۔ باقی رہے وہ امور جو ہم اپنے قیاس و استدلال کے ذریعہ سے شارع کے قول یا عمل سے مستنبط کرتے ہیں، تو ان کو فرض یا واجب قرار دینا، یا حرام یا ناجائز ٹھیرانا، اور ان کی بنا پر ثواب یا عقاب کا حکم لگانا صریحاً غلط ہے، اس لیے کہ انسان کو انسان پر کوئی چیز فرض و واجب کرنے یا حرام و ناجائز ٹھیرانے کا قطعاً کوئی حق نہیں ہے اور عذاب و ثواب خدا کے اختیار میں ہیں نہ کہ انسان کے اختیار میں۔ وَلَا تَقُولُوا لِمَا تَصِفُ أَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هَٰذَا حَلَالٌ وَهَٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوا عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ ۚ إِنَّ الَّذِينَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُونَ (النحل: ۱۵) ایک بڑے سے بڑا عالم اور امام جلیل القدر بھی زیادہ سے زیادہ جو کچھ کہنے کا حق رکھتا ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ میں کتاب اللہ و سنت رسول اللہ سے ایسا سمجھتا ہوں، میرے نزدیک فلاں بات کی جا سکتی ہے یا اس کا کرنا اولیٰ ہے یا فلاں بات نہیں کی جا سکتی یا اس کا کرنا درست نہیں۔ اگرچہ رائے کا اختلاف اس صورت میں بھی باقی رہتا ہے، اس لیے کہ ایک شخص کا فہم دوسرے شخص کے فہم سے بالکل مطابق تو نہیں ہو سکتا، لیکن یہ اختلاف احکام شریعت میں نہیں بلکہ انسانی اجتہاد میں ہوگا اور اس کی بنا پر وہ فرقے نہ بن سکیں گے جو اجتہادی اختلافات کی وجہ سے ایک دوسرے کو گنہگار اور گمراہ ٹھیراتے ہیں، اور إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا کے مصداق بن گئے ہیں۔

اس اصل کو اچھی طرح سمجھ لیجیے۔ اس کے بعد زبان خطبہ کے مسئلہ پر غور کیجیے۔ شارع نے کہیں یہ تصریح نہیں فرمائی کہ خطبہ فلاں زبان میں دینا واجب ہے یا فلاں زبان میں دینا مکروہ تحریمی ہے۔ اسی طرح شارع نے

ان مقاصد کی تفصیل بھی بیان نہیں کی جن کے لیے خطبہ کو نماز جمعہ کے ساتھ لازم کیا گیا ہے۔ اس باب میں جتنی مختلف باتیں مختلف خیالات کے اہل علم بیان کرتے ہیں وہ شارع کے کسی صریح حکم پر مبنی نہیں ہیں، بلکہ ان لوگوں نے صاحب شریعت کے عمل کو دیکھ کر اپنی فہم کے مطابق مختلف امور اخذ کیے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ایک گروہ کا فہم صحیح ہو۔ اور ہوسکتا ہے کہ دوسرے گروہ کا فہم صحیح ہو۔ دونوں کو اپنے اپنے دلائل پیش کرنے کا حق ہے لیکن کسی کو یہ حق نہیں کہ اپنے فہم سے جو حکم وہ نکال رہا ہے اسے واجب ٹھیرائے اور اس کے تارک کو گناہ گار قرار دے۔ لوگوں کو پوری آزادی حاصل ہے کہ جس کے دلائل کو وہ زیادہ وزنی سمجھیں، اور جس کی رائے پر ان کو اطمینان ہو جائے اس کا اتباع کرلیں۔ شارع کا تصریح نہ کرنا خود اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس نے لوگوں کو اس باب میں آزادی بخشی ہے۔ اگر اس میں لوگوں کے طریقے مختلف ہو جائیں تو کوئی حرج نہیں۔ جس کا مسلک زیادہ قوی دلائل پر مبنی ہوگا، اور جس کی رائے مسلمانوں کے اجتماعی ضمیر کو زیادہ مطمئن کرنے والی ہوگی اسی کے اتباع پر بالآخر سواد اعظم مجتمع ہو جائے گا۔ اور اختلاف عمل کا دائرہ خود بخود گھٹتا چلا جائے گا۔

خطبۂ غیر عربیہ کو واجب قرار دینے کے لیے جو طریق استدلال ہمارے مراسلہ نگار نے اختیار کیا ہے وہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی یوں کہے کہ نماز کے مقاصد میں سے اہم ترین مقصد رجوع الی اللہ ہے اور رجوع الی اللہ بغیر خشوع و خضوع کے ممکن نہیں۔ اور جس چیز پر فرض کے مقصد کا حصول موقوف ہو وہ بھی فرض ہونی چاہیے، لہٰذا خشوع و خضوع بھی نماز ہی کی طرح فرض ہے۔ یہ طرز استدلال ممکن ہے کہ منطق کی رو سے درست ہو مگر شرع کی رو سے درست نہیں۔ اس لیے کہ یہ شخص امت پر ایسی چیز فرض کرتا ہے جسے خدا نے فرض نہیں کیا۔ شریعت میں صرف وہی چیز فرض یا حرام ہے جس کو خدا نے فرض یا حرام قرار دیا ہے ہم کو منطقی استدلال سے فرائض اور محرمات کی فہرست میں اضافہ کرنے کا کوئی حق نہیں۔ پچھلی امتوں نے یہی غلط طریقہ اختیار کرکے اپنے اوپر وہ بہت سی چیزیں لازم کرلی تھیں جو خدا نے ان کے اوپر لازم نہیں کی تھیں، اور

یہی وہ بوجھ اور پھندے تھے جن سے انسانیت کو آزاد کرنے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھیجے گئے وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ (الاعراف: ۱۹)

پس زبان خطبہ کے متعلق جو رائے میں نے ظاہر کی ہے، اور اس کے خلاف جو رائے بعض علمائے کرام ظاہر فرماتے ہیں، ان میں سے کسی کو بھی یہ حیثیت حاصل نہیں ہے کہ لوگوں پر اس کا ماننا واجب ہو اور اس کی خلاف ورزی کرنے سے ان پر کوئی گناہ لازم آتا ہو۔ اگر کوئی شخص مفتیانہ تحکم کے انداز میں اپنی رائے بیان کرتا ہے تو یہ اس کی غلطی ہے۔

میں نے زبان خطبہ کو بدلنے سے پہلے جن امور کی اصلاح کو ضروری قرار دیا ہے ان پر صاحب مراسلہ نے پوری طرح غور نہیں فرمایا اسی بنا پر وہ شبہات پیدا ہوئے جو انہوں نے بیان کیے ہیں۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ شرعی نظام کے درہم برہم ہو جانے کی وجہ سے اسلام کا کوئی حکم اپنی اصل پر باقی نہیں رہا ہے جمعہ اور خطبہ ہمارے شرعی نظام کے اہم ترین اجزا میں سے تھے۔ ایک عظیم الشان اجتماعی مقصد تھا جس کی تحصیل کے لیے دوسرے اجزا کے ساتھ ان دونوں چیزوں کو بھی خاص حکیمانہ تناسب سے ایک نظام میں نصب کیا گیا تھا۔ اب وہ نظام ٹوٹ گیا، اجزا پراگندہ ہو گئے، ان کا باہمی ربط اور اجتماعی زندگی کے ساتھ ان سب کا مجموعی ربط ٹوٹ گیا، اور سرے سے وہ عظیم الشان مقصد ہی اب دلوں سے محو ہوتا جا رہا ہے جس کے لیے تمام اجزا فراہم کیے گئے تھے۔ اس حالت کی صحیح اصلاح تو اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ وہ شرعی نظام پھر سے قائم کیا جائے اور اس کے بکھرے ہوئے اجزا کو پھر اسی طرح جمع کر کے ایک مشین کے پرزوں کی طرح نصب کر دیا جائے تاکہ اس کی حرکت کے ساتھ ہی وہ نتائج برآمد ہونے شروع ہو جائیں جو اس سے مطلوب ہیں۔ تاہم اگر یہ نہیں ہو سکتا تو کم از کم اتنا ہی ہو کہ مسلمانوں میں ایک رائے عام پیدا کی جائے، بڑے پیمانہ پر نہیں تو چھوٹے پیمانے پر ہی ان کو اپنے اجتماعی کام ایک نظم کے ساتھ انجام دینے کی عادت ڈالی جائے، اور رائے عام کی طاقت سے ان مضرتوں کا سد باب کیا جائے جو غیر ذمہ دار لوگوں کی منتشر حرکات سے پیدا ہوتی ہیں۔

لیکن اگر یہ بھی نہیں ہو سکتا تو پھر اصلاح کا نام نہ لیجیے، اور جو کچھ ہو رہا ہے اس کو اسی طرح ہونے دیجیے، کیونکہ ہر شخص اپنے ذہن میں اصلاح کا جو مفہوم سمجھے بیٹھا ہے، اگر وہ اسی کے مطابق انفرادی طور پر عمل شروع کر دے تو بے شمار مصلحین، ایک دوسرے کے خلاف عمل کرنے والے پیدا ہو جائیں گے اور ان کی کارگذاری کا نتیجہ صلاح کے بجائے مزید فساد ہوگا۔

نظام شرعی میں خطیب جمعہ کی حیثیت محض ایک واعظ کی نہیں ہے بلکہ وہ ایک ذمہ دار شخص کی حیثیت رکھتا ہے جس پر اپنے حلقہ کی جماعتِ مسلمین کی نگرانی کرنے اور ان کی اجتماعی زندگی کو مفاسد سے بچانے، اور ان سب کو عام قومی پالیسی کے مطابق چلانے کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ ذمہ داری بجائے خود ایک معلم ہے جس شخص پر اس کا بار پڑتا ہے، وہ خود ذمہ داری ہی سے سیکھ لیتا ہے کہ اس سے کیونکر عہدہ برا ہو۔ بخلاف اس کے ایک غیر ذمہ دار شخص جو نہ کسی نظام جماعت سے تعلق رکھتا ہو، نہ کسی کے سامنے جواب دہ ہو، نہ اس امر کا کوئی تصور رکھتا ہو کہ اس کا خطبہ جماعت کی زندگی پر کس طرح اثر انداز ہوتا ہے بلکہ اثر انداز ہوتا بھی ہے یا نہیں، ایسا شخص خطبۂ جمعہ کا حق ادا نہیں کر سکتا۔ اس کے لیے یہ سمجھنا بہت مشکل ہے کہ جماعت کی فلاح و بہبود کن چیزوں کی مقتضی ہے؟ کون سے مفاسد ہیں جن کی اصلاح سب سے پہلے کرنی چاہیئے؟ کن تعلیمات کی تلقین اور کن احکام کی تبلیغ مقدم ہے اور اس کام کو کس طرح انجام دیا جائے کہ فائدۂ مطلوب حاصل ہو؟ ہمارے جمعوں کے امام چونکہ کوئی ذمہ دارانہ حیثیت ہی نہیں رکھتے اس لیے درحقیقت وہ خطیب کے ان فرائض کو ادا کرنے کے ناقابل ہیں۔ وہ اگر عالم بھی ہوں تو ان کی حیثیت ایک واعظ اور مبلغ کی رہیگی، وہ محض اپنے شخصی اختیار و تمیز کی بنا پر تعلیم و تبلیغ کریں گے اور اس سے کوئی خاص اجتماعی فائدہ حاصل نہ ہوگا۔ بلکہ اس کے برعکس ان کے غیر ذمہ دارانہ مواعظ سے یہ تھوڑی بہت اجتماعیت بھی جو اب حاصل ہوتی ہے، پراگندہ ہو جائے گی۔

اگر نظام شرعی کا احیاء اس وقت ممکن نہیں ہے، جیسا کہ بظاہر نظر آ رہا ہے، تو آخری صورت وہی ہے

جو میں نے بیان کی ہے۔ اہل علم کی ایک جماعت، جو کسی حد تک ذمہ دارانہ حیثیت رکھتی ہو، خطبات جمعہ مرتب کرنے کے لیے مقرر ہونی چاہیے، اور اس کو ایسے خطبات مرتب کرنے چاہئیں جن میں اصول اسلام کو غیر اختلافی طریقوں سے بیان کیا جائے۔ مسلمانوں میں وحدت قومی کا احساس پیدا کیا جائے۔ ان کو عام اخلاقی مفاسد اور خلاف شریعت اعمال پر (جو متفق علیہ ہیں) متنبہ کیا جائے، اور ایسے احکام بیان کیے جائیں جن سے مسلمانوں کے کسی فرقہ کو بھی اختلاف نہیں ہے۔ اجتماع جمعہ کے مقاصد کی تحصیل کا کم سے کم ذریعہ یہی ہے ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ مختلف فرقوں کے جمعے جو الگ الگ ہونے لگے ہیں، ان کو بند کیا جائے اور ایسی صورتیں پیدا کی جائیں کہ کم از کم جمعہ میں تمام یا اکثر فرقوں کے مسلمان ایک جگہ اکٹھے ہو جائیں۔ جمعوں کا الگ ہونا غایت درجہ نقصان دہ چیز ہے۔ اس کو مٹانے کی ضرورت ہے۔ نہ یہ کہ ایسے اسباب پیدا کیے جائیں جن سے یہ بیماری اور زیادہ ترقی کرے۔ واعظوں کو اگر اپنے نقطۂ نظر کے مطابق وعظ کہنا ہے اور وہ اپنے مسلک کی تبلیغ کرنا چاہتے ہیں تو وہ مسجدوں سے باہر جہاں چاہیں لب کشائی کریں۔ مسجدیں جمع کرنے کے لیے بنائی گئی ہیں، نہ کہ تفریق کرنے کے لیے۔ ان کو مساجد ضرار بنانا ایک بدترین فعل ہے جسے کسی حال میں گوارا نہیں کیا جا سکتا۔

---

# تنزیل و تاویل

# تفسیر آیہ مَا کَانَ لِنَبِیٍّ اَنْ یَکُوْنَ لَہٗ اَسْرٰی

## (۲)

از جناب مولوی داؤد اکبر صاحب اصلاحی

**قرآن سے استدلال** اس میں تو شک نہیں کہ سورۂ انفال میں غزوۂ بدر پر تبصرہ کیا گیا ہے اور تفصیل سے مسلمانوں کو اصول جنگ کی تعلیم دی گئی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اسی سورہ کی بعض آیات میں ذرا ذرا وقفہ کے بعد یہودیوں پر کیوں نشتر زنی کی گئی ہے اگر واقعی غزوۂ بدر کے سلسلہ میں انھوں نے کوئی شرارت نہیں کی تھی؟ قرآن کا جواب اثبات میں ہے یہی نہیں بلکہ اس کا دعویٰ ہے کہ بدر کی لڑائی یہودیوں ہی کی ریشہ دوانیوں کا نتیجہ تھی چنانچہ اسی سورۂ (انفال) کی ایک آیت سے قرآن کے دعوے کی تصدیق ہوتی ہے ملاحظہ ہو۔

وَاِذْ زَیَّنَ لَھُمُ الشَّیْطَانُ اَعْمَالَھُمْ وَ    اور یاد کرو جب شیطان نے انکی تدبیروں کو اچھا

قَالَ لَاغَالِبَ لَکُمُ الْیَوْمَ وَاِنِّیْ جَارٌ لَّکُمْ    کر دکھایا اور کہا کہ آج تم پر کوئی غالب نہیں آسکتا اور

---

لے ترجمان القرآن۔ یہ کس نے کہا کہ سورۂ انفال میں یہودیوں کا کہیں ذکر نہیں آیا؟ سوال تو یہ تھا کہ یہودیوں سے خطاب ان کیا گیا ہے؟ آپ خود تسلیم کرتے ہیں کہ سورۂ انفال میں غزوۂ بدر پر تبصرہ کیا گیا ہے اور اس تبصرہ کے مخاطب کفار نہیں بلکہ مسلمان ہیں۔ اب یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کو خطاب کر کے جنگ بدر کے اسباب اور نتائج اور مسلمانوں کی کامیابی کے وجوہ اور ایسے ہی دوسرے امور پر کلام کیا جائیگا تو اس میں دوسرے فریق کی کمزوریوں اور اسکے جرائم کا بھی ذکر آئیگا لیکن یہ ذکر اس حیثیت سے نہ ہوگا کہ خود وہی فریق اس کا مخاطب ہو بلکہ اس حیثیت سے ہوگا کہ مسلمان انکی شرارتوں سے واقف ہوں اور یہ بھی جان لیں کہ انکے کمزور پہلو کون سے ہیں۔

فَلَمَّا تَرَاءَتِ الْفِئَتَانِ نَكَصَ عَلٰى عَقِبَيْهِ وَقَالَ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكُمْ اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (۴۸ ۔ انفال)

میں تمہارے ساتھ ہوں، پھر جب دونوں جماعتیں آمنے سامنے ہوئیں تو الٹے پاؤں کھسک گیا اور بولا کہ مجھے کچھ مطلب نہیں میں تو خدا سے ڈرتا ہوں اور اللہ سخت عذاب والا ہے۔

مذکورہ بالا آیت سے صاف ظاہر ہے کہ یہودیوں ہی نے کافروں کو مسلمانوں کے خلاف شہ دی تھی۔ ممکن ہے کسی کو اس مقام پر شبہہ ہو کہ مذکورہ بالا آیت میں یہود کا کہاں تذکرہ ہے؟ اس شبہہ کا امکان ہے لیکن اس کے جواب میں ہم کہیں گے کہ اس مقام پر شیطان سے یہود ہی مراد ہیں اور اس معنی میں یہ لفظ غریب نہیں ہے بلکہ اسی معنی کی تعبیر کے لیے بے شمار مقامات پر آیا ہے۔ اطمینان کے لیے سورۂ بقر کی آیت (۱۴) اور سورۂ مجادلہ کی آیت (۱۰) کی طرف مراجعت کرنی چاہیئے[ؒ] خوف طوالت مانع ہے اور نہ اس مفہوم

۱ ۔ ترجمان القرآن ۔ یہاں ہمارے فاضل دوست نے اِنِّیْٓ اَرٰی مَا لَا تَرَوْنَ کے الفاظ کو متن اور ترجمہ دونوں میں چھوڑ دیا ہے۔ یہ تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ انہوں نے قصداً ایسا کیا ہے، مگر یہ واقعہ ہے کہ یہ الفاظ ان کے مدعا کے خلاف پڑتے ہیں۔ وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اس آیت میں شیطان سے مراد یہود ہیں۔ مگر آیت میں یہ ارشاد ہو رہا ہے کہ شیطان نے جب دونوں کو مقابل دیکھا تو بول اٹھا کہ "اے کافرو! میں تم سے بری الذمہ ہوں، میں وہ چیز دیکھ رہا ہوں جو تمہیں نظر نہیں آتی، میں اللہ سے ڈرتا ہوں"۔ خط کشیدہ الفاظ میں صریح اشارہ ہے اس لشکر ملائکہ کی طرف جو اصحاب رسول کی مدد کے لئے خدا نے بھیجا تھا (اِنِّیْ مُمِدُّکُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ) اور جس کے متعلق سورۂ توبہ میں جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا کہا گیا ہے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ اس غیر مرئی طاقت کو دیکھنا اور خدا کے عذاب سے ڈر کر بھاگ جانا اسی شیطان کا فعل ہو سکتا ہے جو ناری الاصل ہے، نہ کہ یہود کا۔ اگر آپ کو اس بات سے انکار ہے تو ارشاد ہو کہ یہودیوں نے آخر کونسی چیز دیکھی تھی جو کفار مکہ نہیں دیکھ سکتے تھے؟

۲ ۔ یہاں ہمارے فاضل دوست ایک غلطی کو سہارا دینے کے لیے دوسری غلطی اور عظیم تر غلطی کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ قرآن میں جہاں کہیں الشیطان الف لام تعریفی کے ساتھ آیا ہے وہاں شیطان سے مراد وہی ناری مخلوق ہے جس سے بنی آدم کی ازلی عداوت چلی آتی ہے اور جس کا کام انسان کو بہکا کر غلط راستہ پر لے جانا ہے۔ باقی رہا یہ بات کہ کہیں انسانوں کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے، تو تحقیق سے آپ کو معلوم ہو جائیگا کہ قرآن میں جن مقامات پر شیطان سے انسان مراد ہیں وہاں الف لام تعریفی نہیں ہے اور اس معنی پر دلالت کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی صریح قرینہ موجود ہے مثلاً سورہ بقر کی چودھویں آیت میں یہ الفاظ ہیں: وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۔ سورۂ انعام میں ہے وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ۔

کی آیات نقل کرتے۔

ایک دوسرے مقام پر پیشِ نظر سورہ ہی میں یہودیوں پر یوں نیش زنی کی گئی ہے۔

(۲) اِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِنْدَ اللّٰهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ اَلَّذِيْنَ عَاهَدْتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَهُمْ فِيْ كُلِّ مَرَّةٍ وَّهُمْ لَا يَتَّقُوْنَ الایۃ

بیشک سب جانداروں میں بدتر اللہ کے نزدیک وہی ہیں جنہوں نے انکار کیا پھر وہ ایمان نہیں لاتے۔ ان میں سے جن کے ساتھ تم نے معاہدہ کیا وہ ہر بار اپنا عہد توڑتے ہیں اور ان کو ذرا خدا کا خوف نہیں ہے۔

سیاق و سباق سے ظاہر ہے کہ اس آیت میں شرالدواب سے یہود اور کفار قریش دونوں کی تعریض ہے بلکہ اولیت یہود کو حاصل ہونی چاہیے اس لیے کہ اسلام کی فیصلہ کن لڑائی (بدر) میں باوجود یکہ ان کا ایک بال بھی بیکا نہ ہوا ان کی آتش غضب بھڑک اٹھی اور انہوں نے ان تمام عہود و مواثیق کو جو مسلمانوں سے تھے ایک ایک کرکے توڑ ڈالا۔ سوال یہ ہے کہ آخر انہوں نے ایسا کیوں کیا؟ یہ اس لیے کیا کہ بدر کی فتح مبین نے انھیں اندیشہ ناک کر دیا تھا اور انھیں علانیہ نظر آنے لگا تھا کہ اسلام کا بے پناہ سیلاب ان کے خود غرضانہ اقتدار اور جابرانہ تسلط کو بہالے جائے گا۔ اس لیے انہوں نے کھلم کھلا نقض عہد کا اعلان کر دیا چنانچہ طبقات ابن سعد میں بنو قینقاع کے تذکرہ میں ہے۔

فلما کانت وقعۃ بدر اظھروا البغی والحسد و نبذوا العھد والمرۃ ،

جب یہ بدر کی لڑائی ہوئی تو یہودیوں نے شورش اور حسد ظاہر کیا اور عہد کو توڑ ڈالا۔

تکلہ حاشیہ صـ۱۴۳ـ اس قسم کا کوئی قرینہ سورۂ انفال کی زیر بحث آیت میں نہیں پایا جاتا۔ اس لیے الشیطان سے الیہود مراد لینا کسی طرح درست نہیں۔ رہی سورۂ مجادلہ کی دسویں آیت تو اس میں شیطان سے مراد یہود ہرگز نہیں ہیں باس میں تو یہ فرمایا گیا ہے کہ اِنَّمَا النَّجْوٰى مِنَ الشَّيْطٰنِ۔ خفیہ سازباز کی باتیں کرنا ایک شیطانی فعل ہے یا شیطان کی تحریک سے ہوتا ہے

ایک دوسرے مقام پر اسی سورہ میں یوں ہے۔

(۳) وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ اور تیار کرو ان کی لڑائی کے لیے جو کچھ جمع کر سکو قوت
وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَ سے اور پلے ہوئے گھوڑوں سے کہ اس سے دھاک بٹھے
عَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا اللہ کے دشمنوں پر اور ان کے سوا دوسرے اعداء پر
تَعْلَمُوْنَهُمْ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ (انفال ع ۸) جن کو تم نہیں جانتے اللہ ان کو جانتا ہے۔

مذکورہ بالا آیت میں آخرین سے ان دشمنان اسلام کی جانب اشارہ کرنا مقصود ہے جو بظاہر فتنہ وفساد سے دور رہتے ہیں لیکن حقیقت میں دبے ہوئے فتنوں کو وہی ہوا دیا کرتے ہیں[1]۔ ظاہر ہے یہ عظیم الشان کام یا تو اغراض پرست یہود اچھی طرح انجام دے سکتے تھے یا منافقین اس لیے کہ یہ دونوں جماعتیں اغراض دنیا کی غلام تھیں۔ اور یہ مسلم ہے کہ کوئی سا ہو کار کسی جماعت کی کھلم کھلا مخالفت نہیں کر سکتا، اس لیے کہ اُسے سب کا اندوختہ سمیٹنا ہوتا ہے اور اگر اسی طرح وہ لوگوں سے لڑائی لیتا رہے تو کیا خاک اس کا اندوختہ ہو گا۔

سابق تصریحات سے حسب ذیل باتیں مفہوم ہوتی ہیں۔

(۱) بدر کی لڑائی یہودیوں کی ریشہ دوانیوں کا نتیجہ تھی آیت "وَاِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ اَعْمَالَهُمْ وَقَالَ لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ الخ۔ اس بارہ میں حجت قاطعہ ہے[2]۔

(۲) یہودیوں کے نقض عہد کی وجہ مسلمانوں کی فتح مبین اور ان کے اغراض دنیہ کا تحفظ تھا۔ طبقات ابن سعد کی تصریح سابق اس بارے میں ناطق ہے اور اسی لیے قرآن نے انھیں شرالدواب سے موسوم کیا ہے۔

(۳) اعداء دین بالخصوص یہود و منافقین کی سرکوبی کے لیے مسلمانوں کو اسلحہ کی تیاری کے لیے اسی لیے ابھارا گیا ہے کہ جب تک وہ اندرونی فتنوں کا استیصال نہ کریں گے اطمینان نصیب نہ ہو گا۔ آیت

---

[1] ترجمان القرآن۔ آخرین من دونھم سے مراد یہود نہیں ہیں بلکہ ایسے دشمن ہیں جن کا حال مسلمانوں کو معلوم نہ تھا۔ یہود اور منافقین دونوں کے متعلق تو مسلمان بالیقین جانتے تھے کہ وہ دشمن ہیں۔

[2] ترجمان القرآن۔ یہ سرے سے حجت ہی نہیں ہے قاطعہ تو درکنار۔

وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ وَمِن رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ وَآخَرِينَ مِن دُونِهِمْ لَا تَعْلَمُونَهُمُ اللَّهُ يَعْلَمُهُمْ الخ فیصلہ کن ہے۔[1]

ہمارے اس دعوی پر کہ بدر کی فتح مبین کے بعد یہودیوں نے کوئی نہ کوئی شر و شرارت کی چند اور قرائن بھی ہیں مثلاً۔

(۱) کبھی کبھی اسلام کی عظمت و وقار کم کرنے کے لیے وہ مشرکوں سے کہتے مذہب میں مسلمانوں سے زیادہ تم ہی اچھے ہو۔

وَيَقُولُونَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا هَٰؤُلَاءِ أَهْدَىٰ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا الخ (نساء)

اور وہ کافروں سے کہتے ہیں کہ وہ مسلمانوں سے کہیں زیادہ راہ راست پر ہیں۔

(۲) اور کبھی کبھی مذہب اسلام کی عوام میں بے اعتباری پھیلانے کے لیے اسلام لا کر مرتد ہو جاتے تاکہ عوام مذہب اسلام سے متوحش ہوں ملاحظہ ہو۔

وَقَالَت طَّائِفَةٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ آمِنُوا بِالَّذِي أُنزِلَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوا آخِرَهُ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ (آل عمران رکوع ۸)

اہل کتاب میں سے ایک گروہ نے کہا کہ مسلمانوں پر جو دین اترا ہے اس پر صبح کو ایمان لے آؤ اور شام کو اس سے انکار کر دو شاید کہ یہ لوگ اسی طرح اس دین سے پھر جائیں۔

**نظام سورہ سے استدلال** مولنا محترم نے خطاب کی وقت کے باب میں منجملہ اور وجوہ کے یہ بھی لکھا ہے کہ سورۂ انفال کے ساتویں رکوع سے خطاب یا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب ہے یا مسلمانوں کی طرف ہے اس لیے آیات مستفسر عنہا کا خطاب بھی مسلمانوں ہی کی طرف ہونا چاہیے۔ لیکن مولنا کا یہ دعوی

[1] ترجمان القرآن۔ یہ تینوں باتیں ثابت سہی۔ مگر اس سے آپ کے مدعا کو کیا فائدہ پہنچا ہے خطاب مسلمانوں کی طرف ہے اور انہیں دشمنوں سے خبردار کیا جا رہا ہے یہودیوں کی جانب کہیں خطاب نہیں۔

محتاجِ تفسیر ہے اس لیے ہم مضامین سورہ کی بلحاظ نظام نمبر وار تقسیم کرتے ہیں: (۱-۴) ان آیات میں کامل مسلمانوں کے اعلام گنائے گئے ہیں یعنی حقیقی معنی میں ایمان کی دولت سے وہی بہرہ مند ہیں جن میں تقویٰ اصلاح ذات البین اور اطاعت اللہ والرسول کا جذبہ کارفرما ہو اور جن کے قلوب الحب فی اللہ والبغض فی اللہ سے سرشار ہوں یہی جذبہ تھا جس نے حق و باطل کی فیصلہ کن لڑائی میں چند نفوس کو دل بادل کے مقابل کھڑا کر دیا تھا اور دنیا نے دیکھ لیا کہ اس جذبہ میں کتنا اعجاز و سحر ہے اور اسی کا فقدان تھا کہ کچھ لوگ میدان میں آتے ہوئے ڈرتے تھے اور یہ سمجھ رہے تھے کہ موت کے منہ میں جا رہے ہیں۔ چنانچہ اس کے بعد ہی آیات (۵-۸) میں ان لوگوں کا تذکرہ ہے جو باوجودیکہ صراحتاً جنگ کا حکم ہو گیا تھا، میدان جنگ میں اترتے ہوئے حیلے بہانے کر رہے تھے۔ اس کے بعد آیات (۹-۱۴) میں خدا نے غزوۂ بدر کے موقع پر مسلمانوں پر جو احسانات فرمائے ان کو بیان کیا ہے تاکہ ان کے دلوں کے اندر توکل کی روح پیدا ہو اور باطل کی ظاہری طاقت سے (گو کہ بہت بڑھی چڑھی ہو) نہ دبیں اور ان کے دلوں میں یہ عقیدہ راسخ ہو جائے کہ غلبہ حق ہی کو ہو گا گو کہ اس کے علمبردار مادی طاقت و قوت سے یکسر خالی ہوں۔ اس کے بعد آیات (۱۵-۱۹) میں مسلمانوں کو منجملہ اصول جنگ کے ایک نہایت ہی ضروری اصول کی تعلیم دی، یعنی یہ کہ صبر و استقامت کے بغیر جنگ ایک بے معنی شئے ہے۔ یہ روح جس جماعت کے اندر بھی پیدا ہو جائے گی اسباب الٰہی اس کی تائید کریں گے اور اگر یہ چیز حزب اللہ کے اندر ہو تو پھر کیا کہنا ہے؟ آسمان و زمین سب کے سب اس کی تائید کریں گے، خدا کی بے پناہ تلوار اعدار حق کے لیے خود چمکے گی۔ بدر میں کیا ہوا؟ اسی چیز کا ثمرہ تھا کہ خدا کی غیر مرئی افواج اعدار اسلام کے مقابل میدان میں اتر پڑیں (فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُ بَلَاۗءً حَسَنًا اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ") اس کے بعد آیات (۲۰-۲۴) میں اطاعت کاملہ پر زور دیا گیا ہے۔ یہ چیز اس سورہ میں اصول جنگ کے سلسلہ میں آئی ہے اس لیے

ہم کہیں گے کہ اصول جنگ میں سے ایک نہایت ہی اہم دفعہ ہے حقیقت تو یہ ہے کہ لڑائی میں یہ قدم اول ہے اس کے بغیر جماعت بھیڑوں کا انبوہ ہوگی۔ جماعت کے مقدس لفظ کا اس پر اطلاق نہ ہوگا۔ تفصیل کے لیے سورہ کو غور سے پڑھنا چاہیے اس کے بعد آیات (۲۴-۲۶) میں اسی دفعہ کی جو اس سے پہلے والے سلسلہ میں بیان کی تھی تشریح کر دی یعنی: پیر کی ہر دعوت پر لبیک کہنا چاہیے ورنہ اعداء کے مقابل میں ٹکنا آسان نہیں اس کے بعد آیات (۲۷-۲۸) میں انفاق مال ونفس کی دفعہ بتائی گئی ہے۔ بظاہر یہ دفعہ بہت سخت ہے لیکن اسلام کی تو تعبیر ہی یہی ہے۔ "اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَمْوَالَهُمْ وَاَنْفُسَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا الخ" واقعہ یہ ہے کہ انسان سراً وجہراً جو خیانت بھی کرتا ہے وہ دو ہی چیزوں سے متعلق ہوگی۔ یا تو مال سے یا جان عزیز سے۔ ایک شخص کہہ سکتا ہے کیا معلوم کہ ان آیات میں انفاق مال ونفس کا مطالبہ کیا گیا ہے؟ تو ہمارا جواب یہ ہوگا کہ آیت "وَاعْلَمُوْا اَنَّمَا اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ وَّاَنَّ عِنْدَهٗ اَجْرٌ عَظِيْمٌ" جو اسی سلسلہ میں ہے صحیح معلوم ہوتا ہے اس کے بعد آیات (۲۹-۴۴) میں مسلمانوں کو فتح مکہ کی بشارت دی گئی ہے لیکن اسے مشروط قرار دیا ہے تقویٰ پر۔ یعنی جب یہ روح مسلمانوں میں زندہ ہو تو پھر ان کی راہ ترقی میں کوئی چیز بھی روک نہیں بن سکتی بلکہ موانع راہ خود اس کی اعانت کریں گے اور باطل قوتوں کے پرزے پرزے اڑ جائیں گے۔ چنانچہ بدر کی تازہ مثال نظروں کے سامنے ہے۔ اس کے بعد آیات (۴۵-۴۶) میں مسلمانوں کو یہ تعلیم دی گئی کہ جب وہ جنگ کے لیے نکلیں تو ان کی زبانیں اسمار الٰہی سے زمزمہ سنج ہوں۔ ایسا کیوں حکم دیا گیا؟ اس میں یہ راز ہے کہ ان کے اندر اعلاء کلمۂ حق اور ابطال باطل کا جذبہ پیدا ہو۔ ان کا جینا اور مرنا حق کی خاطر ہو۔ نمود ونمائش کے لیے نہ ہو۔ اس کے بعد جب حزب اللہ کی تشکیل ہو چکی تو آیات (۶۵-۶۶) میں اعلان کر دیا کہ اگر دفعات مذکورہ کی روحانیت تمہارے اندر پیدا ہو گئی تو یقین کرو کہ چاہے تعداد میں تم کتنے ہی کم ہو، فتح وکامرانی تمہارے ساتھ ہوگی اور باطل کے علم کے نیچے گو کہ کتنی ہی بڑی بھیڑ ہو

تمہارے مقابل میں نہیں ٹک سکتی اور اگر تمہارے مقابل آئے گی تو پاش پاش ہو جائے گی۔ اس کے بعد آیات (۶۷ - ۷۱) میں چند شبہات کا ازالہ کیا گیا ہے[1]۔ شبہات و جوابات ترتیب وار ذیل میں درج ہیں:

(۱) نبی تو سراپا رحمت بن کر آتے ہیں لیکن یہ تو نبوت کے بھیس میں زمین کو خون سے رنگین کر رہا ہے بھلا نبی کی یہی شان ہوتی ہے۔

(۲) دیکھا تو راۃ میں تو مال غنیمت کا استعمال ممنوع قرار دیا گیا ہے لیکن یہ نبی جائز کر رہا ہے۔

[1] ترجمان القرآن۔ اوپر کے سلسلہ کو مدنظر رکھ کر ان آیات پر نظر ڈالنے سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ دراصل یہ آیات کسی شبہ کو دور کرنے کے لیے نہیں ہیں بلکہ جنگ بدر پر تبصرہ کرتے ہوئے مسلمانوں کو ان کی ایک اور کوتاہی کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ سورہ کی ابتدا میں ایک کمزوری کی طرف اشارہ کیا گیا تھا۔ وَإِنَّ فَرِيقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ لَكَارِهُونَ۔ اس کے بعد [illegible] تُرِيدُونَ عَرَضَ الدُّنْيَا [illegible] پر توجہ دلائی گئی ہے اور وہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے دشمنوں کا زور توڑ دینے کے بجائے مال کی طرف نگاہ کی اس موقع پر دخل مقدر ماننے کی کوئی وجہ نہیں۔ آیات کے سیاق و سباق اور ان کے الفاظ سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ جس طرح خطاب اوپر سے مسلمانوں کی طرف چلا آ رہا تھا اسی طرح یہاں بھی خطاب مسلمانوں ہی کی طرف ہے۔

[2] ترجمان القرآن۔ یہ تمام شبہات جو فاضل مضمون نگار نے بیان کیے ہیں انیسویں صدی عیسوی میں پیدا ہوئے ہیں چھٹی صدی عیسوی کے کسی یہودی کے دل میں پیدا نہیں ہو سکتے تھے۔ "نبی سراپا رحمت بن کر آتے ہیں"۔ یہ یہودی کا تخیل نہیں ہے۔ حضرت موسیٰ کی زندگی کا نقشہ جو تورات میں ہے اور جنگ کی جو اسرائیلی روایات کتب مقدسہ میں موجود ہیں ان کو دیکھ لیجیے پھر آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ زمین کو خون سے رنگین کرنے پر اعتراض کرنے والے اس دور کے یہودی ہو سکتے تھے یا انیسویں صدی کے مسیحی پادری؟ شبہ دوم بھی یہودیوں کے دماغ کی پیداوار نہیں ہے۔ ان کے دل میں اگر کوئی شبہ پیدا ہو سکتا تھا تو یہ کہ یہ نبی اپنے دشمنوں کے ساتھ اس قدر رعایت کیوں کرتا ہے۔ جس قوم کے مذہبی احکام یہ ہوں کہ دشمن قوم کے کسی متنفس کو جیتا نہ چھوڑو اور اس کے تمام اموال پر قبضہ کر لو، کیا وہ قیدیوں سے فدیہ لینے پر اعتراض کر سکتی تھی؟ رہا شبہ سوم تو ہر شخص اس کو دیکھ کر اول نظر میں کہہ دے گا کہ وہ مسیحی تخیل ہے پس واقعہ یہ ہے کہ ہمارے فاضل دوست جن شبہات کی بنا پر قرآن میں دخل مقدر مان رہے ہیں وہ گذشتہ صدی عیسوی میں بین الاقوامی قانون کے تصورات سے پیدا ہوئے تھے اور اب بیسویں صدی میں قانون جنگ کے عملی ارتقاء سے خود بخود ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ ایسے بے بنیاد شبہات کے لیے آیات مذکورہ کو قطعاً دفع دخل مقدر کی ضرورت نہ تھی۔

ہم بھی تو آخر کتاب والے ہیں؟

(۳) اور انبیاء تو دشمنوں سے پیار کرنے کی تاکید فرماتے تھے لیکن اس نے تو ظلم و ستم کا بازار گرم کر رکھا ہے، اس کے ظلم کی حد میدان ہی تک نہیں ختم ہوتی قیدیوں سے فدیہ بھی وصول کیا جاتا ہے یہ ظلم نہیں تو کیا ہے؟ تمھیں لوگ فیصلہ کرو۔

| | |
|---|---|
| (۱) مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ ۭ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا ڰ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۔ (۶۷-۶۸) | کسی نبی کے شایان شان یہ نہیں ہے کہ وہ قیدی کیے جائے کہ ارض الٰہی کو لالہ زار کردے تم متاع دنیا کے غلام ہو خدا کو تو آخرت مطلوب ہے اور خدا عزیز اور حکیم ہے اگر خدا کا قرار دادہ نہ گذر چکا ہوتا تو تمہاری حرکت پر عذاب الٰہی آکر تمہارا خاتمہ کر دیتا۔ |
| (۲) فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا ڮ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۔ (۶۹) | پس کھاؤ مال غنیمت حلال طیب سمجھ کر اور تقویٰ اختیار کرو ضرور خدا غفور اور رحیم ہے۔ |
| (۳) يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّمَنْ فِيْٓ اَيْدِيْكُمْ مِّنَ الْاَسْرٰٓى ۙ اِنْ يَّعْلَمِ اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ خَيْرًا يُّؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّآ اُخِذَ مِنْكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ وَاِنْ يُّرِيْدُوْا خِيَانَتَكَ فَقَدْ خَانُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ فَاَمْكَنَ مِنْهُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۔ (۷۰-۷۱) | اے نبی اکہدے ان قیدیوں سے جو تم لوگوں کے ہاتھوں میں قید ہیں کہ اگر خدا تمہارے دلوں میں صلاحیت پائے تو اس سے زیادہ بہتر چیز (دولت ایمان) دیگا جو تم سے لی گئی ہے (یعنی فدیہ) اور تمہاری لغزشات معاف کر دے گا! اور خدا بہت ہی مغفرت کرنے والا اور رحیم ہے اور اگر وہ تمہیں دھوکہ دیں گے تو یہ کوئی نئی بات نہیں، اس سے پہلے بھی وہ خیانت کر چکے ہیں تو اس نے ان کو تمہارے قابو میں دیدیا اور اللہ علیم اور حکیم ہے۔ |

اس کے بعد آیات (۲، ۵ ۔ ۷) میں حقیقی مسلمانوں کی یہ علامت بتائی گئی ہے کہ وہ خدا کی راہ میں مال و جائداد سب کچھ قربان کرنے کے لیے آمادہ رہتے ہیں۔

دیکھیے پیش نظر سورہ کی ابتدا اور اختتام کی آیات (۱ ۔ ۴ ۔ ۲، ۵ ۔ ۷) میں بلحاظ نظم بہت کم فرق ہے۔ وہ یہ کہ ابتدائی آیات میں کلیات دین پر بہت زور دیا گیا ہے۔ وجہ ظاہر ہے۔ اور اختتام کی آیات میں لوازم ایمان بتائے ہیں۔ ایک لحاظ سے سورہ آیت (۶۵) پر ختم ہو جاتی ہے اور آیت (۶۶) آیۃ ناسخہ ہے اور آیات (۶۷ ۔ ۷۱) دفع اعتراضات میں واقع ہیں۔

**ایک ضروری اصول** اس مقام پر ایک نہایت ضروری اصول بیان کر دینا خالی از فائدہ نہ ہوگا وہ یہ کہ قرآن پاک کی جن آیات میں شبہات کا جواب دیا گیا ہے۔ انھیں چند قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے بعض تو ایسی ہیں جن کے سوالات مذکور ہیں اور سوال کے بعد ہی جواب دیا گیا ہے مثلاً یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ۔ يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ۔ يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ۔ اور بعض دخل مقدر کے جواب میں واقع ہیں مثلاً وَاِنْ يَّرَوْا كِسْفًا مِّنَ السَّمَآءِ سَاقِطًا يَّقُوْلُوْا سَحَابٌ مَّرْكُوْمٌ۔ پچھلے صفحات میں اس سے متعلق ہم بہت سے شواہد نقل کر چکے ہیں اعادہ کی ضرورت نہیں۔ اور بعض آیات میں ایسے اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے جن میں پیغمبر اور مسلمانوں کے اعمال و منہاج پر اعتراض کیا گیا ہے مثلاً تحویل قبلہ کی بابت جب حکم آیا تو یہودیوں نے مسلمانوں کو اسلام کے خلاف ورغلایا ملاحظہ ہو:۔

| | |
|---|---|
| سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا | ناسمجھ لوگ کہیں گے کہ کس چیز نے ان کو اس قبلے |
| وَلّٰهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا | پھیر دیا جس پر وہ اس سے پہلے تھے؟ جواب میں |
| قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا | کہدو کہ اللہ ہی کا مشرق بھی اور مغرب بھی تم جس طرف |

فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ الآیۃ (بقرہ) بھی پھرو گے اسی طرف اللہ ہے۔

تفصیل بالا سے وہ حقیقت ثابت ہوگئی کہ اس طرح دخل مقدر محذوف ہوتا ہے تو کیوں نہ آیات مستفسر منہا میں بھی دخل مقدر مان لیں جب کہ کوئی وقت بھی نہیں ہے۔ رہی ابن عباس اور دیگر مفسرین کی تصریح تو انشاء اللہ اگر ضرورت ہوئی تو اس کی تحقیق ہم آئندہ کریں گے۔

# استدراک

از ایڈیٹر

دخل مقدر اور تبدیل خطاب ماننے کے لیے سب سے پہلے اس قاعدہ کو اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ کلام کو اس کے متبادر معنی سے پھیرنا صرف اسی صورت میں جائز ہو سکتا ہے جب کہ وہ معنی لینے سے کوئی قباحت واقع ہوتی ہو۔ اگر کسی قباحت کے بغیر اس کے متبادر معنی لیے جا سکتے ہوں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم خواہ مخواہ ایک دخل مقدر فرض کریں اور الفاظ کو سیدھے سادے مفہوم سے پھیر کر بعید اور بعید تر تاویلات کی طرف لے جائیں۔ اب یہ ظاہر ہے کہ آیات زیر بحث کا صریح اور متبادر مفہوم تو وہی ہے جو ہر شخص اول نظر میں سمجھتا ہے اور وہی مفہوم ۱۳ سو برس تک تمام مفسرین اور مترجمین قرآن سمجھتے رہے ہیں قبل اس کے کہ آپ اس مفہوم کو چھوڑ کر کوئی دخل مقدر فرض کریں آپ کو یہ ثابت کرنا چاہیے کہ اس متبادر مفہوم میں فی الواقع کوئی قباحت ہے۔ آپ جو قباحت بیان فرماتے ہیں ہم کو اس کے قباحت ہونے ہی میں کلام ہے۔ ایسی صورت میں آپ کی یہ پوری بحث جو ایک خاص دخل مقدر کی تائید میں آپ نے تحریر فرمائی ہے، قبل از وقت ہے پہلے آپ معنی متبادر کی قباحت ثابت کیجیے۔ اس کے بعد یہ سوال زیر بحث آ سکتا ہے کہ صحیح معنی متعین کرنے کے لیے کونسا دخل مقدر مانا جائے اور کس کو ان آیات کا مخاطب قرار دیا جائے۔

آپ نے قرآن مجید سے دخل مقدر کی جتنی مثالیں بیان فرمائی ہیں وہ سب ایسی ہیں کہ آیات کو ان کے صحیح اور عام فہم معنی سے پھیرتی نہیں ہیں بلکہ اسی معنی کی مزید توضیح کرتی ہیں۔ اگر کوئی شخص اس قسم کے دخل مقدر سے خالی الذہن ہو تب بھی وہ آیات کا ایک سیدھا سادھا مفہوم سمجھ سکتا ہے، اور دخل مقدر ماننے والا اُس سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ تو نے ان کا بالکل غلط مفہوم سمجھا ہے۔ اس طرح کا دخل مقدر ماننے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ مگر اس پر قیاس کر کے ایسے دخل مقدر کو جائز ثابت کرنا قیاس مع الفارق ہے جس کو ماننے سے آیات اپنے صریح معنی سے پھر جاتی ہوں۔

مزید براں آپ کی پیش کردہ مثالوں میں جتنے دخل مقدر بیان کیے گئے ہیں وہ یا تو خود قرآن میں کہیں نہ کہیں مذکور ہیں یا قرآن سے باہر کہیں نہ کسی جگہ ان کا ذکر آیا ہے، اور ہر شخص کے لیے یہ ممکن ہے کہ تحقیق کر کے ان کا پتہ لگائے۔ بخلاف اس کے یہ خاص دخل مقدر جسے آپ ثابت کرنا چاہتے ہیں، نہ قرآن میں مذکور ہے نہ کسی اور جگہ۔ اس کا پتہ صرف وہی شخص لگا سکتا ہے جس کے دل میں وہی بات کھٹکتی ہو جو آپ کے دل میں کھٹکتی ہے، اور جس کا طرز فکر وہی ہو جو آپ کا ہے۔ بالفاظ دیگر یہ دخل مقدر کہیں باہر موجود نہیں ہے۔ بلکہ ایک خاص قسم کے ذہن کی پیداوار ہے۔ جس شخص کا ذہن اس خاص قسم کا نہیں ہے وہ قیامت تک اس دخل مقدر کا پتا نہیں لگا سکتا، بلکہ اس کے دل میں شاید اس کی جستجو کا خیال بھی نہیں آ سکتا۔ میں یہ بات کسی مبالغہ کے بغیر کہہ سکتا ہوں کہ آج تک جن لوگوں نے قرآن کی تفسیر اور ترجمہ کیا ہے ان میں سے کسی کا ذہن اس دخل مقدر تک نہیں پہنچا اور جو لاکھوں کروڑوں انسان اس کتاب پاک کی تلاوت کرتے ہیں ان میں بھی شاید ہی کسی کی رسائی وہاں تک ہوئی ہو۔ پھر کیا قرآن ایک معما اور چیستاں ہے کہ اس کے فہم کے دروازے عام انسانوں پر بند ہیں؟ اور کیا اس کی آیات ایسی کلک ہیں کہ ان کے معانی سمجھنے کے لیے دور دور سے دخل مقدر تلاش کر کے لانے کی ضرورت ہے؟

آپ نے تبدیل خطاب کی بھی بہت سی مثالیں پیش فرمائی ہیں۔ مگر آپ خود ان مثالوں پر غور

فرمائیے۔ ان میں ہر جگہ تبدیل خطاب بالکل فطری انداز بیان میں ہوئی ہے۔ ایک عامی ان کو پڑھ کر آسانی سے سمجھ سکتا ہے کہ کس جگہ کون مخاطب ہے بخلاف اس کے آیات زیر بحث میں جو تبدیل خطاب آپ تجویز فرما رہے ہیں وہ ایک عامی تو درکنار علماء کے فہم سے بھی بعید ہے۔ کوئی قرینہ ایسا نہیں جس سے یہ معلوم ہوتا ہو کہ مسلمانوں سے خطاب کرتے کرتے دفعتہً یہودیوں کی طرف کہاں خطاب پھر گیا اور پھر مسلمانوں کی طرف کہاں راجع ہو گیا۔ اس قسم کی تبدیل خطاب کی کوئی مثال ہمیں قرآن میں نہیں ملتی۔

آپ نے نظام سورہ سے بھی استدلال فرمایا ہے مگر آپ خود دیکھ سکتے ہیں کہ نظام سورہ سے آپ کا مدعا ثابت نہیں ہوتا۔ اس طریق استدلال کو چھوڑ کر اگر آپ ترتیب نزول اور نظام سورہ دونوں سے مدد لیں گے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ آیات زیر بحث کا صحیح مفہوم وہی ہے جو اس کے الفاظ سے متبادر ہوتا ہے اور جس کو عام طور پر قرآن کے مفسرین و مترجمین نے سمجھا ہے۔ سب سے پہلے سورہ محمدؐ کی ابتدائی آیات پڑھیے روایات سے قطع نظر، خود قرآن کی اندرونی شہادت سے بھی پتہ چل جاتا ہے کہ یہ آیات ہجرت کے بعد اور جنگ سے پہلے نازل ہوئی ہیں۔ ان میں ارشاد ہوا ہے:۔

”جن لوگوں نے دین حق کو ماننے سے انکار کیا اور اللہ کے راستے سے دوسروں کو روکا، اللہ نے ان کے اعمال کو رائگاں کر دیا۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیا اور اس ہدایت کو جو محمدؐ پر نازل ہوئی ہے مان لیا کہ وہی ان کے رب کی طرف سے برحق ہے، اللہ نے ان کے گناہ ان پر سے اتار دیے اور ان کی حالت درست کر دی۔ یہ اس لیے کہ کفر کرنے والوں نے باطل کا اتباع کیا اور ایمان لانے والوں نے اس حق کا اتباع کیا جو ان کے رب کی طرف سے ہے۔ اس طرح اللہ ان دونوں گروہوں کو لوگوں کے لیے مثال کے طور پر پیش کرتا ہے۔ پس اے مسلمانو! جب تمہاری مڈ بھیڑ ان کافروں سے ہو تو پہلے گردنیں مارنا پھر جب ان کا زور اچھی طرح توڑ

تو قید کرلینا، اس کے بعد تمہیں اختیار ہے خواہ احسان سے پیش آؤ خواہ فدیہ لے کر چھوڑ دو، حتیٰ کہ جنگ اپنے ہتھیار رکھ دے۔ یہ ہدایت تم کو دی جاتی ہے۔ اگر خدا چاہتا تو خود ہی ان سے بدلے لیتا (تمہارے لڑنے کی نوبت ہی نہیں آتی اگر یہ (لڑائی کا طریقہ) اس لیے ہے کہ وہ تم میں سے ایک کو دوسرے کے ساتھ آزمائش میں ڈالنا چاہتا ہے۔ جو لوگ خدا کی راہ میں مارے جائیں گے اللہ ان کے اعمال کو رائیگاں نہ کرے گا، وہ انہیں منزل مقصود کو پہونچا دے گا اور ان کا حال درست کریگا اور اس جنت میں انھیں داخل کرے گا جس سے وہ پہلے ہی ان کو روشناس کرا چکا ہے۔ اے ایمان والو! اگر تم اللہ کے کام آؤگے تو اللہ تمہارے کام آئے گا اور تمہیں ثابت قدم بنادے گا۔ اور جو لوگ کافر ہیں ان کے لیے ہلاکت ہے، اللہ نے ان کے اعمال کو رائگاں کردیا۔ یہ اس لیے کہ انہوں نے پسند نہ کیا۔ اس ہدایت کو جو اللہ نے نازل کی ہے۔ لہٰذا اللہ نے ان کے عمل اکارت کر دیے۔ کیا انہوں نے زمین میں سیر و سفر کرکے نہیں دیکھا کہ ان سے پہلے جو قومیں گذر چکی ہیں ان کا کیا انجام ہوا؟ اللہ نے ان کو تہس نہس کر دیا اور ایسا ہی کچھ دوسرے کافروں کو بھی پیش آنا ہے ....... کتنی ہی بستیاں تھیں جن کے باشندے تیری بستی کے باشندوں سے بہت زیادہ بل بوتا رکھتے تھے جس کے لوگوں نے اے پیغمبر تجھ کو گھر سے نکالا ہے ہم نے ان کو ہلاک کر دیا اور کوئی انکا مددگار نہ کھڑا ہوا۔" (سورۂ محمدؐ رکوع اول و دوم)

اس عبارت اور خصوصاً اس کے خط کشیدہ فقروں پر غور کیجیے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ جنگ ابھی شروع نہیں ہوئی مسلمان ابھی نئے نئے ہجرت کرکے آئے ہیں۔ اب دوسری اور زیادہ سخت لڑائی کی طرف بڑھنے کے لیے ان کو تیار کیا جا رہا ہے۔ ان کے نفوس میں وہ خاص طاقت پیدا کرنے کی کوشش کی جارہی ہے جو دنیا کے لیے نہیں بلکہ صرف خدا کے لیے لڑنے والے مجاہدین کے نفوس میں ہونی چاہیے اس کے ساتھ ہی ان کو ہدایت دی جا رہی ہے کہ دیکھو! لڑائی کے موقع پر اپنی تمام توجہ کفار کا زور

توڑنے کی طرف صرف کرنا۔ مال کی طرف توجہ نہ کرنا۔ اپنا کام پورا کر لینے کے بعد تم قیدی بھی پکڑ سکتے ہو اور ان سے فدیہ بھی لے سکتے ہو لیکن چونکہ تمہاری جنگ حق کے لیے ہے، متاع دنیا کے لیے نہیں ہے، اس لیے کفر کی کمر توڑنے سے پہلے مال لینے کا خیال بھی نہ کرنا۔

اس کے بعد جنگ بدر پیش آتی ہے۔ تاریخ میں پہلی جنگ تھی جو بالکل ایک نرالے مقصد اور بالکل نئے اصولوں کے تحت لڑی جا رہی تھی۔ عرب تو کیا، دنیا کی کوئی قوم بھی اس وقت تک ایسی جنگ سے واقف نہ تھی جس میں کسی دنیوی غرض کا قطعاً کوئی لگاؤ نہ ہو جس میں بھائی سے بھائی، باپ سے بیٹا اور رشتہ دار سے رشتہ دار صرف اصول کی خاطر لڑنے کے لیے نکلا ہو۔ صحابہ کرام اگرچہ کئی سال سے ایسی نفسی تربیت پا رہے تھے جو ان کو اس خاص قسم کی لڑائی کے لیے تیار کرنے والی تھی، مگر ابھی تک عملی امتحان نہیں ہوا تھا۔ خود سرکار رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بھی اس نئی اور بالکل نرالی جنگ کی قیادت کا پہلا موقع تھا۔ ایسی حالت میں بالکل ایک فطری بات تھی کہ جنگ میں صحابہ سے کچھ نہ کچھ لغزشیں سرزد ہوتیں۔ اللہ تعالیٰ کے مقصد کو پورا کرنے میں کچھ نہ کچھ کوتاہیاں باقی رہ جاتیں۔ چنانچہ ایسا ہوا جس کی شہادت قرآن اور تاریخ دونوں سے ملتی ہے۔

جنگ کے بعد اللہ تعالیٰ نے سورۂ انفال نازل کی۔ چونکہ اس فوج کا اصلی جنرل خود اللہ تعالیٰ تھا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم محض اس کی ہدایت کے تحت اس کے نائب کی حیثیت سے کمانڈ کر رہے تھے، اس لیے لڑائی ختم ہونے کے بعد جنرل نے لڑائی پر تبصرہ کیا اور اس تبصرہ میں ایک طرف یہ بتایا کہ تمہارے دشمنوں کی اصل کمزوریاں کیا تھیں جنہوں نے ان کو ناکام کیا اور تمہاری طاقت کے اصل اسباب کیا ہیں جن کی بدولت تم فتحیاب ہوئے اور آئندہ بھی فتحیاب ہو سکتے ہو۔ دوسری طرف اس نے وہ کوتاہیاں بھی بتائیں جو اس کی فوج اور اس کے جلیل القدر نائب سے رہ گئی تھیں، تاکہ دوسری لڑائیوں کے موقع پر ان سے اجتناب کیا جائے۔

جنگ کے بعد مسلمانوں کے دل میں پہلی فکر یہ پیدا ہوئی کہ یہ اموال غنیمت جو ہاتھ آئے ہیں ان کا کیا ہوگا؟ اللہ تعالیٰ جو دل کے چھپے ہوئے بھیدوں سے واقف تھا، اس نے سب سے پہلے اسی چوری کو پکڑا۔ وہ ان لوگوں کو ایسی جنگ کے لیے تیار کرنا چاہتا تھا جس میں دنیوی غرض کا شائبہ تک نہ ہو۔ اس لیے اس نے مال کی اس دبی چھپی طلب کو بھی مٹا دینا چاہا جو اس کی فوج کے دل میں راہ پا رہی تھی۔ اس نے فرمایا:۔

"یہ لوگ مال غنیمت کے بارے میں پوچھ رہے ہیں۔ اے پیغمبر! ان سے کہدو کہ مال غنیمت تو اللہ اور اس کے رسول کا ہے۔ تم اللہ سے ڈر کر پرہیزگاری اختیار کرو اور اپنے باہمی تعلقات کی اصلاح کرو (کہ مال کی محبت میں ایک بھائی کو دوسرے بھائی سے حسد نہ پیدا ہو) اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اگر تم مومن ہو"

(سورۂ انفال۔ آیت اوّل)

جس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نہایت بے سروسامانی کی حالت میں جنگ کے لیے نکل رہے تھے تو مجاہدین میں بعض لوگ ایسے بھی تھے جن کے دل چھوٹے جاتے تھے اور ہمت پست ہوئے جا رہی تھی۔ غریب الدیار تھے۔ روٹی اور کپڑے تک کو محتاج تھے۔ جنگ کے لیے پورے ہتھیار تک نہ رکھتے تھے۔ اور دیکھ یہ رہے تھے کہ ہم مٹھی بھر آدمیوں کو صرف قریش سے نہیں بلکہ تمام عرب سے لڑنا جا رہا ہے۔ ایسی حالت میں دل شکستہ ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے دیکھا کہ ضعف ایمانی کی وجہ سے ان میں کمزوری پیدا ہوئی تھی، اس لیے ان کو اس کمزوری اور اس کے سبب دونوں کی طرف متوجہ کیا اور انھیں ایسی تعلیم دی کہ ان کے نفس میں طاقت پیدا ہو۔ فرمایا:۔

"مومن تو وہ ہیں کہ ان کے سامنے جب خدا کا نام لیا جائے تو ان کے دل کانپ اٹھیں اور جب خدا کی آیات ان کے سامنے پڑھی جائیں تو ان کا ایمان اور زیادہ

بڑھ جائے۔ سچے مومن وہی ہیں جو ہر حال میں صرف خدا پر بھروسہ رکھیں، نماز قائم کریں اور جو کچھ ہمنے دیا ہے اسے ہماری راہ میں خرچ کردیں۔ ایسے لوگوں کے لیے اپنے رب کے ہاں بڑے درجے ہیں، گناہوں کی معافی ہے، عزت کی روزی ہے۔ جس طرح تیرے رب نے تجھے حق کی خاطر لڑنے کے لیے گھر سے نکالا تو مومنین میں سے ایک گروہ دل میں راضی نہ تھا۔ وہ حق کے ظاہر ہو جانے کے بعد بھی تجھ سے جھگڑ رہے تھے (کہ جنگ کیلئے جائیں یا نہ جائیں) ان کا حال ایسا تھا کہ گویا آنکھوں دیکھے موت کی طرف ہانکے جا رہے ہیں"۔ (سورۂ انفال۔ رکوع اول)۔

جنگ بدر کے موقع پر ایک طرف سے قریش کا تجارتی قافلہ مال کثیر لیے ہوئے آرہا تھا اور دوسری طرف سے قریش کی فوج چلی آرہی تھی۔ مسلمانوں میں سے ایک بڑی جماعت چاہتی تھی کہ قافلہ پر حملہ کیا جائے تاکہ آسانی سے اس کو شکست دیکر مال حاصل کیا جا سکے۔ یہ بھی ایک کمزوری تھی جو اسلامی جہاد کی اصلی غرض اچھی طرح ذہن نشین نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے تبصرہ میں اس پر بھی تنبیہ فرمائی۔

"اور جب اللہ نے تمہارے سامنے دو گروہوں کو پیش کیا کہ ان میں سے کوئی ایک گروہ تمہارے ہاتھ آجائے گا، تو تم چاہتے تھے کہ جو گروہ لڑائی کی طاقت نہیں رکھتا وہ تمہارے ہاتھ آجائے۔ مگر اللہ چاہتا تھا کہ اپنے کلمات سے حق کو حق کر دکھائے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے تاکہ حق مضبوط بنیاد پر قائم ہو جائے اور باطل باطل ہو کر رہ جائے، خواہ مجرمین اس پر راضی نہ ہوں"۔ (سورۂ انفال رکوع اول)۔

دوران جنگ میں جب کفار شکست کھا کر بھاگنے لگے تو مسلمان عرب کی قدیم عادت کے مطابق کفار کا پیچھا چھوڑ کر غنائم کی طرف جھک پڑے اور چند قیدیوں کو پکڑ کر مال غنیمت لیے ہوئے، مدینہ کی

طرف فاتحانہ واپس ہوگئے پھر مدینہ پہنچ کر صحابہ کے مشورہ سے حضور اکرم نے فدیہ بھی قبول کرلیا اور انھیں چھوڑ دینے کا تصفیہ کیا۔ یہ فعل اگرچہ اس اجازت کے مطابق تھا جو سورۂ محمدؐ میں قبول فدیہ کی بابت دی گئی تھی، لیکن اللہ تعالیٰ نے جو شرط لگائی تھی کہ قیدیوں کو گرفتار کرنے اور فدیہ لے کر انھیں چھوڑ دینے سے پہلے کفار کا زور توڑنا ضروری ہے، اس شرط کی تکمیل میں کوتاہی کی گئی۔ اس پر حق تعالیٰ اپنی فوج کے سپاہیوں اور خود اپنے نائب کو اس طرح تنبیہ فرماتا ہے:

"کسی نبی کو یہ سزاوار نہیں ہے کہ اس کے پاس قیدی ہوں تاوقتیکہ وہ زمین میں (کافروں) کو اچھی طرح کچل نہ دے۔ تم لوگوں کے پیش نظر دنیا کے فائدے ہیں۔ مگر اللہ کے پیش نظر آخرت ہے، اور اللہ زبردست حکمت والا ہے۔ اگر اس سے پہلے خدا کی اجازت نہ آچکی ہوتی تو جو کچھ تم نے لیا ہے اس پر سخت عذاب تمھیں آگھیرتا۔ خیر اب جو مال غنیمت تم حاصل کرچکے ہو وہ حلال اور پاک ہے، اسے کھاؤ پیو اور اللہ سے ڈرتے رہو وہ بخشنے والا مہربان ہے۔" (سورۂ انفال رکوع ۹)۔

اس سلسلہ میں ایک اور بات سمجھ لیجیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جس بات پر تنبیہ کی گئی ہے وہ صرف پہلے فقرے میں بیان ہوئی ہے۔ یعنی آپ کو صرف اس بات پر متنبہ کیا گیا ہے کہ اے نبی ہم نے اثخان فی الارض کی شرط جو لگائی تھی اس کو تم نے پورا نہیں کیا اور اس کی تکمیل کیے بغیر قیدی پکڑ بھی لیے اور ان سے فدیہ بھی قبول کرلیا۔ اس کے بعد دوسرے فقرے میں عام مجاہدین کو تہم نمائی کی گئی ہے کہ تم ہماری ہدایت کے خلاف غنیمت پر کیوں جھک پڑے، حالانکہ تم کو سمجھا دیا تھا کہ تمہاری جنگ دنیا کے لیے نہیں ہے بلکہ آخرت کے لیے ہے۔ اس فقرہ میں صیغۂ جمع کے ساتھ خطاب کیا گیا ہے، لہٰذا اس کے مخاطب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نہیں بلکہ مسلمان ہیں، اور یہ شبہ کرنے کی گنجائش نہیں رہتی کہ اس سے حضورؐ کی دنیا طلبی کا الزام آتا ہے۔

# اقتباسات

# التزامِ جماعت

## مسلمانوں کے لیے ایک اور صرف ایک راہِ عمل

ماخوذ از "مسئلہ خلافت و جزیرۃ العرب" تالیف مولانا ابوالکلام آزاد

"ان صفحات میں کئی مہینہ سے مسلمانوں کو اس امر کی طرف توجہ دلائی جا رہی ہے کہ ان کے لیے جمعیت اور جماعت کے بغیر کوئی زندگی نہیں ہے اور یہ انفرادیت وانتشار کی زندگی جو وہ بسر کر رہے ہیں دراصل جاہلیت کی زندگی ہے جس کا انجام تباہی کے سوا کچھ نہیں۔ جماعت کے بغیر وہ خواہ کسی طرف جائیں، انہیں کوئی کامیابی میسر نہیں آسکتی۔ اگر وہ اسلام سے ہٹ کر چلنا چاہتے ہیں تو جس جہنم کی طرف چاہیں چلے جائیں۔ لیکن اگر اسلام کا اتباع کرنا چاہتے ہیں تو اس کی تعلیم ہمیشہ سے یہی ہے اور ہمیشہ یہی رہے گی کہ سب کاموں سے پہلے ان کو جماعت بننے کی کوشش کرنی چاہیے۔

اس باب میں ہمارا خیال تھا کہ اسلام کی تعلیمات کو تفصیل کے ساتھ پیش کریں۔ مگر یاد آیا کہ اس سے پہلے مولانا ابوالکلام آزاد سنہ ۱۹۲۰ء میں انہی تعلیمات کو نہایت شرح وبسط کے ساتھ بیان کر چکے ہیں، اور انہی کو دوبارہ شائع کر دینا ہمارے مقصد کے لیے کافی ہے۔ چنانچہ ذیل میں اس تحریر کے ضروری اقتباسات درج کیے جاتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ہر مسلمان اپنے دل کے دروازے کھول کر ان کو پڑھے۔ یہ دین اسلام کے محکمات ہیں

جن کی بنیادیں فطرت کے اٹل قوانین پر رکھی گئی ہیں۔ اشخاص بدل جاتے ہیں مگر حقائق اپنی جگہ قائم رہتے ہیں۔ جو چیز ہبوط آدم کے وقت حقیقت تھی وہی ابتے ساٹھ ہیئرہ سو برس پہلے حقیقت تھی اور ستر برس پہلے بھی اب بھی حقیقت ہے اور قیام قیامت تک حقیقت ہی رہے گی)۔

اجتماع و ائتلاف اور اشتات و انتشار نہ صرف امت اسلامیہ بلکہ تمام اقوام عالم کی موت وحیات ترقی وتنزل اور سعادت وشقاوت کے جو اصولی اسباب ومراتب قرآن حکیم نے بیان کیے ہیں۔ ان کی سب سے زیادہ اہم حقیقت انہی الفاظ کے اندر پوشیدہ ہے۔

اجتماع کے معنی ہیں ضَمُّ الشَّيء بتقریب بعضه من بعض (مفردات امام راغب ۹۵) یعنی مختلف چیزوں کا باہم اکٹھا ہو جانا۔

اور ائتلاف "الف" سے ہے اس کے معنی ہیں ما جمع من اجزاء مختلفة ورتب ترتیبا قدم فیه ما حقه ان یقدم واخر فیه ما حقه ان یوخر (مفردات: ۱۹) یعنی مختلف چیزوں کا اس تناسب اور ترتیب کے ساتھ اکٹھا ہو جانا کہ جس چیز کو جس جگہ ہونا چاہیے وہی جگہ اسے ملے جو پہلے ہونے کی حقدار ہے وہ پہلے رہے۔ جس کو آخری جگہ ملنی چاہیے وہ آخری جگہ پائے۔

پس اجتماع و ائتلاف سے مقصود وہ حالت ہے جب مختلف کارکن قوتیں کسی ایک مقام، ایک مرکز، ایک سلسلے، ایک وجود، ایک طاقت، اور ایک فرد واحد میں اپنی قدرتی اور مناسب ترکیب کے ساتھ اکٹھی ہو جاتی ہیں۔ اور تمام مواد، قویٰ، اعمال، اور افراد پر ایک اجتماعی و انضمامی دور طاری ہو جاتا ہے، بجدیکہ ہر قوت اکٹھی، ہر عمل باہمد گر جڑا اور ملا ہوا، ہر چیز بندھی اور سمٹی ہوئی، ہر فرد زنجیر کی کڑیوں کی طرح ایک دوسرے سے متصل ومتحد ہو جاتا ہے۔ کسی چیز، کسی گوشے، کسی عمل میں علیحدگی نظر نہیں آتی۔ جدائی۔ انتشار، اور الگ الگ، جزء جزء، فرد فرد ہو کر رہنے والی حالت نہیں ہوتی۔ مادہ میں جب یہ اجتماع و انضمام پیدا ہو جاتا ہے تو اسی سے تخلیق وتکوین اور وجود وہستی کے تمام

مراتب ظہور میں آتے ہیں۔ اسی کو قرآن حکیم نے اپنی اصطلاح میں مرتبۂ "تخلیق" و "تسویہ" سے بھی تعبیر کیا ہے اَلَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی۔ (۸۶: ۲) پس زندگی اور وجود نہیں ہے مگر اجتماع و ائتلاف اور موت و فنا نہیں ہے مگر اس کی ضد ہے۔ یہی حالت جب افعال و اعمال پر طاری ہوتی ہے تو اخلاق کی زبان میں اس کو "خیر" اور شریعت کی زبان میں "عمل صالح" اور "حسنات" کہتے ہیں۔ جب جسم انسانی پر طاری ہوتی ہے تو طب کی اصطلاح میں "تندرستی" سے تعبیر کی جاتی ہے اور حکیم کہتا ہے یہ "زندگی" ہے۔ اور پھر یہی حالت ہے کہ جب قومی و جماعتی زندگی کی قوتوں اور عملوں پر طاری ہوتی ہے تو اس کا نام "حیات قومی و اجتماعی" ہو تا ہے اور اس کا ظہور قومی اقبال و ترقی اور نفوذ و تسلط کی شکل میں دنیا دیکھتی ہے۔ الفاظ بہت سے ہیں یعنی ایک ہے۔ مظاہر گو مختلف ہیں، مگر اس حکیم یگانہ و واحد کی ذات کی طرح اس کا قانون حیات و وجود بھی اس کائنات ہستی میں ایک ہی ہے: ولنعم ما قیل۔

عبارا تنا شتی وحسنک واحد

وکل الی ذاک الجمال یشیر

اس حالت کی ضد "اشتات وانتشار" ہے۔ اشتات، شتت سے ہے جس کے معنی لغت میں "تفریق" اور الگ الگ ہو جانے کے ہیں۔ یقال شت جمعھم شتًا وشتاتًا وجاؤا اشتاتًا ای متفرقی النظام (مفردات: ۲۵۶) قرآن حکیم میں ہے یَوْمَ یَصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا (۹۹: ۶) اور مِنْ نَبَاتٍ شَتّٰی (۲۰: ۵۳) اور وَ قُلُوْبُهُمْ شَتّٰی (۵۹: ۱۴) ای مختلفۃ۔

انتشار "نشر" سے ہے اس کے معنی بھی الگ الگ ہو جانے کے ہیں۔ یعنی تفرق کے۔ سورۂ جمعہ میں ہے فَاِذَا قُضِیَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا۔ یعنی تفرقوا۔

اشتات وانتشار سے مقصود وہ حالت ہے جب اجتماع و ائتلاف کی جگہ الگ الگ ہو جانے

منتشر و پراگندہ ہونے اور باہمدگر علیحدگی و بیگانگی کی حالت طاری ہو جائے۔ مواد میں، قویٰ میں، اعمال میں، افراد میں، ہر بات میں پہلی حالت سے بالکل متضاد حالت پیدا ہو جائے۔ یہ حالت جب مادہ پر طاری ہوتی ہے تو "تکوین" کی جگہ "فساد" اور "وجود" کی جگہ "عدم و فنا" کا اس پر اطلاق ہوتا ہے۔ جسم پر طاری ہوتی ہے تو اس کا نام پہلے "بیماری" اور پھر "موت" ہے۔ اعمال پر طاری ہوتی ہے تو اس کو قرآن حکیم اپنی اصطلاح میں "عمل سوء" اور "خسران" سے تعبیر کرتا ہے۔ اور پھر یہی چیز ہے کہ جب قوموں اور امتوں کی اجتماعی زندگی پر طاری ہوتی ہے تو دنیا دیکھتی ہے کہ اقبال کی جگہ ادبار، عروج کی جگہ تنزل، ترقی کی جگہ تنزل، عظمت کی جگہ ذلت، حکومت کی جگہ محکومی اور بالآخر زندگی کی جگہ موت اس پر چھا گئی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے جابجا "اجتماع و ائتلاف" کو قومی زندگی کی سب سے بڑی بنیاد اور اس لیے انسان کے لیے اللہ کی جانب سے سب سے بڑی رحمت و نعمت قرار دیا ہے اور اس کو "اعتصام بحبل اللہ" اور اسی طرح کی تعبیرات عظیمہ سے موسوم کیا ہے۔ مسلمانوں کے اولین مادۂ تکوین امت یعنی اہل عرب کو مخاطب کرکے اور پھر تمام عرب و عجم سے فرمایا:-

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا۔ (۳:۱۰۲)

سب مل جل کر اور پوری طرح اکٹھے ہو کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو سب اسی ایک حبل اللہ سے وابستہ ہوں۔ اللہ کا یہ احسان یاد کرو کہ کیسی عظیم الشان نعمت ہے جس سے تم سرفراز کیے گئے؟ تمہارا حال یہ تھا کہ بالکل بکھرے ہوئے اور ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ اللہ نے تم سب کو باہم ملا دیا اور اکٹھا کر دیا پہلے ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اب بھائی بھائی ہو گئے۔

اس کے بعد فرمایا کہ اشتات و انتشار کی زندگی کو بقا و قیام نہیں ہو سکتا۔ وہ ہلاکی کی ایک آگ ہے

جس کے دھکتے ہوئے شعلوں کے اوپر کبھی قومی زندگی نشو و نما نہیں پا سکتی۔

وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ۔ (۳: ۱۰۲) اور تمہارا حال یہ تھا کہ آگ کے دھکتے ہوئے گڑھے کے کنارے کھڑے تھے پھر اللہ نے تمہیں بچا لیا۔ اللہ اپنے فضل و رحمت کی نشانیاں اسی طرح کھولتا ہے تاکہ کامیابی کی راہ پا لو۔

یہ بھی جا بجا تبلا دیا کہ قوموں اور ملکوں میں اس اجتماع و ائتلاف کی صالح و حقیقی زندگی پیدا کر دینا محض انسانی تدبیر سے ممکن نہیں دنیا میں کوئی انسانی تدبیر امت پیدا نہیں کر سکتی۔ یہ کام صرف اللہ ہی کی توفیق و رحمت اور اس کی وحی و تنزیل کا ہے کہ بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو جوڑ کر ایک بنا دے۔

وَلَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّا اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ۔ (۸: ۶۹) اگر تم زمین کا سارا خزانہ بھی خرچ کر ڈالتے جب بھی ان بکھرے ہوئے دلوں کو محبت و اتحاد کے ساتھ جوڑ نہیں سکتے تھے یہ اللہ ہی کا فضل ہے جس نے متفرق دلوں کو اکٹھا کر دیا۔

اور اسی لیے قرآن حکیم ظہور شریعت و نزول وحی کا پہلا نتیجہ یہ قرار دیتا ہے کہ اجتماع و ائتلاف پیدا ہو، اور بار بار کہتا ہے کہ تفرقہ و انتشار شریعت و وحی کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔ اور اسی لیے نتیجہ شریعت سے بغی و عدوان اور اس کو بالکل ترک کر دینے کا ہے فَمَا اخْتَلَفُوْا حَتّٰى جَآءَهُمُ الْعِلْمُ (۱۳: ۹۳)۔ وَاٰتَيْنٰهُمْ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَمَا اخْتَلَفُوْا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ (۴۵: ۱۶) وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ (۲: ۱۰۴)

اور اسی بنا پر شارع نے اسلام اور اسلامی زندگی کا دوسرا نام "جماعت" رکھا ہے اور جماعت سے علیحدگی کو "جاہلیت" اور "حیاۃ جاہلی" سے تعبیر کیا ہے، جیسا کہ آگے بالتفصیل آئے گا: من فارق

الجماعۃ فمات، میتۃ جاھلیۃ[1]۔ وغیر ذالک۔ اور اسی بنا پر بکثرت وہ احادیث و آثار موجود ہیں جن میں نہایت شدت کے ساتھ ہر مسلمان کو ہر حال میں التزام جماعت اور اطاعت امیر کا حکم دیا گیا، اگرچہ امیر غیر مستحق ہو، نا اہل ہو، ظالم ہو، کوئی ہو، بشرطیکہ مسلمان ہو، اور نماز قائم رکھے (ما اقاموا الصلوٰۃ)۔ اور ساتھ ہی بتلا دیا گیا کہ جس شخص نے علیحدگی کی راہ اختیار کی تو اس نے اپنے تئیں شیطان کے حوالہ کر دیا یعنی گمراہی اور ٹھوکر اس کے لیے ضروری ہے۔ زنجیر کا توڑنا مشکل ہوتا ہے، لیکن کوئی کڑی زنجیر سے الگ ہو گئی ہو تو ایک چھوٹے سے بچے کا حکم رکھتی ہے جس کو انگوٹھے سے ٹال دیا جا سکتا ہے۔ حضرت عمر اپنے خطبوں میں بار بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے علیکم بالجماعۃ فان الشیطان مع الفذ وھو من الاثنین ابعد۔ دوسری روایت میں ہے فان الشیطان مع الواحد۔ یعنی جماعت سے الگ نہ ہو۔ ہمیشہ جماعت بن کر رہو۔ کیونکہ جب کوئی تنہا اور الگ ہوا تو شیطان اس کا ساتھی ہو گیا۔ دو انسان بھی مل کر رہیں تو شیطان ان سے دور ہے یعنی اتحادی و جماعتی قوت ان میں پیدا ہو گئی اب وہ راہ حق سے نہیں بھٹک سکتے یہ الفاظ مشہور خطبۂ جابیہ کے ہیں جو عبد اللہ بن دینار، عامر بن سعد، سلیمان بن یسار وغیرہم سے مروی ہے اور بیہقی نے امام شافعی کے طریق سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے اجماع کے اثبات میں اسی روایت سے استدلال کیا۔ اسی طرح حدیث متواتر بالمعنی "علیکم بالسواد الاعظم"[2] اور "فانہ من شذ شذ فی النار"[3] اور "ید اللہ علی الجماعۃ"[4] اور "لا یجمع اللہ امتی علی الضلالۃ"[5] او کما قال۔ اور خطبۂ حضرت امیر کرم اللہ وجہہ "ایاکم والتفرقہ

---

[1] جو شخص جماعت سے علیحدہ ہو گیا اور اسی حال میں مر گیا تو اس کی موت جاہلیت کی موت ہے۔
[2] تم پر لازم ہے کہ قوم کے سواد اعظم کا ساتھ دو۔
[3] جو جماعت سے چھٹ کر الگ ہو گیا اس نے دوزخ کی راہ لی۔
[4] اللہ کا ہاتھ جماعت پر ہے۔
[5] اللہ میری امت کو گمراہی پر جمع نہیں کرے گا۔

فان الشاذ من الناس للشیطان کما ان الشاذ من الغنم للذئب۔ الا من دعا الیٰ ھٰذا الشعار فاقتلوہ ولو کان تحت عمامتی ھٰذہٖ، وغیر ذالک احادیث میں معلوم و مشہور ہیں۔ آخری قول دیگر روایات میں بطریق مرفوع بھی منقول ہے۔ خلاصہ ان سب کا یہ ہے کہ ہمیشہ جماعت کے ساتھ رہو۔ جو جماعت سے الگ ہوا اس کا ٹھکانا دوزخ ہے۔ افراد تباہ ہوسکتے ہیں مگر ایک صالح جماعت کبھی تباہ نہیں ہوسکتی اس پر اللہ کا ہاتھ ہے۔ اللہ کبھی ایسا نہ ہونے دیگا کہ پوری امت گمراہی پر جمع ہوجائے۔

اسی طرح نماز کی جماعت کی نسبت ہر حال میں التزام پر زور دینا اور اگرچہ امام نا اہل ہو لیکن پھر بھی قیام اہل کے ساتھ التزام جماعت کو بھی جاری رکھنا، حتیٰ کہ صلوا خلف کل بر و فاجر[2] تو اس میں بھی یہی حقیقت مضمر ہے کہ زندگی جماعتی زندگی ہے۔ انفراد و فرقت ہر حال میں بربادی و ہلاکت ہے۔ پس جماعت سے ہر حال میں باہر نہ ہونا چاہیے۔

اور یہی سبب ہے کہ سورہ فاتحہ میں جو قومی دعا مسلمانوں کو سکھائی گئی، اس میں متکلم واحد نہیں ہے بلکہ جمع، حالانکہ وہ دعا فرداً فرداً ہر مومن کی زبان سے نکلنے والی تھی۔ اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ فرمایا، اھدنی نہیں کہا گیا۔ یہ اسی لیے ہے کہ قرآن کے نزدیک فرد اور فرد کی ہستی کوئی شے نہیں ہے ہستی صرف اجتماع اور جماعت کی ہے اور فرد کا وجود اور اعمال بھی صرف اسی لیے ہیں تاکہ ان کے اجتماع و تالیف سے ہیئت اجتماعیہ پیدا ہو۔ اسی لیے اس دعا میں کہ حاصل ایمان و خلاصۂ قرآن و عصارۂ اسلام ہے، متکلم جمع کا صیغہ آیا نہ کہ واحد کا۔ اور اسی لیے مسلمانوں کی باہمی ملاقات کے وقت

[1] خبردار پراگندہ و متفرق نہ ہوجانا۔ اس لیے کہ جماعت سے الگ اکیلا انسان شیطان کا حصہ ہے جس طرح ریوڑ سے الگ اکیلی بکری بھیڑیے کا حصہ ہے۔ جو شخص اس شعار کی دعوت دے اس کو قتل کردو خواہ وہ میرے اس عمامہ کے نیچے ہی کیوں نہ ہو

[2] ہر نیک اور بد کے پیچھے نماز پڑھ لو۔

جو امتیازی دعا سکھلائی گئی، وہ بھی بصیغۂ جمع آئی، اگرچہ مخاطب واحد ہو یعنی "السلام علیکم"، السلام علیک نہیں قرار دیا گیا۔ اسی طرح نماز سے باہر آنے کے لیے بھی السلام علیکم بصیغۂ جمع رکھا گیا واحد کا صیغہ استعمال نہیں کیا گیا۔ ملت اس کی یہی ہے، نہ وہ جو لوگوں نے سمجھی۔

اور اسی بنا پر احکام و اعمال شریعت کے ہر گوشہ اور ہر شاخ میں بھی اجتماعی و ائتلافی حقیقت بطور اصل و اساس کے نظر آتی ہے۔ نماز کی جماعت خمسہ اور جمعہ و عیدین کا حال ظاہر ہے حج بجز اجتماع کے اور کچھ نہیں۔ زکوٰۃ کی بنیاد ہی اجتماعی زندگی کا قیام اور ہر فرد کے مال و اندوختہ میں جماعت کا ایک حصہ قرار دینا ہے علاوہ بریں اس کی ادائیگی کا قیام بھی انفرادی حیثیت سے نہیں رکھا گیا بلکہ جماعتی حیثیت سے یعنی ہر فرد کو اپنی زکوٰۃ خود خرچ کر دینے کا اختیار نہیں دیا گیا جیسا کہ بدقسمتی سے آج مسلمان کر رہے ہیں اور جو صریح غیر شرعی طریقہ ہے، بلکہ مصارف زکوٰۃ متعین کرکے حکم دیا گیا کہ ہر شخص اپنی زکوٰۃ کی رقم امام و خلیفۂ وقت کے سپرد کر دے۔ پس اس کے خرچ کی بھی اصلی صورت جماعتی ہے نہ کہ انفرادی۔ یہ امام کا کام ہے کہ اس کا مصرف تجویز کرے اور مصارف منصوصہ میں سے جو مصرف زیادہ ضروری ہو اسی کو ترجیح دے۔ ہندوستان میں اگر امام کا وجود ضروری نہ تھا تو جس طرح جمعہ و عیدین وغیرہ کا انتظام عذر کی بنا پر کیا گیا، زکوٰۃ کا بھی کرنا تھا۔

اور پھر یہ حقیقت کس قدر واضح ہو جاتی ہے جب ان تمام مشہور احادیث پر غور کیا جائے جن میں مسلمانوں کی متحدہ قومیت[۱] کی تصویر کھینچی گئی ہے، مثل المومنین فی توادھم و تعاطفھم

[۱] مسلمانوں کی یہی متحدہ قومیت ہے جس کی جڑیں آج کاٹی جا رہی ہیں مسلمانوں سے کہا جا رہا ہے کہ "مسلم قوم کا تخیل تو صرف چند لوگوں کی من گھڑت اور محض پرواز خیال ہے۔ اگر اخبارات اس کی اس قدر اشاعت نہ کرتے تو بہت تھوڑے لوگ اس سے واقف ہوتے" (ملاحظہ ہو پنڈت جواہر لال نہرو کی خود نوشت سوانح حیات۔ ترجمہ اردو۔ جلد دوم ۳۳۲) ان کو یقین دلایا جا رہا ہے کہ تمہاری کوئی مستقل تہذیب ہی نہیں ہے۔ بعض ڈاڑھی اور پیجامہ اور رومی دار لوٹا تمہاری تہذیب کی ایک سطحی علامت ہے اور یہ امتیاز بھی اب مٹنے کو ہے۔ (ملاحظہ ہو کتاب مذکور ص ۳۳۵) یہ صرف ایک

ملاحظہ ہو صفحہ ۳۰۵

کمثل الجسد الواحد اذا اشتکیٰ منہ عضو تداعیٰ لہ سائر الجسد بالسھر والحمیٰ (صحیحین) اور المسلم للمسلم کالبنیان یشد بعضہ بعضاً (بخاری) یعنی مسلمانوں کی قومیت ایسی ہے جیسی ایک جسم اور اس کے مختلف اعضا۔ ایک عضو میں درد ہو تو سارا جسم محسوس کرتا ہے۔ اور اس کی بے چینی اور تکلیف میں اسی طرح حصہ لیتا ہے جیسے خود اس کے اندر درد اٹھ رہا ہو۔ اور ان کی مثال دیوار کی سی ہے۔ ہر اینٹ دوسری اینٹ سے سہارا پاتی ہے اور سہارا دیتی ہے۔ پھر تشبیک اصابع کرکے اس کی تصویر بتا دی، یعنی ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں رکھ کر دکھلا دیا کہ اس طرح ایک دوسرے سے جڑا ہوا اور متصل۔ سو ان تمام تصریحات میں بھی اسی حقیقت کو واضح کیا ہے کہ اسلام کی قومیت متفرق اینٹوں کا نام نہیں ہے۔ دیوار کا نام ہے۔ الگ الگ اینٹ کا کوئی مستقل وجود نہیں۔ ہے تو اجتماعی وجود ہے یعنی دیوار کا ایک جز ہے اور انہی اجزاء کے ملنے سے دیوار مکمل ہوتی ہے[1]

اور یاد رہے کہ یہ جو نماز میں تسویۂ صفوف پر سخت زور دیا گیا، یعنی صف بندی پر، اور سب

تحمدہٗ کے فرد کے خیالات نہیں ہیں بلکہ ایک پوری جماعت مسلمانوں کے دماغوں سے متحدہ اسلامی قومیت کا تخیل نکال دینے کے لیے باقاعدہ تبلیغ کر رہی ہے اور خود مسلمانوں کے بعض افراد سے یہ کام لیا جا رہا ہے (ملاحظہ ہو اکثر انتشر کے وہ مضامین جو اسلامی اخبارات میں دھڑلے کے ساتھ شائع ہو رہے ہیں) اور حیرت یہ ہے کہ جو لوگ ہماری متحدہ قومیت کے سب سے بڑے علمبردار تھے وہ آج اسی جماعت کے شریک کار ہیں جو اس قومیت کو جڑ بنیاد سے اکھاڑ پھینکنا چاہتی ہے ان کی آنکھوں کے سامنے یہ استیصال کا عمل ہو رہا ہے اور وہ خاموش ہیں، صرف خاموش ہی نہیں بلکہ اپنی شرکت سے اس عمل کی توثیق کر رہے ہیں، صرف توثیق پر بھی اکتفا نہیں کرتے بلکہ مسلمانوں کو دعوت دے رہے ہیں کہ فرد فرد بن کر اسی جماعت میں شامل ہو جائیں جو ایک ہاتھ سے برطانوی امپیریلزم پر حملہ کرتی ہے تو اس کے ساتھ ہی ساتھ دوسرے ہاتھ سے اسلامی قومیت کی جڑوں پر بھی کلہاڑی مارتی ہے۔ کاش اب بھی ہمیں بتایا جاتا کہ کتاب اللہ وسنت رسول اللہ میں اس طرز عمل کے لیے کونسی سند ہے۔ ترجمان القرآن

[1] عمارت اسلامی کی یہ اینٹیں اس وقت متفرق ہیں۔ ایک جماعت چاہتی ہے کہ ان اینٹوں کو غیر مسلم اینٹوں کے

کے سروں، سینوں اور پاؤں کے ایک سیدھ میں ہونے پر لتسون صفو فکم او لیخالفن اللہ بین وجوھکم (بخاری) اور روایت انس کہ سووا صفوفکم فان تسویۃ الصفوف من اقامۃ الصلوٰۃ (بخاری) و فی لفظ تمام الصلوٰۃ، تو اس میں بھی یہی بھید ہے اور تشریح کا یہ موقع نہیں۔
(مسئلہ خلافت و جزیرۃ العرب طبع ثانی ص ۱۴۱)

---

مرکزیت اور التزام جماعت کائنات کے ہر حصہ اور ہر گوشہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ کی قدرت و سنت ایک خاص نظام پر کار فرما ہے جس کو "قانون مرکز" یا "قانون دوائر" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ یعنی قدرت نے خلقت و نظام خلقت کے بقا و قیام کے لیے ہر جگہ اور ہر شاخ وجود میں یہ صورت اختیار کر رکھی ہے کہ کوئی ایک وجود تو بمنزلہ مرکز کے ہوتا ہے، اور بقیہ اجسام ایک دائرہ کی شکل میں اس کے چاروں طرف وجود پاتے ہیں اور پورے دائرہ کی زندگی اور بقا صرف اسی مرکزی وجود کی زندگی اور بقا پر موقوف ہوتی ہے۔ اگر ایک چشم زدن کے لیے بھی دائرے کے اجسام اپنے مرکز سے الگ ہو جائیں یا مرکز کی اطاعت و انقیاد سے باہر ہو جائیں تو معاً نظام ہستی درہم برہم ہو جائے اور دائرے کی اکسی ہستیاں مرکز سے الگ رہ کر کبھی قائم و باقی نہ رہ سکیں یہی وہ حقیقت ہے جس کو بعض اصحاب اشارات نے یوں تعبیر کیا کہ الحقیقۃ کالکرۃ اور صاحب فتوحات نے کہا کہ "دائرہ قاب قوسین" ہے۔

یہ قانون مرکزیت و دوائر نظام ہستی کے ہر جزو اور ہر حصہ میں صاف صاف دیکھا جا سکتا ہے۔

---

بقیہ حاشیہ ص ۱۲۸ اس کے مقابلہ میں ہم چاہتے ہیں کہ ان اینٹوں کو اسلامی جمعیت کے مسالے سے جوڑ کر ایک دیوار بنا دیا جائے پھر دیوار کی دیوار اپنی اجتماعی ہیئت میں وطنی عمارت کا ایک مستقل جزو بن سکتی ہے سوال یہ ہے کہ ایک مسلمان جو کتاب و سنت کی ان تعریحات اور اس واضح شدہ حقیقت سے واقف ہے، اس کو ان دونوں طریقوں میں کس کا ساتھ دینا چاہیے (ترجمان القرآن)۔

یہ نظام شمسی جو ہمارے اوپر ہے ، ستاروں کی یہ گنجان آبادی کروں کا یہ صحرائے بے کنار ، زندگی اور حرکت کا یہ محیّر العقول طلسم کیا ہے ؟ کس نظام پر یہ پورا کارخانہ چل رہا ہے ؟ اسی قانون مرکزیت پر۔ متحرک ستاروں کے حلقے اور دائرے ہیں ، ہر دائرہ کا نقطۂ حیات و بقا سورج کا مرکزی نقطہ ہے تمام ستارے اپنے اپنے کعبۂ مرکز کا طواف کر رہے ہیں ، اور ہر دائرہ کی ساری زندگی اور بقا صرف مرکز شمسی کی اطاعت و انقیاد پر موقوف ہے : ذٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ۔ خود ہماری زمین بھی ایک ایسے ہی دائرے کی ایک کڑی ہے اور شب و روز اپنے مرکز کے طواف و انقیاد میں مشغول ہے ہر ستارے کے طواف و دوران کے لیے حکمت الٰہی نے ایک خاص راہ اور ایک خاص زمانہ قرار دے دیا ہے وہ اس سے باہر نہیں جا سکتا سب کا حکم : وَلَهُ أَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُومُ (۲۲ : ۱۹) خدا کے بنائے ہوئے قانون کے مطابق اپنی اپنی جگہوں میں کام کر رہے ہیں ۔ لَا الشَّمْسُ يَنْبَغِي لَهَا أَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا اللَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ (۳۶ : ۴۱) ۔

قانون مرکزیت کا یہ پہلا اور بلند ترین نظارہ تھا ۔ اب اس کے بعد جس قدر نیچے اترتے آؤ گے اور حرکت و حیات کی بلندیوں سے لیکر زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے گوشوں تک نظر ڈالیں گے ہر جگہ زندگی اور بقا اسی قانون سے وابستہ نظر آئے گی ۔ عالم نباتات میں درخت کو دیکھو ۔ اس کی مجموعی حد کتنی وسیع کثرت سے مرکب ہے ؟ ڈالیاں ہیں ۔ شاخیں ہیں ، پتے ہیں ، پھول ہیں لیکن سب کی زندگی ایک ہی مرکز یعنی جڑ سے وابستہ ہے ۔ جڑ سے جہاں کوئی شاخ الگ ہوئی موت و فنا اس پر طاری ہو گئی آفاق کو چھوڑ کر عالم انفس کی طرف آؤ ۔ خود اپنے وجود کو دیکھو جسے دیکھنے کے لیے نظر اٹھانے کی بھی ضرورت نہیں ۔ تمہارا وجود کتنے مختلف ظاہری و باطنی اعضا سے مرکب ہے ؟ جسموں اور وجودوں کی ایک پوری بستی ہے جو تم میں آباد ہے ۔ ہر جسم کا ایک فعل ہے اور ایک خاصہ لیکن دیکھو ! یہ ساری آبادی کس طرح

ایک ہی مرکز کے آگے سربسجود ہے ؟ سب کی حیات کا مرکز صرف قلب ہے ۔ اس سے الگ رہ کر ایک عضو بھی زندہ نہیں رہ سکتا ۔ اِذَا صَلَحَتْ صَلَحَتِ الْجَسَدُ كُلُّهٗ وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ (بخاری) ۔

اسلام فی الحقیقت سنت اللہ اور فطرۃ اللہ ہی کا دوسرا نام ہے ۔ اگر نوع انسانی کی سعادت وارتقار کے لیے قانون اسلام اسی فاطر السموٰت والارض کا بنایا ہوا ہے جس نے تمام کائنات کیلیے قانون حیات بنایا، تو ضرور ہے کہ دونوں میں اختلاف نہ ہو بلکہ پہلا قانون پچھلے قانونِ عام کا ایک ایسا قدرتی جزو نظر آئے جیسے زنجیر کی ایک کڑی ۔ پس اسلام کا نظام شرعی بھی ٹھیک ٹھیک اسی قانون مرکزیت پر قائم ہوا ۔ قرآن نے یہ حقیقت جا بجا واضح کی ہے کہ جس طرح اجسام و اشیار کی زندگی اپنے اپنے مرکزوں سے وابستہ ہے اسی طرح نوع انسانی اور اس کی جماعت و افراد کا جسمانی و معنوی بقار بھی قانون مرکزیت پر موقوف ہے ۔ جس طرح ستاروں کی زندگی اور حرکت کا مرکز و محور سورج کا وجود ہے، اسی طرح نوع انسانی کا بھی مرکز سعادت انبیار کرام کا وجود ہے ۔ پس ان کی اطاعت و انقیاد بقار وحیات کے لیے ناگزیر ٹھیری ۔ وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (۴ : ۶۸) دنیا میں کوئی نبی نہیں آیا مگر اس لیے کہ اس کی اطاعت کی جائے ۔ اور اسی لیے فرمایا ۔ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا (۴ : ۶۹) اور لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ۔ پھر قوم وملت کے بقار کے لیے ہر طرح کے دائرے اور ہر طرح کے مرکز قرار دیے ۔ اعتقاد میں اصلی مرکز عقیدۂ توحید کو ٹھیرایا جس کے گرد تمام عقائد کا دائرہ قائم ہے ۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ (۴ : ۵۲) ۔ عبادات میں نماز کو مرکز عمل ٹھیرایا جس کے ترک کر دینے کے بعد تمام دائرۂ عمل منہدم ہو جاتا ہے فَمَنْ اَقَامَهَا اَقَامَ الدِّيْنَ

وَمَنْ تَرَکَھَا فَقَدْ ھَدَمَ الدِّیْن ۔ اور اسی لیے یہ بات ہے کہ کَانَ اصحاب رسول اللہ صلعم لایرونَ شیئًا من الاعمال ترکہٗ کفر غیر الصلوٰۃ (ترمذی) یعنی صحابۂ کرام کسی عمل کے ترک کر دینے کو کفر نہیں سمجھتے تھے مگر نماز کے ترک کو۔ اسی طرح تمام قوموں اور ملکوں کا ارضی مرکز سعادت وادی حجاز کا کعبۃ اللہ قرار پایا جَعَلَ اللّٰہُ الْکَعْبَۃَ الْبَیْتَ الْحَرَامَ قِیَامًا لِّلنَّاسِ "قیامًا للناس" پر غور کرو۔ چونکہ یہ مرکز ٹھیرا اس لیے تمام دائرے کا رخ بھی اسی طرف ہو، خواہ دنیا کی کسی جہت میں مسلمان ہوں لیکن ان کا منہ اسی طرف ہونا چاہیے: وَحَیْثُ مَا کُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْھَکُمْ شَطْرَہٗ (۲: ۱۴۵)۔

پھر جس طرح شخصی اور اعتقادی و عملی زندگی کے لیے مرکز قرار پایا، ضرور تھا کہ جماعتی اور ملی زندگی کے لیے بھی ایک مرکزی وجود قرار پاتا، لہٰذا وہ مرکزی وجود بھی قرار دیدیا گیا۔ تمام امت کو اس مرکز کے گرد بطور دائرے کے ٹھیرایا۔ اس کی معیت اس کی رفاقت، اس کی اطاعت، اس کی حرکت پر حرکت اس کے سکون پر سکون، اس کی [illegible] سنت نبوی کی اسلامی زندگی کی روشنی میں نظر آتا تھا اسلام کی اصطلاح میں اسی قومی مرکز کا نام خلیفہ اور امام ہے اور جب تک یہ مرکز اپنی جگہ سے نہیں ہٹتا ہے یعنی کتاب و سنت کے مطابق اس کا حکم ہے، ہر مسلمان پر اس کی اطاعت اسی طرح فرض ہے جس طرح خود اللہ اور اس کے رسول کی:

| | |
|---|---|
| یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ | مسلمانو! اطاعت کرو اللہ کی، اس کے رسول کی اور |
| اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ | تم میں جو اولوالامر ہو اس کی۔ پھر اگر کسی معاملہ |
| فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی | میں تم مختلف ہو جاؤ تو چاہیے کہ اللہ اور اس کے |
| اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ کُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ | رسول کی طرف لوٹو اور اس کے فیصلہ پر متفق ہو جاؤ |

بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ، ذٰلِکَ خَیْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِیْلًا۔ (۴: ۶۳)۔

اس آیت میں بالترتیب تین اطاعتوں کا حکم دیا گیا ہے۔ اللہ کی، رسول کی، مسلمانوں میں جو اولوالامر ہو اس کی۔ اللہ کی اطاعت کتاب اللہ کی اطاعت ہے۔ رسول کی اطاعت سے مقصود سنت قولی و فعلی ہے۔ باقی رہی اطاعت اولوالامر تو نہایت قوی و روشن وجوہ موجود ہیں کہ اولوالامر سے مقصود مسلمانوں کا خلیفہ و امام ہے جو کتاب و سنت کے احکام نافذ کرنے والا نظام امت قائم رکھنے والا اور تمام اجتہادی امور میں صاحب حکم و سلطان ہے[1]

(حوالہ مذکور۔ صفحہ ۱۹ تا ۲۲)

---

**اسلام کا نظام عمل** احادیث صحیحہ سے اس کی مزید توضیح ہوتی ہے اس بارہ میں اس کثرت کے ساتھ حدیثیں موجود ہیں، اور عہد صحابہ سے لے کر عہد تدوین کتب تک مختلف طبقات رواۃ و حفاظ میں اس قدر ان کی شہرت رہ چکی ہے کہ اسلام کے عقیدۂ توحید و رسالت کے بعد شاید ہی کوئی اور چیز اس درجۂ تواتر و یقین تک پہنچی ہوگی۔

سب سے پہلے میں مسند امام احمد وغیرہ کی ایک روایت نقل کردوں گا جس میں بالترتیب اسلام کا نظام عمل بیان کیا گیا ہے۔

---

[1] مولانا نے اس باب میں جس چیز کو بیان فرمایا ہے وہ ان کی ذاتی رائے نہیں ہے بلکہ فطرۃ اللہ اور سنت الٰہی ہے۔ ذاتی رائے ضرور بدل سکتی ہے، مگر سنت اللہ اور وہ فطرت جس پر اللہ نے نظام کائنات اور نظام اسلامی کی بنیاد رکھی ہے ایک محکم چیز ہے جس میں تبدیل و تحویل کسی طرح ممکن نہیں۔ فَلَن تَجِدَ لِسُنَّتِ اللَّهِ تَبْدِيلًا وَلَن تَجِدَ لِسُنَّتِ اللَّهِ تَحْوِيلًا۔ اس اٹل قانون کی رو سے امت مسلمہ کے لیے موت کی طرف پہلا قدم یہ ہے کہ ان میں لامرکزیت پیدا ہو اور اس نظام شمسی کے تمام تارے بکھر جائیں۔ اور آخری قدم یہ ہے کہ وہ اسلامی نظام شمسی کے بجائے کسی اور نظام شمسی سے وابستہ ہو جائیں کسی اور مرکز کے گرد گھومنے لگیں۔ پہلے مرحلہ میں ہندوستان کی امت مسلمہ اس وقت ہے، اور دوسرے مرحلے کی طرف اب اس کو بلایا جا رہا ہے جس کے انجام سے وہ لوگ ناواقف نہیں ہو سکتے جو اس قانون فطرت سے واقف ہیں، فَأَنَّىٰ تُؤْفَكُونَ۔ ترجمان القرآن

| | |
|---|---|
| قال صلی اللہ علیہ وسلم انا آمرکم بخمس اللہ امرنی بھن: الجماعۃ والسمع والطاعۃ والھجرۃ والجہاد فی سبیل اللہ۔ فانہ من خرج من الجماعۃ قید شبر فقد خلع ربقۃ الاسلام من عنقہ الا ان یراجع، ومن دعا بدعوی جاھلیۃ فھو من جثی جھنم۔ قالوا یارسول اللہ وان صام وان صلّی قال وان صلّی وصام وزعم انہ مسلم (اخرجہ احمد والحاکم من حدیث الحارث الاشعری علی شرط الصحیحین قال ابن کثیر ھذا حدیث حسن ولہ شواھد)۔ | یعنی فرمایا میں تم کو پانچ باتوں کے لیے حکم دیتا ہوں جن کا حکم اللہ نے مجھے دیا ہے۔ جماعت، سمع، طاعت، ہجرت اور اللہ کی راہ میں جہاد یقین کرو کہ جو مسلمان جماعت سے ایک بالشت بھر بھی باہر ہوا تو اس نے اسلام کا حلقہ اپنی گردن سے نکال دیا اور جس نے اسلام کی جماعتی زندگی کی جگہ جاہلیت کی بےقیدی کی طرف بلایا تو اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔ لوگوں نے عرض کیا ایسا شخص جہنمی ہوگا اگرچہ روزہ رکھتا ہو اور نماز پڑھتا ہو؟ فرمایا ہاں اگرچہ نماز پڑھتا ہو، روزہ رکھتا ہو اور اپنے زعم میں اپنے تئیں مسلمان سمجھتا ہو۔ |

شرح حدیث حارث اشعری | اس حدیث میں پانچ باتیں تبلائی گئی ہیں۔

(۱) پہلی چیز "جماعت" ہے، یعنی تمام امت کو ایک خلیفہ و امام پر جمع ہو کر اور اپنے مرکز قومی سے جڑ کے رہنا چاہیے۔ الگ الگ نہیں رہنا چاہیے۔ آگے چلکر کثرت کے ساتھ وہ حدیثیں ملیں گی جن سے معلوم ہوگا کہ جماعت سے الگ ہو کر رہنے کو یا ایسی منتشر زندگی کو جو ایک بندھی سمٹی ہوئی جماعت کی شکل نہ رکھتی ہو اور کسی امیر کے تابع نہ ہو، اسلام نے غیر اسلامی اور ابلیسی راہ قرار دیا ہے، انفرادی زندگی کو وہ زندگی ہی نہیں مانتا۔ اسلامی زندگی "جماعت" ہے۔

"جماعت" سے مقصود افراد کا ایک ایسا مجموعہ ہے جس میں اتحاد، ائتلاف، امتزاج اور نظم ہو۔
اتحاد سے مقصود یہ ہے کہ اپنے اعمالِ حیات میں منتشر نہ ہوں۔ ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہوں اور ان کے تمام اعمال مل جل کر انجام پائیں۔ کسی گوشۂ عمل میں بھی پھوٹ اور بیگانگی نہ ہو۔

"ائتلاف کا مرتبہ "اتحاد" سے بلند تر ہے۔ اتحاد صرف باہم مل جانا ہے۔ ضروری نہیں کہ کسی تناسب کے ساتھ ترکیب ہوئی ہو۔ لیکن ائتلاف سے مقصود ایسا اتحاد ہے جو محض اتحادی نہ ہو بلکہ ایک صحیح و مناسب ترکیب کے ساتھ اتحاد ہو۔ یعنی منتشر افراد اس طرح باہم ملے ہوں کہ جس فرد کو اس کی صلاحیت و قوت کے مطابق جو جگہ ملنی چاہیے وہی اس کی جگہ ہو.......

"امتزاج" ترکیب کا تیسرا مرتبہ ہے۔ اس میں کمیت سے زیادہ کیفیت کا اتحاد ہونا چاہیے یعنی مختلف افراد کو باہم اس طرح ملایا جائے کہ جس فرد کا اجتماعی مزاج جس قسم کے مزاج کے ساتھ مل کر ایک متحدہ کیفیت حاصل کر سکتا ہے ویسا ہی مزاج اس کے ساتھ ملایا جائے...... فرد بجائے خود کوئی کامل وجود نہیں رکھتا۔ محض ایک شئی ہے، اور جب تک اپنے بقیہ ٹکڑوں سے نہ مل جائے، کامل وجود نہیں پا سکتا۔ لیکن یہ باہم ملنا "امتزاج" کے ساتھ ہونا چاہیے تاکہ ہر ٹکڑا اپنے صحیح و مناسب ٹکڑے کے ساتھ مل کر اس طرح جڑ جائے کہ معلوم ہو یہ نگینہ اسی انگشتری کے لئے تھا۔

"نظم" سے مقصود جماعت کی وہ ترتیبی و تقویمی حالت ہے جب اس کے تمام افراد اپنی اپنی جگہوں میں قائم، اپنے اپنے دائرہ میں محدود، اور اپنے اپنے فرائض و اعمال کے انجام دینے میں سرگرم ہوں۔

اجتماع کے یہ خواص و اوصاف نہ تو حاصل ہو سکتے ہیں، نہ قائم رہ سکتے ہیں، جب تک کوئی فعال و مدبر طاقت وجود میں نہ آئے۔ اور وہ منتشر افراد کو ایک مقتدر، موتلف، ممزوج اور منظم جماعت کی شکل میں قائم نہ رکھے۔ پس ایک "امام" کا وجود ناگزیر ہوا، اور اسی لیے ضروری ہوا

کہ سب سے پہلے تمام افراد ایک ایسے وجود کو اپنا امام و مطاع تسلیم کرلیں جو بکھرے ہوئے اجزاء کو اتحاد و ائتلاف اور امتزاج و نظم کے ساتھ جوڑ دینے اور اٹھتے ہوئے ذروں سے ایک حی و قائم مجتمعی وجود پیدا کر دینے کی قابلیت رکھتا ہو...... مسلمانوں کے کسی چھوٹے سے چھوٹے گروہ کے لیے بھی شرعاً جائز نہیں کہ بلا قیام امام کے زندگی بسر کریں۔ حتیٰ کہ اگر صرف تین مسلمان بھی ہوں تو چاہیے کہ ایک ان میں سے امام تسلیم کر لیا جائے۔ اذا کان ثلثة فی سفر فلیؤمروا احدھم.....

(۲) دوسری چیز "السمع" ہے یعنی امام جو احکام دے، اس کو سننا اور اس سے تعلیم و ارشاد حاصل کرنا۔ سمع کے لفظ میں قبولیت احکام اور طلب تعلیم دونوں کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اور امام کی معلمانہ حیثیت کو نمایاں کیا ہے۔

(۳) تیسری چیز "طاعت" ہے یعنی امام کی کامل درجہ اطاعت و فرمانبرداری اور اپنی تمام عملی قوتوں کو اس کے سپرد کر دینا اور اس کے ہر حکم کی بلا چون و چرا تعمیل کرنا۔ البتہ اطاعت معروف میں ہے نہ کہ معصیت میں کہ انما الطاعة فی المعروف۔

(۴) چوتھی بات "ہجرت" ہے۔ ہجرت "ہجر" سے ہے جس کے معنی ترک کر دینے کے ہیں۔ الھجر والھجران مفارقة الانسان غیرہ اما بالبدن او باللسان او بالقلب۔ المھاجرة مصارمة الغیر ومتارکته (مفردات امام راغب: ۵۵۸)۔ اسلام کی اصطلاح میں جب کبھی کوئی فرد یا جماعت، سعادت و صداقت کے کسی مقصد اعلیٰ کے لیے اپنے دنیوی محبوبات و مالوفات ترک کر دے، مثلاً دولت کو، آرام و راحت کو، عزیز و اقارب کے قرب کو، وطن و مکان کو، تو اس کا نام ہجرت الی اللہ اور ذہاب الی اللہ ہے۔ خدا کے ہر رسول اور اس کے پیروؤں کو قیام حق کی راہ میں یہ منزل طے کرنی پڑی۔ اِنِّیْ مُهَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیْ اور اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ.....

(۵) پانچویں چیز "جہاد فی سبیل اللہ" ہے۔ جہاد "جہد" سے ہے جس کے معنی ہیں استفراغ الوسع

فی مدافعۃ العدو ظاھرًا وباطنًا (مفردات) یعنی دشمن اور دشمن کی تمام قوتوں کو دور کرنے اور اپنے کو قائم و باقی رکھنے کے لیے انتہا درجہ کی کوشش کرنا۔ یہ کوشش زبان سے بھی ہوتی ہے، مال سے بھی ہوتی ہے، جان سے بھی ہوتی ہے۔ جس قسم کی کوشش کی ضرورت ہو، ہر قسم جہاد فی سبیل اللہ میں داخل ہے۔ وجاھدوا المشرکین باموالکم وانفسکم والسنتکم (رواہ ابوداود واحمد ونسائی وابن حبان عن انس)۔

یہ کہنا ضروری نہیں کہ یہی پانچ چیزیں دنیا میں قوموں اور ملکوں کے بقاء و قیام کی اصلی بنیادیں ہیں۔ دنیا میں کوئی قوم زندہ نہیں رہ سکتی جس کی قومی ہستی ان پانچ عنصروں سے مرکب نہو۔ سعی و عمل کا کوئی گوشہ ہو، کامیابی بغیر ان اصول خمسہ کے نہیں رہ سکتی۔ تم مشرق سے مغرب تک اور قطب شمالی سے جنوبی کی تحقیق کرو، مگر کوئی چیز بھی بغیر "جماعت"، "اطاعت"، "ہجرت"، اور "جہاد" کے حاصل نہیں ہو سکے گی۔ دنیا نے آج تک جو کچھ پایا ہے، غور کروگے تو وہ سب انہی پانچ سچائیوں کے ثمرات و نتائج ہیں ........ دنیا کی کوئی صالح جماعت ایسی نہیں ہے جس نے ان سے الگ رہ کر کامیابی حاصل کی ہو۔ ہر عقل نے ان کا اقرار کیا ہے، ہر دل میں ان کا اعتقاد موجود ہے، اور عالم جماعت شب و روز ان پر عمل کر رہی ہے۔ البتہ ناموں کے اختلاف نے ساری الجھن ڈال دی ہے۔ اسلام نے جن ناموں سے ان کو تعبیر کیا ہے ان سے دنیا کو اختلاف ہے، لیکن اسلام جن حقیقتوں کو پیش کرتا ہے، ان سے دنیا اختلاف نہیں کر سکتی۔ اگر کرے تو زندگی اور مرادوں سے محروم ہو جائے۔

اس نظام میں پہلی چیز جماعت ہے جس کی مختصر تشریح اوپر گذر چکی۔ غور کرو، دنیا کا کونسا کام ایسا ہے جس کو بلا اجتماع و جماعت کے انجام دیا جا سکتا ہے۔ جماعت کی زیادہ دقیق اور فلسفیانہ تعریف چھوڑ دو، صاف اور سیدھے سادھے معنی جو ہو سکتے ہیں۔ صرف انہی پر غور کرلو۔ سوسائٹی، پارٹی، کمیٹی، کلب، انجمن، کانفرنس، پارلیمنٹ، ملکہ قوم، ملک، فوج، ان سب سے مقصود کیا ہے؟ یہی کہ

جماعت" اور "التزام جماعت"۔ وحشی قوموں تک کو دیکھتے ہو کہ جنگل کے درختوں کے نیچے اکٹھے ہو جاتے ہیں، اور مل جل کر اپنے معاملات کا فیصلہ کرتے ہیں۔ پھر جماعت بے سود ہے اگر اس کا نظام نہ ہو اور کوئی سردار اور رہنما نہ ہو۔ تم پانچ آدمیوں کی بھی کوئی مجلس منعقد کرتے ہو، تو سب سے پہلے ایک پریسیڈنٹ کا انتخاب کرتے ہو اور کہتے ہو کہ جب تک کسی کو صدر مجلس نہ مان لیں گے، یہ پانچ آدمیوں کی مجلس بھی باقاعدہ کام نہ کر سکے گی۔ فوج ترتیب دیتے ہو تو دس آدمیوں کو بھی بغیر ایک افسر کے نہیں چھوڑتے۔ اس کی اطاعت ماتحتوں کے لیے فرض سمجھتے ہو اور یقین کرتے ہو کہ بغیر اس کے فوج کا نظام قائم نہیں رہ سکتا۔ پانچ دس آدمی بھی بغیر امیر کے کام نہیں کر سکتے تو قومیں کیونکر اپنے فرائض بلا امیر کے انجام دے سکتی ہیں؟ ........

"ہجرت" کا لفظ کس قدر تمہارے لیے ناآشنا اور نامانوس ہے؟ تم سمجھتے ہو کہ یہ دنیا کے اس عہد جہل و وحشت کی یادگار ہے جب مذہبی جذبات کی برانگیختگی نے تمدنی احساسات کو معطل کر دیا تھا اور انسان دین پرستی کے جنون میں اپنی عقلی و تمدنی زندگی تک کو قربان کر دیتا تھا۔ لیکن تبلاؤ، اب دنیا کی اعلیٰ سے اعلیٰ علمی و تمدنی ترقیاں بھی تم کو جس راہ کی طرف بلا رہی ہیں وہ ہجرت کی حقیقت سے کب خالی ہیں؟ اور خود علم و تمدن کا تمام ذخیرۂ عروج بھی کس عملی حقیقت کا نتیجہ ہے؟ ہجرت سے مقصود یہ ہے کہ اعلیٰ مقاصد کی راہ میں کمتر فوائد کو قربان کر دینا، اور حصول مقصد کی راہ میں جو چیزیں حائل ہوں، ان سب کو ترک کر دینا۔ خواہ آرام و راحت ہو، مال و دولت ہو، نفسانی خواہشیں ہوں حتیٰ کہ قوم ہو، ملک ہو، وطن ہو، اہل و عیال ہوں، سب کو چھوڑ دینا۔ پھر تبلاؤ، علم و عمل کا کون گوشہ ہے جس میں کامیابی بغیر اس جذبہ کے مل سکتی ہے؟ انسان کے مطلوبات میں سے کوئی چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی ایسی تبلا سکتے ہو جو بلا ہجرت کے مقام سے گذرے اس نے پالی ہو؟ یہ دنیا کی علمی و تمدنی ترقیاں، حیرت انگیز اکتشافات، انقلاب انگیز

ایجادت، دولت کی فراوانی، تجارت کی عالمگیری، نئی نئی آبادیوں کا قیام، طرح طرح کے وسائل معیشت وفلاح کا ظہور، پھر ملکوں کا عروج، قوموں کی بالادستی، تمدن کی وسعت، فی الحقیقت انسان کے کس عمل حق کے نتائج وثمرات ہیں؟ اگر کج نظری چھوڑ دو تو معلوم کر لوگے کہ صرف عمل ہجرت کے..... یہ کیسی عجیب بات ہے کہ اگر صرف قطب شمالی کی تحقیق کے لیے مہاجرین کشف کے ڈیڑھ سو قافلے یکے بعد دیگرے نکلیں اور یکسر قربان و ہلاک ہو جائیں تو تم کہو کہ تحقیق علم کا کمال اور جذبہ نوع پرستی کی انتہا ہے لیکن اگر اسی چیز کو اللہ کی شریعت ایک جامع تر لفظ "ہجرت" سے تعبیر کرے تو تم اس کا انکار کر دو؟ تمہارے نزدیک یہ تو تمدن ہے کہ دریائے نیل کا مخرج دریافت کرنے کے لیے سینکڑوں انسان اپنا گھر بار چھوڑ دیں اور ہلاک ہو جائیں لیکن یہ وحشت ہے کہ قیام حق اور اشاعت صداقت کی راہ میں اللہ کے بندے ترک وطن کریں؟ اگر نیوٹن اپنی راتوں کی نیند اور بستر کی راحت چھوڑ دے تاکہ "کشش ثقل" کا قانون دریافت کرے، تو تم اس کی پرستش کرو اور کہو کہ یہ علم پرستی ہے لیکن اگر تم عزم وطلب کے ایسے ہی پرستار ہو تو اس عازم صادق کے لیے کیا کہتے ہو جو قانون کشش ثقل کے لیے نہیں بلکہ قانون نجات عالم کے لیے اپنا گھر بار چھوڑ دیتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ حق پرستی ہے......

جہاد کے معنی یہ ہیں کہ دفع اعداء میں اپنی جان و مال سے کمال درجہ سعی ومحنت کرنا۔

کیا دنیا میں کوئی قوم، کوئی ملک، کوئی جماعت، کوئی قبیلہ، کوئی خاندان، کوئی گھر، کوئی انسان، بلکہ کوئی وجود اور زندگی بغیر "جہاد" کے زندہ وقائم رہ سکتی ہے؟ کون ہے جو زندہ رہنا چاہتا ہے اور جہاد نہیں کرتا؟ جس چیز کو تم ہزاروں ناموں اور لفظوں میں بولتے ہو اور کارزار ہستی میں بقاء وقیام کی اصلی بنیاد سمجھتے ہو، اسی کو اسلام نے ایک جامع لفظ "جہاد" سے تعبیر کیا ہے اگر تم سے ڈارون اور رسل ویلیس تنازع للبقاء (Struggle for Existence) اور

انتخاب طبیعی Natural selection اور بقاء اصلح Survival of the fittest کا ذکر کرتے ہیں کہ اس کارزار حیات میں بقا صرف اصلح و امثل کے لیے ہے، تو تم پوری طرح کان دھرتے ہو، او فطرت کے قتل کا افسانۂ خونیں تم کو پریشان خاطر نہیں کرتا لیکن اسی حقیقت کو قرآن واسلام زیادہ مکمل شکل میں بیان کرتا ہے وہ کہتا ہے کہ جو قانون الٰہی زمین کے کیڑوں مکوڑوں تک پر نافذ ہے، اس سے جمعیت بشری کیوں کر بری ہو سکتی ہے ؟ پس دنیا میں اسی قوم کو باقی رہنا چاہیے جو حق و ہدایت کے اعتبار سے اصلح ہو۔ غیر اصلح عقائد و اعمال کو مٹ جانا چاہیے اور قانون الٰہی کا ہاتھ ان کو مٹا دینا چاہیے۔ ہدایت یافتہ اقوام کا یہ حق ہے کہ غیر ہدایت یافتہ قوموں پر غالب آئیں لیظھرہٗ عَلَی الدِّین کلہ۔ پھر اس بات پر تم کیوں مضطرب ہوتے ہو ؟ کیوں اس قدرتی قانون ہستی کے ذکر میں تم کو قتل و غارتگری کی دہشت ناکی نظر آتی ہے ؟ یورپ کی قومیں تمام دنیا کو اپنی نو آبادیوں سے بھر دیں اور کہیں کہ افریقہ کے وحشیوں کی جگہ ہم متمدن اقوام زیادہ خدا کی زمین کی حقدار ہیں، اس کو تو تم گوارا کر لو، لیکن اگر اسلام کہے کہ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ وَلِرَسُوْلِهٖ خدا کی زمین حق پرستوں کے لیے ہے، کفر و ضلالت کے پرستاروں کے لیے نہیں ہے، تو تم اس کو وحشت اور خونفشانی کہو ؟

جاہلیت کی زندگی اور اسلام کی زندگی | یہاں ایک اور اہم اور قابل غور امر یہ ہے کہ اس حدیث اور نیز دیگر احادیث میں ہمیشہ جماعت اور اطاعت خلیفہ کی زندگی کو اسلامی زندگی قرار دیا ہے، اور اس کے عکس کو جاہلیت۔ "جاہلیت" کی زندگی میں ہلاکت کا تخم کیا تھا ؟ قرآن نے واضح کیا ہے کہ تفرقہ اور باہم دگر علٰحدگی، اور کسی مرکزی قوت کے ماتحت نہ ہونا۔ اسلام نے ظاہر ہو کر زندگی کی جو تخم ریزی کی وہ کیا تھی ؟ باہمی اتحاد و ائتلاف۔ تمام منتشر افراد کو ایک متحدہ جماعت بنا کر نفس واحدہ کر دیا اور سب کے سر ایک ہی چوکھٹ پر جھکا دیے۔ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ

اَعْدَاءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا۔

پس جاہلیت کا دوسرا نام تفرقہ ہوا اور اسلام کا دوسرا نام جماعت اور التزام جماعت ہی وجہ ہے کہ تمام احادیث میں یہ حقیقت واضح کی گئی اور اعلان کیا گیا کہ جو شخص جماعت اور اطاعت امام سے الگ ہو گیا گویا وہ اسلام سے خارج ہو گیا اسکی موت جاہلیت کی موت ہوگی اگرچہ نماز پڑھتا ہو اور روزہ رکھتا ہو اور اپنے کو مسلمان سمجھتا ہو۔ (حوالہ مذکور۔ صفحہ ۲۹ تا ۴۰)

---

**مسلمانوں کے لیے ایک ہی راہ عمل** مسلمانوں کے لیے راہ عمل ہمیشہ سے ایک ہی رہی ہے اور ہمیشہ کی طرح اب بھی ایک ہی ہے، یعنی ہندوستان کے مسلمان اپنی جماعتی زندگی کی اس معصیت سے باز آجائیں جس میں ایک عرصہ سے مبتلا ہیں اور جس کی وجہ سے فوز و فلاح کے تمام دروازے ان پر بند ہو گئے ہیں۔

"جماعتی زندگی کی معصیت" سے مقصود یہ ہے کہ ان میں "ایک جماعت" بن کر رہنے کا شرعی نظام مفقود ہو گیا ہے۔ وہ بالکل اس گلے کی طرح ہیں جس کا انبوہ جنگل کی جھاڑیوں میں منتشر ہو کر گم ہو گیا ہو۔ وہ بسا اوقات یکجا اکٹھے ہو کر اپنی جماعتی قوت کی نمائش کرنی چاہتے ہیں، کمیٹیاں بناتے ہیں، کانفرنسیں منعقد کرتے ہیں۔ لیکن یہ تمام اجتماعی نمائشیں شریعت میں جماعت کا حکم نہیں رکھتیں بھیڑ اور انبوہ کا حکم رکھتی ہیں "بھیڑ" اور "جماعت" میں فرق ہے۔ پہلی چیز بازاروں میں نظر آجاتی ہے جب کوئی تماشہ ہو رہا ہو۔ دوسری چیز جمعہ کے دن مسجدوں میں دیکھی جا سکتی ہے جب ہزاروں انسانوں کی منظم و مرتب صفیں ایک مقصد، ایک جہت، ایک حالت، اور ایک ہی کے پیچھے مجتمع ہوتی ہیں۔ کوئی قوم اس نظام کو ترک کر دیتی ہے تو گو اس کے افراد فرداً فرداً کتنے ہی شخصی اعمال و طاعات میں سرگرم ہوں، لیکن یہ سرگرمیاں اس بارے میں کچھ سود مند نہیں ہو سکتیں۔ اور قوم جماعتی

معصیت میں مبتلا ہو جاتی ہے۔

قرآن و سنت نے بتلایا ہے کہ شخصی زندگی کے معاصی کسی قوم کو یکایک برباد نہیں کر دیتے اشخاص کی معصیت کا زہر آہستہ آہستہ کام کرتا ہے لیکن جماعتی زندگی کی معصیت کا تخم (یعنی نظام جماعتی کا نہ ہونا) ایسا تخم ہلاکت ہے جو فوراً بربادی کا پھل لاتا ہے اور پوری قوم کی قوم تباہ ہو جاتی ہے۔ شخصی اعمال کی اصلاح و درستگی بھی نظام اجتماعی کے قیام پر موقوف ہے مسلمانان ہند جماعتی زندگی کی معصیت میں مبتلا ہیں اور جب جماعتی معصیت سب پر چھا گئی ہے تو افراد کی اصلاح کیونکر ہو سکتی ہے.........

یہ وقت فصل کاٹنے کا تھا نہ کہ دانہ ڈالنے کا۔ لیکن مسلمانوں نے اپنی جدوجہد کی تمام گذشتہ عمر گم گشتگی و بے حاصلی میں ضائع کر دی، حتیٰ کہ سچ مچ وہ وقت آگیا جس کی تباہیوں کا تخیل پیدا کر کے کبھی ڈرانے والے ڈرایا کرتے تھے فَقَدْ جَاءَ اَشْرَاطُهَا فَاَنّٰى لَهُمْ اِذَا جَآءَتْهُمْ ذِكْرٰىهُمْ (۴۷:۱۸)۔ اب بھی اگر کام ہے تو یہی کام اور غم ہونا چاہیے تو اسی کا سچے کام کرنے میں کتنی ہی دیر ہو جائے مگر جب کبھی کیا جائے سچائی ہے۔ اس کے لیے نہ تو کوئی وقت ناموافق ہے نہ کوئی جگہ مخالف۔ اس کے کرنے میں جس قدر دیر ہو جائے گی، معصیت اور ہلاکی ہے لیکن جب کبھی کر دیا جائے سچائی اور نیکی ہے۔ اور اس کا ثمرہ زندگی اور کامرانی۔........ تمہارا اصلی کام کوئی خاص مسئلہ اور کوئی خاص تحریک نہیں ہو سکتی۔ ہمیشہ سے اور ہمیشہ کے لیے صرف یہی ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو مسلمان بننا چاہیے اور قوم و فرد دونوں اعتباروں سے اسلامی زندگی اختیار کر لینی چاہیے۔ اس ایک کام کے انجام پا جانے پر سارے کام خود بخود انجام پا جائیں گے سوال حکومتوں کے نکل جانے کا نہیں ایمان کی گم گشتگی کا ہے

(حوالہ مذکور ص ۲۰۶ تا ۲۰۹)

(مولانا نے ۱۰ سال پہلے مرض کی جو تشخیص فرمائی تھی، آج مریض کا حال بعینہٖ وہی ہے، ایک سر مو فرق نہیں۔ پھر دین فطرت یا قانون فطرت کے مطابق اس کا صحیح علاج جو اُس وقت تجویز کیا گیا تھا آج کوئی نئی صورت حال ایسی پیش نہیں آگئی ہے جس سے وہ علاج صحیح نہ رہا ہو یا کوئی علاج اس سے بہتر نکل آیا ہو۔ کرنے کا کام اس وقت بھی یہی تھا اور اب بھی یہی ہے ورنہ اجتماعی زندگی کی معصیت میں مبتلا رہ کر مسلمان جدھر بھی قدم اٹھائیں گے ہلاکت ہی کی طرف جائیں گے۔

اس میں شک نہیں کہ جب اس صحیح راہ عمل کی طرف دعوت دی گئی تھی اس وقت کسی نے اسے قبول نہ کیا، اور یہ بھی درست ہے کہ آج بھی کوئی اس کی طرف توجہ کرتا نظر نہیں آتا، مگر مقام دعوت و عزیمت (جس کی شرح و بیان کا حق مولانا نے اپنے "تذکرہ" میں ادا فرمایا ہے) یہ نہیں ہے کہ جب راہ حق کی طرف بلانے میں کامیابی نہ ہو تو راہ باطل کی طرف دعوت دینا شروع کر دیا جائے، اور جب قوم بہشت کے راستے پر آنا قبول نہ کرے تو مایوس ہو کر اس کو جہنم کی طرف دھکیل دیا جائے، بلکہ اس مقام بلند کا اقتضا ہمیشہ سے یہی رہا ہے اور اب بھی یہی ہے کہ آخری سانس تک صحیح راستہ کی طرف دعوت دیتے رہو، اپنی پوری قوت اسی کی طرف قوم کو لانے میں صرف کر دو، تمام دنیا اگر منحرف ہو جائے، تب بھی اس راہ سے ہٹنے کا خیال تک نہ کرو، حتٰی کہ اسی پر جان دیدو، اور اس میں ناکام و نامراد مرجانے کو غلط راستوں کی متاع غرور والی کامیابیوں پر ترجیح دو۔ ترجمان القرآن۔)

# مطبوعات

تاریخ فلسفۂ اسلام | تالیف ٹ۔ج۔ دو بورڈ فرانسوی۔ ترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب پروفیسر فلسفہ و تعلیمات جامعہ ملیہ اسلامیہ ضخامت ۱۸۰ صفحات قیمت عہ۔ مکتبۂ جامعہ دہلی۔

اس کتاب کو فلسفۂ اسلام کی "تاریخ" کسی معنی میں بھی نہیں کہا جا سکتا۔ زیادہ سے زیادہ آپ اسے "تاریخ فلسفۂ اسلام پر ایک تبصرہ" کہہ سکتے ہیں، اور علمی حیثیت سے لفظ "تبصرہ" جو وزن رکھتا ہے اگر اس کو ملحوظ رکھا جائے تو یہ کتاب اس معزز نام سے بھی موسوم ہونے کے لائق نہیں۔ پوری کتاب کو بالاستیعاب پڑھنے سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ مصنف نے فلاسفہ و متکلمین اسلام کی اصل کتابوں کو دیکھا ہی نہیں، یا اگر دیکھا بھی ہے تو بغیر کسی نظم و ترتیب کے ایک آدھ کتاب ادھر سے اور ایک آدھ ادھر سے سرسری طور پر دیکھ لی ہے جو ہرگز کسی سائنٹفک مطالعہ کے لیے کافی نہیں۔ اس کی معلومات تمام تر مستعار ہیں۔ مختلف مغربی مصنفین نے فلسفۂ اسلام پر جو تبصرے لکھے ہیں، ان کو جمع کر کے اس نے اپنے ذہن میں ایک مرقع تیار کر لیا ہے اور اسی مرقع کو وہ ہمارے سامنے "تاریخ فلسفۂ اسلام" کے باوقعت نام سے پیش کرتا ہے۔ اس پر مزید یہ کہ ایک سچے محقق کی طرح وہ اپنے ذہن کو غیر علمی مسلمات اور مشہورات قوم سے صاف کر کے، حقائق کو جیسے کہ وہ فی نفسہٖ ہیں، دیکھنے اور سمجھنے کے لیے مستعد نہیں کرتا، بلکہ جو عام غلط فہمیاں اسلام اور مسلمانوں کے متعلق اہل فرنگ میں پھیلی ہوئی ہیں ان کو حقائق کی حیثیت سے قبول کر لیتا ہے اور انہی پر اپنے نظریات کی بنا رکھتا ہے۔ اس نے بغیر کسی تحقیق کے یہ فرض کر لیا ہے کہ اسلام چونکہ ایک امی قوم میں پیدا ہوا ہے، اور ایک اُمّی ہی نے اس کی "بنا" رکھی ہے (یہ لوگ محمد عربی صلعم کو اسلام کا "بانی" ہی سمجھتے ہیں) اس لیے "علم" سے اس کو کوئی واسطہ نہیں ہو سکتا

[redacted]

کسی "علمی" بیداری یا کسی علمی تحریک کا اس کے لٹریچر اور اس کی تاریخ میں کھوج لگانا ہی عبث ہے۔ بلکہ اس کے برعکس یہ سمجھ لینا چاہیے کہ جب مسلمانوں میں "علم" آئے گا ــــــ اور وہ بہرحال باہر ہی سے آئے گا ــــــ تو اس کی زد سے وہ اپنے آپ کو نہ بچا سکے گا۔ یہ مصنف کا ایک بڑا مفروضہ ہے جو اُس کے تبصرے کی عمارت میں خشتِ اول کی حیثیت رکھتا ہے، اور اس کی کجی نے آخر تک پوری عمارت کو کج کر دیا ہے۔ ایک دوسرا مفروضہ جس کی حیثیت خشتِ ثانی کی ہے، یہ ہے کہ اہل مشرق فطری طور پر تنقید و تحقیق کی صلاحیت سے محروم ہیں، سائنٹفک اصول پر حقائق کا سراغ لگانا اور ان کو مرتب و مدوّن کرنا ان کی افتادِ مزاج ہی کے خلاف ہے، اور اس باب میں "سامی ذہن" تو عام مشرقی ذہن سے مقابلہ میں بھی گیا گذرا ہے۔ ان دونوں مفروضات کی بنیاد پر "تاریخ فلسفۂ اسلام" کی یہ پوری داستان جو مصنف نے بیان کی ہے۔ افکارِ اسلام کے نشو و ارتقا کی ایک ایسی تصویر ناظرین کے سامنے پیش کرتی ہے جس کو دیکھ کر دو مختلف قسم کے آدمی دو مختلف قسم کے اثرات قبول کریں گے۔ جو شخص قبل اسلام اور دورِ اسلامی کی علمی تاریخ سے نابلد ہے وہ تو یہ سمجھے گا کہ علم کی شمع ہمیشہ "فرنگی دماغ" کی کارفرمائیوں سے روشن رہی ہے۔ زمانہ قدیم میں یونانی دماغ نے اس کو روشن کیا، اور زمانۂ جدید میں مغربی یورپ کی قوموں نے اس کو دیا سلائی دکھائی۔ بیچ کے دور میں اسلامی ذہن کا کارنامہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس نے یونانیوں سے جو کچھ لیا اسے بھی پوری طرح نہ سمجھا، اور فلسفہ کے نام سے محض غلط فہمیوں کا ایک انبار جمع کر دیا۔ بخلاف اس کے جو شخص علم رکھتا ہے، جس کی نظر میں حکمائے متقدمین اور حکمائے اسلام دونوں کے کارنامے موجود ہیں، وہ اپنے آپ کو یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور پائے گا کہ مصنف جس موضوع پر کلام کر رہا ہے، اس سے بحث کرنے کا وہ ہرگز اہل نہیں، نہ علمی حیثیت سے اور نہ ذہنی حیثیت سے۔

اس مختصر تنقید میں اتنی گنجائش نہیں کہ مصنف کی غلطیوں کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے۔ اس کی غلط فہمیوں اور دانستہ غلط بیانیوں کی توضیح کے لیے اتنی ہی بڑی ایک کتاب کی ضرورت ہے۔

مجملاً ہم صرف اتنا کہیں گے کہ جو شخص عربی علم نحو کی بنیاد کا سراغ یونانی اور عجمی علم اللسان میں تلاش کرتا ہو، جس کا خیال یہ ہو کہ قرآن کی صحت زبان ثابت کرنے کے لیے مسلمانوں کو محاورے تراشنے کی ضرورت پیش آئی تھی، جس شخص کا مبلغ تحقیق یہ ہو کہ ابتدائی دور کے متکلمین نے "اختیار" کا عقیدہ مسیحی استادوں سے لیا تھا، جس شخص کو یہ بھی معلوم نہیں کہ مسلمانوں کے مذاہب کلامیہ میں نظامیہ کے سوا کسی کا مذہب "طفرہ" کا قائل نہیں ہے، جو شخص سائنس کی پوری تاریخ سے آنکھیں بند کرکے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہو کہ مسلمان سائنٹیفک معلومات کے ذخیروں کو علمی طریقہ پر مدون و مرتب کرنا جانتے ہی نہ تھے، جو شخص ذکریا رازی کی تصانیف پڑھے بغیر یہ رائے زنی کرنے کی جرات کرتا ہو کہ اس نے ارسطو اور جالینوس کی کتابوں کو نہیں سمجھا، اور ساری عمر کیمیا گری میں گنوادی، جو شخص ابن رشد پر یہ الزام لگاتا ہو کہ وہ اسلامی علم دین کو حقیر سمجھتا تھا، اور حقیقت اس کے نزدیک قرآن میں نہیں بلکہ ارسطو کی تصانیف میں تھی، ایسے شخص کو مشکل ہی سے اس کا اہل سمجھا جاسکتا ہے کہ وہ "فلسفہ اسلام" جیسے اہم موضوع پر کلام کرسکے۔

حیرت یہ ہے کہ جامعۂ ملیہ اسلامیہ کے مکتبہ سے یہ کتاب بغیر کسی تنقیدی مقدمہ اور بغیر کسی حاشیہ کے جوں کی توں شائع کردی گئی۔ اس میں شک نہیں کہ اپنے علوم و فنون اور اپنی تاریخ کے متعلق ہمیں دوسروں کی "تحقیقات" یا بیانات سے بھی واقف ہونے کی ضرورت ہے، اور اس لحاظ سے اس کتاب کا ترجمہ شائع کرنا کوئی قابل اعتراض فعل نہیں، بلکہ فائدہ ہی کا پہلو رکھتا ہے۔ مگر جب کہ ہماری زبان میں فلسفۂ اسلام کی معلومات کا ذخیرہ بمنزلہ صفر ہے، اور اردو دان طبقے کے لیے اُن ماخذ تک پہنچنا مشکل ہے جن کو دیکھے بغیر مغربی مصنفین کی غلط بیانیوں کا راز منکشف نہیں ہوسکتا، اس قسم کی کتاب کو بلا تنقید و تحشیہ شائع کرنے کے معنی یہ ہیں کہ دوسروں نے ہماری جو غلط اور بھونڈی تصویر کھینچی ہے، اسے ہم خود اپنے ناواقف طالبان علم کے سامنے

پیش کریں اور انہیں یہ نہ بتائیں کہ تمہاری اصلی تصویر کیا ہے۔ اگرچہ فاضل مترجم نے اپنے دیباچہ میں بہت دبی زبان سے یہ تنبیہی فقرہ لکھدیا ہے کہ "یورپ کے مستشرقین کے لیے عربی غیر زبان ہے اور وہ مشرقی خیال سے بیگانہ ہیں" اس لیے "اگر اس کتاب میں غلطیاں پائی جائیں تو جائے تعجب نہیں" لیکن تریاق کی یہ ذرا سی چٹکی اس زہر کے مقابلہ میں کوئی اثر نہیں رکھتی جو اس کتاب کے مطالعہ سے، ناواقف اردو داں لوگوں میں پھیلیگا۔ فاضل مترجم کا یہ خیال بالکل صحیح ہے کہ "اصل میں یہ کام خود مسلمانوں کا ہے کہ اپنے تمدن کے متعلق خود اپنی قوم کے لیے اور ساری دنیا کے لیے صحیح معلومات بہم پہنچائیں" مگر جب وہ جامعہ بھی اس کام کو انجام نہ دے جو مسلمانوں کو مغرب کی ذہنی غلامی سے آزاد کرنے کے لیے قائم کی گئی تھی، تو آخر ہم مسلمانوں کے اور کس طبقہ سے یہ امید رکھیں کہ وہ ہمارے تمدن کی صحیح نمائندگی کریں گے؟ [redacted]

ترجمہ کا نقش ثانی بلاشبہ نقش اول سے بہتر ہے۔ سات برس قبل جو ایڈیشن شائع ہوا تھا اس کے مقابلہ میں اب فاضل مترجم نے ترجمہ کو بہت زیادہ رواں، سلیس اور بافہم بنادیا ہے تاہم اتنی اصلاح کے بعد بھی ترجمہ کو پڑھتے وقت اکثر یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ اسلامی فلسفہ کا بیان نہیں ہے۔ مصنف اور مترجم دونوں اسلامی حکماء اور متکلمین کی اصل کتابوں پر نظر نہیں رکھتے، اسلیے ترجمہ در ترجمہ ہوکر ان کے خیالات کی صورت کچھ سے کچھ ہوگئی ہے۔ اس پر مزید یہ کہ مترجم نے قدیم اصطلاحات کو چھوڑکر نئی اصطلاحات وضع کی ہیں جن سے اجنبیت اور بڑھ گئی۔ مثلاً ( Categories ) کے لیے قدیم اصطلاح "مقولات" ہے۔ مترجم نے اس کو چھوڑکر "ابواب" کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ قطع نظر اس کے کہ پرانی اصطلاح کے مقابلہ میں یہ نئی اصطلاح موزوں ہے یا نہیں، علوم و فنون میں جو اصطلاحات رائج ہوچکی ہوں اور رواج کی قوت سے اپنے معانی موضوع لہا پر دلالت کرتی ہوں ان کو نئی اصطلاحات سے بدلنا بہرحال قابل اعتراض ہے۔

(Sense-Organ) کا ترجمہ "الحاسّہ" درست نہیں۔ "عضو حاس" یا "آلہ احساس" یا صرف "حاس" کہنا چاہیے۔ (Substantial) کے لیے قدیم اصطلاح "جوہری" ہے، اسے چھوڑ کر "جوہر آسا" کہنے کی کیا ضرورت ہے؟ (activity) کے لیے "فعالی" کی اصطلاح درست نہیں۔ فعل اور فعلیت اور فاعلیت کی اصطلاحیں پہلے سے رائج ہیں۔ (Predestinationist) کے لیے "قدری" نہیں بلکہ "جبری" کی اصطلاح ہے۔ "قدری" اس کو کہتے ہیں جو انسان کے لیے "آزاد ارادہ" (free-will) کا قائل ہو۔ "متکثّر" یا "متعدد" کے لیے مترجم نے "کثرت آسا" کی اصطلاح استعمال کی ہے جو بالکل غیر مانوس ہے۔ (Phenomena) کے لیے انہوں نے "مظاہر" کا لفظ پسند کیا ہے، مگر قدیم اصطلاح "آثار" ہے اور یہی لفظ قرآن میں بھی اس معنی کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اسی طرح "نوری" یا "نورانی" کے لیے "نور آسا"، "احاطہ کے معنی میں "احصاء"، "علم الاحکام" یا "فقہ" کے لیے "علم الفرائض"، "آن" کے لیے "غیر ممتد لمحہ" کی اصطلاحیں بھی نامناسب ہیں اور ان میں اصلاح کی ضرورت ہے۔

"A New Muslim World In Making" تالیف حافظ فضل الرحمن انصاری بی۔ اے علیگ۔ شائع کردہ آل ملایا مسلم مشنری سوسائٹی اسنگاپور۔

فاضل مصنف مسلمان قوم کے ان نوجوانوں میں سے ہیں جن سے بڑی امیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں۔ ابھی ان کا زمانہ طالب علمی ختم بھی نہیں ہوا ہے اور ابھی سے انہوں نے قابل قدر علمی خدمات انجام دینی شروع کر دی ہیں۔ اپنی اس تازہ تصنیف میں وہ عہد جدید کی تاریخ کا بالکل ایک نیا باب پیش کرتے ہیں جس کو آرنلڈ کی (Preaching of Islam) کا بہترین ضمیمہ کہا جا سکتا ہے۔ زمانہ حال میں اسلام اپنے پیروؤں کی مادّی اور روحانی کمزوریوں کے باوجود جس طرح ایشیا، یورپ، افریقہ، امریکہ، اور کرۂ زمین کے بعید ترین جزائر میں پھیلا ہے اور پھیلتا جا رہا ہے اس کی ایک مکمل تصویر آپ

اس کتاب میں نظر آئے گی۔ آپ اس میں دیکھیں گے کہ معمولی علم و عقل والے نہیں، بلکہ سلطنتوں کے سفراء علوم جدیدہ کے ماہرین، اعلیٰ درجے کے مصنفین اور اخبار نویس، حتیٰ کہ غیر مذاہب کے پیشوا اور مبلغین بھی جب اسلام سے روشناس ہوئے اور اس کی اصلی صورت ان کو نظر آگئی تو کس طرح وہ اس کے شیدائی ہوگئے، اور کس طرح انہوں نے اپنی زندگیوں کو اس دین کی تبلیغ کے لیے وقف کر دیا۔ اس قسم کی ایک دو نہیں بلکہ بیسیوں مثالیں مصنف نے بیان کی ہیں اور ایک ایک ملک کو لے کر بتایا ہے کہ اسلام کی فتوحات کا دائرہ محض اپنی روحانی قوت سے کس طرح وسیع ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی مصنف نے تفصیل کے ساتھ جماعت احمدیہ کی تبلیغی کارروائیوں پر بھی تبصرہ کیا ہے اور اس سلسلہ میں تصویر کا دوسرا رخ دکھایا ہے۔

**مسلمان اور سائنس** | تالیف خان بہادر محمد ذکاء اللہ خان صاحب۔ ایم۔ اے۔ ریٹائرڈ کلکٹر و نائب ریاست دتیا قیمت ۴؍ ملنے کا پتہ لطیفی پریس، دہلی۔

یہ کتاب اس سے پہلے مکتبہ جامعہ دہلی سے شائع ہو چکی ہے۔ مگر وہ اشاعت ناقص تھی۔ اب مؤلف نے بہتر کتابت و طباعت کے ساتھ اسے دوبارہ شائع کرا دیا ہے۔

فاضل مصنف ایک دردمند اور مخلص مسلمان ہیں۔ انہوں نے یہ رسالہ اس مقصد کے لیے لکھا ہے کہ علماء کرام کو قدیم نصاب تعلیم کی اصلاح، اور علوم جدیدہ، خصوصاً سائنس، کی تعلیم کی طرف توجہ دلائیں۔ یہ مقصد بجائے خود صحیح ہے، اور ضرورت ہے کہ عربی مدارس کے ارباب حل و عقد اس رسالہ کا مطالعہ کر کے اس سے استفادہ کریں۔ لیکن ہمیں مصنف کے اس خیال سے اتفاق نہیں ہے کہ علماء نفس علوم جدیدہ کے مخالف ہیں، اور ان علوم کو دہریت و الحاد پیدا کرنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ مصنف کو غالباً معلوم ہوگا کہ علماء ہند کے سرخیل حضرت شاہ عبد العزیز صاحب نے اس زمانہ میں مسلمانوں کو علوم جدیدہ کی طرف توجہ دلائی تھی جب سرسید احمد خان شائد پیدا بھی نہیں ہوئے تھے

اور ہندوستان میں کسی شخص کو اس ضرورت کا احساس نہ تھا۔ شاہ صاحب کی دوررس نگاہوں نے اسی وقت دیکھ لیا تھا کہ ہندوستان پر ایک حکیم قوم مسلط ہو رہی ہے اور حکیم کا مقابلہ حکمت ہی سے کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ انگریزوں کے غدر سے پہلے دہلی کالج میں جب علوم جدیدہ کی ابتدائی تعلیم شروع ہوئی تھی تو علماء میں سے کسی نے بھی اس کی مخالفت نہیں کی تھی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علماء کو حکمت کی تعلیم سے کبھی اختلاف نہ تھا نہ آج ہے۔ اصل چیز جس کے وہ مخالف تھے اور آج بھی مخالفت پر مجبور ہیں، وہ طرز تعلیم ہے جو انگریزی حکومت نے اپنی اغراض کے لیے رائج کیا ہے ابتدائی جدید تعلیم تمام تر عیسائی مشنریوں کے ہاتھ میں تھی، اور سرکار برطانیہ کی سرپرستی میں انہوں نے بیسیوں زنانہ و مردانہ تعلیمگاہیں صرف اس غرض کے لیے جاری کی تھیں کہ اگر ہندوستان کے لوگوں کو عیسائی نہ بنایا جا سکے، تو کم از کم اپنے مذہب اور اپنی تہذیب سے بیگانہ بنا دیا جائے، اور ان کے دلوں میں فرنگی تہذیب کی عظمت اور فرنگی اقتدار کی غلامی کا گہرا نقش بٹھا دیا جائے۔ اس کے بعد جب خود حکومت نے تعلیم کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیا تو جدید تعلیمی پالیسی کا سنگ بنیاد میکالے کے اس تخیل پر رکھا گیا کہ اس سے ایک ایسی قوم پیدا ہوگی "جو رنگ اور خون کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہوگی، مگر مذاق، خیالات، اخلاق اور ذہنیت کے اعتبار سے انگریز ہوگی"۔ اس پالیسی کے تحت جتنے مدارس اور کالج قائم ہوئے ان کا اصل مقصد باشندگان ہند کو زیور علم سے آراستہ کرنا نہ تھا بلکہ ان کے دل و دماغ کو انگریزی اقتدار کی غلامی کے لیے تیار کرنا تھا۔ خصوصیت کے ساتھ ان تعلیمگاہوں میں مسلمانوں کے خلاف تو ایسی سخت زہریلی فضا پیدا کی گئی تھی کہ کوئی خوددار مسلمان اس میں سانس نہ لے سکتا تھا۔ ان کے اسلاف پر تبرا بھیجا جاتا تھا۔ ان کے مذہب کی توہین کی جاتی تھی۔ ان کے عقائد کی تردید ہوتی تھی۔ ان کی تہذیب کا مذاق اڑایا جاتا تھا، اور اس کے ساتھ ہر ممکن ذریعہ سے کوشش کی جاتی تھی کہ اسلامی علوم و فنون دنیا سے مٹ جائیں، عربی و فارسی کی تعلیم بند ہو، اور اسلامی علوم پڑھنے والوں

کے لیے رزق کے دروازے مسدود ہو جائیں۔ کیا کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ علماء اس تعلیمی پالیسی کی مخالفت کرنے میں حق بجانب نہ تھے؟

انیسویں صدی کے آخر میں جدید تعلیم کی اشاعت کے لیے جو تحریک خود مسلمانوں کی طرف سے اٹھی اس کے دنیوی اور مادی فوائد سے کسی کو انکار نہیں، مگر اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جو طرز تعلیم علیگڑھ اور دوسری اسلامی درسگاہوں میں اختیار کیا گیا وہ ایک خفیف سی ترمیم کے ساتھ اسی طرز تعلیم کا چربہ تھا جو انگریزی حکومت نے رائج کیا تھا۔ اس کی مخالفت علماء نے اس بنا پر کبھی نہیں کی کہ انگریزی زبان کیوں سکھائی جاتی ہے، یا علوم جدیدہ کی تعلیم کیوں دی جاتی ہے۔ بلکہ مخالفت کا اصلی سبب یہ تھا کہ اس میں انگریزی زبان کے ساتھ فرنگی ذہنیت بھی بطور جزو لازم کے شریک کی گئی، اور علوم جدیدہ کی تعلیم میں وہی نقطۂ نظر اختیار کیا گیا جو انگریزی حکومت کی رائج کردہ تعلیم میں اساس و اصل کی حیثیت رکھتا ہے۔ فاضل مصنف کی طرح ہم بھی یہ کہتے ہیں کہ علوم جدیدہ میں سے کوئی علم بھی ایسا نہیں جو اسلام کا مخالف ہو۔ طبیعیات، کیمیا، ریاضی، ہیئت، تاریخ، سیاسیات، معاشیات اور دوسرے علوم، حتیٰ کہ فلسفہ میں بھی کوئی ثابت شدہ حقیقت ایسی نہیں ہے جو اسلام کے اصول و فروع میں سے کسی کی تردید کرتی ہو، بلکہ اس کے برعکس یہ سب علوم دراصل مسلمان کے ایمان میں اضافہ کرنے والے اور اس کو خلافت الٰہیہ کے فرائض کی بجا آوری میں مدد دینے والے ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ جدید درسگاہوں میں ——— خواہ وہ قومی ہوں یا سرکاری ——— ان علوم کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۹۵ فی صدی مسلمان طلبہ کی مت کیوں پلٹ جاتی ہے؟ وہ ہندوستانی مسلمان سے یکایک "صاحب بہادر" کیوں بن جاتے ہیں؟ ان کی لڑکیاں خاتون مشرق سے یکلخت "میم صاحب" کیوں بن جاتی ہیں؟ ان کی زبان، ان کے لباس، ان کی معاشرت، ان کے عادات و اطوار پر فرنگیت کیوں مسلط ہو جاتی ہے؟ ان کے دماغ اپنے دین کی صداقت میں کیوں شک کرنے لگتے ہیں؟ ان کے

اندر حدود شریعت سے آزادی کا مرض کیوں پیدا ہوجاتا ہے؟ وہ نماز سے کیوں گریزاں ہوتے ہیں؟ رمضان میں علانیہ کھانے پینے اور سگریٹ کے دھویں اڑانے کی جرات ان میں کیوں پیدا ہوتی ہے؟ شعائر اسلامی کا مذاق اڑانے اور عقائد اسلامی کے خلاف زبان کھولنے پر وہ کیوں جری ہوجاتے ہیں؟ آخر وہ کونسی چیز ہے جو طبیعیات اور فلسفہ کے طالب علم کو دہریہ بناتی ہے؟ عمرانیات کے طالب علم کو اسلام سے ہٹاکر سرمایہ داری یا اشتراکیت کی طرف لے جاتی ہے؟ تاریخ وسیاسیات کے طالب علم کو رنگ ونسل ووطن کی پرستش کا سبق سکھاتی ہے؟ قانون کے طالب علم کو اسلامی قوانین میں جاہلانہ ترمیمیں کرنے پر آمادہ کرتی ہے؟ اور مشترک طور پر تمام علوم جدیدہ کے طالب علموں میں یہ مرض تھوڑا یا بہت پیدا کردیتی ہے کہ ان پر زندگی کا مادہ پرستانہ نقطۂ نظر غالب ہوجاتا ہے اور وہ ہر چیز کی قدر مادی منفعتوں اور حسی لذتوں کے لحاظ سے متعین کرنے لگتے ہیں؟ اگر آپ حکیمانہ نظر سے ان خرابیوں کے اسباب کا تجسس کریں گے تو آپ کو معلوم ہوجائیگا کہ یہ محض سطح کا سیل نہیں ہے جو اوپر سے مسلمان نوجوانوں کو لگ جاتا ہو بلکہ اس کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ وہ اس غلط طرز تعلیم اور ناقص طریق تربیت میں نشوونما پا رہی ہیں جو علوم جدیدہ کی تعلیم کے لیے اختیار کیا گیا ہے اور جس میں اسلامی تعلیم وتربیت کا کوئی عنصر شامل نہیں ہے۔ علمار اگر اس کی مخالفت کرتے ہیں تو کوئی گناہ نہیں کرتے، بلکہ وہ اسلام کے دشمن ہوں گے اگر اس کی حمایت کریں گے۔

پس درحقیقت علمار پر اس حیثیت سے کوئی الزام عائد نہیں کیا جاسکتا کہ وہ علوم جدیدہ کی تعلیم کے موجودہ طرز کے مخالف ہیں، بلکہ ان پر الزام ایک دوسری حیثیت سے عائد ہوتا ہے۔ وہ اس بنا پر ملزم اور سخت ملزم ہیں کہ زمانہ کی ضروریات کو سمجھنے اور قدیم طرز تعلیم کو ان کے مطابق بنانے کی کوشش نہیں کرتے۔ انہوں نے اپنے اردگرد ساتویں صدی ہجری کی فضا طاری کر رکھی ہے جس میں العالم متغیر وکل متغیر حادث کا سبق تو روز دیا جاتا ہے مگر اس کی حقیقت

تسلیم کرنے سے ہر آن انکار کیا جاتا ہے۔ وہ آج تک اُن فرق باطلہ کا رد کیے جا رہے ہیں جو اب دنیا میں

[redacted] ، اہلیت اپنے اندر

پیدا نہیں کرتے، کجا کہ ان کا رد کر سکیں۔ ان کی زبان پرانی، ان کے خیالات پرانے، ان کی حجتیں پرانی

ان کی حرکات و سکنات پرانی، غرض مجموعی حیثیت سے وہ خود اس قدر پرانے ہیں کہ دنیا آج ان کو

آثار قدیمہ میں شمار کرنے پر مجبور ہے۔ جدید زمانے کی زندگی میں وہ اس کے سوا کوئی اثر پیدا نہیں

کر سکتے کہ لوگ ان کو اسلام کا نمائندہ سمجھ کر خود اسلام سے بدگمان ہو جائیں۔ ان میں اب تک ایسے

لوگ موجود ہیں جو اخبار تک پڑھنا پسند نہیں کرتے کہ مبادا العالم متغیر کی حقیقت ان پر

منکشف نہ ہو جائے۔ فاضل مصنف تو ان پر صرف علوم جدیدہ سے ناواقفیت کا الزام لگاتے ہیں،

مگر میں کہتا ہوں کہ خود اسلامی علوم کی تعلیم بھی جو ان کے مدرسوں میں دی جا رہی ہے، شدت کے ساتھ

محتاج اصلاح ہے۔ درحقیقت وہ اس قدر ناقص ہے کہ اس کے انتہائی مدارج پر پہنچ کر بھی انسان

روح اسلامی سے بیگانہ رہتا ہے، اور اس میں اسلام کو سمجھنے کی اہلیت پیدا نہیں ہوتی، کجا کہ

وہ دنیا کے سامنے اسلام کی نمائندگی کر سکے۔ اس طرز تعلیم کے نقائص بیان کرنے کا یہاں موقع نہیں

اگر خدا کی توفیق شامل حال رہی تو انشاء اللہ ایک مستقل مضمون عربی مدارس کی تعلیم پر بھی اسی طرح

لکھا جائے گا جس طرح علیگڈھ یونیورسٹی کی تعلیم پر لکھا جا چکا ہے۔

**خاتمہ** تالیف حضرت سید محمد گیسو دراز چشتی رحمۃ اللہ علیہ۔ ضخامت ۲۰۸ صفحات۔ قیمت

دو روپیہ۔ ملنے کا پتہ۔ مولوی سید عطا حسین صاحب ایم۔ اے۔ بی۔ ای۔ لنگم پلی۔ حیدرآباد دکن۔

"آداب المریدین" تصوف کی مشہور کتابوں میں سے ہے۔ حضرت خواجہ گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ

نے اس کی تین شرحیں لکھی تھیں، اور ان میں سے ایک شرح کے آخر میں تکملہ یا ضمیمہ کے طور پر یہ رسالہ

تحریر فرمایا تھا جس کا نام "خاتمہ" ہے۔ اس میں حضرت نے تفصیل کے ساتھ وہ ۱۸ آیتیں درج فرمائی

ہیں جنہیں ایک طالب حق کو تعلیم سلوک کے دوران میں ملحوظ رکھنا چاہیے۔ مدتوں سے یہ رسالہ گوشۂ گمنامی میں پڑا ہوا تھا۔ مولوی سید عطا حسین صاحب شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اس کے مختلف نسخوں کا مقابلہ کرکے ایک صحیح نسخہ تیار کیا اور اسے جدید طرز پر ایڈٹ کرکے شائع کر دیا۔ تصوف جس علم اور جس عمل کا نام ہے اس کی صحیح تصویر اگر آپ کو دیکھنی ہو تو ان اکابر اولیاء اللہ کی تصانیف دیکھیے جو اس علم و عمل کے حقیقی نمائندے ہیں۔

**عورت** تالیف جناب مرزا حسین احمد بیگ صاحب زائد سشن جج گلبرگہ۔ ضخامت ۲۴۸ صفحات قیمت [redacted] حیدرآباد دکن۔

جدید مغربی تہذیب میں عورت اور مرد کا فطری توازن بگڑ جانے کی وجہ سے تمدن و معاشرت میں جو خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں ان کو فاضل مؤلف نے ایک حد تک تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے پوری کتاب عدالتی مقدمات اور معتبر کتابوں اور رسالوں کے شواہد سے بھری ہوئی ہے۔ خود مؤلف یورپ کی سیاحت کر چکے ہیں اور انہوں نے اپنے ذاتی مشاہدات بھی بیان کیے ہیں۔ جو لوگ صنفی معاملات میں یورپ کی اندھی تقلید پر مائل ہیں انھیں خصوصیت کے ساتھ اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ افسوس کہ اس کتاب کی ترتیب زیادہ اچھی نہیں ہے، مؤلف نے مختلف عنوانات کے تحت واقعات کو محض جمع کر دینے پر اکتفا کیا ہے۔ واقعات کے درمیان کوئی فلسفیانہ ربط پیدا نہیں کیا جس سے ذہن آسانی کے ساتھ نتائج اخذ کر سکے۔ تاہم واقعات بہت سبق آموز ہیں، اور ان کو پڑھ کر ہر شخص خود معلوم کر سکتا ہے کہ یہ مغربی تہذیب انسان کو کدھر لے جا رہی ہے۔

**فضل الخطاب** تالیف جناب اکبر شاہ خاں صاحب نجیب آبادی۔ ضخامت ۱۲۰ صفحات قیمت مجلد (عہ) غیر مجلد ۱۲ اس ملنے کا پتہ:۔ منیجر مکتبہ عبرت، نجیب آباد (یوپی)۔

آج کل پنجاب میں دو مختلف سمتوں سے اسلامی امارت کا ایک ہی نظریہ پیش کیا جا رہا ہے جو سراسر غیر

ہے مگر مسلمانوں کو غلط فہمی میں ڈالنے کے لیے اس کو اسلامی لباس پہنا یا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں کے گروہ میں امیر کی حیثیت "مطاعِ مطلق" کی ہے۔ جس طرح نبی قوم کے سامنے جوابدہ نہیں ہے اسی طرح نبی کا نائب بھی جواب دہی سے مبرّا ہے۔ اور اس کے کسی حکم اور کسی قول و فعل پر تنقید نہیں کی جا سکتی۔ قوم کا کام صرف اس کی اطاعت ہے، بے چون و چرا اطاعت، ویسی ہی اطاعت جیسی نبی کی کرنی چاہیے۔ اس نظریہ کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ قرآن مجید کی وہ آیت ہے جس میں اطاعت اولی الامر کا حکم دینے کے ساتھ ہی یہ فرمایا گیا ہے کہ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ (اگر تمہارے درمیان کسی چیز میں نزاع ہو جائے تو اس کو خدا اور رسول کی طرف پھیر دو اگر تم اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو)۔ اس آیت کا صاف منشا یہ ہے کہ حق اور باطل کی تمیز کے لیے مسلمانوں کے پاس اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کا طریقہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایک معیار ہے، اور یہ معیار اس قوم کو اسی لیے دیا گیا ہے کہ یہ اپنے جیسے انسانوں کو ارباب من دون اللہ نہ بنائے، شخصیت پرستی میں مبتلا نہ ہو، کسی بڑے سے بڑے آدمی کی بھی اندھی تقلید اور کورانہ اطاعت نہ کرے، بلکہ ہر رہنما کی رہنمائی اور ہر حاکم کے حکم کو اس معیار پر جانچ کر دیکھتی رہے کہ آیا وہ حق کی طرف لے جا رہا ہے یا باطل کی طرف۔ مگر عبداللہ ابن سبا کے زمانہ سے آج تک تمام گمراہ فرقوں اور ضلالت کے داعیوں کی یہ سنت رہی ہے کہ وہ سب سے پہلے اسی معیارِ حق پر ہاتھ صاف کرتے ہیں، کیونکہ اس کی موجودگی میں ان کا کاروبار کسی طرح چل ہی نہیں سکتا۔ چنانچہ اس آیت کریمہ کے اثر کو باطل کرنے کے لیے سب سے پہلے حدیث کا انکار کیا جاتا ہے تا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین کا طریقہ، جو مسلمانوں کے سامنے اسلامی زندگی کا حقیقی نمونہ ہے، یک قلم محو ہو جائے۔ اس کے بعد قرآن کی غلط تاویلات کی جاتی ہیں اور ایسے خوشنما طریقوں سے کی جاتی ہیں کہ ہر وہ مسلمان دھوکا کھا جائے

ہو بچارا خود قرآن کا صحیح علم نہیں رکھتا پھر یہ خطرہ پیش آتا ہے کہ کہیں صحیح علم رکھنے والے اس فریب کا پردہ چاک نہ کر دیں۔ تو اس کا سدباب کرنے کے لیے علما پر گالیوں کی بوچھاڑ کی جاتی ہے تاکہ قوم کی نگاہ میں ان لوگوں کو ساقط الاعتبار کر دیا جائے جو اس کو حقیقت سے خبردار کر سکتے ہوں؟ اور اس طرح قوم کے ناواقف لوگ آسانی کے ساتھ اس شخص کی مٹھی میں آجائیں جو ان پر اپنی شخصیت کا جال پھیلانا چاہتا ہو۔ مزید براں ایک چال یہ بھی اختیار کی گئی ہے کہ جو لوگ اس غلط رہنمائی پر تنقید کرتے ہیں ان کے جواب میں نہایت غیر مہذب اور غیر شریفانہ انداز بیان اختیار کیا جاتا ہے تاکہ کوئی شریف آدمی بھرے بازار اپنی پگڑی اچھلوانا پسند نہ کرتا ہو ان گمراہ کن لوگوں کی کارروائیوں پر نکتہ چینی کی جرأت نہ کر سکے اور خاموشی کے ساتھ اپنی قوم کو ایک غلط راستے کی طرف جاتے ہوئے دیکھتا رہے۔

خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اُس قوم کا کیا [illegible] ہوگا جس کے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ خود اپنی قوم کی جہالت اور مصیبت سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں مسلمان قوم کے کم از کم ۹۵ فی صدی افراد قرآن و سنت کے صحیح علم سے بے بہرہ ہیں۔ یہ چیز ان لوگوں کے لیے ایک سرمایہ بن گئی ہے جو اس غریب قوم کے سروں پر اپنی کبریائی کا قصر تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ اور ان کا دوسرا سرمایہ اس قوم کی وہ مصیبت ہے جس میں یہ آج کل مبتلا ہے۔ بدنظمی و انتشار کے ہولناک نتائج نے ساری قوم کو ہراساں کر دیا ہے وہ تنظیم کی پیاسی ہو رہی ہے اور اس پیاس نے اس کو اتنا بدحواس کر دیا ہے کہ تنظیم کا لیبل لگا کر زہر کا پیالہ بھی اگر اس کو دیا جائے تو دوڑ کر منہ سے لگائے گی۔ یہ دوسری چیز ہے جس سے خود غرض لوگ ناجائز فائدہ اٹھانے کے لیے مستعد ہو گئے ہیں۔ ایک گروہ (یعنی قادیانی) تو پہلے ہی ایک فرقہ بن چکا ہے جس کے زہریلے اثرات کو آج تمام ہر صاحب عقل مسلمان محسوس کر رہا ہے۔ اب دوسرا گروہ (یعنی خاکسار) اپنے اندر روز بروز وہ

خصوصیات پیدا کرتا جا رہا ہے جو بالآخر اس کو بھی ایک فرقہ اور جنگ جو فرقہ بنا کر چھوڑیں گی۔

مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے امارت کے ان دونوں قادیانی و خاکساری نظریوں کی تردید میں کتاب اللہ و سنت رسول اللہ و طریقۂ خلفاء راشدین سے بہترین دلائل مہیا کیے ہیں۔ ان کے جواب میں مخالفین کے پاس کوئی وزنی دلیل نہیں اس لیے اُنہی اوچھے ہتھیاروں سے کام لیا جا رہا ہے جو باطل کے حامیوں کا آخری سہارا ہیں۔ وہ بجز اس کے کوئی جوابی دلیل پیش نہ کر سکے کہ اکبر شاہ کی تحریر میں "طائیت" ہے اور "ان کا بڑا منشا کتابیں لکھنے سے کتابوں کی فروخت ہے"۔ مقصد یہ ہے کہ لوگ اُس کتاب کی طرف سے پہلے ہی بدگمان ہو جائیں جو ان کو حقیقت حال سے آگاہ کر سکتی ہے۔ مگر اس کے باوجود ہم امید رکھتے ہیں کہ خاکسار تحریک میں جو نیک نیت مخلص اور حقیقی اسلامی جذبہ رکھنے والے لوگ محض اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی کا داعیہ لیکر شریک ہوئے ہیں، وہ تعصبات سے خالی الذہن ہو کر مولانا اکبر شاہ خاں کی اس کتاب کو دیکھیں گے، اور اس غیر اسلامی امارت کے وقتی فوائد سے قطع نظر کر کے اس کے دور رس نتائج و عواقب کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔

**تبصرہ بر تذکرہ نمبر ۱ و ۲** یہ دو رسالے ہیں جن میں عنایت اللہ خان صاحب مشرقی کی کتاب "تذکرہ" پر چوہدری محمد حسین صاحب ایم۔ اے اور مولانا سید سلیمان ندوی کے تبصرے نقل کیے گئے ہیں۔ دونوں مضمون غایت درجہ سنجیدگی کے ساتھ لکھے گئے ہیں اور ان میں "تذکرہ" کی اساسی غلطیوں پر تنقید کی گئی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ ناشر نے مشرقی صاحب کے خلاف درشت کلامی اختیار کر کے ان تبصروں کی وقعت میں اضافہ کرنے کے بجائے اس کو اور گھٹا دیا۔ اس میں شک نہیں کہ خود مشرقی صاحب اور ان کے ہم خیال حضرات بھی درشت کلامی میں کسی سے

پہنچے پائے ہیں، لیکن ضروری نہیں کہ درشتی کا جواب درشتی سے دیا جائے جو لوگ درحقیقت مسلمانوں کو صحیح راستہ دکھانا چاہتے ہیں ان کے لیے لازم ہے کہ نہایت متین لہجہ اختیار کریں، تاکہ مسلمان ٹھنڈے دل سے تصویر کے دونوں رخ دیکھ کر رائے قائم کر سکیں۔

دونوں رسالے ۳ر کے ٹکٹ بھیج کر مہتمم دائرۃ الارشاد، چوک بابا اٹل امرتسر سے منگائے جاسکتے ہیں۔

اسلام اور مرزائیت | تالیف مولوی عتیق الرحمٰن صاحب آروی۔ ضخامت ۳۲ صفحات قیمت ۳ر ملنے کا پتہ: مولوی عتیق احمد صاحب صدیقی مدیر قاسم العلوم۔ دیوبند۔

اس مختصر رسالہ میں مؤلف نے ایک طرف اسلام کے اصلی عقائد قرآن و حدیث سے جمع کئے ہیں۔ اور دوسری طرف قادیانی عقائد خود مرزا صاحب اور ان کے خلیفہ اور اکابر طائفہ کی تحریروں سے فراہم کردئے ہیں تاکہ دونوں کا تقابل کرکے ہر طالب حق خود فیصلہ کرے کہ اسلام اور قادیانیت میں اصولاً کتنا بڑا فرق ہے، اور قادیانیت کو اسلام کا ایک فرقہ کہنا کہاں تک حق بجانب ہو سکتا ہے۔

سرکار کا دربار | تالیف مولوی الیاس احمد صاحب مجیبی۔ ضخامت ۲۸ صفحات۔ قیمت ۸ر ملنے کا پتہ:۔ مکتبۂ جامعہ دہلی۔

سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک بہت سہل اور میٹھی زبان میں بچوں کے لیے لکھی گئی ہے، اور ایسا انداز بیان اختیار کیا گیا ہے جس سے بچوں کے دل پر سرکار اور یاران سرکار کی عظمت کا نقش بیٹھ جاتا ہے۔ ضرورت ہے کہ یہ کتاب ہر مسلمان بچے کو پڑھائی جائے۔

نبوت اور نبی | یہ وہ خطبہ ہے جو ڈاکٹر سید ظفر الحسن صاحب استاد فلسفہ مسلم یونیورسٹی علیگڈھ نے یوم النبی کی تقریب پر یونیورسٹی کی مجلس اسلامیات کے سامنے پڑھا تھا۔ یہ دیکھ کر نہایت مسرت ہوئی کہ ہماری یونیورسٹی میں جو شخص فلسفہ کا پروفیسر ہے وہ ایک سچا اور صحیح العقیدہ مسلمان ہے، اور اپنے علم کو دہریت و الحاد کے بجائے ایمان باللہ و ایمان بالرسول کی خدمت میں استعمال کرتا ہے۔ فاضل خطیب نے اس مختصر سے خطبہ میں

دراصل دریا کو کوزہ میں بند کیا ہے۔ دیکھنے والے کے لیے الفاظ بہت کم ہیں مگر سمجھنے والے کے لیے معانی بہت زیادہ ہیں۔ ان کے کلام کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کے قلب کو ابتدا سے آج تک جس چیز نے شعوری یا غیر شعوری طور پر مضطرب کیے رکھا ہے وہ اپنے کمالِ لائق کو پہنچنے کی خواہش ہے۔ سائنس فلسفہ اور شہود باطنی (Religious experien… ) کے ذریعہ سے انسان نے اپنے اس مطلوب تک پہنچنے کا صحیح راستہ معلوم کرنے کی کوشش کی مگر ناکام ہوا۔ ان تینوں ذرائع کی ناکامی آج ہر صحیح النظر نقاد پر روشن ہے۔ اب صرف ایک ہی ذریعہ جادۂ کمال کی دریافت کا باقی رہ جاتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ وجود کامل خود اس وجود ناقص یعنی انسان کی طرف متوجہ ہو اور اس کو اپنی طرف آنے کا راستہ بتائے۔ یہی چیز ہے جس کو نبوت کہتے ہیں، اور درحقیقت راہ راست پانے کا کوئی ذریعہ نبی پر ایمان لانے اور اس کی پیروی کرنے کے سوا نہیں ہے۔
آگے چل کر خطیب فاضل نے بیان کیا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وحی و نبوت کے کامل ترین مظہر ہیں۔ آپ کی لائی ہوئی کتاب اور آپ کی سیرت آپ کی نبوت پر ایسی قطعی شہادت ہے کہ عقل سلیم کے لیے کسی شک کی گنجائش نہیں۔ اس کے بعد وہ اس مسئلہ پر بحث کرتے ہیں کہ مذہب کو ایک انفرادی چیز سمجھنا اور یہ خیال کرنا کہ وہ محض انسان اور خدا کے درمیان ایک تعلق ہے کس قدر غلط اور گمراہ کن تخیل ہے۔ ہدایت دراصل ہدایت ہی نہیں ہے اگر وہ انسان اور انسان کے تعلق کو درست کرنے کے لیے کوئی رہنمائی نہ پیش کرے۔

ہم اپنے ناظرین سے اس خطبہ کے مطالعہ کی پرزور سفارش کرتے ہیں مجلس اسلامیات علیگڈھ مسلم یونیورسٹی سے غالباً مفت مل سکیگا۔

بصائر القرآن۔ جناب نکہت شاہجہانپوری۔ بی۔ اے۔ ضخامت ۷۶ صفحات۔ قیمت عہر۔ مولف سے انجمن اسلامیہ ہائی اسکول بوری بندر بمبئی کے پتہ پر مل سکتی ہے۔

یہ مختصر کتاب ان خطبات کا مجموعہ ہے جو جناب نکہت نے انجمن تحریک قرآنی کے جلسوں میں قرآن مجید

کی تعلیمات پار شاد فرماتے تھے، فاضل خطیب نے عقیدۂ توحید، مغفرت الٰہی رحمت الٰہی، اور قبلۂ اسلام کے عنوانات پر کلام کیا ہے اور ان کے تحت مسلمانوں کی بہت سی عام غلط فہمیوں کو دور کرکے اسلامی تعلیمات کی ایسی تشریح کی ہے جو موجودہ زمانہ کے روشن خیالوں کو اپیل کر سکتی ہے بعض بعض مقامات پر خطیب سے لغزشیں بھی ہوئی ہیں مثلاً وہ اللہ تعالیٰ کی صفت غفاری کو "جذبہ" سے تعبیر کرتے ہیں اور شفاعت کو "خدا کے جذبۂ غفران سے اپیل" قرار دیتے ہیں۔ لفظ "جذبہ" جن معنوں میں عام طور پر مستعمل ہوتا ہے ان کے لحاظ سے حق تعالیٰ کی طرف اسے منسوب کرنا درست نہیں۔ اس کے بجائے "صفت" کی پرانی اصطلاح ہی کو استعمال کیا جاتا تو کیا مضائقہ تھا؟

آخری رسول | تالیف جناب ماہر القادری صاحب ضخامت ۴۰ صفحات قیمت ۸ر ملنے کا پتہ:۔ مکتبۂ علمیہ، چار مینار حیدرآباد دکن۔

جناب ماہر نے اس کتاب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک بہت سادہ اور عام فہم زبان میں لکھی ہے مقصد یہ ہے کہ مولود کی بے اصل کتابوں کے بجائے اس قسم کی کتابوں کو رواج دیا جائے جن میں سیرت پاک کے صحیح حالات ہوں اور ساتھ ساتھ اسلام کی تعلیمات پر بھی کچھ روشنی پڑتی جائے۔ کتاب بلاشبہ اس مقصد کیلیے مفید ہے اگر بہتر ہوتا کہ [illegible] کی رعایت ملحوظ رکھکر بیان کو زیادہ رنگین اور خطیبانہ کردیا جاتا اور بیچ بیچ میں نعتیہ اشعار بھی لائے جاتے جناب ماہر یہ دونوں کام خوبی کے ساتھ کر سکتے تھے۔ خصوصاً نعت کے باب میں عام مذاق جس قدر پست ہوگیا ہے اس کو بلند کرنے کے لیے ضرورت ہے کہ ماہر جیسے قادر الکلام شاعر صحیح قسم کی نعتیں کہیں اور ان کو عام رواج دیا جائے۔

بعض مقامات پر مصنف نے جوش عقیدت میں نامناسب الفاظ استعمال کیے ہیں جنکی اصلاح ضروری ہے مثلاً نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جگہ جگہ شہنشاہ لکھا ہے، حالانکہ حضور نے خود اس لفظ کو غیر اللہ کے لیے استعمال کرنے کی مانعت فرمائی ہے ایک جگہ لکھا ہے کہ حضور کا چہرہ سورج سے زیادہ چمکیلا تھا اور آپکے پسینہ میں مشک و عنبر سے زیادہ خوشبو تھی۔ یہ محض ایک عقیدتمندانہ مبالغہ ہے سرکار دو عالم رسالتمآب کے محاسن و فضائل اس سے بالا و برتر ہیں کہ آپ کی فضیلت بیان کرنے کے لیے اس قسم کے مبالغوں کی ضرورت ہو ترتیب واقعات میں بھی کچھ فروگذاشتیں رہ گئی ہیں مثلاً بادشاہوں کے نام آپکے دعوت ناموں کا ذکر فتح مکہ کے بعد کیا ہے، حالانکہ اس سے پہلے ہونا چاہیے تھا۔

[illegible]

[illegible]

"[illegible]" [illegible]

[illegible] ترسیل زر بنام مینجر [illegible] روڈ۔ لکھنؤ

---

## بچوں کیلئے مفید کتابیں

**اسوۂ رسول** ۔ اس مختصر کتاب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیۂ مبارک [illegible]

[illegible]

[illegible] قیمت ۲ ر

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

**دفتر ترجمان القرآن سے طلب کیجیے**